خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

اپریل 2015

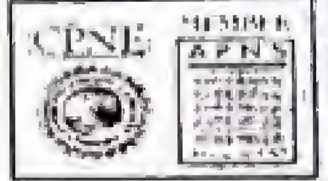
نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول



جلد45 • شمارہ04 اپریل 2015 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com



پبلشر و پرپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

نجات

بوڑھے قدموں سے چل کر میں بچپن کی طرف گیا۔ انجام کی طرف جاتے ہوئے میں نے آغاز کا رخ کیا۔ میری تھکی ہوئی پنڈلیاں، میرے ناقص اور ناہموار وجود کو بستیوں اور بازاروں میں، کوچوں اور کلبۂ احزان میں گھسیٹتی پھریں۔

میں سودائی اپنی گلیوں میں چلتے چلتے تھک گیا۔ میں غوغائی اپنے جنگلوں میں چیختے چیختے ہار گیا۔

میں نے راحت کو پکارا اور رنج کمایا۔

میں نے آرام کو آواز دی، آلام میرے حصے میں آیا۔

وہ تاریخ میں نے جس میں پہلا سانس لیا، وہ جغرافیہ میں جس میں عرصۂ دراز سے رہتا ہوں، انہوں نے مجھے مایوس کیا، مغموم کیا۔

تاریخ اور جغرافیے کے حوالے سے میرے چاروں طرف وحشتوں کا بہاؤ ہے اور خبروں کا اندھیاؤ ہے۔ افسوس کہ تاریخ نے حکمت سے ہاتھ اٹھایا۔ صد افسوس کہ جغرافیے نے دانائی فراموش کی۔

اچھے دنوں کی نوید دینے والے کہاں ہیں؟ کہاں چلے گئے؟

سب ہی کے دلوں سے خوش امیدی کوچ کر گئی کیا؟

کور چشموں اور بد باطنوں کو، احمقوں اور احدیوں کو نوشتہ دیوار سنانے والا کوئی نہیں رہا کیا؟

وہ آنکھیں بستیوں سے کوچ کر گئیں کیا جو اس تحریر کو پڑھ سکیں، جسے دانائی نے اپنی انگلیوں سے لکھا اور جسے حکمت نے اپنے ہاتھ سے نصب کیا؟

لوگو! کیا تمہیں یاد نہیں کہ حکمت زور سے پکارتی ہے اور دانائی اپنی آواز بلند کرتی ہے ''وہ راہ میں اونچے مقاموں کی چوٹیوں اور رستوں کے بیچ میں کھڑی ہوتی ہے۔ وہ پھاٹکوں کے نزدیک شہر کے مدخل کے پاس یعنی دروازوں میں داخل ہونے کی جگہ زور سے پکارتی ہے۔''

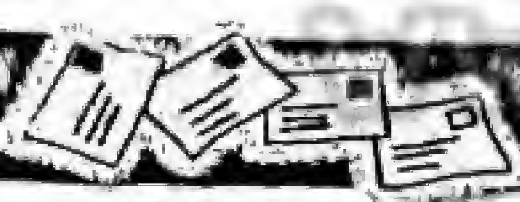
وہ کہتی ہے ''اے آدمیو! میں تم کو بلاتی ہوں اور بنی آدم کے ساتھ میری بات ہے۔ اے نادانو! دانائی کو سیکھو۔ اے جاہلو! فہمید کو پہچانو۔ سنو! کیونکہ میں بڑی باتیں بولوں گی اور میرے لب درست باتوں کے لیے کھلیں گے کیونکہ میرا منہ حق بیان کرتا ہے اور میرے لب شرارت سے نفرت رکھتے ہیں۔ میرے منہ کی سب باتیں صداقت ہیں، ان میں کچھ ترچھا اور ٹیڑھا نہیں۔ وہ سمجھنے والے کے نزدیک سب کی سب درست ہیں اور علم رکھنے والے کے نزدیک راست ہیں۔ میری تادیب کو قبول کرو نہ کہ چاندی کو اور علم کو کندن پر فوقیت دو کیونکہ حکمت لعلوں سے بہتر ہے اور کوئی دل پسند چیز اس کے برابر نہیں۔

میں حکمت، مشورت کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں علم اور بصیرت رکھتی ہوں۔ ہر غرور اور شیخی اور بدراہی اور ضدی زبان والے منہ سے مجھے نفرت ہے۔ مشورت اور مہارت میرے ساتھ ہیں۔ میں فہمیدہ ہوں۔ توانائی میری ہے۔ سلاطین میرے ذریعے سے مسلط ہیں اور حاکم انصاف سے عدالت کرتے ہیں۔ امرا میرے ذریعے سے امارت کرتے ہیں اور رئیس زمین پر حکمران ہیں۔

میں ان کو پیار کرتی ہوں جو مجھ کو پیار کرتے ہیں اور جو میری تلاش کرتے ہیں وہ مجھے پالیں گے۔ دولت اور عزت اور پائیدار سرمایہ اور اقبال مندی میرے پاس ہیں۔ میرا پھل سونے اور کندن سے بہتر اور میرا حاصل خالص چاندی سے افضل ہے، میں صداقت کی راہ میں اور عدل کے رستوں کے درمیان چلتی ہوں تاکہ ان کو جو مجھے پیار کرتے ہیں، اچھے مال کے وارث بناؤں اور ان کے خزانے بھر دوں۔

میں ازل سے نصب کی گئی...... قدیم سے...... یعنی اس سے پیشتر کہ زمین بنائی گئی۔ پس اے لوگو! میری سنو...... مبارک ہیں وہ جو میری راہوں کو مانتے ہیں۔ تادیب کو سنو اور دانش مند بنو اور اس سے انکار نہ کرو۔ مبارک ہے وہ انسان جو میری سنتا ہے۔

کہاں گئے وہ مبارک انسان جو حکمت کی مشورت سنیں؟ دانائی کے موتی چنیں! میری تاریخ، میرا جغرافیہ کیا بانجھ ہوئے؟ لوگو! دانائی کیوں نہیں سیکھتے؟ کیوں نہیں فہمید کو پہچانتے؟ کہ تمہاری اور میری اور آنے والوں کی نجات اسی میں ہے۔





آپ کے خط

محترم قارئین

السلام علیکم!

اپریل 2015ء کا پُر بہار شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آج کل ہر جانب رنگ برنگے کھلتے پھول موسم میں خوشگوار تبدیلی کا احساس دلا رہے ہیں۔ انسان کا مزاج بھی موسم کی طرح بدلتا ہے۔ کبھی بہت بوجھل اور کبھی اپنے جوبن پر، جیسے کہ گزشتہ دنوں ورلڈکپ کے لیے پاکستانی قوم کا جوش قابل دید تھا لیکن ورلڈکپ کے آغاز میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کی ناقص کارکردگی نے عوام کو مایوس بھی کر دیا مگر اچانک جنوبی افریقا کے خلاف 29 رنز کی برتری سے حاصل ہونے والی فتح نے نہ صرف عوام کو پرجوش کر دیا بلکہ کھلاڑیوں میں بھی ایک ولولہ انگیز مسرت بھر دی۔ اللہ سے آگے بھی اچھے کی امید ہے۔ اصل چوکے چھکے تو آج کل سیاست کے میدان میں لگ رہے ہیں۔ سینیٹ کے الیکشن کے دنگل میں اگرچہ حاصل کردہ نشستوں کی تعداد نے مختلف سیاسی پارٹیوں کو نمبر ایک اور دو کی فہرست میں لا کھڑا کیا ہے مگر قابلیت کا یہ ثبوت اگر مثبت کارکردگی سے بھی دیا جائے تو شاید پاکستانی عوام کی تقدیر بدل جائے۔ جس طرح قانون سازی میں انہماک دکھایا جاتا ہے اسی طرح ان کے نفاذ میں بھی جوش اور ولولہ ہو تو لاقانونیت کی رسم کا بھی خاتمہ ہو جائے اور نظام میں خوشگوار تبدیلی چہرے بدل کر نہیں بلکہ بہترین پالیسیوں کی ترتیب اور نتائج سے آتی ہے۔ معاشی ترقی میں خواتین کی بھرپور شمولیت، فلاحی تنظیموں کا آغاز اور تکمیل تک بہترین نتائج کا یقینی حصول، چیک اینڈ بیلنس کا اصول، تعلیمی نظام کی درستی، نوجوان طبقے کے لیے مثبت سرگرمیوں کے مواقع کی فراہمی دہشت گردی اور معاشرتی نظام کی تباہی سے بچنے کے کتنے آسان اور سودمند طریقے ہیں لیکن ان پر عمل کرنا اتنا دشوار کیوں ہے۔ اس سوال کا جواب کس کے پاس ہے؟ الیکشن کا رواج اور حاکموں کا راج جب عوام کی خاطر ہے تو عوام کو مسائل... کی جانب دھکیل کر وسائل سے محرومی کیوں؟ اچھا روزگار، بجلی، پانی، گیس کی بحالی، بہترین اور سستی تعلیم اب تو صرف خواب کی سی باتیں لگتی ہیں۔ سیاستدانوں کی خوشحالی اور شہروں کی تباہ حالی کا قصہ اگرچہ پرانا ہے مگر جب تک مرہم نہ رکھا جائے زخم تو ہرا ہی رہے گا۔ اب دیکھتے ہیں یہ مرہم کون، کب اور کیسے رکھتا ہے۔ چلیں کچھ افسردہ چہروں پر مسکراہٹ بکھیرنے کی جسارت ہم بھی کرتے ہیں اور اپنائیت کے پھول بانٹتے چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب۔

✠ **محمد صفدر معاویہ**، خانیوال سے تشریف لائے ہیں ''15 فروری کی صبح ہم بڑے جوش و خروش میں تھے کہ اس دفعہ ہم بھارت کو ہرا دیں گے لیکن رزلٹ وہی جو پہلے ہی گزشتہ ورلڈکپ میں دیکھ چکے ہیں۔ 15 کی شام کو دل بوجھل ایسا لگتا تھا کہ گل بوٹے ہار پر شرمندہ سے ہیں، ہوا ساکن ہو گئی پرندے بھی اوپر ساکت سے لگتے تھے۔ سڑک بھی خاموش خاموش سی لگتی تھی ایسے میں ہم اپنی مطلوبہ جگہ پہنچے۔ سلام کیا تو سامنے والے نے مارچ کا شمارہ اٹھا کر ہمیں دے دیا۔ اس وقت میں شمارے کا ملنا گویا کسی خوشگوار سے احساس کے مانند تھا کہ دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا۔ سرورق کو بہت ہی پیاری اور مشرقی دوشیزہ سے بہت ہی پیارا سجایا گیا۔ تم کملائی نہیں ہو تم ہمارے دل میں رہتی ہو۔ جون ایلیا لفظ لفظ موتی بکھیر رہے تھے۔ جانے والے چلے جاتے ہیں پر ان کی یادیں کبھی نہیں جاتیں۔ میرے نانا جی بھی 16 فروری کو اس عارضی دنیا سے انتقال فرما کر مستقل دنیا کے باسی ہوئے۔ اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور اللہ کی رحمتیں ہوں آپ پر (آمین) آپ کا اداریہ پڑھا آپ نے سچ کہا جو حالات اس حکومت کے چل رہے ہیں وہ سمجھ سے بالاتر ہیں۔ ان دہشت گردوں چوروں ڈاکوؤں کا سدباب کیا جائے ورنہ والدین اس طرح تو اپنے بچوں کو بے بسی سے مرنے کے لیے اسکول نہیں بھیجیں گے۔ اپنی محفل میں آئے تو محترم جناب بھائی عبدالجبار رومی انصاری کو بہت ہی اعلیٰ عمدہ اور جامع تبصرہ کرتے پایا۔ صدارت کی مبارک ہو بھائی جان۔ محمد خواجہ کراچی والے بھی بہت عمدہ تبصرہ لے کر حاضر ہوئے۔ محمد قاسم رحمٰن سب سے پہلے پڑھائی پھر دیگر معروفیت۔ قدرت نیازی صاحب بھی اچھا تبصرہ لے کر حاضر ہوئے۔ آپ نے کہا اقربا پروری کا الزام لگ جائے تو لگنے دو۔ بقول حبیب جالب۔ ''ہم کو آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں۔'' محمد یوسف سانول بھی اچھا تبصرہ کرتے پائے گئے۔ عبدالغفور خان کون سی خوشی دینے والے ہیں۔ الیلی بھی نائس تبصرے کے ساتھ موجود۔ ایم اے فاضل فریدی کو ویلکم کرتے ہیں۔ احمد خان توحیدی آپ کرلیں چار شادیاں۔ آپ کو کس نے روکا ہے۔ وسیم احمد خان بھی محفل میں موجود۔ برادر اللہ کا کرم اب ٹھیک ہوں۔ ماریہ خان اینڈ بشریٰ افضل آپ کے مرحومین کو اللہ پاک جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے درماندہ عشق پڑھی۔ نظام نے بہت ہی بھیانک منصوبہ بنایا۔ داؤد کو پھنسانے کے لیے، داؤد اپنے انجام کو پہنچا لیکن ابھی نظام کے ہاتھ میں بھی کچھ آتا نظر نہیں آ رہا۔ فیروز بخت وصی الدین کی سرپرستی میں چلا گیا۔ سودائے جنوں، حق کی راہ میں چلنے والے عابد اور نائمہ، لیلیٰ پارٹی زبیدہ اینڈ خالد پارٹی محسن اور باز غز کا مقابلہ خون کے پیاسے شیطان کے چیلوں یعنی یہودی برادری کے ساتھ جو کسی بھی موقع پر مسلمانوں سے رعایت نہیں برتتے تو مجاہد بھی ان کو خاک چٹاتے رہتے ہیں۔ ماروی میں مراد اپنی ماروی کے پاس پہنچ چکا۔ سارے خطرے مول لے کر لگتا تو ایسا ہے ماروی ایک دو قسط کی مہمان ہے پر آگے مصنف کی مرضی۔ کاشف زبیر کی مقابلہ پڑھی۔ میکس نے کیا خوب نبھائی، الیکس کے ساتھ وہ فاتح بن کر بھی اپنا سب کچھ ہار گیا۔ تنویر ریاض کی رشتہ مینڈولین سے شروع ہونے والی کہانی رے گراہم کی جان لے کر ختم ہوئی۔ بیٹی نے باپ پر محبوب کو فوقیت دی۔ دیمک، مرزا صاحب کے کیسوں میں سے

ایک پیچیدہ اور خطرناک کیس شگفتہ اور شاہد نے بہت بھیانک چال چلی، خالد کے خلاف، پر مرزا صاحب نے اپنی صلاحیت اور ذرائع بروئے کار لاتے ہوئے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا۔ ابوضیا اقبال کی دھماکا خیز لبوں پر ہلکی پھلکی مسکراہٹ چھوڑ گئی کہ میاں کوئی بم ابھی تک ہاتھوں میں لیے پھرتا ہے۔ سلیم انور کی شعبدہ باز میں سلم گورڈن کے بتانے کے باوجود انشلے پروفیسر اور لڑکی کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا۔ محفل شعر و سخن بہترین اشعار سے مزین تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید مجبوری لے کر آئے۔ ہمیں سب سے پہلے اس وطن کی خدمت کرنی چاہیے جس کی سرزمین پر ہم نے آنکھ کھولی ہے نہ کہ جہاں پڑھنے جائیں اور نہ پلٹ کر والدین کی خبر لیں۔ بابر نعیم کی روایت۔ تمہارے دادا نے فلاں فلاں کو مارا اور میں بھی اور تم بھی آگے اس روایت کو جاری رکھنا۔ کیا تحریر تھی۔ ش م جمیل کی بلاعنوان میں جوائس کے ساتھ کیج ہاتھ کیا سوا اور ڈیوڈ نے۔ خواجہ باقی باللہ کے بارے میں پڑھ کر دل کو سکون سا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سایہ ہمسایہ۔ اعجاز نے بہت ہی برا کیا انیسہ کے ساتھ پھر بھی اس نے بڑا پن دکھایا۔ منظر امام سفر در سفر لے کر آئے۔ ڈاکٹر احمر اور تماچی کا ملن نصیب نہیں تھا پہلے غزالہ کی یادیں اب تماچی کی یادیں ڈاکٹر احمر کی قسمت۔ کترنیں بھی اعلیٰ تھیں۔ اس دفعہ شمارہ بہت بیسٹ رہا۔"

✠ **زیب حسن**، اچھرہ لاہور سے چلے آ رہے ہیں "میں سال میں صرف ایک بار ہی سسپنس یا جاسوسی میں حاضر ہوتا ہوں لیکن اس دفعہ حاضر ہونے کا مقصد آپ کی بے توجہی ہے۔ میں نے جنوری کے شمارے میں درخواست کی تھی کہ طاہر جاوید مغل صاحب سے آخری صفحات پر کوئی داستان لکھوائیں یا کوئی سلسلے وار کہانی للکار کی طرح شروع کروائیں لیکن آپ نے توجہ نہیں دی۔ مارچ کے شمارے کا سرورق بالکل بھی پسند نہیں آیا محفل البتہ خوب جمی ہوئی ہے۔ انکل ملکی مسائل پر جس طرح نوحہ کناں تھے ہر محب وطن اسی طرح غمزدہ ہے۔ ابھی دو دن پہلے لاہور میں دھماکا ہوا میرا بہت عزیز دوست حافظ ہارون خان اس جگہ سے صرف دو منٹ کی مسافت پہ تھا اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا بہت دردناک منظر تھا۔ اللہ پاک ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے آمین۔ عبدالجبار رومی انصاری صاحب لاہور سے محفل کے عہدۂ صدارت پر براجمان تھے۔ بہت بہت مبارک برادر...... جنوری کے شمارے میں آپ کو میرا خط پسند آیا اس کے لیے شکریہ۔ باقی یارانِ محفل کو بھی سلام۔ بشریٰ افضل آپ کی بہن کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ علی سفیان آفاقی صاحب بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اللہ پاک ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ درمائدہ عشق کی اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ داؤد کہاں ایک شادی بھی نہیں کر رہا تھا لیکن جب کی اکٹھی دو واہ جی واہ۔ کائنات کے سارے رنگ عورت ہی کی وجہ سے تو ہیں۔ اب دیکھتے ہیں فیروز بخت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ ایک تو صنفِ نازک نے ستیاناس کر دیا ہے۔ لیکن قصور بھی داؤد کا تھا کس نے کہا کہ بیک وقت تین جگہ پہ پنگا لے۔ آخر اپنی جان سے بھی گیا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید بہت اچھا لکھتے ہیں ہر دفعہ ایک حساس موضوع لے کر آتے ہیں۔ ان کی تحریریں سبق آموز ہوتی ہیں اگر ان سے بڑی کہانیاں بھی لکھوائی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا تو نام ہی کافی ہے۔ سایہ ہمسایہ کیا زبردست تحریر تھی۔ بہت خوب ڈاکٹر صاحب...... منظر امام لکھتے تو بہت زبردست ہیں لیکن اس دفعہ پتا نہیں کیا ان کے دل میں آئی کہ سفر در سفر لکھ ماری۔ حقیقت سے بعید کوئی فلمی کہانی لگ رہی تھی۔ آپ سے دوبارہ پھر درخواست کر رہا ہوں کہ محبتوں کے سفیر مغل صاحب سے کوئی محبت بھری داستان لکھوائیں۔" (آپ کی تجویز طاہر جاوید مغل صاحب تک پہنچا دی گئی ہے)

✠ **طاہرہ گلزار**، پشاور سے محفل میں شریک ہیں "سرورق کی حسینہ تو انڈین ڈراما جودا اکبر کی رقیہ بیگم زیادہ لگی۔ کہانیوں کی فہرست میں کاشف زبیر، عبدالرب بھٹی، ڈاکٹر شیر شاہ سید، نواب انکل اور منظر امام کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن اپنے بہت ہی فیورٹ مغل اعظم کو نہ پا کے دکھ ہوا پھر دل کو تسلی دی کہ کوئی بات نہیں صرف ایک دو مہینے کی جدائی ہے سسپنس میں پھر مغل اعظم یعنی طاہر جاوید مغل کا راج ہوگا۔ انشاءاللہ۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی با مقصد باتیں پڑھ کر معنی کے معنی ڈھونے لگے لیکن حاصل کچھ نہ ہوا۔ آج کل لوگوں کی زندگی بے مقصد ہی گزر رہی ہے۔ معراج انکل کی با مقصد باتیں ہمیشہ دل کو پر امید کر دیتی ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ آگے اچھا ہی اچھا ہو جائے گا۔ اس بار بھی 23 مارچ صرف ایک تاریخ کی طرح گزر جائے گی جیسے اس دن کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ سانحہ پشاور کے ٹھیک 53 دن کے بعد سانحہ حیات آباد جو مسجد کے اندر جمعہ کی نماز کے دوران بزدلوں نے دھماکے کیے اور 25 سے 30 بندے شہید اور 75 سے اوپر زخمی ہو گئے۔ اللہ ہماری حالت پہ رحم کرے اور ان ظالموں کو تباہ و برباد کرے۔ آمین ثم آمین۔ پہلے نمبر پر عبدالجبار رومی انصاری بھائی مبارکاں۔ رومی انصاری جی طاہرہ گلزار آنسو نہیں چھپاتی کیونکہ میں روتی نہیں ہوں ہمیشہ مسئلے کا حل نکالتی ہوں اور حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کرتی ہوں تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ دوسرا خط میرے بہت ہی پیارے بھائی محمد صفدر معاویہ کا تھا جو نہ جانے آج کل کیوں خفا ہو کے مجھ سے رابطہ ہی نہیں کر رہے۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ بھائی ہٹلر کی یہودیوں کے لیے کی گئی بات بہت اچھی لگی، بھائی آپ کا تبصرہ اسی نمبر کے قابل تھا، مبارک ہو...... محمد خواجہ کا تبصرہ بھی بھرپور رہا۔ محمد قاسم رحمان بچے ابھی اپنے دل و دماغ کو جھومنے کے بجائے تعلیم کے حصول کے لیے رکھو۔ ورنہ بعد میں زندگی کے معاملات آپ کو گھما دیں گے۔ لو جی اتنے عرصے بعد میرے فیورٹ تبصرہ نگار رضوان تنولی بھی آخر حاضر ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح مکمل اور جامع تبصرے کے ساتھ لاجواب تبصرہ ہم نے بھی دل و جان سے پڑھا کستوری میں پشاوری نسوار لگا کے۔ قدرت اللہ نیازی بھی حاضر تھے دل خوش ہوا۔ قدرت اللہ بھائی کچھ سیاسی لوگوں کو دھرنے سے اٹھنے کی بے عزتی سے بھی وقتی طور پہ بچا لیا سانحہ پشاور نے۔ تبصرہ بہت ہی جاندار رہا۔ اس کے باوجود بھی نیازی بھائی نے کسی کو خوش کرنے کے لیے باجی کا ذکر ہی نہیں کیا۔ محمد یوسف سانول بھائی سسپنس ایسا رسالہ ہے جس سے حاسد رسالے جل کے بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے، بہت جاندار تبصرہ رہا۔ ادریس احمد خان کا تبصرہ بھی کافی جاندار اور با مقصد تھا۔ ان کی باتوں نے دل جیت لیا۔ احمد خان توحیدی بھائی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ماریہ خان اللہ آپ لوگوں کو صبر عطا کرے اور آپ کے دونوں کزنز کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ ماریہ خان اتنا جامع تبصرہ شاندار آتی رہا کرو۔ بشریٰ افضل اللہ تعالیٰ آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور آپ کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔



آمین ثم آمین آخر میں غیر حاضر تبصرہ نگاروں کو بہت مس کیا خاص کر بابر عباس، تفسیر عباس بابر، آغا فرید احمد خان آف سکھر، جاوید بلوچ، ھمایوں سید، ہارٹ کچر شیر علی خان، ماہا ایمان، تصویر العین اور دلنشین بلوچ پلیز آپ سب جلدی انٹری دے دیں۔ معراج انکل اور آنٹی عذرا رسول کو بھائی ذیشان رسول کی شادی بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ معراج انکل کو صحت کامل عطا کرے۔ آمین۔ پلیز آپ اقلیم علیم صاحب سے کہیں کہ اپنا وعدہ پورا کریں ایک سال ہو گیا ہے اب تو کوئی شاہکار دے دیں۔ الیاس سیتاپوری کی دوسری قسط در ماندہ عشق بہت شاندار رہی۔ میرے فیورٹ رائٹر کی شاندار تحریر سودائے جنوں، یہ قسط بھی خوب شاندار رہی۔ آخری میں نائمہ کا زندہ بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔ اگلی قسط کا ابھی سے انتظار ہے۔ اگلی قسط میں یہودیوں کو خوب نیست و نابود کرنا ویلڈن بھٹی صاحب۔ سلیم انور کی مختصر تحریر شعبدہ باز بس ایک شعبدہ بازی ہی لگی۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی ایک اور حساس تحریر مجبوری کریم کتنا نافرمان اور بے حس بیٹا تھا۔ دوسری طرف ایک باپ جو انتظار کرتے رہے کہ بیٹا لوٹ آئے گا۔ جب تمام لوگ یہ ملک چھوڑ کر جائیں گے تو اس ملک کا کیا بنے گا۔ ساتھ میں سید صاحب نے 30 سال پہلے کی کراچی کی تصویر دکھا دی۔ نواب انکل کی تحریر ماروی اب کچھ ماورائی چیز بن گئی ہے۔ مرینہ کو ایک بار پھر مراد نے ٹھینگا دکھا دیا۔ مراد کو میکی براؤن کی بیٹی ملی۔ میکی براؤن کا بیٹا مارا گیا زبردست ایکشن، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ آخر مراد اپنی ماروی سے ملنے آ گیا پاکستان۔ روح کو منور کرنے والی ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر باقی باللہ پڑھ کے دل و دماغ کو روحانی سکون ملا۔ میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی انوکھی تحریر جو روس اور جرمنی کے پس منظر میں لکھی ہوئی تحریر تھی ویلڈن کاشی بھائی...... آخری صفحات پر منظر امام جیسے رائٹر کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ امجد بیگ صاحب کا یہ کیس واقعی بہت نرالا اور انوکھا تھا۔ مختلف کترنیں بھی بہت زبردست تھیں۔ امید رکھتی ہوں کہ بہت جلد اپنے فیورٹ رائٹر طاہر جاوید مغل کو پڑھیں گے۔''

✠ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ''مارچ کا سسپنس آب و تاب کے ساتھ نمودار ہوا۔ جس میں ذاکر صاحب کی مہارت کا بھی منہ بولتا ثبوت تھا۔ انشائیہ نے بھی آگہی کے در وا کیے۔ اداریے کے بعد اپنی محفل کے ناموں پر نظر پڑی۔ جس میں سرفہرست عبدالجبار رومی نظر آئے تو برادر مبارکباد قبول کریں۔ کچھ دیرینہ شائقین سسپنس کچھ مہینوں سے سسپنس کے ناموں کی فہرست میں ان نہیں ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی آرا سے جلد مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔ اندر کے صفحات پر سب سے پہلے ابتدائی کہانی درماندہ عشق جو کہنہ مشق رائٹر الیاس سیتاپوری کی تحریر کردہ کہانی ہے، اس نے اپنے سحر میں آخری سطر تک مجبور رکھا۔ پھر آخر میں جاری ہے کے تجسس میں اگلے مہینے کے لیے جلا کر دیا۔ پھر دوسری کہانی سودائے جنوں وہ بھی انتہائی دلچسپ کہانی ہے۔ وہ بھی آخر سطر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ پھر تیسرے نمبر پر ماروی ہے وہ بھی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی کہانی مقابلہ اپنی مثال آپ تھی۔ جس میں آخر تک کتاب سے نظریں نہیں ہٹتیں جس میں جذبوں کا اظہار اور محبت کی گرمی سب ہی کچھ تھا۔ تحریر ریاض کی رشتہ نے بھی متاثر کیا۔ دھماکا خیز بھی اچھی رہی۔ شعبدہ باز بہتر لگی۔ محفل شعر و سخن اچھے اور معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ (آپ کا شعر ضرور لگتا ہے) مجبوری ڈاکٹر شیر شاہ سید کی کہانی بھی یقیناً اچھی لگی کہ اس میں کچھ پیغام ہوتا ہے جو...... دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیتا ہے اور عبرت کا سامان بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ روایت، روایت شکن نہیں روایت آزما نظر آیا۔ اچھا ہوا اگر وہ روایت شکن ہوتا تو قصبے میں جرائم بہت بڑھ جاتے جس کا سدباب مشکل ہو جاتا۔ اچھا ہوا کہ جرم کی بیخ کنی کر دی گئی۔ بلاعنوان نے بھی اچھا تاثر دیا جو انکس آئرلینڈ نے مفت کی دولت ملنے کے خوابوں کا تانا بانا بنا مگر سب مسمار ہو گیا جب وہ دولت کسی اور ہاتھ میں منتقل ہو گئی اور وہ خالی ہاتھ رہ گئی۔ خواب دیکھتے ہوئے چکنا چور ہو گئے۔ خواجہ باقی باللہ ولیوں کی یہ شان ہے کہ وہ دنیا کی حرص و ہوس سے دور رہتے ہیں تو اللہ رب العزت کی نظر میں ان کا مقام اعلیٰ ہو جاتا ہے۔ ایسے ایمان افروز ولیوں کے حالات و واقعات پڑھ کر دلوں کا میل صاف ہو جاتا ہے اور اللہ کی وحدانیت کا بندہ اور زیادہ معترف ہو جاتا ہے۔ سایہ ہمسایہ نے بھی کافی متاثر کیا۔ منظر امام کی کہانی سفر در سفر نے آخری صفحات کی خوب صورت کہانی کا حق ادا کر دیا، بہت اثر انگیز کہانی تھی۔ بیچ بیچ میں کترنوں نے بھی محظوظ کیا۔''

✠ **طالب حسین طلحہ**، نیو سینٹرل جیل، ملتان سے شریک محفل ہیں ''مارچ کا شمارہ حسب دستور 19 تاریخ کو ملا۔ انشائیہ کے بعد ملکی حالات کے بارے میں آپ کی تحریر پڑھی۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ پر رحم فرمائے۔ آمین۔ بزم یاراں میں کرسی صدارت پر عبدالجبار رومی انصاری براجمان تھے اور پھر تبصرے کی کیا بات...... اس دفعہ بزم میں نئے نام بھی شامل تھے اور سب دوستوں نے اپنے اپنے انداز میں بہت خوب تبصرے کیے...... سب نوں مبارکاں...... تے جی آیاں نوں...... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی سودائے جنوں کا چوتھا حصہ بہت خوب رہا۔ فلسطینی مجاہدین کو سلام اللہ تعالیٰ انہیں فتح و نصرت نصیب فرمائے۔ آمین۔ شہدا کی قربانیاں انشاء اللہ رنگ لائیں گی۔ ایک ولی کی روداد میں خواجہ باقی اللہ کے بارے میں پڑھ کر ایمان کی کیفیت بہتر ہوئی۔ ماروی پہلے سے بہتر ہو رہی ہے۔ کترنیں بھی خوب رہیں۔ محفل شعر و سخن میں دوستوں کے انتخاب کے کیا کہنے...... بس اتنا پڑھ پایا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور آپ کی دعاؤں سے میں ہائیکورٹ سے باعزت بری ہو گیا ہوں۔ سزائے موت ختم ہو گئی ہے الحمدللہ (شکر الحمدللہ۔ مبارک ہو) فروری کے شمارے میں شبانہ حسن، مہرین ناز، زرمین نیازی صاحبہ اور عبدالجبار رومی انصاری سمیت دیگر قارئین کی دعاؤں کا شکریہ۔ خاص طور پر اس مہربان کا جس نے مجھے وظیفہ بھیجا۔ جناب معراج رسول صاحب اور ان کی پوری ٹیم کا بھی شکریہ کہ انہوں نے بھی مجھے دعائیں دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔''

✠ **ابرار وارث**، سندیلیانوالی سے تشریف لائے ہیں ''سسپنس کا سرورق دیکھ کر دل پہلی بار خوش ہوا۔ مشرقی روایات کی پاسداری کا نمونہ کامل دوشیزہ بہت حسین لگی۔ جون ایلیا کی تحریر چیخ چیخ کر معصوم بچوں کی معصومیت اور ظالموں کے ظلم کو بیان کر رہی تھی...... خطوط میں اپنا نام نہ دیکھ کر کسی بھی خط کو منہ نہیں لگایا ہاہاہا! جلدی سے اپنی من پسند تحریر ''سودائے جنوں'' کو پڑھا...... بہت سنسنی خیز قسط...... نائمہ اور عابد سنگھری سمندر کی بے رحم



موجوں سے بچ کر اسرائیلی آبدوز میں جا گھسے اور امید ہے اس آبدوز کو تباہ کر کے ہی دم لیں گے۔ سارہ نے ... عابد کو دھوکے میں رکھ کر شاید اپنے لوگوں کو بلا لیا تھا۔ بازغہ اور محسن مکمل طور پر خطرے کی زد میں ...... پتا نہیں کمانڈوز سے ان کی جان کیسے چھوٹے گی ......؟ حماد، کمال اور بیگی کا دورۂ عراق یقیناً دلچسپ ہوگا۔ ماروی کی ہر قسط میں نئی لڑکی مراد پہ لازمی نثار ہوتی ہے اس دفعہ تو حد ہی ہوگئی۔ مراد کے جانی دشمن بیگی کی بچی ہی اس پر فدا ہوگئی ...... محبوب کے خوابوں کو چکنا چور کرنے کے لیے مراد ایمان علی کی صورت میں پاکستان آدھمکا اور عبداللہ کبڈی کے ساتھ مل کے کامیاب ڈراما کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مرینہ شاید اب کچھ سیدھی ہوئی ہے۔ اصل میں ایمان علی لالچ زن میں اسپتال جا پہنچا، بے چارہ ...... آخری صفحات پر مختصر تحریر پڑھنے کو ملی جس کا عنوان تھا سفر در سفر۔ افریقا میں وحشی قبائل کی داستان پڑھی۔ احمر کو زبردستی وہاں کا بادشاہ بنایا جا رہا تھا۔ تماچی کا کردار عجیب سا لگا۔ منظر امام صاحب نے محی الدین نواب کا طریقہ تحریر اپنایا اس دفعہ ...... کاشف زبیر نے بھی بہت پیاری کہانی مقابلہ لکھی۔ روسی اور جرمن جنگ کے پس منظر میں میکس، الیکس اور نتالیہ کا کردار پسند آیا ...... میکس بے چارے کو شروع سے ہی ان دونوں کی محبت ایک آنکھ نہ بھائی اور آخر کار وہ خود بھی گیا اور دھماکوں میں نتالیہ بھی چل بسی۔ شاید مر کر میکس نے مقابلہ جیت لیا تھا ...... اس دفعہ کے شمارے میں سب سے زیادہ کہانی جو پسند آئی وہ تھی، سایہ ہمسایہ، بزرگوں کے اس قول کے برخلاف کہ خالی گھروں میں نحوست برستی ہے۔ نسیمہ اور افتخار کے پڑوس نے آباد ہو کر ان کی زندگی برباد کر لی۔ نسیمہ کو شروع دن سے ہی افتخار کو بتا دینا چاہیے تھا۔ نسیمہ کی بے بسی پر صحیح معنوں میں بہت دکھ ہوا جب افتخار نے ایاز کو موردِ الزام نہ ٹھہراتے ہوئے اپنی ہی بیوی کو گھر سے نکال دیا اور طلاق بھی دے دی۔ ایاز اور عنبرین کا تو کچھ بھی نہ بگڑا ٹوٹا تو صرف افتخار اور نسیمہ کا گھر ...... افتخار جیسے لوگوں کے بھی کیا کہنے جو اپنوں کو قصوروار اور بیگانوں کو اپنا سمجھ لیتے ہیں نسیمہ کے آخری فقرے کو ایاز ہی سمجھ سکا لیکن کیا فائدہ ...... باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ پلیز طاہر جاوید مغل کی کہانی لے آئیں، چاہے قسط وار یا آخری صفحات پر ...... ان کے بغیر کوئی تحریر اچھی نہیں لگتی۔"

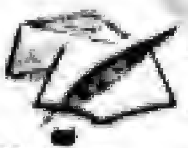
✠ **رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی** سے حاضر ہو رہے ہیں "آہا کیا حسن اتفاق ہے کہ ہمارا محبوب سسپنس عین ویلنٹائن کے دن موصول ہوا، ہم نے بھی محبوبانہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ایک ننھا سا گلدستہ لا کر سسپنس کے اوپر رکھ دیا، لنچ کے بعد پڑھیں گے۔ اس بار ڈاکٹر صاحب نے سرورق اچھا نہیں بنایا، مردانہ ہاتھ کو کرنٹ لگا دیا، پھول ہونا چاہیے تھا، لگتا ہے ڈاکٹر صاحب ویلنٹائن ڈے (یوم محبت) پر ایمان نہیں لائے ہوں گے۔ فہرست بھی عام سی تھی۔ انشائیہ تو ہمیشہ ہی تلخ و ترش ہوتا ہے۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے عبدالجبار رومی انصاری صاحب کا طویل و عریض تبصرہ بھلا لگا، مبارکباد۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ موصوف رومی بھی اور انصاری بھی۔ جبار صاحب وضاحت فرمائیں اورنگی والے کریزوی بھائی اور کورنگی والے خواجہ صاحب کے تبصرے اچھے لگے۔ قدرت اللہ نیازی صاحب کے خیالات بھی من کو بھائے۔ بشریٰ افضل صاحبہ کی بہن کی رحلت کی خبر پر بہت دکھ ہوا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ اس بار غیر ملکی کہانیاں سب کی سب اچھی اور معیاری تھیں۔ خاص کر روایت نے بہت متاثر کیا۔ روسی کہانی مقابلہ نے بھی دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ بلا عنوان، اس کا عنوان نہلے پہ دہلا رکھ لینے میں کیا قباحت تھی۔ طبع زاد کہانیوں میں سایہ ہمسایہ اول مجبوری، دوم مان لیتا ہوں۔ اشعار کی محفل میں اسلام آباد والے کرامت علی کراچی والے محمد زریان سلطان اور پشاور کے محمد رمضان اور بہاولپور کے بشیر احمد بھٹی کے اشعار بہت بہت پسند آئے، ان صاحبان کو بے شمار داد دیتا ہوں۔"

✠ **احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی** سے چلے آرہے ہیں "شمارہ مارچ تین دن لیٹ 19 فروری کو ملا۔ انشائیہ جون ایلیا "تم کملائی نہیں ہو" سارا درد کملانے کا شعر میں پرو دیا۔ بت سدا بہار لہلہانے والے پھولوں کو جب کملانے سے قبل جڑ سے اکھاڑ دیں۔ تو پھر ہائے کون دیکھے یہ بے بسی دل کی۔ دو تخلص رومی اینڈ انصاری ناکس تبصرہ کے ساتھ جلوہ افروز مبارکباد۔ صد صد جی۔ دن رات 24 گھنٹے نہیں۔ وقت شمار کر کے 6 گھنٹے روزانہ غور سے پڑھیں۔ 4 دن میں بہ آسانی شمارہ ختم ہو جائے گا۔ بھائی صفدر معاویہ، ظاہر ہے ہمارے وجود کی شناخت پاکستان سے ہے۔ سلامتی کی دعائیں لازم ہیں۔ تبصرہ ویری گڈ۔ ڈیئر قدرت اللہ نیازی۔ دیکھ لیں اب ماروی مرینہ درشا کے ساتھ میڈونا بھی مسلمان ہو کر نکاح پر تیار ہے۔ نواب صاحب چاروں کو مراد کے ساتھ نکاح کی نکیل ڈال کر آبادی میں اضافہ کریں۔ مجھے تو بزرگوں نے اپنی مرضی سے خاندان میں اتفاق رکھنے کے لیے تین نکیل ڈالی ہیں۔ شرعی حد چوتھی کی حسرت باقی ہے۔ برادر یوسف ساتول خوشاب تبصرہ گڈ بٹ مقام حیرت خوشاب اور سرگودھا کے کینو کھانے کے باوجود آپ سانولے ہیں۔ طویل وقفے کے بعد دلچسپ تبصرے کے ساتھ اللہ بیلی والی سسٹر ا لیلیٰ کراچی کو سیراب کرنے والی کلری جھیل کا پانی غلاظت ختم کرنے کے درپے نظر آئیں۔ حاضر رہا کریں۔ بہنا بشریٰ افضل بہاولپور، آپ کی محترم بہن کی رحلت کا قلبی دکھ اللہ رحمت برسائیں۔ پھر میم کے دائرے میں مراد کی چوتھی عاشق میڈونا کا دیدار کیا تو پتا چلا مراد اور عبداللہ کبڈی تبدیلی روپ سے ماروی کے پاس آ کر مراد نے آنکھ مار کر ماروی کو قلبی مسرت کے ساتھ ہاتھوں سے منہ چھپانے کے بعد مگس رین آنکھوں میں ڈالی اور مزے دار ڈراما زار و قطار رونے کا شروع کر دیا۔ نواب صاحب ہم نکاح کے چھوہاروں کے منتظر ہیں پھر ہر چیز کو کھا جانے والی بیگ صاحب کی دیمک کا دیدار کیا۔ شکیلہ اور شاہد کو سرِعام سنگساری کی سزا ملنی چاہیے۔ سیتاپوری صاحب کی درماندہ عشق بچوں نے بہت پسند کی۔ پہلے سے زیادہ دلچسپ، جاری رکھیں۔ اگلی قسط کے منتظر ہیں۔ ڈاکٹر بھٹی صاحب کی سودائے جنوں، اچھی کہانی ہے بٹ ازلی دشمنِ اسلام اسرائیل کے تذکرے سے جی متلاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سایہ ہمسایہ اچھی تحریر، نسیمہ کو اعجاز کے بارے میں افتخار کو پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ شک کا علاج تو لقمان حکیم کے پاس بھی نہ تھا بچوں کی پسند میں شادی حرج نہیں ہے۔ محفل شعر و سخن، آپ کا میری پوری چار لائن شائع کرنے پر شکریہ۔ منظر امام صاحب، کیا آپ کی دنیا کی معلوماتی تحریر ختم ہوگئی ہے جو افریقی قبائل کے ساتھ سفر در سفر چل دیے؟ ڈاکٹر احمر کو غزالہ کے بعد دوسری شادی کر لینی چاہیے تھی۔ تماچی تو دیوتا بن کر زندگی کے اصل لطف سے محروم ہوگئی۔ ہمیں تو سسپنس، سرگزشت، جاسوسی، پاکیزہ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ جو افریقی طویل سفر کے بجائے پورا کراچی بھی آج تک نہ دیکھ سکے۔ عبدالمنصور ساگری۔ تبصرہ جامع بٹ ویری گڈ۔ شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ احسان سحر، ماریہ خان، وسیم احمد خان اچھے تبصرے۔

✠ نادر سیال، میانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''پیارا محبوب سسپنس ڈائجسٹ 17 فروری کو دل پر دستک دے کر دل میں سما گیا۔ ٹائٹل گرل اس بار سوہنی کڑی پنجاب دی سر پر ہلکے نیلے رنگ کا دوپٹا اوڑھ کر اور خوب صورت اداس آنکھیں تھوڑی ترچھی نظر سے دیکھا ہمیں تو دل تڑپ کر رہ گیا۔ ہماری امیدیں ہم سب کی تیاریاں اتنا انتظار دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ ہم یہ کر دیں گے وہ کر دیں گے تاریخ بدل کے رکھ دیں گے پتا نہیں کیا کیا؟ بڑے دنوں کے بعد جب وہ دن آیا انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں ہم سب کام کاج چھوڑ کے بیٹھ گئے۔ پہلے کی طرح اس سال بھی ہم ٹاس ہار گئے اور وہ جیت گئے لیکن پھر دل ناداں کو سمجھایا کہ ابھی تو گیم باقی ہے جب گیم شروع ہوئی تو آپ کو کیا بتاؤں کبھی بدن لرز جاتا اور کبھی سنبھل جاتا۔ کبھی خون کی گردش تیز ہو جاتی اور کبھی نارمل۔ کبھی ہماری امیدیں گہرے بادلوں میں چھپ جاتیں کبھی سامنے آجاتیں، دل آہستہ آہستہ ڈوبتا گیا اور ڈوبتا گیا لیکن بڑی تیزی سے اپنے آپ کو سنبھالا کہ اے دل دھڑک دھڑک کے خاموش ہو جا۔ ہم پہلے تھوڑی انڈیا سے جیتے جو اس بار ہم جیتیں آخر وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ خیر اگلی باری یعنی اگلے میچ پہ آس لگا بیٹھے کالی آندھی کے ساتھ لیکن پہلے سے بھی بہت پر فارم بری تھی اب تو میں زندگی میں کبھی بھی میچ نہیں دیکھوں گا۔ کبھی ہماری ٹیم اتنا اچھا کھیلتی ہے کہ دل خوش ہو جاتا ہے اور کبھی اتنا برا کھیلتی ہے کہ بیچاری عوام ٹیم کا غصہ اپنے ٹی وی پر نکالتی ہے۔ اب چلتے ہیں محفلِ دوستاں کی طرف جناب عبدالجبار رومی انصاری کو کرسیٔ صدارت پر بیٹھا پایا مبارکاں جناب! محمد صفدر معاویہ یہ آپ خود ہی سوچ لو کہ اتنے جلدی ختم کیوں ہو جاتا ہے؟ محمد خواجہ جی جب دل میں ایمان ہو تو حکمران صاحبان اپنی غریب عوام اور اپنے پیارے ملک کی خاطر جان بھی دے دیتے ہیں۔ رضوان تنولی صاحب اس بار آپ نے گرل کی بہت تعریف کی۔ انیلی کراچی جی آپ کا بہت شکریہ اور آپ کو نئی زندگی مبارک ہو اپنے نئے ہمسفر کے ساتھ اچھی زندگی کا آغاز کرو۔ رمضان پاشا نے بھی اس بار زیادہ زحمت نہیں کی۔ ایم اے فاضل فریدی خان ہمت مرداں تے مدد خدا؟ وسیم احمد خان بھائی آپ کا میں دل سے شکر گزار ہوں۔ بشریٰ افضل جی اللہ پاک آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ شبانہ حسن اور مہرین ناز اس بار آپ دونوں کو سسپنس کی گاڑی کے پائیدان میں لٹکے ہوئے دیکھا۔ احمد خان توحیدی، مرزا طاہر الدین بیگ، ان سب کے تبصرے اچھے تھے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے میں نے اپنی پسندیدہ کہانی ماروی پڑھی جو محی الدین نواب صاحب کے قلم سے لکھی گئی اور ایک اچھے انداز میں لفظ ادا ہوئے ہیں قلم نے مراد تو اپنا ہم شکل ایمان علی مل گیا اور لگتا ہے اگلی قسط میں ایمان کو اپنا ڈیڈ بھی مل جائے۔ مرینہ پاگلوں کی طرح مراد کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ ایک بات کی سمجھ نہیں آئی اس پوری تحریر میں مرینہ کی یادداشت کیوں نہیں گم ہوئی۔ ایک گھنٹے بعد تو یادداشت چلی جانا چاہیے تھی ادھر مراد ایمان علی کے روپ میں کبڈی کے ساتھ پاکستان پہنچ گیا اور مراد کو اپنا دشمن دیکھنے کو بھی مل گیا۔ اگلی تحریر کا بڑی شدت سے انتظار رہے گا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی تحریر سودائے جنوں پڑھی جو ہمارے ایمان کو تازہ کرنے والی ہے تاریخ میں بھی عورتوں کی بہادری کی داستان پڑھی اور سنی اور انشاء اللہ ان مجاہدوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر سایہ ہمسایہ پڑھی جو واقعی ہمسائے کے ساتھ سایہ تھا۔ نسیم کو کیا معلوم تھا کہ ویران پڑوس ہوں تو اچھا ہے یا فیملیز ہوں تو اچھا ہوتا ہے۔ باقی کہانیاں بھی زبردست تھیں۔''

✠ درشہوار پیرزادہ، بہاولپور سے رونق افروز ہیں ''مارچ کا سسپنس ہمیں 19 فروری کو مل گیا۔ سرورق والی سوہنی کڑی اچھی لگی۔ انشائیہ اور اداریہ بہت سبق آموز ہوتا ہے کہ مسرت کے چشمے تو انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ محض خارجی ماحول مسرت و شادمانی کا موجب نہیں بن سکتا۔ جس دور میں حکمرانوں نے لوگوں کی نیندیں حرام کر دی ہوں ان کے لبوں سے ہنسی کی آخری رمق تک چھین لی ہو، وہ کیا کریں کس کو اپنا درد سنائیں؟ عبدالجبار رومی بھائی کو منصبِ صدارت مبارک ہو۔ میں سب بھائیوں اور بہنوں کی شکر گزار ہوں کہ میرے تبصرے کو اس قدر پسند کیا گیا۔ خاص طور پر محفل آپ کے خط کی انچارج کی، جنھوں نے میرا خط فرسٹ پوزیشن پہ شائع کیا۔ محمد صفدر بھائی شکریہ۔ بشریٰ افضل آپی ہم آپ کے لیے دعا گو ہیں سودائے جنوں بہت بہترین اسٹوری ہے جو کہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود اس کہانی کا حصہ ہیں۔ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ مرزا امجد بیگ کی دیمک بہت نصیحت آموز کہانی ہے۔ شکیلہ جیسی عورتیں دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی خراب کر لیتی ہیں۔ ماروی بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ اب دیکھتے ہیں محبوب چانڈیو کی موجودگی میں مراد اور ماروی کیسے ایک ہوتے ہیں۔ منظر امام صاحب کی سفر در سفر نائس اسٹوری ہے بہت زیادہ پسند آئی۔ کوئی بھی سفر بے مقصد نہیں ہوتا کسی نہ کسی کو کچھ مل ہی جاتا ہے۔ کسی کو یادیں تو کسی کو سوغاتیں۔ درماندہ عشق کا تیسرا حصہ پڑھ کر اپنی رائے دوں گی ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ویسے اسٹوری دلچسپ ہے۔ مقابلہ اور دھماکا خیز بھی زبردست اسٹوریز ہیں۔ محفل شعر و سخن میں سب کے اشعار اچھے تھے بالخصوص مہرین ناز اور اعجاز احمد راحیل کے اشعار اچھے لگے۔ مارچ کا شمارہ دل جیت گیا۔'' (بہت شکریہ)

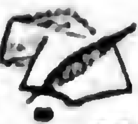
✠ مہرین ناز، اعجاز احمد راحیل، حیدر آباد سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ''مارچ 2015ء کا دیدہ زیب شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ٹائٹل ہماری بھرپور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ بہاروں کا یہ مہینا ہمیں عہدِ ماضی کی یاد دلاتا ہے جب مسلمانوں نے متحد ہو کر خوابِ اقبال کو حقیقت کا روپ دیا تھا۔ کاش ہم مسلمان پھر سے ایک ہو جائیں۔ انشائیہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے لفظوں کے اوزان ناپنے کا پیمانہ ان کی ہیئت و ساخت نہیں ہوتی بلکہ اس قلم کی طاقت ہوتی ہے جس سے رقم ہوتے ہیں جون ایلیا از گریٹ۔ اپنی محفل میں آنے سے پہلے اداریہ ہم لازمی پڑھتے ہیں کیونکہ معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ خود کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر ہمیں تھوڑا سا عجیب لگا چلو خیر ہے عبدالجبار رومی برادر کو منصبِ صدارت کی مبارک باد۔ محمد صفدر معاویہ اینڈ محمد خواجہ بھائی آپ کا حسنِ نظر ہے۔ محمد قدرت اللہ نیازی بھائی لاہور والا مکان آپ اور بھابی کے لیے خالی کر دیا ہے۔ ایم اے فاضل آفریدی اینڈ احمد خان توحیدی برادر تبصروں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ساگر کھوکر بھائی از حد نوازش۔ بشریٰ افضل سسٹر ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں اللہ آپ کی بہن کو جنت الفردوس میں جگہ اور آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری کی درماندہ عشق



کا دوسرا حصہ بصد شوق پڑھا۔ داؤد اپنے عہد کی پاسداری نہ کرسکا۔ فیروز بخت کا کردار ابھی تک تحیر و اسرار کے پردے میں چھپا ہوا ہے بہرحال موجودہ قسط بیسٹ رہی۔ کاشف زبیر صاحب کا مقابلہ زبردست اسٹوری ہے۔ انسان اگر کرنے پر آجائے تو الیکس کی طرح بہت کچھ کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی بے مثل تحریر سودائے جنوں اپنے آپ کو منوانے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ دشمنانِ اسلام مسلمانوں کے حوصلوں کو کبھی پست نہیں کرسکتے۔ ڈاکٹر کمال، عابد شیگھری، لیلیٰ، زبیدہ، قیصری محسن کے کردار بہت پرفیکٹ ہیں۔ ایسی تحاریر مدتوں یاد رہتی ہیں۔ تنویر ریاض کی رشتہ مہذب دنیا کے خودغرض رشتوں کی دلدوز کتھا بیسٹ رہی۔ مرزا امجد بیگ کی وکالت ہو اور مجرم بچ نکلے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عورت چادر اور چاردیواری میں ہی اچھی لگتی ہے مگر بعض شکیلہ جیسی عاقبت نااندیش عورتیں اس بات کو نہیں سمجھتیں تو انجام بھی برا ہی نکلتا ہے۔ ابوضیا اقبال کی دعا کا خیر مقدم کرتی انسان کو اپنی صلاحیتوں اور سوچ کا استعمال مثبت ہی رکھنا چاہیے تو اس کے لیے بہتر ہے۔ شعبدہ باز خود کو عقل مند سمجھنے والے اٹھلے کی طرح ناکام ہی رہتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی مجبوری ان والدین کا المیہ جو اپنی اولاد کی محبت میں ہر لمحہ جیتے مرتے رہتے ہیں۔ نسل تو شاید ہی اس درد کو سمجھ سکے۔ ماروی میں سمجھ نہیں آرہی کہ نواب صاحب ہمیں کس طرف لے کر جانا چاہتے ہیں بہرحال گزارے لائق ہے۔ بابر نعیم کی روایت انسان چاہتے ہوئے بھی کچھ روایات کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کیم کا فیصلہ وقت کی مناسبت سے ٹھیک لگا۔ ش م جمیل کی بلاعنوان دولت کی ہوس میں مبتلا انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ خواجہ باقی باللہ کی داستانِ حیات ایمان کو تازہ کرگئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سایہ ہمسایہ اسٹوری آف منتھ رہی۔ بے شک اچھے ہمسائے خدا کا تحفہ ہوتے ہیں۔ اعجاز اور عنبرین جیسے وبالِ جان ہوتے ہیں جو دوسروں کی زندگی میں زہر گھول دیتے ہیں۔ آخری صفحات پر منظر امام صاحب کی سفر در سفر اپنا تاثر قائم کرنے میں ناکام رہی۔ یہ درست ہے کہ زندگی اک سفر ہے اور کہیں نہ کہیں پڑاؤ بھی کرنا پڑتا ہے ہر سفر یادوں کے سمندر میں ہمیں دھکیل جاتا ہے ہم یادوں سے بھی جان نہیں چھڑا سکتے۔ آخر ہماری گزارش ہے ناصر ملک صاحب سے کوئی سلسلہ وار ناول لکھوایا جائے۔“

✠ **سیف حاجی حسین کاظمی**، پاراچنار گاؤں، نواگی سے تشریف لا رہے ہیں۔ ”مارچ کا شمارہ بہت خوب صورت سرورق اور دلچسپ کہانیوں کے ساتھ ملا۔ اداریے میں آپ کی باتیں ہمیشہ دل کو چھو لیتی ہیں۔ بچے ہماری قوم کا سرمایہ ہیں اور تعلیم اس سرمائے کا زیور اللہ تعالیٰ ان کی ہمیشہ حفاظت کرے اور ملک دشمن عناصر کی حوصلہ شکنی ہوتی رہے (آمین) سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کے قلم سے لکھی گئی داستان درماندہ عشق پڑھی۔ بہت زبردست تحریر ہے۔ سازشوں نے ہر دور میں ایک الگ ہی داستان رقم کی ہے۔ آخری صفحات پر منظر امام کی تحریر کردہ سفر در سفر تھی۔ کیا خوب لکھا منظر صاحب نے بھی۔ اگرچہ روایتی کہانیوں سے کچھ ہٹ کر تھی۔ پڑھنے کے بعد بھی کافی دیر تک سوچتا رہا۔ ویلڈن منظر امام صاحب۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید تو ہر بار ایک شاہکار اور سبق آموز کہانی لاتے ہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں آج بھی ہمارے ملک میں بعض جگہوں پر اتنا برا حال ہے۔ کاشف زبیر مقابلہ بھی کیا زبردست تحریر ہے۔ انسان اگر کوشش کرے تو حسب منشا نتائج حاصل کرسکتا ہے۔ خواجہ باقی باللہ، ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر پڑھی۔ اللہ کے نیک بندوں کے حالات سے آگاہی کا بہترین سلسلہ ہے۔ بابر نعیم کی روایت نے اچھا سبق دیا۔ ظلم کو مٹانے کا اچھا طریقہ ہے۔ کترنیں بھی مزہ دے جاتی ہیں جبکہ محفل شعر و سخن کا اپنا الگ انداز ہے۔ سودائے جنوں اور ماروی اپنی اپنی ڈگر پر چل رہی ہیں۔ ایک بہت تیز رفتار ہے اور دوسری آہستہ روی کا شکار، بہرحال دونوں ہی دلچسپ رہیں۔ اگلے شمارے کا انتظار رہتا ہے۔ بہت جلد ختم ہوجاتا ہے نا...... اللہ سسپنس کی ساری ٹیم کو خوش رکھے (آمین)“

✠ **عبدالجبار رومی انصاری**، لاہور سے محفل میں شریک ہیں۔ ”گھنٹی بجانے کو بٹن پہ انگلی رکھی تو جیسے اٹھانا ہی بھول گئے اور خوب صورت دوشیزہ بھی جیسے اپنا میک اپ ادھورا چھوڑ کر آموجود ہوئی۔ جیسے سے نین نقش کاجل زدہ آنکھیں نامعلوم سی مسکراہٹ سے لڑکی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ فہرست پر نظر ڈال کے جون ایلیا کی گہری باتوں میں کھو گئے ”تم کملائی نہیں ہو، تم بھلا کیسے مرجھا سکتی ہو۔ دل میں...... ہمارے دل میں کھلی ہوئی ہو پر کیا کریں موت سے کس کو رستگاری ہے۔ جون ایلیا کی نظم سے معمور سوگوار تحریر ایک معصوم بچی کے لیے تو نوحہ کناں تھی۔ جو ہمیں پشاور کے معصوم شہدا کی یاد دلا گئی۔ یہ تو معصوم طلبہ کی بات ہے اور پھر پاک وطن میں شکار پور، پشاور، لاہور اور اسلام آباد میں ہونے والی دہشت گردی نے کتنی ہی زندگیاں گل کردیں۔ اللہ رحم فرمائے۔ ٹھیک ہی کہا ہے کہ اگر ماضی سے جھنجوڑنے والے عہد سے سبق سیکھا ہوتا تو ہمارے ملک کا یہ حال نہ ہوتا مگر یہاں ہر دور کے ارباب اختیار ایسے کہ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ بس ایسے واقعات پر کمیشن بٹھا کے وعدے وعید کیے جاتے ہیں اور بات ختم، دوسری طرف ورلڈکپ کی تیاریاں زور و شور سے ہوگئیں بہت امیدیں لگائیں مگر کرکٹ ٹیم کی مایوس کن کارکردگی سے شروع میں ہی کرکٹ شائقین کو دھچکا لگا اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنی محفل میں اپنا خط پہلے نمبر پہ دیکھ کر ہم تو خوشی سے نہال ہوگیا۔ انتظار تھا کہ ہم بھی اسٹیج پر براجمان ہوں گے تو یہ بھی فروری کے شمارے میں عزت افزائی حاصل ہوئی۔ اس کے لیے میں ادارہ و قارئین کا دل و جان سے ممنون ہوں۔ جس طرح شمارہ جلدی ختم ہونے کا غم ہوتا ہے ویسے اس کا انتظار بھی مسرور کیے رہتا ہے پھر صفدر معاویہ بھائی غم کیسا؟ محمد خواجہ صاحب یہ امیدیں کب ختم ہوتی ہیں بس تبھی سال پہ سال آتا ہے گزر جاتا ہے اور ہم ترقی کی راہ ہی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ رضوان تنولی آپ کے سرورق کے بارے میں منفرد و نایاب الفاظ دیکھ کے دل کر رہا تھا سب جمع کرکے شاعری میں پرو دیں۔ جی قدرت اللہ نیازی اس رشتے کی بنا پر ہی ہم ایک دوجے سے جڑے ہوئے ہیں۔ یہ سسپنس کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ ہی ہے جو ہم ایک دوسرے سے واقف حال رہتے ہیں۔ ہاں جی الیکٹی راز بھی آخر کب تک راز رہے اور پھر وقت کہاں ہوتا ہے وقت تو نکالنا پڑتا ہے۔ آپ کو شادی مبارک ہو جی، احمد خان توحیدی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ماریہ خان ویلکم آپ کا دیوانہ وار مطالعہ بھی قابل رشک ہے۔ ادریس احمد، فاضل فریدی، طاہر الدین



اور وسیم احمد خان کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ سعدیہ بخاری، طاہرہ گلزار، زرمین نیازی اور انعم کمال۔ ساتھ میں ہارٹ کچر، تفسیر عباس، ہارون جبریس، زویا اعجاز کی کمی محسوس ہوئی۔ شاعری میں مہرین ناز، مدحت اور طاہر الدین بیگ کے اشعار بہت اچھے تھے۔ کہانیوں کا آغاز درماندہ عشق سے کیا۔ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ نظام کی اپنی بیویوں سے مل کر داؤد کی دولت ہتھیانے کی سازش بھی ناکام رہی تو دوسری طرف داؤد جو عورتوں سے بھاگتا تھا انہی کے چنگل میں پھنس گیا مگر اپنی نفسانی خواہشات پر کنٹرول نہ رکھ سکا اور اپنے پندار کے ساتھ نرجس اور کبنہ کو بھی لے ڈوبا اور ان سے شادی کرنا پڑی مگر نظام اور سعدیہ کی سازش سے موت سے ہمکنار ہوا، ہاں فیروز بخت کے لیے دو تہائی کی وصیت کر گیا اور نظام خالی ہاتھ ملتا رہ گیا۔ جس کو صحرا نوردی کہتے ہو وہ کسی شے کی تلاش کا بامقصد سفر ہے اور اس تلاش میں شوق کی آگ مشتعل ہے جس میں اذیتوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ ہیں اللہ کے ولیوں کی دلوں کو مسحور کرنے والی باتیں۔ جن کی گہرائی میں جائیں تو اصل زندگی کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ خواجہ باقی باللہ کے حالات زندگی بھی متاثر کن تھے۔ نماز تقاضا کرتی ہے نیک اعمال کا اور یہ کہ نمازی اپنا محاسبہ کرلے۔ ساری دنیا کی خاک چھانتے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما مراد علی خود کو پارسا رکھ کے یہی کرتا آرہا تھا۔ اسرائیل میں سرینہ سے آنکھ مچولی کھیلتے نکل گیا اور اپنے ہم شکل ایمان علی کو اس کے حسن کے قصے سنا کے پیچھے لگا دیا۔ دوسری طرف عبداللہ کبڈی کے روپ میں مراد ماروی کے سامنے تھا اور ماروی شش و پنج میں اس کے مراد ہونے کا خود کو یقین دلا رہی تھی، عجیب و غریب اور دلچسپ روداد کے ساتھ کبھی کبھی تو ذہن ہی الجھ جاتا ہے کہ محی الدین نواب کی ماروی آخر ہے کیا چیز...... اے...... اے ایک منٹ رکو تو۔ تم کہاں بھاگے جارہے ہو۔ اتنی جلدی کیا ہے تمہیں...... ہاہاہا ابوضیا اقبال کی عجیب دھماکا خیز کہانی تھی۔ جذبۂ انسیت ہی محبت کی پہلی سیڑھی ہے اور انسیت اثر پذیری کے عمل سے پھوٹتی ہے اور یہی کچھ بازغہ اور محسن بھی خود میں محسوس کررہے تھے۔ دوسری طرف کمال برقع پوش عورت کی الجھن میں پڑ گیا تھا۔ تیسرے سین میں عابد شیکھری شپ میں یہودیوں سے نبرد آزما ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے جنوں میں دشمنوں سے برسرپیکار ہے اور سودائے جنوں کی تصویر بنا ہوا ہے۔ دیکھو عبدالرب بھٹی اس جنوں کو کیسے کامیابی سے ہمکنار کرتے ہیں۔ ہم بھی ساتھ ساتھ ہیں۔ سچ اور جھوٹ اچھائی اور برائی کے ساتھ تجسس اور سسپنس سے بھرپور کہانیاں بہت کچھ سکھا جاتی ہیں جن میں برائی کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے تو وہیں اچھائی اور سچائی اپنے قدم جماتی سرخرو نظر آتی ہے۔‘‘

✠ مرزا طاہر الدین بیگ، میرپور خاص سے چلے آرہے ہیں ’’تم کملائی نہیں ہو! بہت خوب لکھا بہت خوب آپ کے خطوط میں انصاری صاحب /لیلیٰ اور ماریہ خان کے ساتھ احسان سحر خوب رہے۔ تاریخ کے جھرو کے کے ساتھ پڑھتے ہیں تو تاریخ میں گم ہوجاتے ہیں۔ درماندہ عشق سبک رفتاری سے بڑھ رہی ہے۔ اب دیکھیں کہاں دی اینڈ ہو۔ منظر امام صاحب سفر در سفر لے کر آئے اور اپنے قلم کا خوب ہی جادو جگایا بہت زبردست۔ منظر صاحب کاش منظر صاحب کسی طرح کھینچ تان کر تماچی کو بھی پاکستان لے کر آجاتے تو کام کی کہانی ہوتی ویسے کمال کی تو اب بھی ہے۔ بہت ہی منفرد اور دلچسپ سسپنس فل۔ مرزا بیگ صاحب کی ڈیرنگ بھی کیا خوب۔ کیس اور کس طرح آپ نے سلجھایا۔ پولیس والوں کی نفسیات آپ سے اچھی کون جان سکتا ہے۔ خالد، شکیلہ اور عزت...... مزہ دار کیس محترمہ شکیلہ کے ماضی کے کرتوت آپ نے تو کمال کردیا۔ ایک بیگ کی طرف سے دوسرے بیگ صاحب کو سیلیوٹ۔‘‘

✠ احسان سحر، میانوالی سے تشریف لائے ہیں ’’انسان کی زندگی میں باتیں اور کام کبھی ختم نہیں ہوتے۔ باتیں بھی ہمارے لیے ضروری ہیں اور کام بھی۔ انہی کاموں میں سے ایک کام میرا...... بلکہ سب کا سسپنس پڑھنا بھی ہے اور باتوں میں کاغذ اور قلم کے ذریعے مخاطب ہونا ہے۔ سسپنس ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ 20 فروری کو لاہور سے واپس آتے ہوئے خریدا۔ پیار کرنے اور نبھانے میں جس طرح فرق ہے...... اسی طرح دوران سفر اور کمرے میں بند ہو کر مطالعہ کرنے میں بھی کافی فرق ہے۔ بہرحال وقت گزر جاتا ہے اور ہم نے گھر آتے ہی دوبارہ سے مکمل اطمینان سے صنف نازک کو غور سے دیکھا...... اوہ مطلب ٹائٹل کو دیکھا وہ بھی اکیلے میں...... نیلے رنگ کے لباس میں ترچھی نظر سے دیکھنا، ہائے کیا نام دوں اسے......؟ ہلکی ہلکی مسکراہٹ جو صرف خاص نظر سے ہی نظر آتی تھی...... اور یہ خاص نظر خوش قسمتی سے ہمارے وجود کا حصہ ہے، آگے بڑھے۔ محفل خوش رنگ...... بلکہ رنگ برنگی محفل کی طرف رخ کرنے سے پہلے تھوڑا سا آج کے جون ایلیا سے مل لیا جائے اور پڑھیں کہ آج کا جون ایلیا کون سا ٹوپک لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ آج کے جون ایلیا کا کہنے کا مقصد راز تھا اور راز ظاہر نہیں کیے جاتے۔ ادارے والے خاص کر ہماری پیاری خاتون خطوط انچارج سمجھ گئی ہوں گی اور سمجھ گئی ہوں گی تو تھوڑا سا مسکرا بھی دو نا پلیز...... ہمیشہ خوش رہو جی۔ تو جون ایلیا صاحب کہہ رہے تھے مرجھا گئے ہمارے گلشن کے پھول...... جو آنے والی خوشبو کے امین تھے۔ ان ننھے پھولوں کے لیے دل سے دعائیں ہردم ہی نکلیں گی۔ محفل یاراں کی طرف گامزن ہوئے جہاں مختلف علاقوں کے لوگ اپنے علم اور سمجھ کے مطابق بونگیاں مارتے نظروں کے سامنے آتے اور جاتے رہے۔ کیوں نہ اب ہم بھی اس محفل کا حصہ بن جاتے اور کچھ کہنے سے پہلے جاسوسی ڈائجسٹ کے نئے سلسلے کے بارے میں جو سسپنس رکھا گیا سسپنس کی محفل میں تو ہم اپنے ننھے ذہن کو استعمال کرتے ہوئے رائٹر کا نام بتاتے ہیں وہ ہے جناب کاشف زبیر صاحب۔ آگے اللہ خیر ہی کرے۔ گڑ کھا کے۔ پہلے نمبر پر جناب عبدالجبار رومی براجمان تھے۔ مبارک ہو جناب۔ درماندہ عشق اپنے خوب صورت انداز کے ساتھ آگے ہی آگے بڑھتی جارہی ہے۔ ہم تو یہی کہیں گے بڑھتے ہی دو...... میٹھی اور اچھی چیزیں جتنی زیادہ ہوں کم ہی لگتی ہیں۔ مقابلہ، الیکس کی طویل جدوجہد کامیاب تو رہی پر ہاتھ پھر بھی کچھ نہیں آیا۔ بعض کامیابیاں ایسی ہی ہوتی ہیں جو کامیابیاں لگتی ہی نہیں یعنی خوشی میں بھی غم کا سماں ہوتا ہے۔ دل جواں ہو تو ہر چیز ہی نکھری نکھری ہی لگتی ہے۔ سودائے جنوں، کافی نکھرتی جارہی ہے۔ ہر ایک مشکل اور جان لیوا امتحانات سے گزر رہا ہے۔ کامیابی کافی دور کھڑی کسی الہڑ دوشیزہ کی طرح اٹکھیلیاں ہی کررہی ہے۔ رشتہ، کافی بور اور نا سمجھ آنے والی اسٹوری رہی۔ معاف کرنا سو بورنگ اور مرزا امجد بیگ کے زہریلے اور دلچسپی سے بھرپور جملوں نے ذہن کو کافی مسرور کیے رکھا۔ ہم بھی بیچ میں ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔ دھماکا خیز مختصر مگر حیران کن تحریر تھی۔ اختتام پر یہ پڑھ کر ہنسی باہر نکل آئی اور وہ بھی ہنسنے لگی...... اے کہاں بھاگے جارہے ہو...... اتنی جلدی کیا ہے۔ پاگل تھا کیا وہ...... بے شک بزدل تھا۔ شعبدہ بازی کی بازیاں بھی چھاتی رہیں۔ اسٹلے بے چارہ...... آخری صفحات کو بھی جلدی جلدی پڑھا کیونکہ آخری صفحات کو ہم پہلے سے ہی پڑھ لیتے



ہیں تاکہ دل نہ جلے اور...... جو بل چکا وہی بہت ہے۔ وحشیوں کے درمیان رہ کر اخلاقیات کا درس بھی ملتا رہا۔ واقعی حیران کر دینے والے واقعات احمر کو پیش آتے رہے۔ بے پروائی کی انتہا جتنی ہمارے سیاست دان کر رہے ہیں، اتنی تو جنگل میں بھی نہیں ملتی۔ مجبوری، پردیس جانے والے ماں باپ کی طرف سے اکثر غافل ہو جاتے ہیں باہر کی رنگینیوں میں رنگ کر والدین جیسے مقدس رشتے کو بھلا دینا آج کل کی بے ضمیر نسل میں کوئی بڑا کام نہیں رہا۔"

✠ **محمد زریان سلطان**، اردو بازار کراچی سے محفل کی رونق بڑھانے چلے آرہے ہیں۔ مارچ کا شمارہ اپنے تمام تر لوازمات کے ساتھ پڑھا، مزہ آیا۔ تاریخی کہانی کا تسلسل اور سودائے جنوں کا بے باک انداز دل کو بھاتا ہے۔ ماروی البتہ ذرا ہلکی چل رہی ہے۔ ہمارا خط جن جن دوستوں نے سراہا ہم ان کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔ یہی آپ کی محبت اور اس محفل کا اصل رنگ ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑا ہوا ہے۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کو ضرور لائیں یا کوئی سلسلہ شروع کروائیں۔ پلیز۔"

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے چلے آرہے ہیں "سرورق مارچ کے مہینے کی مناسبت سے گندمی حسینہ سے مزین تھا۔ پس منظر میں احسان سحر پڑوسیوں کی ڈوربیل بجا کر بھاگنے کی کوشش میں نظر آئے۔ جون ایلیا کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہیں گے کہ کسی بھی چیز کا درست استعمال ہی اسے بامعنی بناتا ہے۔ اداریہ معاشرتی شکایات کا ترجمان رہا پٹرول کی قیمتیں نصف ہونے کے باوجود کرایہ وہی ہے ٹرانسپورٹر حضرات کا کہنا بھی درست لگتا ہے کہ ہمیں تو آٹا، دال، چاول، چینی پہلی قیمتوں پر ہی مل رہا ہے تو کرایہ کیسے کم کر دیں۔ عبدالجبار رومی کرسی صدارت پر براجمان تھے مبارکاں بھئی اور گزشتہ شمارہ سال کا دوسرا شمارہ تھا پہلا نہیں۔ محمد صفدر معاویہ! سرورق حسینہ خانیوال کے 4 حسین نوجوانوں کو محفل میں دیکھ کر شاید حیران ہو رہی ہے اور تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ محمد قاسم رحمان! دل و دماغ کا جھوم جانا اچھی علامت نہیں دل تو چلو جھوم جائے دماغ کا جھوم جانا ٹھیک نہیں۔ العیلی! ٹائٹل تو ایک کھلا راز ہے اور صدارت صرف اچھے نام سے نہیں جامع تبصرے سے ملا کرتی ہے۔ رمضان پاشا! انکساری اچھی چیز ہے مگر اس قدر عاجزانہ اظہار وہ بھی خواتین کے سامنے انہیں شیر کرنے کے مترادف ہے اس لیے ہتھ ذرا ہولا رکھیں۔ مرزا طاہر الدین بیگ! لفظ کاش بنا ہی بعد کے لیے ہے تو زاہدہ کے منہ سے پہلے کیسے ادا ہوتا۔ کاش تو نتائج کے بعد ہی بولا جاتا ہے۔ ماریہ خان! تاریخی کہانی کے لیے تو صفحات مخصوص ہیں تاریخی تبصروں کے لیے نہیں۔ تمام شہدا اور آپ کے کزنز کی مغفرت کی دعا ہے۔ اسما عبدالغفار انصاری! تحریر پڑھتے ہوئے آنکھ میں آنسو آجانا تو روزمرہ کی بات ہے مزہ تب ہے کہ انسان روزمرہ معاملات میں بھی حساسیت برقرار رکھے۔ بشریٰ افضل! آپ کی ہمشیرہ کی مغفرت کے لیے دعاگو ہوں۔ احسان سحر! آپ کے تبصرے میں ایک معنف کی جھلک نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی درماندہ عشق پڑھی۔ شادی کے نام سے بھی دور بھاگنے والے داؤد کو 2 شادیاں کرنی پڑیں۔ نظام نے دولت کی ہوس میں جو کھیل کھیلا بہت گھناؤنا تھا۔ مرزا امجد بیگ کی دیمک بھی درماندہ عشق کی طرح دولت کی ہوس میں مکروہ کھیل کھیلنے والوں کا قصۂ عبرت تھا۔ نظام بھائی کی جگہ یہاں شاہد بھائی اپنے مکروہ کردار کے ساتھ موجود تھے۔ انجام کار ذلت مقدر بنی۔ سودائے جنوں پہلی قسط سے ہی تیز رفتار اور پراثر جارہی ہے۔ آزادی کے متوالے ہر دنیاوی رشتے اور مفاد کو بھول کر صرف وطن کی خاطر سر پر کفن باندھے صیہونی طاقتوں سے نبرد آزما نظر آئے۔ ان کی کامیابی کے لیے دعاگو ہیں۔ ماروی میں نواب صاحب بہتری لانے کی جو کوشش کر رہے ہیں اس میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ دو ایمان علی دشمنوں کو یقیناً چکرانے میں کامیاب رہے ہیں۔ مراد فرہاد علی تیمور بنتا جارہا ہے۔ آخری صفحات پر منظر امام کی سفر در سفر میں سوائے جنگل کے کچھ بھی فطری نظر نہ آیا۔ تماچی کی قربانی احمر کو واپس مہذب دنیا میں لے آئی۔ تماچی کا یہ جذبہ قابلِ تحسین رہا۔ ڈاکٹر شیر شاہ سید کی مجبوری نے بے پناہ متاثر کیا۔ اولاد کے لیے ہر قربانی دینے والے والدین بڑھاپے میں کیسے تنہا رہ جاتے ہیں جیسے ان کا کردار اب ختم ہو چلا ہو۔ دھماکا خیز میں میکا گونی آخر کار دھماکا خیز بنا نظر آیا۔ جب آخر میں اس نے بتایا کہ بم ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے تو مقابل کی دوڑ نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔"

✠ **سید محی الدین اشفاق**، فتح پور، لیہ سے تبصرہ کر رہے ہیں "اس بار سسپنس 22 کو ملا۔ اتنی کتر نیں ارسال کیں۔ چلو اس بار ہماری بھی سنی گئی۔ سچ کہوں تو اس بار دونوں قسط وار کہانیوں میں کوئی خاص مزہ نہیں تھا۔ ماروی عجیب ڈگر پر چل پڑی ہے۔ خواجہ باقی باللہ کا قصہ اچھا لگا۔ سفر در سفر میں منظر امام نے افریقی ماحول اور رسم و رواج سے آشنائی کروادی۔ جون ایلیا "تم کملائی نہیں ہو" اذیت کے نئے پہلوؤں سے آشنا کروا گئے۔ عبدالجبار رومی انصاری بڑے خوب صورت انداز میں تبصرے کرتے ہوئے نظر آئے۔ محمد خواجہ بھی قوم کی ترقی کے طالب نظر آئے۔ تاہم یہ سب تب ہی ممکن ہے جب ارباب اختیار کوئی توجہ کریں۔ رضوان تنولی اگر سرورق کی حسینہ سچ میں اگر کوئی زندہ لڑکی ہوتی تو آپ پر فدا ہو جاتی۔ ماریہ خان کیسے کیسے تاریخی خلوط؟ بہرحال خوش آمدید۔ احسان سحر آپ کو سسپنس ٹائم پر ہی مل جاتا ہے کیا بات ہے آپ کی۔ اچھا تبصرہ تھا۔ سفیان آفاقی کی وفات پر تہہ دل سے ان کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ انگارے کے مصنف میرے خیال میں ہمارے محبوب مصنف جناب طاہر جاوید مغل صاحب ہیں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

وسیم احمد خان، خانیوال۔ امتیاز احمد، بہاولپور۔ نور الدین، سیالکوٹ۔ شازیہ کمال، کراچی۔ مجاہد علی، حیدر آباد۔ محمد انور، میانوالی۔ خواجہ اظہار، فیصل آباد۔ نور اللہ، ٹنڈو آدم۔ منزہ حبیب احمد ملک، گلستان جوہر، کراچی۔ فاطمہ بلقیس، اسلام آباد۔ یاسمین بانو، لاہور

درماندہ عشق

الیاس سیتاپوری

تیسرا اور آخری حصہ

دنیا میں سب سے مضبوط اور مخلص رشتہ اللہ تعالیٰ نے والدین کا بنایا ہے... اس حقیقت کا ادراک ہر اس شخص کو بہ خوبی ہوگا جس کے سر پر یہ سایہ موجود نہیں، والدین... جو اپنی اولاد کو زمانے کی تپتی دھوپ اور راہ میں بچھے کانٹوں سے بچا کر اپنی شفقت کی چادر میں چھپا لیتے ہیں، بس یہی دکھ اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بنتا جارہا تھا جو حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہو کر ایسے لوگوں کے درمیان پھنس گیا تھا جنہیں اس پر ظلم ڈھاتے وقت نہ تو انسانیت کا سبق یاد رہتا ہے اور نہ ہی عذابِ الٰہی کا خوف... تاریخ گواہ ہے کہ ایسے کتنے ہی کرداروں نے اپنی تمام تر کم مائیگی کو اپنی ایسی طاقت بنا لیا جس سے نہ صرف زمینی مملکتیں بلکہ دل کی دنیا بھی تسخیر کرلی۔ وہ بھی ایک ایسی ہی داستان رقم کرنے نکلا تھا جس کا ہر لفظ ایک الگ ہی معنی میں ملبوس تھا۔ جس کے ہر موڑ پر تحیر و اسرار پوشیدہ تھے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی بھید بھری شخصیت نے ایک اور ہی روپ دھار لیا جس کے باعث تاریخ نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا کیونکہ... اس کی زندگی کے نشیب و فراز سب سے جدا تھے۔

ماضی کا آئینہ۔ با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

اب فیروز بخت خود کو آزاد اور خود مختار محسوس کرنے لگا تھا۔ احساس محرومی اور قسمت کی بے اعتمادی کے نتیجے میں جو مایوسی اور قنوطیت اس کے دل و دماغ میں سما گئی تھی، اب وہ بادل کے عارضی سائے کی طرح دور ہو رہی تھی اور اس کی جگہ اعتماد پیدا ہو رہا تھا۔ اسے داؤد کی موت کے غم سے زیادہ داؤد کے دو تہائی ورثے کی حصولیابی کی خوشی تھی۔

کیفیہ اور نرجس اس خوش فہمی میں مبتلا تھیں کہ فیروز بخت ان کے خلاف نہیں جائے گا اور اس نادان نوعمر لڑکے کو... بے وقوف بنا کر عیش و عشرت میں گزر بسر کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ کیفیہ کی لڑکی شازیہ بلوغت کی منزل میں تھی اور یہ نظام کی بیٹی تھی لیکن وہ اس کا اعلان نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ یہ اعلان کردے کہ شازیہ اس کی بیٹی ہے اور کیفیہ اس کی بیوی رہ چکی ہے تو اس پر ہر طرف سے لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہو جائے گی لیکن نظام اس داؤ کو استعمال کرنے کی تدبیریں برابر سوچ رہا تھا۔ کیفیہ نے شازیہ کو فیروز بخت سے قریب کرنا شروع کردیا کیونکہ اب وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر فیروز بخت کو اپنے قابو میں رکھنا چاہتی تھی۔

وصی احمد دور بیٹھا کیفیہ کے ارادے سے باخبر، اسے ناکام کردینے کی تدبیریں کر رہا تھا اور فیروز بخت کو سائرہ سے وابستہ کردینے کے چکر میں تھا۔ فیروز بخت چند ماہ تو ان دونوں کے ارادوں کی سنگینی اور نزاکت کا اندازہ نہیں لگا سکا لیکن پھر جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ اس کے سامنے ایک نیا محاذ کھل چکا ہے۔ فیروز بخت کے سامنے شازیہ بھی تھی اور سائرہ بھی۔ دونوں ہی خوب صورت تھیں لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکتا تھا کہ کس کو قبول کرے اور کس کو مسترد کردے۔

زمانے کے اتار چڑھاؤ اور قسمت کے نشیب و فراز نے اس



کو دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ سمجھ دار کردیا تھا۔
کیفیہ کی ناراضی کا یہ مطلب تھا کہ اس کی گھریلو زندگی اور گھر کا سکون برباد ہوجائے گا اور سائرہ کو رد کردینے کا مطلب تھا کہ وہ اپنی کاروباری دنیا میں مصیبتوں اور پریشانیوں کو دعوت دے دے۔

وہ کبھی کبھی سورت بندر بھی جاتا اور وہاں اپنے کاروبار کی نگرانی اور فروغ کے لیے عملاً حصہ لیتا۔ اس دوران اس میں خدا ترسی اور رحم دلی عروج کو پہنچ گئی تھی۔ وہ حاجت مندوں اور ناداروں کی بڑی فراخ دلانہ مدد کرتا اور آہستہ آہستہ اس کا اتنا شہرہ ہوا کہ اس کے پاس دور دور سے اہل احتیاج آنے لگے۔ وہ ہفتے میں ایک بار احمد آباد کے مضافات میں چلا جاتا اور وہاں ناداروں اور غریبوں کی خفیہ مدد کرتا رہتا۔ اس نے ان کی فہرستیں تیار کرلی تھیں اور ان کو جو بھی مدد دی جاتی براہِ راست دی جاتی تھی۔

اس طرح کئی سال بیت گئے اور کمزور فیروز بخت ایک طاقتور جوان ملک التجار کی حیثیت سے معروف ہوگیا۔ تاجر وصی احمد بھی اس کو اسی حیثیت میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ فیروز بخت کو اپنے بیٹے کی طرح نصیحتیں کرتا رہتا۔ اب ستار کو فیروز بخت کی خدمت میں ایک خاص عزت حاصل تھی۔ کاروباری حویلی کے جملہ منشی، اہلکار، گماشتے اور کارندے فیروز بخت کے تابع فرمان ہوچکے تھے۔ نظام بدستور ایک معمولی گماشتہ تھا۔ کیفیہ اور نرجس کی ہدایات کے پیش نظر فیروز بخت اس سے ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہتا مگر نظام ابھی تک جوڑ توڑ میں مشغول تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب وہ مفید مطلب کیفیہ، نرجس یا فیروز بخت پر ایک بھرپور وار کرسکے لیکن وہ موقع ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

فیروز بخت ہر سال داؤد کی یاد مناتا اور خیرات اور صدقات کے دریا بہادیتا۔ دو تین سال تک تو کیفیہ اور نرجس نے اس کو بے تحاشا خیرات اور صدقات سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ دونوں اس کو اس سے باز نہیں رکھ سکیں۔ داؤد کا ربیع الثانی کی پانچ تاریخ کو انتقال ہوا تھا اور کافی عرصے بعد اس سال پانچ ربیع الثانی مارچ کے آخری ہفتے میں پڑی تھی۔ موسم بہار میں درختوں نے پرانا لباس اتار کر نیا زیب تن کرلیا تھا۔ وہ اس یادگار تاریخ کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ اس دن اس نے شاندار اور مزے دار کھانے پکوائے۔ حویلی کے باہر شامیانوں کا جنگل کھڑا کردیا گیا اور شہر بھر کے حاجت مندوں کو مطلع کردیا گیا کہ شامیانوں کے نیچے مہمانوں کی طرح آکر بیٹھ جائیں اور کسی سے بھی کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔

عزیزوں، رشتے داروں اور دوسرے معزز مہمانوں کا حویلی کے اندر ہی انتظام کردیا گیا تھا۔ ان مہمانوں میں سعدیہ اور نظام بھی شامل تھے۔ سعدیہ نے ایک مدت بعد فیروز بخت کو دیکھا تو اس کے دلکش خدوخال اور حسین روپ کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔

پانچ ربیع الثانی کو صبح ہی سے دیگیں چڑھ گئیں اور شامیانوں کے بغلی میدان میں دیگوں کے نیچے سے دھواں اٹھنے لگا۔ دوپہر کو ناداروں اور غریبوں کو پیٹ بھر کا کھانا کھلایا گیا اور انہیں شام کے کھانے کے لیے بھی روک لیا گیا۔ غریبوں کے مزے آگئے تھے۔

ستار نے فیروز بخت کو بلا کر یہ دلچسپ منظر دکھایا کہ دیکھو بھوکے اور نادار کس طرح اضطراب، اضطرار اور بے صبرے پن میں محفلوں کا نظام درہم برہم کرکے رکھ دیتے ہیں۔ فیروز بخت، داؤد کے سوگ میں افسردہ و اداس چہرہ لیے شامیانوں کے قریب ایک موٹے رسے کے پاس کھڑے ہوکر یہ تماشا دیکھنے لگا۔

کھانے کے بعد فیروز بخت نے نقدی کی تقسیم شروع کردی۔ اس تقسیم پر جگہ جگہ جھگڑے شروع ہوگئے اور ناداروں کی حرص و ہوا میں خاصا اضافہ ہوگیا۔ اسی عالم میں ایک نوجوان خوب صورت لڑکی اس کے روبرو آکھڑی ہوئی اور بڑی لجاجت سے ہاتھ پھیلا کر سوال کیا۔ ''نوجوان تاجر! خدا تجھے دونوں جہاں میں سرخرو کرے۔ کچھ مجھ پر بھی کرم ہوجائے۔''

لڑکی کی آواز میں جو کھنک اور کشش تھی، اس نے فیروز بخت کو کہیں کا نہ رکھا۔ اس نے لڑکی کو بے اختیار دیکھا اور اس کے مسکراتے چہرے اور شوخ و شریر آنکھوں میں معلوم نہیں کیا کچھ تھا کہ فیروز بخت سب کچھ بھلا بیٹھا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ ناداروں اور غریبوں میں داؤد مرحوم کے نام پر نقد رقم تقسیم کررہا ہے۔ لڑکی نے فیروز بخت کو اپنی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے جو محسوس کیا تو شوخ لہجے میں کہا۔ ''نوجوان تاجر! تو کہاں گم ہوگیا؟ اپنا کام کر اور میرا پلّو بھردے۔''

فیروز بخت چونک کر ہوش میں آگیا۔ اپنے آس پاس موجود حاجت مندوں کی پروا کیے بغیر لڑکی سے پوچھا۔ ''لڑکی! کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تو کون ہے؟''

''کیوں نہیں۔'' لڑکی شوخی اور شرارت پر آمادہ تھی۔ ''کیا تجھ کو نظر نہیں آرہا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور اگر میں یہ فرض بھی کرلوں کہ تو اندھا ہے تب بھی تو نے میری

آواز تو ضرور سنی ہوگی اور میری آواز سے تجھے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں ایک لڑکی ہوں۔"

فیروز بخت نے کھسیا کر جواب دیا۔ "نہ تو میں اندھا ہوں اور نہ ہی بہرا۔ میں تجھے دیکھ بھی رہا ہوں اور تیری آواز بھی سن لی ہے اور میں یہ بات پورے یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تو نے میرے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے اور اسی لیے میں تجھ سے تیرا تعارف حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک بڑے میاں نے اپنے پیچھے موجود حاجت مندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "برخوردار! یہ تم خیری کر رہے ہو یا عشق و محبت۔ ہم سب کو دے دلا کر رخصت کرو۔ اس کے بعد اس چھوکری سے اطمینان کے ساتھ معاشقہ لڑاؤ۔"

فیروز بخت پانی پانی ہو گیا۔ لڑکی سے کہا۔ "لڑکی! میں تجھے یوں نہیں جانے دوں گا۔ کیا تو اجازت دے گی کہ میں ان سب کو دے دلا کر اطمینان سے تجھ سے باتیں کروں؟"

لڑکی نے کئی بار بڑی بڑی پلکیں جھپکائیں اور ہنس کر کہا۔ "تو مجھ سے کس قسم کی باتیں کرے گا؟ اور مجھے یہاں کتنی دیر رکنا ہوگا؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "بمشکل نصف ساعت۔"

فیروز بخت بڑی تیزی سے رقوم تقسیم کرتا رہا اور نصف ساعت میں اس کام سے فارغ ہو گیا۔ حاجت مندوں اور ناداروں کے چلے جانے کے بعد شامیانے اجڑ گئے۔ ہر طرف سکوت اور سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ وہ لڑکی ایک شامیانے کے نیچے دری پر بیٹھی فیروز بخت کا انتظار کر رہی تھی۔ فیروز بخت کو اپنی طرف آتے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور کہا۔ "بخدا میں تو تیرا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو چکی تھی لیکن یہ تو نے کیا کیا کہ......"

فیروز بخت نے پوچھا۔ "لڑکی، تیرا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "فرخندہ...... مگر تو نے میرا نام کیوں پوچھا؟"

فیروز بخت نے کہا۔ "فرخندہ! تو مجھ پر اعتبار کر میں کوئی غلط نوجوان نہیں ہوں۔"

"میں کیا جانوں تو صحیح نوجوان ہے یا غلط کیونکہ میں تجھ سے ذرا بھی واقف نہیں۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ تو کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو مگر تجھ میں یہ بات تو اچھی نہیں کہ تو جوان لڑکیوں کو ندیدوں کی طرح دیکھنے لگتا ہے۔"

فیروز بخت نے پھر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "مجھے حیرت ہے کہ یہ اسم بامسمیٰ تجھے کہاں سے عطا ہوا۔ بہر حال اب مجھے یہ بتا کہ کہاں سے آئی ہے اور کیا چاہتی ہے؟"

فرخندہ نے جواب دیا۔ "سادہ لوح تاجر! تو ان چکروں میں خواہ مخواہ پڑ رہا ہے۔ جس طرح تو نے دوسروں کو دے دلا کر رخصت کر دیا ہے یہی میرے ساتھ بھی کر اور مجھے اپنے گھر جانے دے۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "فرخندہ! میں نے تجھے روکا ہی کب ہے۔ میں نے ناداروں، حاجت مندوں اور بیواؤں کی ایک فہرست بنا رکھی ہے اس لیے میں ہر وقت اس فہرست میں اضافے کے لیے بے چین رہتا ہوں۔"

فرخندہ نے تیکھی نظروں سے فیروز بخت کو گھورا، بولی۔ "تو اس فہرست میں میرا نام بھی لکھ لے لیکن یہ میرا دعویٰ ہے کہ تو میرے گھر تک نہیں پہنچ سکے گا کیونکہ جن کھنڈرات میں، میں ٹھہری ہوئی ہوں وہاں تک میری یا کسی اور کی مدد کے بغیر پہنچنا مشکل ہے۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "میں تیری پناہ گاہ تک پہنچنے کے لیے ہر وقت آمادہ ہوں لیکن پہلے چند سوالوں کے جوابات تو دے دے۔"

فرخندہ نے جواب دیا۔ "پوچھ، کیا پوچھتا ہے؟"

فیروز بخت نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ تاجر وصی احمد آگیا۔ وہ دور ہی سے کہتا ہوا آیا۔ "فیروز بخت! تو یہاں ہے۔ میں تو تجھے بہت دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔ یہاں تو کیا کر رہا ہے؟"

وصی احمد نے یہاں جو منظر دیکھا تو دل پر چوٹ سی لگی۔ دونوں کی نظروں میں جو کچھ تھا، وصی احمد نے بھی پڑھ لیا۔ فرخندہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لڑکی تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟"

فیروز بخت گھبرا گیا، اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کو روپوں سے بھر دیا اور فرخندہ کو دیتے ہوئے کہا۔ "سردست یہ لے جا، میں نے تیرا نام بھی فہرست میں شامل کر لیا ہے اور آئندہ تجھے زحمت نہیں کرنا پڑے گی، میں خود ہی بھجوا دیا کروں گا۔"

فرخندہ بھی وصی احمد سے گھبرا گئی۔ روپوں کا رومال قبضے میں کیا اور رات کے اندھیرے میں کہیں غائب ہو گئی۔

فرخندہ چلی گئی لیکن فیروز بخت اور وصی احمد دونوں ہی کو الجھن میں ڈال گئی۔ فیروز بخت کو فرخندہ کے تیکھے نقوش اور دلکش خدوخال شکار کر چکے تھے۔ وصی احمد کی چالاک اور معاملہ فہم نظروں نے فیروز بخت کے ان احساسات اور جذبات کو خوب سمجھ لیا تھا جن میں وہ مبتلا ہو چکا تھا۔ اس نے

فیروز بخت اور فرخندہ دونوں ہی کی نظروں میں ایک دوسرے کے لیے جذبات محسوس کیے تھے۔ وہ بڑے تکلیف دہ تھے اور ان کی موجودگی میں اس کی لڑکی سائرہ کا مستقبل تاریک ہوا جا رہا تھا۔ اس نے بمشکل فیروز بخت سے پوچھا۔ ''فیروز بخت! یہ لڑکی کون تھی؟''

فیروز بخت نے گم صم لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا۔''

وصی احمد نے غیر مطمئن لہجے میں پوچھا۔ ''اگر تم اسے جانتے نہیں تو تم نے اس سے یہ کیوں کہا کہ آئندہ اسے زحمت نہیں کرنا پڑے گی، بلکہ تم خود ہی بھجوا دیا کرو گے؟'' پھر پوچھا۔ ''وہ کہاں رہتی ہے؟''

''میں یہ بھی نہیں جانتا۔''

وصی احمد نے ترش لہجے میں کہا۔ ''فیروز بخت! جھوٹ تم بول رہے ہو اور شرمندگی میں محسوس کر رہا ہوں۔ اگر تم یہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں رہتی ہے تو تم نے یہ وعدہ کیوں کر لیا کہ آئندہ زحمت نہیں کرنی پڑے گی تم خود بھجوا دیا کرو گے؟''

فیروز بخت نے جواب نہیں دیا بلکہ وہ دونوں ایک ایسے کمرے میں بیٹھ گئے جہاں سے ان کی آواز دوسروں تک نہ پہنچ سکے۔ کچھ دیر تک دونوں ہی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر وصی احمد نے بات چیت کی ابتدا کر دی اور فیروز بخت سے کہا۔ ''ہاں فیروز بخت! میں چاہتا ہوں آج تم سے کچھ دیر باتیں کر لوں۔ وہ باتیں اتنی اہم اور ضروری ہیں کہ اب میں اپنا وقت نہیں ضائع کرنا چاہتا۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''جو باتیں آپ کریں گے میں جانتا ہوں۔ آپ یہی کہیں گے نا کہ میں سائرہ سے جلد از جلد شادی کر لوں۔''

وصی احمد نے کہا۔ ''ہاں، میں یہی کہتا ہوں کہ اب اپنا وقت نہ برباد کر۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں اتنی جلدی شادی نہیں کروں گا۔''

وصی احمد نے کہا۔ ''جو کچھ اس وقت تم کہہ رہے ہو، اس کو میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا جب تم اس فقیرنی سے باتیں کر رہے تھے اور اگر میرا اندازہ درست ہے تو تم اس کو کافی دنوں سے جانتے ہو اور یہ تمہاری پہلی ملاقات نہیں تھی۔''

فیروز بخت نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''آپ نے جو کچھ کہا میں نے سن لیا۔''

''جھوٹ، سر تا پا جھوٹ۔'' وصی احمد اپنے غصے پر قابو نہیں رکھ سکا۔ ''فیروز بخت! میں نے تیری سرپرستی کی ہے اور تجھ پر میری مہربانی کی یہ انتہا تھی کہ میں اپنی بیٹی سائرہ کو تجھ سے وابستہ کر دینا چاہتا تھا لیکن اگر تو نے اس بھکارن کے بارے میں سب کچھ بتانے سے گریز کیا تو میں مجبوراً اپنا فیصلہ بدل دوں گا اور سائرہ کے لیے کسی اور کا انتخاب کر لوں گا۔''

فیروز بخت نے خاموشی اختیار کی اور اٹھ کر اندر چلا گیا۔ وصی احمد کو اور زیادہ غصہ آ گیا۔ وہ بھی غصے میں پاؤں پٹختا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

☆☆☆

فرخندہ کا چھوڑا ہوا تاثر وقت کے ساتھ ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ اس رات تو وہ اچھی طرح سو بھی نہ سکا۔ ساری رات ٹوٹ ٹوٹ کر نیند آتی رہی۔ صبح اٹھا تو اداس اداس تھا۔ وہ ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے کاروباری حویلی بھی نہیں گیا۔ نرجس اور کیفیہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ فیروز بخت مرحوم داؤد کے سوگ میں ملول اور افسردہ ہو گیا ہے۔ فیروز بخت نے اپنے دکھ کو ہر کسی سے چھپائے رکھا۔ بار بار اندر سے کوئی اکساتا اور مجبور کرتا کہ فرخندہ کو تلاش کر لیکن جب بھی تلاش کے ارادے سے اٹھنا چاہتا تو یہ سوچ کر رک جاتا کہ کہاں تلاش کرے، اس کا تو کوئی پتا ہی نہیں۔ پھر اچانک یاد آیا کہ اس نے اپنے مسکن کے ساتھ کھنڈرات کا ذکر کیا تھا لیکن اس مبہم پتے ونشان کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ احمد آباد کے مضافات سے اچھی طرح واقف نہیں تھا۔ وہ ان کھنڈرات کا کسی سے ذکر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس راز کے افشا سے ڈرتا تھا۔

دوسرے دن وہ پھر کاروباری حویلی نہیں گیا۔ تیسرے دن قرار جو آیا تو وہ بادل ناخواستہ اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ اپنے ابلقی گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ لوہار کو اس نے لال لال لوہے کو گھن سے ضربیں لگاتے دیکھا۔ لوہار کا لڑکا سنسی سے آگ جیسے لوہے کو دبائے ادھر ادھر حرکت دے رہا تھا اور باپ گھن چلا رہا تھا۔ لوہار کی دکان سے ذرا آگے کمہار کی دکان تھی اور کمہار اپنے چاک پر برتن بنانے میں مشغول تھا۔ فیروز بخت ان کی دل جمعی اور اطمینان پر رشک کرنے لگا اور اس نے سوچا۔ ''اے کاش یہ سکون اور یہ اطمینان مجھے بھی ملا ہوتا۔''

قریب کے بازار میں بڑی چہل پہل تھی اور لوگوں کے شور وغل اور چلنے پھرنے کی آوازوں سے پورا بازار گونج رہا تھا مگر وہ فرخندہ کے خیالوں میں ڈوبا ہوا کاروباری حویلی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

بازار کے بعد امرا کے مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور

یہاں نسبتاً سکون تھا۔ بڑی بڑی حویلیوں کے پھاٹک پر کئی کئی خدمت گار اور پہرے دار چارپائیوں پر براجمان خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ اس نے یہیں ایک عظیم الشان حویلی سے فرخندہ کو نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ حویلی سے وہ تنہا نکلی تھی۔ فیروز بخت کا دل دھک دھک کرنے لگا اور اس نے تیزی سے گھوڑا اس کی طرف بڑھا دیا۔ گھوڑا اس کے قریب جو پہنچا تو فرخندہ نے وحشی ہرنی کی طرح بچ کر ایک طرف نکل جانا چاہا لیکن فیروز بخت نے ادھر بھی پیچھا کیا اور فرخندہ کے سامنے لگام کھینچ کر گھوڑے کو روک دیا۔ فرخندہ بڑے غصے میں تھی، بولی۔ ''اے شخص! تو یہ کس قسم کی حرکت کر رہا ہے؟''

فیروز بخت بے اختیار گھوڑے سے کودا اور فرخندہ کے سامنے جا کھڑا ہوا، بولا۔ ''یہ میں ہوں فرخندہ! بخدا میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تجھے ایک بار پھر پالیا۔''

فرخندہ نے شوخی سے اس کی طرف دیکھا اور منہ بنا کر بولی۔ ''واللہ اگر اس وقت تو نہ ہوتا تو میں جو بھی ہوتا اس کی چاند ماری ضرور کر دیتی۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''فرخندہ! اس وقت میں تم سے تمہارا پتا معلوم کر کے رہوں گا۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''یہیں کھڑے کھڑے کیا باتیں کروں اور تیرے سوالات کے کیا جواب دوں؟ کہیں بیٹھ کر باتیں کر چل کے۔''

فیروز بخت نے لمحوں میں فیصلہ کر لیا۔ ''کیا تو مجھے اپنے گھر لے چلے گی؟''

فرخندہ نے بڑی بے مروتی سے جواب دیا۔ ''نہیں، میں تجھے اپنے گھر ہرگز نہ لے جاؤں گی۔''

فیروز بخت ایک پام کے سائے میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''فرخندہ! سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تجھ سے کیا کہوں؟''

فرخندہ نے شرارت سے کہا۔ ''جو کچھ کہنا ہے، اس میں شرمانا کیسا؟''

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے فرخندہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن فرخندہ نے ہاتھ کھینچ کر پیچھے کر لیا، بولی۔ ''بری بات، کوئی دیکھ لے گا۔''

فیروز بخت ڈر کر ہاتھ کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس قسم کی باتیں کرے۔

فرخندہ نے ہنس کر اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ''اس دن میں پوری رات سوئی تھوڑی، بس ٹوٹ ٹوٹ کر نیند آتی رہی، معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے؟''

فیروز بخت نے ہمت کر کے جواب دیا۔ ''فرخندہ سچ! یہی میرا بھی حال تھا اور میں آج تک یہی سوچ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟''

فرخندہ نے پوچھا۔ ''میں نے کئی بار تیری حویلی میں آنے کا ارادہ کیا لیکن میں اس شخص سے ڈر گئی جو اس دن بھی مجھے اس طرح گھور رہا تھا گویا اس کا بس چلے تو میرا کام تمام کر دے۔''

فیروز بخت نے بات بنائی۔ ''فرخندہ! وہ میرے چچا ہیں اور انہوں نے نہایت صغر سنی سے مجھے پالا ہے۔ اس لیے میں ان کا احترام کرتا ہوں اور ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''جب تو اپنے چچا سے اتنا ہی خوفزدہ رہتا ہے تو کوئی اور چیز تو تیرے بس کی ہے ہی نہیں جس کو دیکھ کر میں یہ سمجھوں کہ تو آگے بڑھنے کی روح اپنے سینے میں چھپائے رکھتا ہے۔''

فیروز بخت نے ہمت کر کے فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن وہ اداس بہت تھی۔ فیروز بخت نے پوچھا۔ ''ہاں، اب بتا تو مجھ سے کتراتی کیوں ہے؟''

فرخندہ نے کہا۔ ''دیکھ نوجوان! عقل مند وہی ہے جو ہر کام کے مآل پر نظر رکھے۔ کبھی تو نے اس پر بھی غور کیا کہ ہم دونوں کا معاشرے میں کوئی جوڑ نہیں۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''فرخندہ! تو شاید نہیں جانتی کہ میں خود بھی ایک معمولی گھرانے کا فرد ہوں۔ میرے ماں باپ بڑی کسمپرسی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے اور میں لوگوں کے رحم و کرم پر پرورش پاتا رہا۔''

فرخندہ نے اس کی روداد پر یقین نہیں کیا، سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''تو کسی بھی خاندان کا ہو، مجھے اس سے ذرا بھی دلچسپی نہیں بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گی کہ تو اپنے حالات، ماحول اور معاشرے کو سامنے رکھ کر یہ سوچ کہ تیرا مجھ سے ربط و ضبط رکھنا کہاں تک مناسب اور مفید ہے؟''

فیروز بخت نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''فرخندہ! میں واقعی ایک بدنصیب انسان ہوں۔ بظاہر تو کتنی سریع الحصول نظر آتی ہے لیکن میرے لیے تو بھی عزیز مصر سے کم نہیں۔'' اس کا دل بھر آیا اور وہ چپکے چپکے رونے لگا۔

فرخندہ اسے روتے ہوئے دیکھتی رہی پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ قہقہہ مار کر ہنس دی۔ ''کیا بچوں کی طرح رو رہا ہے۔ اس طرح تو عورتیں بھی نہیں روتیں۔''

فیروز بخت نے کوئی جواب دیے بغیر فرخندہ کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ روتا رہا۔

فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ گھوڑے نے اپنے سامنے گھاس کا ایک جنگل جو دیکھا تو

چپ چاپ اس میں گھس کر سم مارنے لگا۔ فرخندہ گھوڑے کی حرکت دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت سے لطف اندوز ہو رہی تھی جو ابھی آیا نہیں تھا۔ وہ باغ کے مالک کو فیروز بخت سے لڑتے جھگڑتے دیکھ رہی تھی۔ فیروز بخت، فرخندہ کے خیال میں گم تھا، اس فرخندہ کے خیال میں جو اس کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

فرخندہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اک ذرا ٹھہرنا، میں ابھی آئی ورنہ میرا باپ مجھے تلاش کرتا ہوا یہاں تک آجائے گا اور تجھے دیکھ کر بلاوجہ برہم ہوگا اور میں اس سے بہت ڈرتی ہوں۔''

فیروز بخت نے مجبوراً اجازت دے دی، بولا۔ ''لیکن فرخندہ واپس ضرور آنا ورنہ میں تجھے تلاش کرتا ہوا کسی بھی دن تیرے گھر پہنچ جاؤں گا۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''نوجوان تاجر! تو ایسی غلطی نہیں کرے گا۔ اس طرح میں بدنام ہو جاؤں گی اور تو میرے باپ یا بھائیوں کے ہاتھوں پٹ سکتا ہے۔''

فیروز بخت نے نخوت سے کہا۔ ''فرخندہ! میں ملک التجار ہوں، میں تیرے باپ اور بھائیوں کو مالا مال کر دوں گا۔''

فرخندہ زور سے ہنس دی۔ ''ہمیں تیری دولت نہیں چاہیے تو میرے باپ اور بھائیوں سے واقف ہی نہیں، تب ہی تو ایسی باتیں کر رہا ہے۔''

یہ کہتے کہتے فرخندہ باغ کے دروازے کی طرف چل دی، اس کی چال میں گھبراہٹ اور عجلت تھی۔ فیروز بخت نے باغ کے صدر دروازے کی طرف دیکھا تو ایک پستہ قامت گنجے کو باغ میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی نظریں فرخندہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے دور ہی سے آواز دی۔ ''فرخندہ! تو کہاں چلی گئی تھی۔ میں بڑی دیر سے تجھے تلاش کر رہا ہوں۔''

فرخندہ نے اس کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔ ''آئی بابا، آرہی ہوں۔''

فیروز بخت سمجھ گیا کہ یہ پستہ قامت گنجا فرخندہ کا باپ ہے۔ اس کی ہمت نہیں پڑی کہ اس سے ملتا۔ فرخندہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ جاتے جاتے کئی بار مڑ کر فیروز بخت کی طرف دیکھا بھی لیکن واپس نہیں آئی۔ چونکہ جانے سے پہلے فرخندہ نے واپس آنے کا وعدہ کر لیا تھا اس لیے وہ وہیں بیٹھ کر فرخندہ کا انتظار کرنے لگا۔

اتنے میں باغبان آگیا اور اس نے گھوڑے کی بے راہ روی پر فیروز بخت کو سخت شرمندہ کرنا چاہا لیکن وہ شرمندہ ہونے کو تیار ہی نہیں تھا۔ باغبان نے تجویز پیش کی۔ ''جناب والا! تیرے گھوڑے نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ یا تو میرا نقصان بھر دے یا پھر میرے ساتھ قاضی کے پاس چل اور وہ جو فیصلہ کر دے، اس پر ہم دونوں عمل کریں گے۔''

فیروز بخت نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں کہیں بھی تیرے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ شاید تو مجھ سے واقف نہیں ہے۔ میں ملک التجار داؤد مرحوم کا بیٹا فیروز بخت ہوں۔ اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ میرے گھوڑے نے تیرے باغ کو نقصان پہنچایا ہے تو میں اس کا نقصان ادا کرنے پر تیار ہوں۔''

باغبان نے حیرت سے کہا۔ ''تو، گویا ملک التجار فیروز بخت تو ہی ہے؟''

فیروز بخت نے باغبان کو پانچ اشرفیاں دیں اور درخواست کی۔ ''میں یہاں کچھ دیر اور ٹھہروں گا۔''

باغبان نے اشرفیاں تو اپنی جیب میں رکھ لیں، ہنستے ہوئے کہا۔ ''شاید تو اس لڑکی کا یہاں انتظار کرے گا جو ذرا دیر پہلے اپنے باپ کے ساتھ چلی گئی ہے۔''

فیروز بخت کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ''ہاں ہاں، خدا تیرا بھلا کرے، میں اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

باغبان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ لڑکی اب نہیں آئے گی۔''

''کیوں کیوں، وہ واپس کیوں نہیں آئے گی؟''

باغبان مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔ ''جناب! اس نے جاتے جاتے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں یہ خبر ضرور پہنچا دوں اور اس نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ تجھ سے تیرے گھوڑے کے نقصان کا ہرجانہ طلب کروں۔ تو یہ ہرجانہ فوراً ہی ادا کرے گا چنانچہ اس کی دونوں ہی باتیں پوری ہو چکی ہیں۔''

فیروز بخت کو فرخندہ پر بڑا غصہ آیا کہ اول تو وہ اس کو دھوکا دے کر چلی گئی اور دوسری شرارت یہ کی کہ باغبان کو اس کے پیچھے لگا دیا۔ وہ دل شکستہ با دل ناخواستہ اٹھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی کاروباری حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں سنگ احمر کی بنی ہوئی وہ حویلی پھر نظر آئی جہاں سے فرخندہ نکلی تھی۔ وہ دیوانہ وار اس حویلی کی طرف بڑھا اور اس کے صدر دروازے میں بیٹھے ہوئے دربانوں سے پوچھا۔ ''دوستو! کیا تم یہ بتاؤ گے کہ اس حویلی میں کون رہتا ہے؟''

دربانوں نے اسے ذرا غور سے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی، ایک نے جواب دیا۔ ''اس میں سلطنت دہلی کا نائب رہتا ہے لیکن ان دنوں اس میں نائب کا خاندان ٹھہرا ہوا ہے اور خود نائب دہلی گیا ہوا ہے۔''

فیروز بخت کو بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس کے خیال کے مطابق فرخندہ اسی نائب کی بیٹی یا بھتیجی ہوسکتی تھی۔ اس نے غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔ ''اس میں فرخندہ بھی رہتی ہے؟''

ایک دربان نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ ''فرخندہ ...... یہ نام تو آج میں پہلی بار سن رہا ہوں۔''

دوسرے دربان نے بدمزاجی سے کہا۔ ''لیکن تو ہے کون اور شرفاء کی بہو بیٹیوں کے نام کیوں لے رہا ہے؟''

تیسرے دربان نے دوسرے کے کان میں کہا۔ ''کیا تو اس نوجوان کو نہیں جانتا؟ یہ ملک التجار داؤد مرحوم کا متبنیٰ فیروز بخت ہے۔''

دونوں دربانوں کا رویہ ایک دم بدل گیا۔ وہ خوشامد پر اتر آئے۔ پہلے نے کہا۔ ''نوجوان ملک التجار! ہم شرمندہ ہیں کہ تجھے پہچان نہ سکے لیکن پھر بھی ہمارے لیے یہ اعزاز کیا کم ہے تو نے ہم سے بات تو کی۔''

دوسرے نے پوچھا۔ ''اس کا کوئی ثبوت کہ یہ نوجوان ہی ملک التجار کا بیٹا ہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''اپنا تعارف میں نے تو نہیں کروایا اور یہ کہ اس کا ثبوت میں دوں بھی کیوں؟ میں نے تم لوگوں سے ایک بات پوچھی تھی اگر اس کا جواب مل جائے تو خوب ورنہ کوئی شکایت نہیں۔''

لیکن تینوں دربانوں نے ٹال دیا۔ ایک نے بقیہ دونوں کی نمائندگی کی، بولا۔ ''مرحوم تجار کے بیٹے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ شرفاء کے مردوں کے بجائے ان کی عورتوں کے پتے معلوم کرے۔''

فیروز بخت واقعی شرمندہ ہو چکا تھا۔ کوئی اور بات کیے بغیر وہ اپنی کاروباری حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

کاروباری حویلی میں اس کے ملازمین نے بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ یہاں ستار بھی موجود تھا۔ فیروز بخت نے لوگوں کی پرسش پر اپنے دل پر بڑا بوجھ محسوس کیا اور پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ کارندے، گماشتے، ہرکارے اور منشیوں نے فیروز بخت کو سنبھالے رکھا اور خود بھی رونے لگے۔

اب فیروز بخت نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ احمرین حویلی میں فرخندہ کو کس طرح تلاش کیا جائے؟ یہ سوچ سوچ کر اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ شام سے ذرا پہلے وصی احمد آ گیا اور فیروز بخت کو بیٹھا دیکھ کر اس کے قریب گیا اور پوچھا۔ ''آج تم آ گئے؟ خوب خوب میں تو تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ تمہارا گھر پر بھی انتظار ہو رہا ہے۔ سائرہ بہت بے چین ہے اور تمہیں کئی بار پوچھ چکی ہے۔ ہم سب کو تمہاری صحت کی طرف سے بڑی فکر تھی۔''

فیروز بخت نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں اور سائرہ سے کہہ دیجیے کہ میں دو چار دن میں ضرور آؤں گا۔''

وصی احمد نے اکھڑے اکھڑے لہجے سے دل کی کدورت محسوس کر لی۔ اس لیے کچھ دیر بیٹھ کر خاموشی سے چلا گیا۔

فیروز بخت کا کاروباری حویلی میں ذرا بھی دل نہ لگا اور وہ وہاں سے اٹھ کر ایک بار پھر احمرین حویلی کے سامنے پہنچ گیا لیکن اب وہ تنہا نہیں تھا۔ ستار اس کے ساتھ تھا۔ حویلی کے سامنے تینوں دربان اس وقت بھی موجود تھے۔ انہوں نے فیروز بخت کے گھوڑے سے پہچان لیا کہ ملک التجار کا بیٹا پھر آ گیا ہے۔ ستار سوچ رہا تھا کہ فیروز بخت اس حویلی کے پاس رک کیوں گیا؟

فیروز بخت حویلی سے ذرا دور کھڑے ہو کر ستار سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ستار نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''میرے آقا! آپ یہاں رک کیوں گئے؟ کیا یہاں کسی سے ملنا ہے؟''

فیروز بخت نے گول مول جواب دے کر پھر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ فیروز بخت کو امید تھی کہ جس طرح ایک بار پہلے فرخندہ اچانک حویلی سے نکلی تھی، اسی طرح دوبارہ بھی نکل سکتی ہے۔ کچھ دیر بعد دربانوں میں سے ایک دربان فیروز بخت کے پاس آیا اور پوچھا۔ ''ملک التجار! داؤد کے بیٹے تو اس حویلی کے در پر دوبارہ آیا ہے اور اس سے پہلے تو نے کسی لڑکی کا نام بھی لیا تھا۔ کیا پوچھ سکتا ہوں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟''

فیروز بخت ابھی ناتجربہ کار تھا، گھبرا گیا، بولا۔ ''میں ایک ایسے آدمی کو تلاش کر رہا ہوں جو مجھ سے ادھار مال لے آیا ہے۔ میں اس کا نام تو بھول گیا لیکن اس لڑکی کا نام یاد رہ گیا۔ وہ بار بار اپنی لڑکی کا فرخندہ نام لیتا تھا اور کہتا تھا کہ میری حویلی کا رنگ سرخ ہے اور اسے عام طور پر لوگ احمرین حویلی کہتے ہیں۔''

دربان نے شاید اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا، بولا۔ ''بہرحال میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ یہ نائب السلطنت کی حویلی ہے۔ اس میں فرخندہ نام کی کوئی لڑکی نہیں رہتی۔ اپنے گاہک کو کہیں اور تلاش کر اور آئندہ اس طرف مت آنا۔''

فیروز بخت نے اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ ستار، فرخندہ نام کی کسی لڑکی کو اپنے حافظے میں تلاش کرنے لگا۔

کئی دن گزر گئے مگر فرخندہ کا کہیں پتا نہ چلا۔ فیروز بخت چپ چپ اور چڑچڑا رہنے لگا۔ جب گھٹن زیادہ بڑھی اور ضبط برداشت کا یارا نہ رہا تو اس نے ہمراز کی ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ یہ سعادت بھی ستار کے حصے میں آئی۔ اس نے فرخندہ کی بابت ستار کو وہ سب بتا دیا جو جانتا تھا۔ ستار دنگ رہ گیا، بولا۔ ''لیکن میرے آقا! آپ نے داؤد مرحوم سے شادی نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا پھر یہ کس چکر میں پڑ گئے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''ستار! میرے غم خوار، میرے ہمدرد، فی الحال تو میں اس سے ملنے اور اس سے ربط وضبط بڑھانے کی خواہش رکھتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی تو خیر ورنہ اس کو راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔''

ستار نے کہا۔ ''لیکن آپ ایسا نہیں کرسکیں گے کیونکہ تاجر وصی احمد اور بی بی کیفیہ اس کی سختی سے مخالفت کریں گی اور ان دونوں کی مرضی کے خلاف آپ کچھ بھی نہیں کرسکتے۔''

فیروز بخت نے غصے میں کہا۔ ''ستار! میں نے تجھ پر احسان کیے ہیں ان کا خیال کر اور مجھے فضول مشورے نہ دے۔ اگر فرخندہ کا پتا چل سکتا ہے تو چلا ورنہ خاموش رہ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔''

ستار نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میں آپ کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں اور اللہ نے چاہا تو فرخندہ کا پتا آپ کو ضرور بتاؤں گا۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''پھر جا اور احمد آباد کے باہر کوئی کھنڈرات والی حویلی ہو تو مجھے اس سے مطلع کر۔''

ستار فرخندہ کی تلاش میں اسی وقت چلا گیا۔

سہ پہر کو بے چینی اتنی زیادہ بڑھ گئی کہ وہ فرخندہ کی تلاش میں تنہا نکل کھڑا ہوا۔ وہ پورے احمد آباد میں گھومتا پھرتا رہا لیکن فرخندہ کا کہیں پتا نہ تھا۔

ان دنوں احمد آباد کے مضافات سے کپڑوں کے تھان آئے چلے جارہے تھے۔ یہ تھان مشرق وسطیٰ کے شہروں میں بھیجے جانے والے تھے۔ اس کام کی نگرانی فیروز بخت خود کررہا تھا کیونکہ وہ اپنی ساکھ کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

کپڑوں کے تھان بیل گاڑیوں پر لدے ہوئے تھے اور پندرہ بیل گاڑیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے فیروز بخت ان کے لیے جگہ بنانے لگا جو بیل گاڑی سب سے آخر میں کھڑی تھی۔ اس کا گاڑی بان ہولے ہولے قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا۔ گاڑی بان نے قریب آکر دریافت کیا۔ ''ملک التجار داؤد کا بیٹا فیروز بخت کہاں ہے؟''

فیروز بخت نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''بدقسمتی سے وہ میں ہی ہوں۔''

گاڑی بان نے خیریت پوچھی اور کہا۔ ''میری بیل گاڑی کے سائے میں ایک لڑکی آپ سے ملنے کی درخواست کررہی ہے۔''

فیروز بخت نے سوچا کہ مجھ سے کون لڑکی ملنے آسکتی ہے لیکن ساتھ ہی فرخندہ کا بھی خیال آرہا تھا۔ وہ دھڑکتے دل اور لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی بان کے ساتھ اس کی بیل گاڑی تک پہنچ گیا۔ وہاں فرخندہ بیل گاڑی کے نیچے چادر بچھائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خوشی سے پھولے نہ سمائے۔

فرخندہ نے شوخی سے کہا۔ ''کیوں جی، یہ اچھا واسطہ پڑا ہے کہ تیرے پاس میں تو آجاتی ہوں مگر تو ایک بار بھی نہیں آیا۔''

فیروز بخت بیل گاڑی کے نیچے جھک گیا۔ ''واہ ایک تو، تو اپنا پتا نہ بتائے اور اس پر میرے نہ آنے کی شکایت بھی کرے، یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

فرخندہ نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ دور کھڑا جھانک کیوں رہا ہے؟ میرے پاس آ کیوں نہیں جاتا؟''

فیروز بخت نے حیرت سے پوچھا۔ ''تیرے پاس آجاؤں؟ یعنی بیل گاڑی کے نیچے؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''ہاں ہاں، بیل گاڑی کے نیچے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟''

فیروز بخت نے کہا۔ ''یہ بھی کوئی بیٹھنے کی جگہ ہے؟''

فرخندہ نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ''کیوں؟ کیا یہ اتنی بری جگہ ہے، میں جو بیٹھی ہوں۔ اگر یہ کوئی بری جگہ ہے اور تو یہاں نہیں آسکتا تو میں فوراً ہی چلی جاؤں گی اور پھر بھی نہ آؤں گی۔''

لیکن فیروز بخت کے لیے یہ بڑی تکلف دہ شرط تھی۔ بیل گاڑیاں کاروباری حویلی کے سامنے کھڑی تھیں اور اس کا کاروباری عملہ برابر آ، جا رہا تھا۔ دو منشی ان گاڑیوں کے پاس ہی موجود تھے۔ فیروز بخت نے کہا۔ ''فرخندہ! میں نہیں جانتا کہ یہ تو مذاق میں کہہ رہی ہے یا سنجیدگی سے...... اور میں یہ بھی نہیں جانتا کہ معاشرے میں تیرا اور تیرے خاندان کا کیا مقام ہے لیکن میں خود ملک التجار داؤد کا بیٹا ہوں اور اگر میں تیرے کہنے پر بیل گاڑی کے نیچے تیرے

پاس بیٹھ جاؤں گا تو میں اپنے کاروباری عملے اور دوسرے افراد کی نظر میں ذلیل وخوار ہو جاؤں گا اس لیے اگر تو اپنی یہ شرط واپس لے لے اور بیل گاڑی کے نیچے سے نکل کر باہر آجا تو میں تیرا شکریہ ادا کروں گا۔''

فرخندہ برا مان گئی اور گاڑی کے نیچے ہی سے جواب دیا۔ ''تب پھر اے ملک التجار کے بیٹے! تو واپس جا، میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ میری طبیعت میں عاجزی ہے، استغنا ہے، عجز ہے، خاکساری ہے اور تیرے مزاج میں کبر ہے، تفاخر ہے، انانیت ہے پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ کس طرح چل سکیں گے۔ تیرا راستہ دوسرا ہے، میرا دوسرا۔''

فیروز بخت نے سوچا لڑکی نادان بھی ہے اور سرکش بھی۔ اگر ایک بار روٹھ کر چلی گئی تو پھر کبھی نہیں مانے گی چنانچہ کچھ مزید سوچے بغیر بیل گاڑی کے نیچے چلا گیا اور فرخندہ کے پاس جا بیٹھا۔ گال پر ہلکی سی چپت رسید کر دی، بولا۔ ''اب تو خوش ہوئی تو؟''

فرخندہ نے منہ بنائے رکھا۔ ''خوش کیا خاک ہوں گی۔ اگر تو ٹال اور بحث کے بغیر ہی میری بات مان لیتا تو میں بہت خوش ہوتی لیکن تو نے بدرجۂ مجبوری، خوف زدہ ہو کر میری بات مانی ہے اس لیے میں خوش نہیں ہوئی۔''

فیروز بخت نے محسوس کیا کہ گاڑی کے باہر اس کو تلاش کیا جا رہا ہے، گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فرخندہ! میں نے تیرا کہا پورا کر دیا اور تیری بات مان لی۔ اب تو بھی میری بات مان لے اور میرے ساتھ باہر نکل چل۔ دیکھ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔''

فرخندہ نے سختی سے جواب دیا۔ ''میں یہیں بیٹھوں گی تو چاہے تو باہر چلا جا۔''

فیروز بخت کا جی چاہا کہ باہر چلا جائے لیکن اس ڈر نے اسے روک دیا کہ فرخندہ ناراض ہو کر ہمیشہ کے لیے چلی جائے گی۔

اتنے میں ستار کی آواز سنائی دی۔ ''میرے آقا! آپ کہاں چلے گئے؟''

فرخندہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ سرگوشی میں بولی۔ ''بولنا مت، دیکھنا ہے وہ تجھے تلاش کر پاتا ہے یا نہیں؟''

پھر ایک منشی کی آواز سنائی دی۔ ''مالک! آپ کہاں ہیں؟ یہ تھان گودام میں رکھے جائیں گے یا سورت بندر جانے والے تھانوں میں شامل کر دیے جائیں گے؟''

فرخندہ نے پھر منع کیا۔ ''خبردار بولنا مت، جواب نہ دینا۔ دیکھنا ہے کہ یہ تجھے کہاں تلاش کرتے ہیں؟''

فیروز بخت پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، ستار تلاش کرتا ہوا ان کی بیل گاڑی کے پاس آگیا اور پھر معلوم نہیں کس کی نشان دہی پر یا خود ہی دیکھ لیا۔ بیل گاڑی کے نیچے جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرے آقا! تو آپ یہاں موجود ہیں مگر آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

فرخندہ کو بڑی ہنسی آرہی تھی، فیروز بخت نے اپنی خفت مٹانے کے لیے ستار سے کہا۔ ''تو باہر کھڑا کیا کر رہا ہے تو بھی یہیں ہمارے پاس آجا۔''

ستار نے کچھ پس وپیش کیا اور پھر خود بھی ان دونوں کے پاس چلا گیا۔ اب فیروز بخت کو ذرا سکون ملا لیکن یہ سکون زیادہ دیر کے لیے نہیں ملا تھا۔ اب فیروز بخت کو منشی تلاش کرتا پھر رہا تھا اور آخر کار وہ بھی وہیں پہنچ گیا جہاں یہ تینوں چھپے بیٹھے تھے۔

منشی نے یہ تماشا جو دیکھا تو اس کا اپنی آنکھوں کا اعتبار ہی جاتا رہا۔ وہ اس کو فریب نظر سمجھ کر خاموش ہو جانا چاہتا تھا کہ فیروز بخت نے منشی کو آواز دی۔ ''منشی! یہیں میرے پاس آجا۔''

منشی نے آنکھیں پھاڑ کر خوشامدانہ انداز میں پوچھا۔ ''یہ آپ وہاں بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''بس یونہی بیٹھ گیا۔ میں نے کہہ تو دیا کہ تو بھی آجا۔''

لیکن فیروز بخت نے منشی سے جو کچھ کہا تھا، وہ جواب میں کچھ کہے بغیر ہی حویلی میں چلا گیا اور کچھ دیر بعد پورے عملے کو بھیج دیا۔ یہ سب بیل گاڑی کے نیچے کا تماشا دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ فیروز بخت نے فرخندہ سے کہا۔ ''فرخندہ! مجھ پر رحم کر۔ اب مزید ذلت سے بچا۔''

فرخندہ نے برا مان کر کہا۔ ''تو عزت ذلت کا خیال تیرے دل میں اب بھی موجود ہے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''فرخندہ! یہ تو کیسی باتیں کر رہی ہے۔ میں اسی ماحول اور معاشرے کا ایک فرد ہوں۔ جہاں آدمی کے لیے عزت اور ذلت کے پیمانے موجود ہیں پھر میں خود کو ان سے الگ کس طرح کر سکتا ہوں۔''

فرخندہ نے اور برا مانا، بولی۔ ''تب پھر چلا جا، یہاں میرے پاس کیوں بیٹھا ہے؟''

فیروز بخت خاموش رہا۔ آخر ایک منشی نے بیٹھ کر بات چیت شروع کر دی۔ ''مالک! آپ کب تک یہاں بیٹھیں گے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں یہاں ضروری باتیں کر رہا ہوں۔ بس تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

فیروز بخت نے فرخندہ سے کہا۔ ”فرخندہ! یا تو باتیں کر یا پھر ہنسی خوشی باہر نکلنے کی اجازت دے دے۔“

فرخندہ بے اختیار ہنس دی، بولی۔ ”میں تو تیرا امتحان لے رہی تھی، تو اس میں کامیاب ہوا۔“

کامیابی کے مژدہ نے فیروز بخت کو نہال کر دیا پوچھا۔ ”تب پھر میں باہر نکل سکتا ہوں؟“

”بالکل۔“ فرخندہ نے جواب دیا۔ ”اب میں بھی باہر نکلتی ہوں اور تیری حویلی میں بیٹھ کر تجھ سے باتیں کروں گی۔“

فرخندہ، فیروز بخت اور ستار تینوں باہر نکل آئے۔

فیروز بخت ہمت سے کام لے رہا تھا مگر پھر بھی اپنے عملے سے نظریں ملاتے ہوئے شرما رہا تھا۔ وہ فرخندہ کو حویلی کے اندر لے گیا۔ ستار اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے فرخندہ کو پہلی بار دیکھا تھا اور دل ہی دل میں اس کا اعتراف کر رہا تھا کہ فیروز بخت نے فرخندہ کو خوامخواہ پسند نہیں کیا ہے۔ وہ تو اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا ستار نے سوچا تھا۔

فیروز بخت، فرخندہ کو اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ کبھی اس کمرے میں داؤد بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے ستار کو حکم دیا کہ جب تک میں فرخندہ سے باتیں کروں، کسی کو کمرے میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔

میر منشی نے آگے بڑھ کر دریافت کیا۔ ”جناب والا! بیل گاڑیوں پر رکھے ہوئے تھانوں کا کیا ہوگا؟“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”انہیں حویلی کے گودام میں رکھوا دیا جائے۔“

حکم دے کر فیروز بخت، فرخندہ کی طرف مڑا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا اور کہا۔ ”فرخندہ! میرے سر بڑی ذمے داریاں ہیں، تو نے اس کی ہلکی سی جھلک تو دیکھ ہی لی۔“

فرخندہ نے ہنس کر جواب دیا۔ ”میں تیری باتوں سے مرعوب نہیں ہو سکتی۔ تو مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟“

فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! آج میں تجھ کو اس وقت تک روکے رکھوں گا جب تک تو اپنا تفصیلی تعارف نہ کروا دے گی اور اگر اپنی مرضی سے تجھ سے ملنا چاہوں تو کہاں ملوں؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”کہیں بھی نہیں۔ میں خود جو آجاتی ہوں۔“

فیروز بخت بے بس تھا۔ فرخندہ اس کی چلنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ فرخندہ اس کی بے بسی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ چھیڑنے کی خاطر بولی۔ ”نوجوان تاجر! اب میں تجھ سے نہیں مل سکوں گی۔ ہم دونوں کی یہ آخری ملاقات ہے۔“

فیروز بخت گھبرا کر ہوش میں آگیا۔ وہ فرخندہ کی طرف کھسکا لیکن فرخندہ اس سے دور ہٹ گئی۔ فیروز بخت نے کہا۔ ”فرخندہ! کیا تو نے وہ تڑپ اور کسک نہیں محسوس کی جو تیرے لیے مجھ میں پیدا ہو چکی ہے؟“

فرخندہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”نوجوان تاجر! میں اتنی گاڑھی اور گہری باتیں نہیں سمجھتی۔ مجھ سے سیدھی سادی باتیں کر۔“

فیروز بخت نے پوچھا۔ ”اگر یہ بات ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اپنا وقت برباد کر رہا ہوں، اپنی عزت گنوا رہا ہوں اور یہ جو کچھ بھی ہے یک طرفہ ہے مگر تو کیوں مجھ سے ملنے آتی ہے؟“

فرخندہ نے جواب دیا۔ ”تیری دولت کی وجہ سے۔ تو ذرا رحم دل بھی ہے۔ میں ایک غریب گھرانے کی لڑکی تجھ سے کچھ نہ کچھ مانگنے آجاتی ہوں۔“

فیروز بخت نے غصے میں پوچھا۔ ”اور یہ جو میں تیری خاطر بے عزتی اور ذلت برداشت کر رہا ہوں، کبھی سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟“

اچانک ستار نے دروازے پر دستک دی اور فیروز بخت کو مطلع کیا۔ ”تاجر وصی احمد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”اس سے کہہ دے پھر کسی وقت آجائے۔ اس وقت میں نہیں ملوں گا۔“

ستار نے مزید کہا۔ ”بڑے آقا مرحوم کی بیوہ کیفیہ بھی تشریف فرما ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

اس خبر نے فیروز بخت کو پریشان کر دیا۔ جواب دیا۔ ”ان سے کہہ دے، میں ابھی ملاقات کرتا ہوں۔“

لیکن اس جواب سے پہلے ہی کیفیہ کمرے میں داخل ہو گئی اور آتے ہی فرخندہ کی گدی پکڑ لی۔ ”تو کون ہے اور یہاں کیا کر رہی ہے؟“

فیروز بخت کو بھی کیفیہ پر غصہ آگیا، بولا۔ ”آپ یہ کیا کر رہی ہیں، اس کی گدی تو چھوڑ دیجیے۔“

کیفیہ نے فرخندہ کو کئی جھٹکے دیے اور بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بولی۔ ”میں اس کو چھوڑوں گی، اس ذلیل چھچھل پیری کو۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں تو اسے ہلاک کر دوں گی۔ آخر یہ خود کو سمجھتی کیا ہے؟“

فرخندہ نے فیروز بخت کو اشارے سے منع کیا۔ ”تو مت بول، خاموش رہ اور تماشا دیکھ۔“

اس نے کیفیہ سے پوچھا۔ ”میری گدی شرافت سے چھوڑ دے ورنہ میں خود چھڑا لوں گی۔“

کیفیہ نے ایک جھٹکا دیا۔ ''میں تو تیرا خون پی جاؤں گی۔''
فرخندہ نے ایک سخت جھٹکا دیا تو کیفیہ لڑکھڑاتی ہوئی فیروز بخت پر جا گری۔ فرخندہ نے کہا۔ ''ہم دونوں کی طاقت میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے مجھ پر اپنی طاقت کا رعب ہرگز نہ ڈالنا۔''

کیفیہ نے دہائی دی۔ ''اس جاہل لڑکی نے مجھے ذلیل کر دیا اس سے خدا سمجھے۔''

فرخندہ نے فیروز بخت سے بگڑ کر کہا۔ ''میں نے تیری تڑپ اور کسک دیکھ لی۔ میں سمجھی تھی کہ تو میرا عاشق ہے لیکن تو، تو میرا تماشائی نکلا۔ یہ عورت تیری کون ہے؟''

فیروز بخت کو بڑا قلق ہوا کہ بات بگڑ گئی اور اس انکشاف نے تو اس کو کہیں زیادہ پریشان کر دیا کہ فرخندہ اس کی جملہ کیفیات سے اچھی طرح واقف تھی۔

فرخندہ نے درشتی سے پوچھا۔ ''یہ عورت تیری کون ہے، بتاتا کیوں نہیں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''یہ ملک التجار داؤد مرحوم کی بیوہ ہے اس طرح یہ میری ماں بھی ہے۔''

کیفیہ نے بھی یہی سوال کیا۔ ''اور فیروز بخت! میں پوچھتی ہوں کہ یہ چڑیل کون ہے؟''

فیروز بخت نے درشتی سے کہا۔ ''دیکھیے آپ ایسی زبان میں بات نہ کیجیے جس سے فرخندہ کی بے عزتی ہو کیونکہ میں اس کی عزت کرتا ہوں۔''

کیفیہ نے پوچھا۔ ''تو اس کی کیوں عزت کرتا ہے؟''

فیروز بخت کے بجائے فرخندہ نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ یہ مجھ سے محبت کرتا ہے، عشق کرتا ہے اور عشق کرنا کوئی گناہ نہیں، کوئی جرم نہیں۔''

کیفیہ اچھل پڑی، جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ فیروز بخت کو خوشی ہوئی کہ فرخندہ تو غضب کی واقف کار نکلی۔ اس نے کیفیہ کو سمجھایا۔ ''دیکھیے، آپ خاموشی اختیار کیجیے اور معاملے کو طول نہ دیجیے کیونکہ یہ ایک فطری بات ہے۔ اگر کسی کی بے عزتی کی جائے گی تو جوابی حملے سے وہ بھی بے عزتی کر سکتا ہے۔''

کیفیہ کمرے سے نکل گئی۔ اس کے نکلتے ہی تاجر وصی احمد داخل ہو گیا۔ اسے فیروز بخت نے ڈانٹ دیا۔ ''تم یہاں کیا لینے آ گئے؟ جاؤ باہر، کیا میں نے تمہیں منع نہیں کیا تھا کہ جب تک میں خود نہ بلاؤں اندر مت آنا۔''

تاجر وصی احمد نے فرخندہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ لڑکی، جس کی خاطر تو ہم سب کو ذلیل کر رہا ہے، کچھ جانتا ہے کہ یہ کون ہے؟ اگر نہیں جانتا تو مجھ سے پوچھ۔ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔''

فرخندہ نے ہنس کر وصی احمد کی طرف دیکھا۔ فیروز بخت سے بولی۔ ''یہ میرا واقف کار کہاں سے آ گیا، میں تو اسے نہیں جانتی۔''

فیروز بخت نے اصرار کیا۔ ''میں کہتا ہوں تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

تاجر وصی احمد نے جواب دیا۔ ''میں اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گا جب تک اس بازاری لڑکی کی بابت وہ سب کچھ نہیں بتاؤں گا جو میں جان چکا ہوں۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''میری بابت تو کیا بتائے گا، میں خود بتا دوں گی، کیا تو مجھے مجھ سے زیادہ جانتا ہے؟''

فیروز بخت نے تاجر وصی احمد کو تنبیہ کی۔ ''او خبیث تاجر! خبردار جو تو نے فرخندہ کو بازاری یا کچھ اور کہا۔''

وصی احمد نے کہا۔ ''میں اس کے منہ پر کہتا ہوں کہ یہ بھکارن ہے۔ اس کا خاندان دریوزہ گری کرتا ہے۔ اس کا باپ بھکاری ہے اور ان سب کی گزر بسر بھیک پر ہے۔''

فیروز بخت مشتعل ہو کر وصی احمد پر جھپٹا لیکن دونوں کے بیچ فرخندہ آ گئی۔ فیروز بخت سے کہا۔ ''خوامخواہ ہاتھا پائی سے کیا حاصل؟ تاجر وصی نے جو کچھ کہا، میں اس کو جھٹلاؤں گی نہیں، کیونکہ میں واقعی بھکارن ہوں اور میں خاندانی بھکارن ہوں۔ میرا باپ بھی بھکاری ہے اور میرے خیال میں بھکاری ہونا کوئی عیب کی بات تو نہیں۔ جس طرح تاجر ہونا کوئی عیب میں داخل نہیں۔ آخر پیشے پر کوئی اعتراض ہی کیوں کرے؟''

فرخندہ کی باتوں نے فیروز بخت کو چکر میں ڈال دیا، اس کا دل ڈوبنے لگا، آہستہ سے پوچھا۔ ''فرخندہ! تو نے جو کچھ کہا یہ سچ ہے یا مذاق میں کہہ رہی تھی؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''میں مذاق نہیں کرتی اور جھوٹ بھی نہیں بولتی۔''

تاجر وصی کو اپنی حیثیت اور فیروز بخت کی خجالت پر ہنسی آ گئی۔ باہر جاتے ہوئے بولا۔ ''فیروز بخت! اس وقت تو میں جا رہا ہوں کیونکہ میں تجھے شرمندہ نہیں دیکھ سکتا پھر کسی وقت ملوں گا۔''

فیروز بخت نے فرخندہ پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ ''تو، تو واقعی بھکارن ہے، تو جھوٹ نہیں بولتی؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں بھکارن ہوں اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتی۔''

فیروز بخت نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''افسوس فرخندہ کہ تو نے اپنی بابت پہلے کچھ بھی نہیں بتایا۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''میں مناسب موقع کی تلاش میں تھی اور پھر جیسے ہی موقع ملا، میں نے اپنی بابت صاف صاف بتا دیا۔''

فیروز بخت کا سر چکرا رہا تھا، اسے اپنے سامنے کی ہر شے گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے گرتے گرتے دیوار کا سہارا لیا اور زمین پر بیٹھ گیا، بولا۔ ''فرخندہ! مجھے اب بھی اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔''

فیروز بخت کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ زمین پر لیٹ گیا۔ اس کی نظروں تلے اندھیرا پھیل چکا تھا۔

☆☆☆

ستار اس کو بے ہوش دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ وہ طبیب کی تلاش میں نکل گیا۔ منشی، اہلکار، گماشتے، ہرکارے اور دوسرے ملازمین نے فیروز بخت کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ فرخندہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہاں سے جا چکی تھی۔ ستار طبیب کو لے کر داخل ہوا مگر اس سے پہلے ہی فیروز بخت کو ہوش آ چکا تھا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی سوال کیا۔ ''کیا وہ چلی گئی؟''

ستار نے جواب دیا۔ ''ہاں میرے آقا...... وہ چلی گئی۔''

فیروز بخت نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ شام ہوئی اور شام سے رات ہو گئی مگر فیروز بخت کاروباری حویلی میں ہی پڑا رہا۔ عملے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن ستار اس کے پاس ہی رکا رہا۔ فیروز بخت اپنے آپ اور دوسروں سے بہت شرمندہ تھا۔ ستار اس کی غم گساری کر رہا تھا۔ رات کو دریافت کیا۔ ''کیا آج آپ گھر نہیں چلیں گے؟''

فیروز بخت نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ''ستار! میں تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہا۔''

ستار نے ڈھارس بندھائی۔ ''آپ ناحق شرمندہ ہوتے ہیں۔ آپ نے فرخندہ کو لاعلمی میں چاہا تھا لیکن اب جبکہ اس کی حقیقت کھل چکی ہے تو اسے دھتکار دیں گے اور اس کی مجال نہیں جو آپ سے بات تک کر سکے۔''

فیروز بخت نے تصور میں فرخندہ کو اپنے روبرو کھڑا کیا اور اسے جھڑکنے کی کوشش کی لیکن ایک دم اس کی حالت غیر ہو گئی اور فرخندہ کے رعب حسن اور دل میں موجود فرط عشق نے اسے بے بس کر دیا۔

ستار کہہ رہا تھا۔ ''بھکارن کا حسن ہی ایسا ہے کہ آپ کیا کوئی بھی اسے دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ آپ مجبور تھے۔''

فیروز بخت نے لاشعوری میں جواب دیا۔ ''میں تھا نہیں ہوں۔''

ستار نے پھر ہمت بندھائی۔ ''میرے آقا! اک ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اب فرخندہ جیسے ہی سامنے آئے، آپ منہ پھیر کر اسے جھڑک دیجیے گا۔ یہ کام اتنی پھرتی اور جوش سے انجام دیجیے کہ کوئی دوسرا جذبہ ابھر ہی نہ سکے۔''

لیکن فیروز بخت اچھی طرح جانتا تھا یہ ساری کہنے کی باتیں ہیں ورنہ فرخندہ کے سامنے اس قسم کی اداکاری ناممکن ہے۔

وہ کئی دن تک کاروباری حویلی میں رہا۔ کیفیہ کو جب یہ خبر ملی کہ فیروز بخت بہت شرمندہ ہے تو بہت خوش ہوئی اور اس نے فیروز بخت کو کہلا بھیجا کہ صبح کا بھولا اگر شام کو آ جائے تو اس کو بھولا نہیں کہنا چاہیے۔

تاجر وصی احمد بھی فیروز بخت کی ندامت سے بہت خوش تھا۔ فیروز بخت نے تحمل سے کہا۔ کوئی فقیر ہے، کوئی راعی ہے، کوئی رعایا ہے، کوئی تاجر ہے تو کوئی بھکاری ہے بھی انسان آدم کی اولاد ہمیں کسی کو ذلیل نہیں سمجھنا چاہیے۔''

وصی احمد چونک پڑا۔ اس نے سمجھ لیا کہ فیروز بخت کے دل میں فرخندہ کے عشق کی آگ ابھی پوری طرح بجھی نہیں ہے۔ چنگاریاں اب بھی موجود ہیں چنانچہ اس نے بحث نہیں کی اور غیر متعلق باتیں کرنے لگا۔

شام کو کیفیہ اسے لینے کے لیے پہنچ گئی اور تسلی دلاسے دے کر اپنے ساتھ لے گئی۔ کیفیہ نے نرجس کو فیروز بخت کے پاس چھوڑا اور خود شازیہ کے پاس چلی گئی۔ اس نے شازیہ کو سمجھایا۔

''شازیہ! فیروز بخت تیرا ہے اور ہم سب کی یہی خواہش ہے کہ تو اس سے وابستہ ہو کر خوش وخرم زندگی گزارے لیکن مشکل یہ ہے کہ فیروز بخت پر دوسری طرف سے بھی کمندیں پڑ رہی ہیں۔ میری کوشش تو یہی ہے کہ دوسرے ناکام رہیں لیکن تنہا میری کوشش سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اب تجھے فعال ہو جانا چاہیے اور پوری ہوشیاری اور چالاکی سے یہ کوشش کر کہ فیروز بخت تیرا ہی ہو جائے۔''

شازیہ نے اپنی ماں کی باتوں کا کچھ کچھ مفہوم سمجھ لیا۔ مختصر اً جواب دیا۔ ''آپ جو کہیں، کرنے کو تیار ہوں۔''

کیفیہ نے کہا۔ ''میں آرام کرنے کے بہانے اسے پانچ سات دن کے لیے روک لوں گی۔ ان پانچ سات دنوں میں تو اس کے اتنی قریب ہو جائے گی کہ وہ تجھے اپنی

ضرورت محسوس کرنے لگے کیونکہ یہ میرا تجربہ ہے کہ مرد بھولا ہوتا ہے اور عقلمندی، احتیاط اور رکھ رکھاؤ سے اپنا سب کچھ دے کر اسے اسیر کیا جاسکتا ہے۔''

شازیہ اپنی ماں کی باتوں کا پورا مفہوم سمجھ نہ سکی، بولی۔ ''آپ مجھے بتا دیجیے کہ مجھے کیا کرنا ہے، میں اسی پر عمل کروں گی۔''

کیفیہ نے مختصراً جواب دیا۔ ''میں نے بتا تو دیا عقلمندی، احتیاط اور رکھ رکھاؤ سے اپنا سب کچھ فیروز کے حوالے کردے۔'' شازیہ اس دور رس اور معنی خیز نصیحت کو سمجھ نہ سکی۔

اسی دن رات کو شازیہ، فیروز بخت کے حوالے کردی گئی اور کیفیہ نے فیروز بخت کو کہہ دیا۔ ''میں جانتی ہوں کہ آج کل تو بہت پریشان ہے، اس حویلی اور ہم سب کا تو واحد سہارا ہے۔ نصیب دشمناں اگر تجھے کچھ ہوگیا تو ہم سب تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تجھے ملازموں اور خدمت گاروں پر نہیں چھوڑیں گے۔ ہم سب مل جل کر تیری خدمت کریں گے۔ اب تو ہفتہ عشرہ آرام کرے گا اور کاروباری حویلی نہیں جائے گا۔''

فیروز بخت نے کوئی جواب نہ دیا اور شازیہ کو اس کے پاس چھوڑ دیا گیا۔

☆☆☆

فیروز بخت کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ شازیہ اس کے پاس موجود تھی اور وہ فرخندہ کے تصور میں آنکھیں بند کرکے خاموش پڑا ہوا تھا۔ شازیہ اس کی سرد مہری اور بے التفاتی سے بیزار اور عاجز تھی۔

وہ فیروز بخت کے قریب دوسری مسہری پر اونگھ رہی تھی۔ نصف رات گزر چکی تھی۔ اس عالم میں کیفیہ جائزہ لینے پہنچ گئی۔ اس نے شازیہ کو اونگھتے جو دیکھا تو آگ بگولہ ہوگئی۔ غصے میں دھکا دے کر گرا دیا۔ بھنچی بھنچی آواز میں بولی۔ ''یہ تو نہیں تیری قسمت اونگھ رہی ہے۔ کیا میں نے تجھے یہاں اونگھنے کے لیے بھیجا ہے؟''

شازیہ کی نیند اڑ گئی اور جواب دیا۔ ''پھر میں اور کیا کروں؟ یہ شخص تو بس آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ کوئی بات نہیں کرتا۔ میں اگر اسے مخاطب بھی کرتی ہوں تو ہوں ہاں کرکے رہ جاتا ہے۔''

کیفیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔ ''اے بدقسمت لڑکی! اس پر تو ایک بھکارن کا عشق سوار ہے۔ اس عشق کو... دو چکر کرنا تیرا کام ہے۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ اسے تو بس کسی بھی طرح اپنے قابو میں کرلے۔''

شازیہ کو دوبارہ اس کمرے میں دھکیل دیا گیا۔ فیروز بخت اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور اس طرح بنا پڑا رہا گویا سویا ہوا ہے۔

کیفیہ کے واپس جاتے ہی شازیہ نے دروازے کو اندر سے بند کرلیا اور فیروز بخت کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر ساکت وصامت کھڑی فیروز بخت کو گھورتی رہی پھر آہستہ آہستہ فیروز بخت پر جھکی اور جھنجوڑنے کے انداز میں دونوں ہاتھ بڑھائے مگر تکلفاً پھر کھینچ لیے۔ فیروز بخت گوشہ چشم سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ شازیہ نے ہمت کرکے ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔ فیروز بخت نے آنکھیں کھول دیں۔ شازیہ نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ فیروز بخت نے پوچھا۔ ''شازیہ! خیریت تو ہے؟''

شازیہ نے جواب دیا۔ ''میں دیکھ رہی تھی آپ کو بخار تو نہیں۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''مجھے بخار نہیں ہے۔ میں اچھا بھلا ہوں۔ تم آرام کرو سو جاؤ، پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

شازیہ نے کہا۔ ''کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اپنی مسہری پر جا کر سو جاؤ۔''

شازیہ کو اس کی بے مہری پر غصہ آگیا اور تیزی سے اپنی مسہری پر گر کر سو جانے کی کوشش کرنے لگی۔ فیروز بخت اس کو اچھا ضرور لگتا تھا لیکن وہ گر کر، خوشامد کرکے اسے اپنی طرف راغب نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دن میں ستار بھی آگیا اور وہ فیروز بخت کی دل جوئی اور غم گساری کرنے لگا۔ اس نے فیروز کو مشورہ دیا کہ یوں گھر میں بیکار پڑے رہنے سے طبیعت اور زیادہ پریشان ہوجائے گی اس لیے سیر و تفریح کا وقت ضرور نکالنا چاہیے لیکن کیفیہ نے اسے نہیں نکلنے دیا۔

اس طرح پورا ہفتہ گزر گیا اور شازیہ صرف اتنی سی کامیابی حاصل کرسکی کہ فیروز بخت اس سے باتیں کرنے لگا۔ شازیہ اور کیفیہ کے لیے یہی بہت کچھ تھا کیونکہ اس میں کامیابی کا امکان تو پایا جاتا تھا۔ اس دوران اس نے ایک بار بھی فرخندہ کا نام نہیں لیا تھا۔ ستار محتاط تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ احتیاط اور شرم وندامت کی راکھ تلے دبی ہوئی چنگاری کو فرخندہ کا نام لے کر کرید ا جائے۔

ستار نے فیروز بخت کو مشورہ دیا کہ وہ چند ماہ کے لیے

سورت بندر چلا جائے تاکہ ماحول ہی بدل جائے اور فرخندہ کا خیال بھی دل سے نکل جائے۔ اب اس کی حالت معمول کے مطابق تھی۔ اس لیے فیروز بخت نے ستار کا مشورہ قبول کرلیا اور سفر کی تیاریاں مکمل کرلی گئیں۔ کیفیہ نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ اس سفر میں شازیہ، فیروز بخت کے ساتھ رہے گی۔ فیروز بخت کو اس فیصلے سے اختلاف تھا لیکن وہ بھی شازیہ کو قبول کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

وصی احمد کو سفر کا علم ہوا تو وہ بھی تیار ہوگیا اور اس نے اعلان کردیا کہ فیروز بخت ابھی نادان ہے اس لیے تجارت کے میدان میں اس کی راہنمائی کی بہت ضرورت ہے۔ اس نے فیروز بخت کے ساتھ جانے کا اعلان کردیا اور یہ کہ اس سفر میں اس کے ساتھ اس کی بیٹی سائرہ بھی جائے گی۔ جب یہ خبر کیفیہ کو ملی تو اس نے دانت پیس کر شازیہ سے کہا۔

''شازیہ! خبردار جو تو نے اس خبیث تاجر کی بیٹی کو فیروز بخت کے قریب آنے دیا۔'' اور پھر ستار کو خاص طور پر ہدایت کی۔ ''اور تیرا فرض ہے کہ کسی بھی طرح وصی احمد کو فیروز بخت سے دور رکھ۔ اگر تو اس میں کامیاب ہوگیا تو تجھے مالامال کردیا جائے گا۔''

دوسری طرف تاجر وصی احمد، ستار کو سمجھا رہا تھا کہ اگر اس نے وصی احمد کا ساتھ دیا تو نہ صرف یہ کہ اسے مالامال کردیا جائے گا بلکہ چھوٹی موٹی تجارت بھی کروادی جائے گی۔

تیاریاں مکمل ہوگئیں تو ستار، فیروز بخت کو رسول آباد کے مزار پر لے گیا اور فیروز بخت سے کہا۔ ''میرے آقا! میں آپ کے اندر بپا کشمکش کی آہٹیں صاف سن رہا ہوں اور اگر میں یہ کہوں کہ وہ بھکارن اس وقت بھی آپ کے دل و دماغ پر مسلط ہے تو غلط نہ ہوگا۔''

فیروز بخت نے ناگواری سے کہا۔ ''افسوس کہ ابھی تک میں نے تجھے اپنا ہمدرد و غم گسار سمجھا لیکن تو بھی دوسروں سے کچھ مختلف نہیں نکلا۔''

ستار نے اپنی عزت اور اعتماد کو خاک میں ملتے دیکھا تو چپ ہوگیا۔ فیروز بخت نے مزار شریف پر فاتحہ پڑھی اور بڑی رقت سے دعا مانگی۔

''حضرت! میں نہیں جانتا کہ اس وقت آپ کے روحانی تصرف کی وسعت اور دائرۂ اثر کی حد کہاں تک ہے۔ اگر آپ میرے لیے کچھ کرسکتے ہیں تو یہ کیجیے کہ لوگوں کے دلوں میں احترام انسانیت پیدا ہوجائے۔ معاشرتی معیار اور پیمانے وہ نہ رہیں جو اب تک رائج رہے ہیں۔ انسانوں کو طبقات میں نہ تقسیم کیا جائے۔ آپ خدا سے کہیے کہ لوگ فرخندہ کو بھکارن نہ کہیں اور اسے ذلیل نہ سمجھیں۔''

لیکن ستار یہ دعا مانگ رہا تھا۔ ''حضرت شاہ عالم! میرے آقا کو جو بچہ میں گرنے سے بچا لیجیے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر آقا تباہ و برباد ہوجائے گا اور میں کہیں کا بھی نہیں رہوں گا۔''

ادھر سے فارغ ہوکر ستار نے احمد آباد سے تین کوس دور پتوہ آباد کی راہ لی اور فیروز بخت سے کہا۔ ''میرے آقا! جب آپ نے حضرت شاہ عالم بخاری کے مزار پر حاضری دی ہے تو ان کے والد کے مزار کو کیوں نظرانداز کیا جائے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں تو تیرے ساتھ نکل کھڑا ہوا ہوں جہاں چاہے لے چل۔ میں انکار نہیں کروں گا۔''

سرسبز، لہلہاتے کھیتوں اور سایہ دار درختوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے دونوں پتوہ آباد جارہے تھے پھر یہ دونوں ایک خوشنما باغ میں داخل ہوگئے۔ باغ سے نکلے تو شاہ عالم بخاری کے والد شاہ قطب عالم بخاری کا روضہ نظر آنے لگا۔ یہ دونوں درگاہ میں داخل ہوگئے۔ روضے پر ایک لمبا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس پردے میں لکڑی، لوہا اور پتھر بھی شامل تھے۔ ستار نے اس پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے آقا! آپ تو یہاں پہلی بار تشریف لائے ہیں لیکن میں کئی بار آچکا ہوں۔ یہ پردہ جو ہمیں نظر آرہا ہے بڑا کراماتی پردہ ہے۔ اس کے لیے یہ مشہور ہے کہ جو شخص بھی اس پردے پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگتا ہے، اپنے مقصد کی حصولیابی میں ضرور کامیاب ہوجاتا ہے اس لیے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ اس پردے پر ہاتھ رکھ کر دعا مانگیے، ضرور پوری ہوگی۔''

فیروز بخت کا دل بھر آیا۔ اس نے مزار کے چاروں طرف گھوم پھر کر پہلے تو اس کی زیارت کی۔ اس کے بعد فاتحہ پڑھی اور پھر پردے پر ہاتھ رکھ کر رقت سے دعا مانگی۔ ''حضرت! جو کچھ میں آپ کے بیٹے کے مزار پر کہہ آیا ہوں، وہی کچھ آپ سے بھی کہوں گا۔ جو کچھ میں نے آپ کے بیٹے کے توسط سے مانگا تھا، وہی آپ کے توسط سے بھی چاہتا ہوں۔''

اس کا گداز دل بری طرح رو رہا تھا۔ گلا رندھ رہا تھا اور اضطراری کیفیت طاری تھی۔ اس نے پردے کو مضبوطی سے پکڑلیا اور دعا مانگی۔ ''قطب عالم! عشق الٰہی میں آپ نے بھی اپنے دل کو جلایا ہوگا اور اس عجیب و غریب لذت کا مزہ آپ نے بھی چکھا ہوگا جو عاشقوں کی قسمت رہا ہے۔ آج کل وہی لذت میں بھی محسوس کررہا ہوں۔ عشق کا وہی مزہ میں بھی چکھ رہا ہوں۔ دنیا والے مجھے درغلا رہے ہیں اور

اس سعی میں ہیں کہ میں ان جیسا کورا کاغذ بن جاؤں لیکن میں اپنے اس سرمایۂ کیف و نبساط سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ آپ خدا سے سفارش کیجیے کہ اس نے میرے دل میں عشق کا جو شعلہ موجزن کیا ہے، اس میں اور شدت پیدا ہوجائے۔ میں اس آگ میں جل جانا چاہتا ہوں کیونکہ یہ موت زندگی سے زیادہ قیمتی اور لذیذ ہے۔ فرخندہ کو بھکارن کہہ کر لوگ مجھے شرمسار کرنا چاہتے ہیں، آپ خدا سے دعا کیجیے کہ وہ میرے دل کو اتنی ہمت اور قوتِ برداشت دے کہ لوگوں کے طنز و طعن کا میرے دل پر کوئی اثر نہ ہو۔''

ستار، فیروز بخت کی آنکھوں سے جاری آنسو دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ ندامت کے آنسو ہیں اور اس کے آقا نے یقیناً فرخندہ سے نجات حاصل کرنے کی دعا مانگی ہوگی۔

جب فیروز بخت نے پردے کو چھوڑا تو ستار نے ہاتھ رکھ دیا اور دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اس کا آقا راہِ راست پر آجائے اور دونوں میں سے اس لڑکی کا ہاتھ پکڑے جس سے خود اسے فائدہ پہنچ سکے۔

ستار نے درخواست کی۔ ''میرے آقا! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے کیونکہ شام ہو چکی ہے اور ابھی ہمیں تین کوس کا فاصلہ طے کرنا ہے۔''

فیروز بخت نے یہاں کچھ ایسی طمانیت محسوس کی کہ اٹھنے کے لیے تیار ہی نہ تھا۔ اس نے ستار کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھا بھی نہیں۔ ستار کچھ دیر اپنے جواب کا منتظر رہا۔ اس کے بعد کھسیانے پن سے روضے کے در و دیوار دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی۔ ستار نے کہا۔ ''اگر ہم اس وقت چلیں گے تو کم از کم ایک ساعت تو لگ ہی جائے گی حویلی تک پہنچنے میں۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''ستار! اگر تو گھر جانے کے لیے بے چین ہے تو چلا جا، میں ابھی یہیں رکوں گا۔''

مزار کے خدمت گار نے مزار کے اوپر لٹکی ہوئی دس شاخہ شمع جلائی اور چاروں طرف دیواروں کی طاقوں میں سجے ہوئے چراغوں کو روشن کیا۔ ان سب کی روشنی میں مزار کا یہ حصہ دن کی طرح چمکنے لگا۔ خدمت گار نے واپس جاتے جاتے ان دونوں سے پوچھا۔ ''سجادہ نشین نے دریافت فرمایا ہے کہ کیا تم دونوں پردیسی ہو اور رات یہیں بسر کرو گے؟''

ستار نے جواب دیا۔ ''نہیں، ہم دونوں چلے جائیں گے۔''

لیکن فیروز بخت نے کہا۔ ''لیکن شاید میں نہ جاؤں کیونکہ میں یہاں سکون محسوس کر رہا ہوں۔''

ستار نے عرض کیا۔ ''میرے آقا! یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ تو یہیں رہیں اور میں گھر چلا جاؤں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

خدمت گار نے کہا۔ ''تب پھر میں سجادہ نشین سے کہہ کر آپ دونوں کی شب بسری کا انتظام کرتا ہوں۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''تو سجادہ نشین سے جا کر کہہ دے کہ میں یہ رات حضرت قطب عالم کے قدموں میں گزاروں گا اس لیے میری شب بسری کا کہیں اور بندوبست نہ کیا جائے۔''

خدمت گار چلا گیا اور ستار نے اپنے طور پر یہ محسوس کیا کہ فیروز بخت کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ مایوسی اور غم نے اس پر غلبہ کر رکھا ہے۔ تھوڑی دیر بعد خدمت گار واپس آگیا اور اعلان کیا۔ ''آپ دونوں رات کو یہاں نہیں رہ سکتے۔ خانقاہ میں سونے کا انتظام کر دیا جائے گا۔ ہاں اس وقت تک یہیں رہیں جب تک ارادت مند آ جا رہے ہیں اور درگاہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔''

ستار نے کہا۔ ''میرے آقا! یوں تو مجھے آپ کے پاس بلکہ ساتھ ہی رہنا چاہیے لیکن مجھے حویلی والوں کا بھی خیال ہے۔ ہم دونوں کچھ کہے سنے بغیر یہاں آگئے ہیں، اس حالت میں اگر ہم رات بھی یہیں گزاریں گے تو حویلی والوں کو بڑی تشویش ہوگی۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''تبھی تو میں تجھ سے کہتا ہوں کہ حویلی چلا جا اور ان سب کو بتا دے کہ آج رات میں واپس نہیں آؤں گا۔''

ستار کا اندازہ بتا تا تھا کہ وہ رکنا تو نہیں چاہتا لیکن جبراً روکا جائے تو رک جائے گا لیکن فیروز بخت نے اس کو نہیں روکا اور حویلی بھیج دیا۔ مزار پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ فیروز بخت ایک کونے میں لیٹ گیا۔

نصف رات سے چند ساعت پہلے درگاہ میں عورتوں، مردوں اور بچوں کا ہجوم داخل ہوا۔ وہ سب مزار کے چاروں طرف کھڑے ہوگئے اور زیر لب دعا مانگی۔ ''عزت و آبرو تیرے ہی ہاتھ میں ہے، ہمیں آزمائشوں سے بچالے۔''

اس ہجوم میں اس نے فرخندہ کو بھی دیکھا۔ وہ بھی ان سب کے ساتھ آئی تھی۔ وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر مزار کے سرہانے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر فیروز بخت لیٹا ہوا تھا۔ فیروز بخت نے اسے پہچان لیا تھا لیکن فرخندہ نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ فیروز بخت نے اپنے کان اس کی باتوں

پر لگادیے۔ وہ بڑی رقت سے قطب عالم بخاری سے کہہ رہی تھی۔ ''او قبر میں دراز ہم سب کے حال سے باخبر بزرگ! خوش قسمتی یا بد قسمتی سے ملک التجار کے دل میں جگہ بنالی ہے لیکن میرے بھکاری ہونے سے معاملہ بگڑ گیا ہے۔ آپ اس کے دل میں یہ بٹھا دیجیے کہ اپنے آبائی پیشے کے بارے میں جو میرے احساسات ہیں، وہی درست ہیں۔ میرا محبوب ان سے اتفاق کرے کیونکہ میں نہ تو اپنے محبوب کو حاصل کرنے پر قادر ہوں اور نہ اپنے آبائی پیشے کو ترک کرنے کی قدرت رکھتی ہوں۔ اب میں اس سے خود نہیں ملوں گی، اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔''

فیروز بخت نے فرخندہ کی آواز میں غم کی لرزش محسوس کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور بے ساختہ آواز دی۔ ''فرخندہ! تیری دعا قبول ہوگی۔ میں حاضر ہوں۔''

فرخندہ نے گھبرا کر پیچھے جو دیکھا تو فیروز بخت کو اپنے سامنے پا کر پھولی نہ سمائی پھر بھی اپنی اصل حالت کو چھپا گئی اور منہ پھیر کر جواب دیا۔ ''تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''تیری طرح میں بھی یہاں تیری تلاش میں آیا تھا اور بالآخر تجھے پالیا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔''

فرخندہ نے ناراضی سے جواب دیا۔ ''لیکن میں تجھ سے ذرا بھی خوش نہیں، میں تجھ سے ناراض ہوں۔ تو نے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

فیروز بخت نے کہا۔ ''عجب الٹی بات کر رہی ہے تو؟ پتہ نشان کے بغیر میں کس طرح تیرے پاس پہنچ جاتا؟''

فرخندہ نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''میں تیری چاہت اور عشق کو آزمانا چاہ رہی تھی۔ عاشق تو اپنے عشق اور طلب کے زور سے خدا تک پہنچ جاتے ہیں لیکن تو کیسا عاشق ہے کہ تو مجھے نہ تلاش کرسکا۔''

ان دونوں کو باتیں کرتے دیکھ کر فرخندہ کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں میں سے دو ان دونوں کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک تو وہی پستہ قامت گنجا تھا جس کو فرخندہ نے اپنا باپ کہا تھا۔ دوسرا بوڑھا تھا لیکن پستہ قامت یہ بھی تھا۔

پستہ قامت گنجے نے فیروز بخت کو گھور کر دیکھا اور فرخندہ سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے فرخندہ؟ تو کس سے باتیں کر رہی ہے؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''بابا، یہ وہی ملک التجار کا بیٹا ہے جس کا میں غائبانہ ذکر کر چکی ہوں۔'' اس کے بعد فیروز بخت سے کہا۔ ''اور اے نوجوان تاجر! یہ مخاطب میرا باپ ہے۔'' پھر دوسرے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور یہ میرا دادا ہے۔''

فیروز بخت کھڑا ہوگیا۔ فرخندہ کے باپ نے دل میں پیوست ہوجانے والی نظروں سے فیروز بخت کو دیکھا اور اپنی بیٹی سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہتا ہے؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''کچھ نہیں کہتا۔ میں اسے اپنے گھر لے جانا چاہتی ہوں۔''

دادا نے فوراً تائید کردی۔ ''پھر سوچ کس بات کی، لے چل گھر...... مہمان نوازی تو اسوۂ حسنہ میں سے ہے۔''

فیروز بخت ان کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ فرخندہ سے کہا۔ ''کیا تیرے گھر چلنا ضروری ہے؟''

فرخندہ نے بے غرضی سے جواب دیا۔ ''تیری مرضی، چلتا ہے تو چل ورنہ بھاری پتھر کی طرح یہیں پڑا رہ۔''

باپ نے بیٹی کو نصیحت کی۔ ''کیا میں نے تجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی کہ جس دنیا سے یہ نوجوان تعلق رکھتا ہے، وہاں طبقاتی اونچ نیچ بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں بڑا تاجر چھوٹے تاجر کو خاطر میں نہیں لاتا جبکہ ہم جس ماحول اور معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، وہاں اس قسم کی درجہ بندیاں نہیں ہیں۔''

دادا زور سے ہنسنے لگا۔ ''فرخندہ! یہ تیری پہلی غلطی نہیں ہے، تجھ سے پہلے بھی بعض دوسری لڑکیوں نے ایسی ہی غلطیاں کی تھیں اور میں جانتا ہوں کہ بعد میں ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا تھا۔ تو یہ کیا تاجر تجار کے چکر میں پڑی ہے، یہ بوئے وفا سے محروم لوگ کیا جانیں عشق کیا ہے اور محبت کسے کہتے ہیں۔''

فرخندہ نے رحم طلب نظروں سے فیروز بخت کی طرف دیکھا۔

اتنی دیر میں فرخندہ کا باپ اور دادا دونوں ہی وہاں سے چلے گئے۔ فرخندہ نے فیروز بخت سے درخواست کی۔ ''نوجوان تاجر! مجھے اپنے بزرگوں کی نظر میں خوار نہ کر اور مجھے میزبانی کا شرف بخش۔ خدا کے لیے میرے ساتھ میرے گھر کو چل، وہاں ہم سب اپنے مستقبل پر غور بھی کریں گے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''چل میں تیرے ساتھ چلوں گا اور دیکھوں گا کہ تو اپنے مستقبل پر کس طرح غور کرتی ہے۔''

اس نے فرخندہ کے ساتھ چلنے کا وعدہ تو کرلیا تھا لیکن ان کے ساتھ جانے میں عار محسوس کر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ فرخندہ کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ ابلقی گھوڑا رانوں تلے دبا تھا۔ فرخندہ اور اس کے رشتے دار ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ یہ لوگ کھیتوں کی منڈیروں کو پار کرتے ہوئے ایک ویرانے میں داخل ہو گئے۔ یہاں کھنڈرات کی افراط تھی۔ فیروز بخت کو خوف یا لالچ نام کو نہ تھا۔ وہ محض فرخندہ کی خاطر ان کے گھر چلا گیا تھا۔

فرخندہ کے گھر والوں نے فیروز بخت کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے کھانے کا انتظام کیا لیکن فیروز بخت نے کھانے سے انکار کر دیا۔ ایک نیم تباہ کمرے میں اس کی شب بسری کا انتظام کر دیا گیا۔ سونے سے ذرا پہلے فرخندہ کے باپ نے فیروز بخت کی مزاج پرسی کی اور کہا۔ ''رات کو جس چیز کی بھی ضرورت محسوس ہو، بلا تکلف کسی سے بھی طلب کی جاسکتی ہے۔'' باپ جانے لگا تو فیروز بخت کے پاس بیٹھی ہوئی اپنی بیٹی سے پوچھا۔ ''تو کیا یہیں بیٹھی رہے گی، چل میرے ساتھ چل۔''

اس نے باپ سے کہا کہ کچھ دیر بعد آجائے گی۔ وہ چلا گیا تو فرخندہ نے بات کرنے کی خاطر کہا۔ ''میں نے تو یہ سمجھ لیا تھا کہ اب تجھ سے میری ملاقات کبھی نہ ہوگی۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''ایسا کیوں سوچ لیا تھا؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''اس دن بات ہی کچھ ایسی ہوگئی تھی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ تیرے معاشرے کے لوگ انسانوں کی دل آزاریاں بہت کرتے ہیں۔''

فیروز بخت نے فرخندہ کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی اور بڑی احتیاط سے سوال کیا۔ ''فرخندہ! میں تجھ سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں تو ان کے جواب دینا گوارا بھی کرے گی یا نہیں؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''میں تیرے ہر سوال کا جواب دوں گی تو فکر نہ کر۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''فرخندہ! کیا تجھے اپنے حسن کا اندازہ ہے؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''نوجوان تاجر! کوئی کام کی بات کر۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''خدا نے تجھے دولتِ حسن سے مالا مال کیا ہے اور اس دولت کی موجودگی میں تیرا بھیک مانگنا بہت معیوب لگتا ہے۔ کیا تو اس سے تائب نہیں ہو سکتی؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''میں کتنی بار تجھے یقین دلاؤں کہ یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔ جس طرح تیرا پیشہ تجارت ہے، میں اپنے خاندانی پیشے کو کیونکر چھوڑ دوں؟''

فیروز بخت نے ذرا سختی سے کہا۔ ''میں تیری یہ دلیل نہیں مان سکتا کیونکہ بھیک مانگنا پیشہ نہیں ہو سکتا۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے اس خاندانی پیشے سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کسی اور کو اپنے خاندانی پیشے سے ہو سکتی ہے۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''جبکہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ تجھے خدا نے دولت حسن سے مالا مال کیا ہے۔ حسن کے اس شاہکار کو بھکاریوں کی بستی کے بجائے ملک التجار کی حویلی میں رہنا چاہیے۔''

فرخندہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اس قسم کی باتیں نہ کر نوجوان تاجر۔ اگر میرے کسی عزیز نے تیری یہ بات سن لی تو مصیبت آجائے گی اور تجھے اسی وقت یہاں سے چلتا کر دیا جائے گا اور میں نہیں چاہتی کہ تجھے کسی بے عزتی یا خواری سے واسطہ پڑے۔''

فیروز بخت ڈر گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسی ویسی کسی بات سے فرخندہ کے گھر والوں سے ان بن ہوگئی تو پھر وہ کبھی فرخندہ سے مل بھی نہ سکے گا۔ وہ خاموش ہو گیا۔

نصف شب کے بعد مشرقی افق سے چاند نے اپنا چہرہ نکالا، سونے کی پیلی پیلی ٹکیا آسمان میں چمکی ہوئی تھی۔ فیروز بخت کی نظریں چاند پر ٹنگ کر رہ گئیں۔ فرخندہ اس کی محویت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ پھر کہا۔ ''بخت! مجھے تو، تو انتہائی بدذوق معلوم ہوتا ہے۔''

فیروز بخت نے گھبرا کر پوچھا۔ ''وہ کس طرح؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''وہ اس طرح کہ ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے تو نے میرے حسن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے تھے اور میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ میں بھی کچھ ہوں لیکن اب میں نے تجھے چاند کی طرف ٹکٹکی لگائے جو دیکھا تو بہت افسوس ہوا کیونکہ تو نے میرے حسن کو نظر انداز کر دیا اور چاند کی کہن سالہ بڑھیا میں دلچسپی لینے لگا۔''

فیروز بخت شرما گیا۔ ''یہ بات نہیں ہے فرخندہ۔ میں تو چاند میں شعراء کے اس روایتی حسن کو تلاش کر رہا تھا جس کے ذکر سے مشرقی شاعری بھری پڑی ہے لیکن مجھے چاند میں یہ حسن نہیں نظر آیا۔ اگر میں شاعر ہوتا تو صرف تیرے حسن کی تعریفیں کرتا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آج کی رات میں بستر کے بجائے تیرے ساتھ سیر و تفریح میں گزار دوں؟''

فرخندہ نے کہا۔ ''افسوس کہ میں اپنے باپ کی

اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہیں نکال سکتی۔"

فیروز بخت نے پوچھا۔" کیا اجازت مل سکتی ہے؟"

فرخندہ نے کہا۔"میں کہہ کر دیکھتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر فرخندہ اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ فیروز بخت ڈرا کہ شاید بات بگڑ گئی اور فرخندہ کا باپ ڈانٹنے پھٹکارنے آ گیا ہے۔ احتیاطاً بولا۔"مجھے تو اس بستر پر ہی بڑا مزہ آ رہا ہے، یہاں سے کہیں اور جانے کی خواہش ہی نہیں۔"

فرخندہ نے تعجب سے کہا۔"یہ کیسی باتیں کر رہا ہے تو۔ میرا باپ سو رہا تھا، میں اسے جگا کر تیرے پاس لائی ہوں اور اب تو ایسی باتیں کر رہا ہے، آخر یہ کیوں؟"

فرخندہ کے باپ نے نرمی سے کہا۔"اگر تم دونوں چاندنی رات میں گھوم پھر کر لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر تو نے فرخندہ کی بابت کوئی اور فیصلہ کر لیا ہے یعنی کوئی ایسا فیصلہ جس سے تم دونوں مل جل کر زندگی بسر کرو، تو تم دونوں کے ساتھ گھومنے پھرنے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں...... اور اگر تو فرخندہ کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے اور یہ سب وقتی اور ہنگامی ہے تو بھی میں تم دونوں کو آج کی رات گھومنے پھرنے کی اجازت دے دوں گا مگر اس کے ساتھ ہی میری یہ شرط ہو گی کہ تو آئندہ فرخندہ سے نہیں ملے گا۔ آج کی رات گھومنے پھرنے کی اجازت اس لیے دے رہا ہوں کہ مہمان نوازی کا تقاضا بھی یہی ہے۔"

فرخندہ کے باپ کی باتوں نے فیروز بخت کا حوصلہ بڑھا دیا۔ بڑے جوش سے جواب دیا۔"محترم بزرگ! فرخندہ کے معاملے میں اگر میں سنجیدہ نہ ہوتا تو آج کی رات اس بستی میں نہ ہوتا۔ میں ملک التجار ہوں اور ملک التجار کا اس بستی میں شب بسر کرنا ایک انتہائی غیر معمولی واقعہ ہے۔ آپ کو اس کا صحیح اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔"

فرخندہ کے باپ نے چیں بہ جبیں ہو کر جواب دیا۔"تیرا ملک التجار ہونا میری نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتا۔"

فرخندہ نے آہستہ سے فیروز بخت کا پاؤں دبایا، بولی۔"ہم کن باتوں میں الجھ گئے۔" پھر باپ سے پوچھا۔"تو بابا، آپ نے مجھے اجازت دے دی گویا؟"

باپ نے سرد مہری سے جواب دیا۔"ہاں دے دی اجازت لیکن ایک بات تو خود بھی اس نوجوان تاجر کے ذہن نشین کرا دے کہ رات کے سناٹے یا تنہائی میں یہ حد سے تجاوز نہیں کرے گا اگر ایسا ہوا تو میں تم دونوں کو معاف نہیں کروں گا۔"

فرخندہ نے آہستہ سے جواب دیا۔"میں اس کا خیال رکھوں گی۔"

فیروز بخت نے فرخندہ کے باپ کو شکرگزار نظروں سے دیکھا اور پھر فرخندہ کے ساتھ لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی طرف نکل گیا جو شاہ قطب عالم بخاری کے مزار تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس رات فرخندہ اور فیروز بخت عشق کی سرشاریوں میں ڈوبے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کبھی پگڈنڈیوں پر چلتے اور کبھی ان راہوں پر بھاگنے اور دوڑنے لگتے جو ایک طرف تو احمد آباد تک لے جاتی تھیں اور دوسری طرف مالوے کو چلی گئی تھیں بھاگنے دوڑنے کے بعد وہ ایک پیپل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ فرخندہ نے کہا۔"اگر تجھے یہ یقین دلایا جائے کہ اس پیپل پر ایک خطرناک راکشش رہتا ہے تو تیرا خوف سے برا حال ہو جائے گا۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔"میں راکشش سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر راکشش تجھے نظر بھر کے دیکھ لے تو اپنے ہوش و حواس میں نہ رہے اور ساری شرارتیں بھول جائے۔"

فرخندہ نے شوخی سے کہا۔"تو میرے حسن کی تعریف کا کوئی موقع بھی ضائع نہیں جانے دیتا۔"

فیروز بخت نے اس کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔"غالباً اس حد تک تو مجھے اجازت ہو گی ہی اور تیرے باپ سے عہد شکنی کا مرتکب نہیں ٹھہروں گا۔"

فیروز بخت نے آنکھیں بند کر لیں۔ فرحت، تازگی، سرشاری اور کیف و سرور، انبساط غرض وہ کون سی لذت تھی جو فرخندہ کے شانے کے لمس سے اسے نہیں مل رہی تھی۔ فرخندہ خود بھی بہت خوش تھی اور چاہتی تھی کہ یہ لمحات ابدی اور دائمی ہو جائیں۔ دونوں پیپل کے تنے سے لگے ایک دوسرے کا سہارا لیے نیند کی آغوش میں پہنچ گئے۔ صبح اس وقت دونوں کی آنکھ کھلی جب برہم دیو کے ایک پجاری نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھتے رہنے کے بعد بیدار کیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ فیروز بخت نے پوچھا۔"اب کیا ہو گا؟"

فرخندہ نے جواب دیا۔"ہو گا کیا، کچھ بھی نہیں۔"

فیروز بخت نے کہا۔"تو اپنے باپ کو کیا جواب دے گی؟"

فرخندہ نے جواب دیا۔"ہم دونوں نے کوئی بدعہدی تو کی نہیں پھر خوف کس بات کا؟"

فیروز بخت نے کہا۔ "جب پھر تو جانے اگر مجھ سے پوچھ گچھ ہوئی تو میں ساری ذمے داری تجھ پر ڈال دوں گا۔"

فرخندہ نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے۔"

یہ دونوں باتیں کرتے ہوئے چلے جارہے تھے کہ سامنے سے فرخندہ کا بابا اپنے باپ کے ساتھ آتا دکھائی دیا۔ ان دونوں نے انہیں دور سے دیکھ لیا تھا وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ان کے پاس آگئے اور فرخندہ کے باپ نے دونوں ہی سے سوال کیا۔ "یہ ساری رات کہاں غائب رہے تم دونوں؟"

فرخندہ نے جواب دیا۔ "بابا گھوم پھر کر میں بہت تھک گئی تھی اس لیے ایک پیپل کی جڑ میں تنے سے ٹیک لگا کر ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے سہارے ایک تہائی رات سوتے رہے۔"

فرخندہ کے باپ اور دادا نے ان دونوں کو غور سے دیکھ کران کے جھوٹ سچ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

یہ چاروں اپنے مسکن میں واپس پہنچے۔ یہاں پہنچ کر فیروز بخت کو یاد آیا کہ شاہ قطب عالم کے مزار پر اسے تلاش کیا جارہا ہوگا۔ اس نے فرخندہ کے باپ سے واپس جانے کی اجازت طلب کی۔

فرخندہ کے باپ نے کہا۔ "نوجوان! تجھے جانے کی جلدی کیوں ہے؟ تھوڑی دیر رک جا۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "میں ذرا دیر کیا سارا دن رک سکتا ہوں لیکن شاہ قطب عالم کے مزار پر مجھے تلاش کیا جارہا ہوگا اور جب میں وہاں نہیں ملوں گا تو وہ سب بہت پریشان ہوں گے۔"

فرخندہ نے آہستہ سے فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ لیا اور دھیمی آواز میں پوچھا۔ "دوبارہ تو آؤ گے؟"

"ضرور آؤں گا، اب میں کہاں جاؤں گا؟"

فرخندہ کے دادا نے فیروز بخت سے کہا۔ "آنا اور ضرور آنا مگر اب یہ سوچ کر آنا کہ فرخندہ کو حاصل کرلینا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تو سمجھ بیٹھا ہے۔ یہ تجارت نہیں ہے کہ مال و دولت کی فراوانی سے جو چاہا خرید لیا۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ میں فرخندہ کو ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا۔"

دادا نے طنزیہ کہا۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، یہ بھی دیکھ لوں گا۔"

فیروز بخت اور فرخندہ نے ایک دوسرے کو الوداعی نظروں سے دیکھا اور جدا ہوگئے۔ فیروز بخت بھاگتا ہوا قطب عالم کے مزار پر جا پہنچا۔ وہاں ستار اس سے پہلے ہی پہنچا ہوا تھا۔ "میرے آقا! آپ کہاں چلے گئے تھے، آپ کو یہاں نہ پا کر میں تو بہت پریشان ہورہا تھا۔"

فیروز بخت نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "میں ذرا ہوا خوری کو چلا گیا تھا۔"

ستار نے کہا۔ "لیکن سجادہ نشین نے تو مجھے یہ بتایا ہے کہ آپ بھکاریوں کے ساتھ رات ہی کہیں چلے گئے تھے۔"

فیروز بخت نے گھبرا کر کہا۔ "سجادہ نشین کیا میری چوکیداری کرتا رہا ہے؟"

ستار نے کہا۔ "میرے آقا! سجادہ نشین کی بات کا تو خود میں نے بھی یقین نہیں کیا لیکن جب اس نے یہ بتایا کہ آپ بھکاریوں کے ساتھ تشریف لے گئے ہیں تو میرا ماتھا ٹھنکا۔"

فیروز بخت اور ستار ایک ساتھ اپنے گھر احمد آباد کی طرف روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

فیروز بخت کا سارا کاروبار، عملے کے لوگ چلا رہے تھے اور وہ فرخندہ کی محبت میں دیوانہ ہورہا تھا۔ کیفیہ اس کی نیم دیوانگی کو تشویش سے دیکھ رہی تھی۔ وہ بار بار شازیہ پر تختی کرتی اور کہتی کہ ایک ایسا نوجوان تیرے قابو میں نہیں آرہا جو ہر وقت تجھ سے قریب رہ سکتا ہے۔ شازیہ بے بسی سے جواب دیتی۔ "فیروز بخت حد درجہ سرد مہر ہے۔ اس کا دل پتھر کا ہے اور چٹان پر محبت کا بیج ڈال کر اس کے نمو اور نشوونما کی امید کرنا سراسر حماقت ہے۔"

تاجر وصی احمد بھی مایوس اور شرمندہ تھا۔ وہ اپنی بیٹی سائرہ سے ناراض تھا کہ وہ بھی فیروز بخت کا شکار نہیں کرسکی تھی۔ فیروز بخت فرخندہ سے شادی کرنا چاہتا تھا لیکن خوفزدہ تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو نظام، نرجس، کیفیہ اور سائرہ کا باپ تاجر وصی احمد سب مل کر اس کے خلاف محاذ آرائی کریں گے۔

ستار نے عرض کیا۔ "میرے آقا! منصوبے کے مطابق ہمیں سورت چلے جانا چاہیے۔ اب تامل کس بات کا؟"

فیروز بخت بدرجہ مجبوری بولا۔ "لیکن ہم دونوں سورت کتنے دن کے لیے جائیں گے؟ اور سچی بات تو یہ ہے کہ پچھلے دنوں میں سورت میں بڑی پریشانیاں اٹھا چکا ہوں اس لیے اب وہاں کے نام سے ہی وحشت شروع ہوجاتی ہے۔"

ستار نے مایوسی سے پوچھا۔ "تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ سورت نہیں جائیں گے؟"

فیروز بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔

حویلی میں کیفیہ اور وصی احمد کی طرف سے زبردست دباؤ پڑا کہ وہ شازیہ یا سائرہ سے شادی کر لے لیکن فیروز بخت نے انکار کر دیا۔ فیروز بخت لاشعوری طور پر فرخندہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گھنٹوں فرخندہ کے مسئلے پر غور کرتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے فرخندہ سے خفیہ شادی کر لینا چاہیے اور اس شادی کا اعلان کسی مناسب موقع پر اٹھا رکھنا چاہیے۔

اسی دوران سورت سے اطلاع آئی کہ ایک ولندیزی جہاز خام ریشم، تانبا اور ہاتھی کے دانت لے کر آیا ہوا ہے چنانچہ اس کے نمائندوں نے پرزور خواہش کی کہ فیروز بخت کچھ دنوں کے لیے سورت آجائے۔ ادھر ستار کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ چند ماہ سورت چلا جائے۔ چنانچہ جب سورت سے اس کا بلاوا آیا تو فیروز بخت کو یہی شبہ گزرا کہ یہ بلاوا ستار کے اشارے پر آیا ہے۔

فیروز بخت، ستار اور دوسرے کارندے سورت روانہ ہو گئے۔ فیروز بخت نے یہ سفر بڑی بے دلی سے کیا تھا۔ ستار کو قلق تھا کہ اگر اس جمود کو توڑا نہ گیا تو فیروز بخت کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا اور شاید کچھ مدت بھی نہ گزرے کہ فیروز بخت کی جگہ کوئی نیا ملک التجار پیدا ہو جائے۔

سورت کے کاروباری ناظم اعلیٰ نے ولندیزی سامان کی اہمیت پر ایک چھوٹی سی تقریر کی اور فیروز بخت کو بتایا کہ خام ریشم اٹلی سے، تانبا فرانس سے اور ہاتھی کے دانت افریقا سے لائے گئے ہیں اس لیے ان چیزوں کے بلند معیار پر شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا اور ان کی ہندوستان میں بڑی مانگ ہے اس لیے پورے جہاز کا سودا کر لیا جائے۔

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''پورے جہاز کی مالیت کیا ہوگی؟''

ناظم نے جواب دیا۔ ''پانچ لاکھ روپے۔''

فیروز بخت نے حیرت سے پوچھا۔ ''اس جہاز کے مال کا ہمارے علاوہ بھی کوئی خریدار ہے؟''

ناظم کو ہنسی آگئی، بولا۔ ''شاید آپ کو اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہے ورنہ یہ سوال نہ کرتے۔''

فیروز بخت نے اصرار کیا۔ ''میں اپنے سوال کا جواب مانگ رہا ہوں؟''

ناظم نے بے دلی سے جواب دیا۔ ''میرے چھوٹے آقا! آپ ملک التجار ہیں اور ملک التجار کی موجودگی میں کوئی دوسرا تاجر ولندیزی جہاز کا معاملہ کس طرح کر سکتا ہے؟ کسی کو اپنی شامت تھوڑی بلوانی ہے۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''اگر ہم ولندیزی جہاز کا سودا نہ کریں تو؟''

ناظم نے جواب دیا۔ ''جناب! میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ اگر ایک بار کوئی دوسرا تاجر ہمارے مقابلے پر آ گیا تب پھر وہ بار بار ہمارے مقابلے پر آتا رہے گا اور یہ خطرہ پیدا ہو جائے گا کہ آئندہ وہی ملک التجار بن جائے اور ہم ثانوی حیثیت اختیار کر جائیں۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''اگر ہم ملک التجار نہ بھی رہیں اور کوئی دوسرا تاجر یہ مرتبہ حاصل کر لے تو اس سے ہمیں کیا نقصان پہنچے گا؟''

ناظم اعلیٰ حیرت سے فیروز بخت کی صورت دیکھنے لگا۔ ستار نے چٹکی بھری کہ اس قسم کی باتیں مت کیجیے۔

لیکن فیروز بخت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے مزید کہا۔ ''صاحبان! میں کچھ بھی سہی مگر حریص نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں اپنے کاروبار کو مختصر اور محدود کر دینا چاہیے کیونکہ اس طرح ہماری مصروفیت میں کمی واقع ہو جائے گی اور ہم سب چین و سکون کے ساتھ زندہ رہ سکیں گے۔''

ناظم اعلیٰ نے افسوس سے کہا۔ ''میرے چھوٹے آقا! پست ہمتی سے تو دنیا کا کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا۔''

ستار نے اپنے طور پر کہا۔ ''ناظم اعلیٰ کو اختیار ہے کہ وہ اپنے طور پر معاملہ کر لیں۔ رہ گئی میرے آقا کی منظوری تو یہ میں بعد میں دلوا دوں گا۔''

ناظم اعلیٰ، ستار کو ایک طرف لے گیا اور پوچھا۔ ''تیرا اپنے چھوٹے آقا سے کیا رشتہ ہے؟''

ستار نے جواب دیا۔ ''میں اپنے اس آقا کا خدمت گزار ہوں، اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

ناظم اعلیٰ نے کہا۔ ''اپنے آقا سے زیادہ ہوشیار تو، تو خود ہے۔ احمد آباد واپس جا کر آقا اور داؤد مرحوم کی بیوہ کیفیہ سے میری طرف سے عرض کر دینا کہ انہیں اپنے مرحوم شوہر کی حیثیت اور مقام کو برقرار رکھنا ہے تو اس ناتجربہ کار نوجوان کی جگہ کسی اور کو ملک التجار بنائیں کیونکہ یہ بے پروا اور قانع نوجوان ذرا سا بھی کاروباری مزاج نہیں رکھتا۔''

ستار نے جواب دیا۔ ''میں یہ بات اپنے مرحوم آقا کی بیوہ سے نہیں کر سکتا۔''

فیروز بخت نے دور ہی سے آواز دی۔ ''یہ تم دونوں عورتوں کی طرح کھسر پھسر کیا کر رہے ہو؟''

دونوں گھبرا کر فیروز بخت کے پاس واپس آئے۔

فیروز بخت نے ناظم اعلیٰ کو حکم دیا۔ ''ولندیزی جہاز کا سودا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فی الحال کاروبار کو محدود

رکھا جائے۔''

ناظم اعلیٰ نے جواب دیا۔''بہتر ہے مگر اس کے نتائج دوررس مضر نکلیں گے کیونکہ ولندیزی جہاز کسی اور تاجر سے معاملہ کرے گا اور کاروباری دنیا میں ہماری حیثیت ثانوی ہو کر رہ جائے گی۔''

فیروز بخت نے کہا۔''میں نے ایک بار کہہ جو دیا، میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔'' ناظم اعلیٰ منہ لٹکا کر چلا گیا۔

رات کو ستار نے فیروز بخت سے کہا۔''میرے آقا! اپنا فیصلہ بدل لیں کیونکہ یہ فیصلہ آپ کی ساکھ کو مجروح کردے گا۔''

''ستار! تو نہیں جانتا کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟'' فیروز بخت نے پوچھا۔

ستار نے کہا۔''نہیں، میں نہیں جانتا۔''

فیروز بخت نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور فرخندہ کے تصور میں چلا گیا، بولا۔''ستار! میں یہاں زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں۔ اگر ولندیزی جہاز کا سودا کرلیا گیا تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ میں جہاز پر موجود سامان کو اتروا کر تجارتی گودام میں رکھواؤں اور اس کو منڈیوں میں پہنچاؤں۔ اس کام کے لیے بڑا وقت درکار ہوگا اور افسوس کہ میرے پاس سورت کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔''

ستار نے عاجزی سے کہا۔''آپ کے پاس وقت ہی وقت ہے آقا۔ احمد آباد میں واپس جانا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا سورت میں ٹھہر کر درپیش مسائل اور معاملات کا نمٹانا۔''

فیروز بخت نے سختی سے جواب دیا۔''میں نے ایک بار جو فیصلہ کرلیا سو کرلیا۔''

ستار نے کہا۔''میرے آقا! آپ یقین کیجیے اس کے مضر نتائج بہت جلد رونما ہونا شروع ہوجائیں گے۔''

''مثلاً کون سے برے نتائج، کوئی مثال؟''

ستار نے جواب دیا۔''میرے آقا! کیا آپ نے ناظم اعلیٰ کے چہرے پر اچانک چھا جانے والی اس خفگی اور اذیت کو نہیں محسوس کیا جو آپ کے منفی حکم کے بعد نمودار ہوگئی تھی۔''

فیروز بخت نے کہا۔''نہیں، میں نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی۔''

ستار نے بدستور عاجزی سے عرض کیا۔'' لیکن میں نے یہ اذیت اور خفگی صریحاً محسوس کرلی تھی اور اس کا یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ ناظم اعلیٰ آپ کے خلاف سازشیں کرے گا اور اس سے آپ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور آپ کے مخالف فائدہ اٹھا جائیں گے۔''

فیروز بخت نے اس کا مذاق اڑایا۔''اندیشہ ہائے دور و دراز۔ وہم شک محض بدظنی۔ ستار تو یاد رکھ ایسا نہیں ہوگا۔''

فیروز بخت نے اس کی ایک نہ مانی اور چوتھے دن احمد آباد کی واپسی کا سفر شروع کردیا۔

دوران سفر اس پر جنون سا طاری ہوچکا تھا۔ وہ فرخندہ کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس سے شادی اور پرمسرت ازدواجی زندگی کی لذتوں کا لمس محسوس کرتا رہا۔ اسے بڑا ملال تھا کہ اس نے بوقت سفر فرخندہ سے ملاقات نہیں کی اور نہ ہی اسے یہ اطلاع دی کہ وہ سورت جارہا ہے۔ وہ یہ سوچ کر لرز جاتا کہ اگر فرخندہ اس سے ناراض ہوگئی اور اس سے ملنا گوارا نہ کیا تو وہ فرخندہ کو کس طرح منائے گا۔

دوسری طرف ستار کو یہ شبہ تھا کہ ناظم اعلیٰ نے جو بات اس سے کی تھی اور اس نے انکار کردیا تھا وہی بات ان دونوں منشیوں سے ضرور کی ہوگی جو اس سفر میں اس کے ساتھ چل رہے تھے اور وہ خوب جانتا تھا کہ اگر اس کا یہ خیال درست نکلا تو احمد آباد میں داخل ہوتے ہی محلاتی سازشوں کا شکار ہوجائے گا۔

☆☆☆

وہ نہایت افسردگی اور مردہ دلی سے احمد آباد میں داخل ہوگیا۔ اس کے جی میں آئی کہ وہ اپنی حویلی کے بجائے سید حافرخندہ کے پاس چلا جائے۔

کیفیہ نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔''کیا ولندیزی جہاز کا سودا ہوگیا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''نہیں، میں نے حکماً یہ کہہ دیا ہے کہ اس جہاز کا سودا نہیں کیا جائے گا۔''

''کیوں، کوئی سبب؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ مجھے سورت پسند نہیں، میں وہاں زیادہ عرصے تک نہیں رہ سکتا۔''

کیفیہ نے ناگواری سے کہا۔''کاروبار کی خاطر تجھے سورت میں رک جانا چاہیے تھا۔''

فیروز بخت نے ڈھٹائی سے کہا۔''ایک جان ہزار آزار۔ میں کاروبار کی خاطر اتنا نہیں کرسکتا۔ آخر روپوں پیسوں کا مصرف کیا ہے اور زیادہ سے زیادہ دولت کس کے لیے پیدا کی جائے۔ دولت اور مال و زر کی ہوس وہ شاہراہ ہے جس سے جملہ شیطانی راستوں کی ابتدا ہوجاتی ہے۔''

کیفیہ نے چونک کر پوچھا۔''تو مال و زر کی بابت تیرے یہ خیالات ہیں؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔''میں تو، توکل اور

قناعت کا قائل ہوں اور میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر رکھا ہے کہ حرص و طمع سے ہمیشہ دور رہوں گا۔"

کیفیہ نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی لیکن وہ اس تبدیلی کا سبب جاننے کے لیے بے چین ہوگئی۔ فیروز بخت اس کی بیٹی شازیہ کی پروا کیے بغیر معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ اسے حویلی اور کاروبار سے بھی کوئی خاص انس نہیں نظر آرہا تھا۔

دوسری طرف تاجر وصی احمد سورت چلا گیا اور ولندیزی جہاز کے سامان کا سودا کرلیا۔ اس نے سورت میں داؤد مرحوم کے کاروباری عملے کو ترغیب و تحریص دے کر اپنے پاس لگالیا۔ ناظم اعلیٰ نے فیروز بخت اور کیفیہ کو ایک تفصیلی خط لکھ کر مطلع کردیا کہ اب وہ سورت میں ان کے کاروباری فرائض اور حقوق سے دستبردار ہوچکا ہے اس لیے اس کا استعفا منظور کیا جائے، اس استعفے کے ساتھ ہی دوسرے اہم اور قیمتی اہل کاروں اور کارندوں کے استعفے بھی موصول ہوگئے۔ فیروز بخت کی حویلی اور کاروباری کوٹھی میں زلزلہ آگیا۔ وصی احمد نے احمد آباد میں بھی جوڑ توڑ شروع کردیا۔ کیفیہ پریشان ہوگئی اور اس نے فیروز بخت کو تحکمانہ مشورہ دیا کہ وصی احمد کی محاذ آرائی کا مقابلہ کرے اور اگر وہ خود کو مقابلے کا اہل نہیں پاتا تو پھر چپ چاپ کونے میں بیٹھ جائے اور کیفیہ کو اجازت دے کہ وہ اپنے مرحوم شوہر کے کاروبار کو نہ صرف زندہ رکھے بلکہ ترقی بھی دے۔

فیروز بخت نے پوچھا۔ "کیا آپ وصی احمد سے جیت سکیں گی؟"

کیفیہ نے جواب دیا۔ "کیوں نہیں، اس میں مشکل کی کیا بات ہے؟"

فیروز بخت نے کہا۔ "آپ کو اجازت ہے لیکن میری ناقص رائے میں آپ مقابلہ اس طرح کریں کہ وصی احمد اور آپ کے درمیان حسد اور انتقام کے جذبے نہ پیدا ہوجائیں۔ محاذ آرائی صاف ستھری ہو۔"

کیفیہ نے برا سا منہ بنایا۔ "وصی احمد نے جو کچھ کیا ہے وہ صاف ستھرا نہیں ہے۔ اس کا جواب بھی اس کے حملے کے مطابق دیا جائے گا۔"

فیروز بخت سامنے سے ہٹ گیا۔

نظام بہت دنوں سے موقع کی تلاش میں تھا۔ اب موقع مناسب دیکھ کر آگے بڑھا اور کیفیہ کی دل جوئی کرنے لگا۔

فیروز بخت کا اس ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ وہ فرخندہ سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ اگر فرخندہ اسے بھولی نہ ہوگی تو ناراض ضرور ہوگی چنانچہ وہ ہمت کرکے قطب عالم بخاری کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بہانے پتوہ آباد چلا گیا۔

فرخندہ، فیروز بخت کے بغیر بہت بے چین تھی۔ اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ اسے فیروز بخت کی سردمہری پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ وہ پیپل کی جڑ میں بیٹھ کر آنے جانے والوں میں فیروز بخت کو تلاش کرتی رہتی تھی۔ اس کے انتظار میں بڑی طمانیت اور سکون تھا کیونکہ وہ اپنے عشق کا چرچا نہیں چاہتی تھی۔ خاموشی اور فکرمندی نے سینے میں گھٹن پیدا کردی اور فرخندہ کو بخار آگیا۔ اس کا پستہ قامت گنجا باپ بیٹی کی ذہنی اور قلبی اذیت سے آگاہ تھا۔ اس نے جلے کٹے لہجے میں فرخندہ کو سمجھایا۔ "فرخندہ! میں یک طرفہ معاملے کا قائل نہیں ہوں۔ اگر وہ تجھے بھول گیا ہے تو، تو بھی خاموشی اختیار کر۔ اس خاموش آگ میں جلنے سے حاصل؟"

فرخندہ نے باپ کی بات ہنسی میں اڑادی۔ "بابا، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ آپ کا شبہ سراسر غلط ہے۔ میں کسی کی محبت میں جلنے کے بجائے جلانے کی قائل ہوں۔ میرے دل پر فیروز بخت کی بے اعتنائی یا بے وفائی کا ذرہ برابر اثر نہیں۔"

ایک دن اس نے دوپہر سے ذرا پہلے خلاف توقع فیروز بخت کو پیپل کے درخت کی طرف آتے دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کئی بار اپنے دیکھے کی تصدیق کی اور جب اس کو یقین ہوگیا کہ آنے والا فیروز بخت ہی ہے تو بیزاری سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

فیروز بخت کا گھوڑا پیپل کے سائے میں رک گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ٹاپوں کی آہٹ پر فرخندہ اس کی طرف ضرور دیکھے گی لیکن وہ بدستور منہ پھیرے بیٹھی رہی۔ فیروز بخت گھوڑے سے اتر کر فرخندہ کے پاس جاکھڑا ہوا پھر وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ فرخندہ نے اسے سرسری نظر سے دیکھ کر پھر منہ پھیر لیا۔

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا تو ناراض ہے مجھ سے؟"

فرخندہ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور ذرا دور کھسک کر بولی۔ "میں تجھے نہیں جانتی، مجھ سے دور رہ۔"

فیروز بخت کے دل پر چوٹ سی لگی۔ "فرخندہ! اس ناراضی کا سبب؟"

فرخندہ نے بدستور ناراضی سے جواب دیا۔ "میں تجھ سے نہیں بولتی، تو واپس چلا جا۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "فرخندہ! میں واقعی اس کا گناہ

گار ہوں کہ تجھے اپنے سورت جانے کے منصوبے سے مطلع نہیں کیا۔ میں اچانک ایک ضروری کاروباری مقصد سے سورت چلا گیا تھا لیکن تجھے نہ بتانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں اپنا کام بھی انجام نہ دے سکا اور چند غلطیاں کر کے اپنا ایک زبردست کاروباری رقیب بھی پیدا کرلیا۔''

فرخندہ میں ذرا سی تبدیلی ہوئی، بولی۔ ''تو، تو احمد آباد میں نہیں تھا ان دنوں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں یہاں نہیں تھا۔ سورت چلا گیا تھا۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''پھر بھی تجھے بتا کر جانا چاہیے تھا۔ تو اس اذیت اور کرب کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا جس سے میں دوچار رہی ہوں۔ میرا بابا بھی تجھ سے بدظن ہو گیا ہے کیونکہ وہ تجھے بہت چاہتا ہے اور میری اداسی سے میرا باپ بھی اداس ہو جاتا ہے۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''فرخندہ! تو اس ایثار کا اندازہ نہیں لگا سکتی جو میں تیری خاطر کر رہا ہوں۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''میں ایثار کا تو اندازہ کرنے سے رہی لیکن اب تجھے ایک قطعی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ تو مجھ سے کیا چاہتا ہے۔''

فیروز بخت نے افسوس سے کہا۔ ''میں کیا چاہتا ہوں یہ عجیب سوال کیا تو نے۔ یعنی ابھی تک تجھے یہی معلوم نہیں ہوسکا کہ میں کیا چاہتا ہوں؟''

فرخندہ نے اپنے سامنے پگڈنڈی سے اپنے باپ کو آتے دیکھا تو گھبرا کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ''دیکھ میرا باپ آرہا ہے۔ وہ تجھے میرے پاس دیکھ کر خوش نہیں ہوگا اس لیے تو ذرا دور ہٹ جا۔''

فیروز بخت نے گھوم کر دیکھا۔ فرخندہ کا باپ تیز تیز قدموں سے بھاگا چلا آرہا تھا۔ اس نے فرخندہ سے کہا۔ ''میں تجھے یہ مشورہ دوں گا کہ میرے معاملے میں کسی بحث مباحثے سے بچتی رہ اور اپنی طرف سے کسی سے بھی وعدے وعید ہرگز نہ کر۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''میں تو خاموش رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے صرف تیری فکر ہے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تجھ سے جس قسم کی باتیں ہونے والی ہیں اس میں بڑے بڑوں کو پسینا آ جاتا ہے اور میں جانتی ہوں کہ تو بھی لرز جائے گا۔''

فرخندہ کا باپ ان دونوں کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے فیروز بخت کو بیزار نظروں سے دیکھتے ہوئے فرخندہ سے سوال کیا۔ ''تو یہاں کیا کر رہی ہے اور اسے اپنے پاس کیوں بیٹھنے دیا؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''بابا میں نے قطعی فیصلے کے لیے کہا تھا اور یہ تیار ہے اور کہتا ہے کہ میں ہر آزمائش سے گزرنے کو تیار ہوں۔''

باپ نے خشمگیں نظروں سے فیروز بخت کو دیکھا اور کرخت لہجے میں کہا۔ ''تب پھر میرے ساتھ چل تاکہ تو خود بھی جان جائے کہ فرخندہ تیرے لیے کتنی سریع الحصول ہے یا مشکل الحصول۔''

فرخندہ نے فیروز بخت کو نظروں ہی نظروں میں حکم دیا۔ ''اٹھ اور ہمارے ساتھ چل۔''

یہ تینوں ایک ساتھ چل پڑے۔ فیروز بخت نے گھوڑے کی لگام پکڑلی اور دھڑکتے دل سے ان دونوں کے ساتھ چلتا رہا اور سوچتا رہا کہ معلوم نہیں اسے اس وقت کس آزمائش سے گزرنا پڑے گا۔

☆☆☆

فیروز بخت کو فرخندہ کی برادری نے بڑی عزت واحترام سے قبول کیا۔ فرخندہ کے باپ نے اسی وقت ایک ہنگامی پنچایت بلالی۔ جس میں برادری کے گیارہ بڑوں نے فیروز بخت کو اپنے پاس بٹھا کر آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ فرخندہ کا دادا سرپنچ بنا دیا گیا۔ سرپنچ کے مقابل فیروز بخت بیٹھا تھا اور چبوترے کے سامنے نیچے برادری کے مرد عورتیں اور بچے جمع تھے۔ فرخندہ کو بلا کر فیروز بخت کے پاس بٹھا دیا گیا۔

سرپنچ نے فیروز بخت کی طرف جھک کر سرگوشی میں پوچھا۔ ''نوجوان تاجر! فرخندہ اور تیرے معاشقے کی داستان برادری میں تعجب اور تجسس سے سنی جاتی رہی ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو اس ملک کا بڑا تاجر ہے لیکن معاشرے میں جتنا بڑا اور غیر معمولی تو ہے اتنی ہی بڑی فرخندہ بھی ہے کیونکہ فرخندہ جس برادری سے تعلق رکھتی ہے اس کا ماضی میں راجا بھوج کے سرکاری بھکاریوں سے سلسلہ ملتا ہے۔ بعد میں اس خاندان کے سربرآوردہ لوگ مسلمان ہو گئے اور اسی خانوادے سے فرخندہ کا بھی تعلق ہے۔ ہم لوگ دریوزہ گری نہیں کرتے بلکہ شاہوں، مہاراجوں اور امراء کے دروں سے وابستہ لوگ ہیں اور ہمارے ماہانے، سالانے اور ہفتے مقرر ہیں اور ہم لوگ اپنے مقررہ وقت پر جا کر اپنا حق حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ اس طرح ہمارا تعلق بھکاریوں کے معزز ترین گھرانے سے ہے۔'' فیروز بخت نے کوئی جواب نہ دیا۔

سرپنچ نے فیروز بخت سے پوچھا۔ ''کیا میں پنچایت

کی کارروائی شروع کردوں؟‘‘
فیروز بخت نے جواب دیا۔’’ہاں شروع کردیجیے، میری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔‘‘
سرپنچ اپنی جگہ پر کھڑا ہوگیا اور برادری والوں کو مخاطب کیا۔’’پنچو! اور میری برادری کے لوگو! میرا خیال ہے کہ اس وقت ہم سب جس کام سے یہاں جمع ہوئے ہیں اس سے یہاں کا ہر شخص واقف ہے۔‘‘
کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔’’ہاں ہم سب واقف ہیں۔‘‘
سرپنچ نے فیروز بخت کو حکم دیا۔’’تو اپنی جگہ پر کھڑا ہوجا۔‘‘
فیروز بخت کھڑا ہوگیا۔ حاضرین نے فیروز بخت کو بڑے اشتیاق سے دیکھا۔
سرپنچ نے کہنا شروع کیا۔’’یہ نوجوان تاجر فرخندہ سے عشق کرتا ہے اور شاید فرخندہ بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ اب میں تم سب کی موجودگی میں اس نوجوان سے پوچھتا ہوں کہ کیا یہ فرخندہ کے معاملے میں سنجیدہ ہے؟‘‘
فیروز بخت نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔’’یہاں مجھے کیا کہنا ہے؟‘‘
سرپنچ نے جواب دیا۔’’صرف یہ کہ جو کچھ بھی تجھ سے کہا جائے اس کا ہاں یا نہیں میں جواب دیتا رہ.....‘‘ اس کے بعد سرپنچ نے ایک بار پھر پنچوں اور برادری والوں کو مخاطب کیا۔’’جب ان دونوں کی داستانِ عشق نے شہرہ پکڑا تو پنچوں کو ان دونوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنا پڑا۔‘‘
پھر فیروز بخت سے پوچھا۔’’تو اپنے ارادے میں ثابت قدم اور مستقبل پر نظریں جمائے رکھ۔ کسی دن بھی یہ تعلق مستقل اور دائمی ہوجائے گا۔ کیا تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دینے پر آمادہ ہے؟‘‘
فیروز بخت نے جواب دیا۔’’ہاں، میں اسے اپنی دلہن بنانا چاہتا ہوں۔‘‘ برادری نے خوشی میں نعرہ بلند کیا۔
فرخندہ کے دادا نے اپنی تقریر جاری رکھی۔’’ہوسکتا ہے کہ یہ تاجر خود کو معزز اور اعلیٰ و ارفع سمجھ رہا ہو لیکن ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا کیونکہ ہم خود بھی کسی معمولی خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ تاجر تو بہت مل جائیں گے لیکن ہم جیسے کہیں نہیں ملیں گے۔‘‘ اس کے بعد اس نے فرخندہ کو آواز دی اور کہا۔’’تو یہاں ہمارے پاس آجا۔‘‘
فرخندہ چبوترے پر دادا کے پاس پہنچ گئی۔ دادا نے اسے فیروز بخت کے قدموں میں بٹھادیا اور کہا۔’’اب میں فرخندہ سے پوچھتا ہوں کہ وہ ہم سب کو بتائے کہ وہ فیروز بخت سے محبت کرتی ہے اور اس نے اپنے محبوب کو اچھی طرح پرکھ اور سمجھ لیا ہے۔‘‘
فرخندہ کھڑی ہوگئی اور جواب دیا۔’’بہرحال میں اس نوجوان سے محبت کرتی ہوں لیکن اس کو پرکھوں گی شادی کے بعد۔‘‘
دادا نے فیروز بخت سے پوچھا۔’’کیا تو فرخندہ کی خاطر اس کی برادری کی مقرر کردہ شرائط کو قبول کرنے کو تیار ہے؟‘‘
فیروز بخت نے فرخندہ کی طرف اور فرخندہ نے فیروز بخت کی طرف دیکھا، فرخندہ نے آہستہ سے کہا۔’’کہہ دے ہاں، برادری کی شرائط مجھے سنے بغیر ہی منظور ہیں۔‘‘
فیروز بخت نے یہ جواب دہرادیا اور ایک بار پھر تالیوں سے فضا گونج گئی۔
دادا نے مزید کہا۔’’اور یہ بتا کہ تیری نظر میں تیرا حسب نسب زیادہ قیمتی ہے یا فرخندہ؟‘‘
اس نے پھر وہی جواب دیا۔’’فرخندہ۔‘‘
دادا نے اطمینان کی سانس لی اور کہا۔’’فیروز بخت! تو یہ بات تو جانتا ہی ہوگا کہ جب کوئی شخص ایک دھرم سے دوسرے دھرم میں داخل ہوتا ہے اور کوئی شخص اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے کا اختیار کرتا ہے تو اس کو نئے مذہب کے اصول وضوابط بتائے جاتے ہیں اور اس سے چند عہدو پیمان کیے جاتے ہیں؟‘‘
فیروز بخت نے جواب دیا۔’’میں جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے۔‘‘
دادا نے اپنا فیصلہ سنادیا۔’’اس طرح ہماری برادری کا بھی یہ اصول ہے کہ یہ اس وقت تک کسی شخص کو اپنی برادری میں داخل نہیں کرتی جب تک کہ وہ سال بھر بھیک مانگ کر نہ دکھائے لیکن چونکہ تیرا معاملہ دوسروں سے مختلف ہے اس لیے تجھے چھ ماہ کی چھوٹ دے دی جائے گی اور تو اگر فرخندہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کی خاطر چھ ماہ تک بھیک مانگے گا اور جب تو اس امتحان میں پاس ہوجائے گا تو فرخندہ تجھ سے وابستہ کردی جائے گی۔‘‘
فیروز بخت کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پریشانی میں کہا۔’’یہ کس طرح ممکن ہے؟‘‘
اب کسی پنچ نے زبان کھولی۔’’اگر تو فرخندہ سے محبت کرتا ہے تو تجھے اس آزمائش سے بہرحال گزرنا پڑے گا۔‘‘
فرخندہ نے اس کا ہاتھ دبایا۔’’فیروز بخت! یہ تو کیا کہہ رہا ہے..... کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرتا؟‘‘

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں تجھ سے محبت کرتا ہوں فرخندہ لیکن میں بھیک نہیں مانگ سکتا۔''

فرخندہ کے دادا نے پنچوں کو مخاطب کیا۔ ''پنچو! نوجوان آزمائش سے گزرے بغیر فرخندہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

پنچوں نے یک آواز میں کہا۔ ''پھر یہ رشتہ بھی نہیں ہوسکتا۔''

فرخندہ نے اپنے دادا سے کہا۔ ''دادا! فیصلے میں عجلت سے کام نہ لو۔'' پنچوں کی طرف منہ کر کے درخواست کی۔ ''فیروز بخت کو سوچنے کا موقع دیا جائے کیونکہ میں جانتی ہوں کہ فیروز بخت مجھ سے محبت کرنے کے باوجود اتنا بڑا فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں قبول کرسکتا۔''

دادا نے فیروز بخت سے پوچھا۔ ''کیا تو فرخندہ کے خیال سے متفق ہے؟''

فیروز بخت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فرخندہ نے عاجزی سے درخواست کی۔ ''فیروز بخت! میری خاطر تو ہاں کرلے۔ خدا کے لیے اس وقت تو دادا اور برادری کے پنچوں کو مایوس نہ کر۔ ورنہ یہ لوگ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کردیں گے۔''

فیروز بخت نے عاجز و جبر کی شکار فرخندہ کو دیکھا تو اس کا دل لرز گیا، بولا۔ ''تو مجھے قعرِ ندامت میں گراتی رہی ہے۔ میری زندگی کا یہ سب سے زیادہ بھیانک اور شرمناک گڑھا ہے جس میں مجھے گرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔''

فرخندہ نے مایوسی سے پوچھا۔ ''تو کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرتا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، میرا خدا شاہد ہے کہ میں دنیا میں سب سے زیادہ تجھے چاہتا ہوں۔ میں کس طرح اپنے اس دعوے کا یقین دلاؤں؟''

''فرخندہ نے کہا۔'' اس طرح کر یا تو، تو فوراً ہی ہاں کردے اور اگر ہاں نہیں کرتا تو کچھ مہلت ہی مانگ لے تاکہ تو غور و فکر اور مجھ سے مشورے کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔''

فیروز بخت نے فرخندہ کے دادا اور پنچوں سے ایک ساتھ کہا۔ ''صاحبان! میں آپ کا اتنا بڑا فیصلہ سوچے سمجھے بغیر نہیں مان سکتا۔ آپ لوگ ایک ہفتہ سوچنے کی مہلت دیجیے تاکہ میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔''

دادا نے پنچوں سے پوچھا۔ ''اس مہلت کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟''

پنچوں نے جواب دیا۔ ''ہم سے پوچھنے کے بجائے یہ سوال فرخندہ سے کیا جائے تو بہتر ہے۔''

لیکن فرخندہ نے سوال کرنے سے پہلے ہی جواب دے دیا۔ ''میرا خیال ہے فیروز بخت کو سوچنے کے لیے سات دن دے دیے جائیں، میں اسے راضی کرلوں گی۔''

چنانچہ دادا نے بھی اعلان کردیا۔ ''نوجوان تاجر! تجھے سوچنے کے لیے سات دن دیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ تو ان سات دنوں میں کوئی فیصلہ کرلے گا۔''

فیروز بخت نے فرخندہ کی طرف دیکھا، فرخندہ نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں، مجھے یقین ہے کہ یہ سات دنوں میں کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور کرلے گا۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو میں خود بھی اسے خدا حافظ کہہ دوں گی۔''

دادا نے پنچوں کی اتفاق رائے سے اعلان کردیا۔ ''نوجوان تاجر کو سوچنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دی جاتی ہے۔ اس کے لیے موقع ہے کہ یا تو چھ ماہ کی دریوزہ گری کے بعد فرخندہ کو حاصل کرلے ورنہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوجائے۔''

فیروز بخت پنچایت کے فیصلے سے اداس ہوگیا تھا اور ان سب میں خود کو بالکل اجنبی محسوس کررہا تھا۔ اس نے فرخندہ کو دور ہی سے مطلع کردیا۔ ''میں واپس جارہا ہوں۔''

فرخندہ باپ کو چھوڑ کر اس کے پاس آگئی۔ ''فیروز بخت! آج تو مسلسل دل دکھا رہا ہے، کیا بات ہے کیا تو مجھ سے محبت نہیں کرتا؟ کیا تو سات دنوں کی مہلت سے فائدہ نہیں اٹھائے گا؟''

فیروز بخت نے بے دلی سے کہا۔ ''اگر تیری پنچایت نے سنگدلی سے کام لیا تو میں پسپائی اختیار کرلوں گا۔''

فرخندہ نے منہ لٹکا کر جواب دیا۔ ''تب پھر تو اس وقت چلا جا، میں تجھ سے بات نہیں کروں گی۔''

فیروز بخت، فرخندہ کی خفگی سے ڈر گیا۔ ''فرخندہ! میں تجھے اداس بھی نہیں دیکھ سکتا لیکن تیری پنچایت کو مجھے اس بے ہودہ آزمائش میں بھی نہیں ڈالنا چاہیے۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''میں یہاں تجھ سے کوئی بات نہ کروں گی، تو میرے ساتھ پیپل کے سائے تک چل خوب باتیں کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کی جائے تو بہتر ہے۔''

فیروز بخت نے اختلاف نہیں کیا اور وہ دونوں پیپل کے درخت کی طرف چل دیے۔

فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور گم صم چلتے ہوئے پیپل کے سائے تلے پہنچ گیا پھر گھوڑے کو یوں ہی چھوڑ کر دونوں درخت کی جڑ میں بیٹھ گئے۔ دونوں ہی خاموش رہے۔ آخر فیروز بخت نے اجازت طلب کی،

بولا۔ ”فرخندہ! میں جانا چاہتا ہوں۔“
فرخندہ نے بیزاری سے کہا۔ ”تو میں نے تجھے روکا کب ہے؟ جا اور شوق سے جا۔“
فیروز بخت واپس جانے کے لیے مڑا تو فرخندہ نے آواز دی۔ ”بخت! اتنی بے حسی بھی اچھی نہیں، میری بات تو سن۔“
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”تو بات تو کرتی نہیں پھر میں بیکار بیٹھ کر کیا کروں؟“
وہ واپس آ گیا۔ فرخندہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔ ”جو کچھ تجھے فیصلہ کرنا ہے مجھے نہیں بتاتا جا۔ میں تیرے انکار کی کوفت سے بچنا چاہتی ہوں۔“
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”تجھے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اب بھی تجھ سے محبت کرتا ہوں لیکن بھیک مانگ کر تجھے حاصل کرنا، بہت دشوار شرط ہے۔“
فرخندہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”لیکن ملتے رہنا۔ رہا بھکاری ہونے کا سوال تو یہ تیرے لیے یوں شرمناک ہے کہ تو ایک تاجر ہے اور چونکہ تجھے کوئی پریشانی بھی نہیں اٹھانا پڑی اس لیے تو کترا رہا ہے۔“
فیروز بخت نے کہا۔ ”ایک یہ بات بھی ہے لیکن میں اپنی تحقیر سے ڈر رہا ہوں۔“
معاملہ بگڑ چکا تھا، ان دونوں نے بڑی کوشش کی کہ خوشی اور مفاہمت کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ کافی دیر ایک دوسرے کے سامنے رہ کر بھی دونوں اکھڑے اکھڑے، چپ چپ رہے۔ آخر فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی اور فرخندہ سے کہا۔ ”میں اجازت چاہتا ہوں۔“
فرخندہ نے گم صم لہجے میں جواب دیا۔ ”جب تو جانا ہی چاہتا ہے تو بصد شوق جا، میں تجھے نہیں روکوں گی لیکن تو یہ بتا کہ تو اپنے فیصلے سے ہمیں مطلع کرے گا یا نہیں؟“
فیروز بخت نے کہا۔ ”میں واپس آؤں گا اور ضرور آؤں گا اور تیری پنچایت کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دوں گا۔“
فرخندہ نے جبراً خوش دلی سے کہا۔ ”تب پھر جا، فی امان اللہ...... خدا تجھے خوش اور تادیر سلامت رکھے۔“
فیروز بخت احمد آباد واپس چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فرخندہ کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھی کپکپاتی رہی اور جب تک فیروز بخت نظر آیا، دیکھتی رہی لیکن وہ جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا وہ زار و قطار رونے لگی۔ پیپل کی جڑ میں لیٹ گئی۔
فیروز بخت اپنی حویلی میں واپس پہنچا تو ہر شخص کو بیگانہ، اجنبی اجنبی سا محسوس کیا۔ کیفیہ نے اسے نظرانداز کر دیا۔ شازیہ نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ نرجس نے اسے ایک نظر دیکھا اور اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اشارے سے فیروز بخت کو اپنے پاس بلایا۔ فیروز بخت، نرجس کے کمرے میں چلا گیا۔ نرجس نے کمرے کو اندر سے بند کر لیا اور سرگوشی کے انداز میں فیروز بخت سے مخاطب ہوئی۔ ”فیروز بخت! میں پوچھتی ہوں تو یہ آج کل ہے کس چکر میں؟ تو کھویا کھویا گم صم کیوں رہتا ہے؟“
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں، اول تو یہ کہ میں نہ تو کھویا کھویا رہتا ہوں اور نہ ہی گم صم۔ لوگوں کو میری بابت کچھ شبہات ہو گئے ہیں جو جلد ہی دور ہو جائیں گے۔“
نرجس نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھ میں تجھے مشورہ دوں گی کہ تو کیفیہ سے نہ الجھ۔ شازیہ سے شادی کر کے کیفیہ کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لے، ورنہ پچھتائے گا۔“
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں شازیہ سے شادی نہیں کروں گا۔ یہ لوگ مجھے خواہ مخواہ پھانس رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان سے کس طرح پیچھا چھڑاؤں؟“
نرجس نے پوچھا۔ ”لیکن تو شازیہ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتا؟“
فیروز بخت نے سیدھا سا جواب دیا۔ ”شازیہ مجھے اچھی نہیں لگتی۔“
نرجس نے پوچھا۔ ”پھر تو کس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“
”ابھی میں خود بھی نہیں جانتا۔“
”تو جانتا ہے اور خوب جانتا ہے، مثل مشہور ہے کہ جس درخت کا بکل ہوتا ہے وہیں لگتا ہے۔ تیرا نسب نامہ بھی کچھ ویسا ہی لگتا ہے ورنہ شازیہ اس بھکارن سے لاکھ درجے بہتر ہے۔“
فیروز بخت نسب نامے کے طعنے سے چڑ گیا۔ نرجس کے پاس سے اٹھ گیا لیکن نرجس نے اس کا راستہ روک لیا، بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تو فرار کا عادی ہے لیکن میری آخری بات سنتا جا، اگر تو نے ہم سب کا کہنا نہ مانا تو، تو یہ سمجھ لے کہ عنقریب ایک ایسا انقلاب رونما ہونے والا ہے جس میں کچھ بھی نہ رہے گا اور تو اپنے کیے پر پچھتائے گا۔“
لیکن فیروز بخت جواب دیے بغیر چلا گیا۔
وہ تجارتی حویلی میں پہنچ گیا، وہاں ستار منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ عملے نے سلام کیا لیکن اس میں گرم جوشی نہیں تھی۔ جب وہ اپنے کمرۂ خاص میں جا کر بیٹھ گیا تو ستار بھی وہیں پہنچ گیا، بولا۔ ”میرے آقا! میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ

کچھ ہونے والا ہے۔''

فیروز بخت نے نہایت صبر وتحمل سے اپنی حالت برقرار رکھی بے پروائی سے پوچھا۔''کیا ہونے والا ہے؟''

''میں نہیں جانتا لیکن کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔''

میر منشی نے فیروز بخت سے خوشامدانہ دریافت کیا۔

''میرے آقا! آپ کاروبار میں پوری دلچسپی نہیں لے رہے ہیں، اس لیے ہمارا کاروبار خسارے میں جارہا ہے۔ خدا کے لیے اس پر پوری توجہ دیں ورنہ مجھے یقین ہے کہ ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ قسمت برگشتہ ہے اور آسمان الٹی چال چل رہا ہے۔''

فیروز بخت نے تختی سے پوچھا۔''آخر بات کیا ہے، قسمت برگشتہ کیوں ہے اور آسمان الٹی چال کیوں چل رہا ہے؟''

میر منشی نے عرض کیا۔''میرے آقا! آپ اپنی نا تجربے کاری اور نوعمری کی وجہ سے میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں ورنہ جو کچھ میں کہہ چکا ہوں، اتنا ہی کافی ہے۔''

فیروز بخت نے کافی دیر سوچنے میں وقت گزار دیا۔ ''منشی جی! جس کام پر میرا دل آمادہ نہیں ہوتا، میں نہیں کرتا۔''

میر منشی بھی جھک مارنے کے لیے آیا تھا اور جھک مار کر چلا گیا۔

کارندوں نے مطلع کیا۔''سورت میں ایک جنک (چینی جہاز) آیا ہوا ہے۔ وہ ملابار کے ساحل کورومنڈل سے کالی مرچ لایا ہے، اس کا معاملہ کرلیجیے۔''

فیروز بخت ہنسا۔''ہش، میں کالی مرچ لے کر کیا کروں گا؟''

ایک منشی نے جواب دیا۔''اس مال کی مغربیوں میں بڑی کھپت ہے۔ جنک جہاز جس پر کالی مرچ بار ہے وہ یہاں سے واپس چلا جانا چاہتا ہے اگر اسے واپس نہ جانا ہوتا تو وہ اپنے مال کو کسی مغربی ملک میں لے جاکر بیچ دیتا۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''میر منشی سے کہو کہ وہ سورت کے ناظم اعلیٰ کے نام خریداری کا اجازت نامہ تحریر کردے۔ میں اس پر دستخط کردوں گا۔ دوسری بات یہ کہ اجازت نامے میں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ اس مال کو کسی مغربی کمپنی کے ہاتھ فروخت کردیا جائے۔''

کارندے چلے گئے لیکن ذرا دیر بعد میر منشی خود آگیا اور عاجزی سے عرض کیا۔''میرے آقا! اس ناچیز کی رائے میں آپ چند دنوں کے لیے خود سورت تشریف لے جائیں اور یہ کام اپنے سامنے انجام دلوائیں کیونکہ یہ کوئی معمولی سودا نہیں ہے۔''

فیروز بخت کو فرخندہ کا خیال آرہا تھا لیکن معلوم نہیں کیا سوچ کر جواب دیا۔''اچھا، سفر کی تیاری کی جائے۔ میں کل سے پرسوں تک سورت روانہ ہوجاؤں گا۔''

کاروباری حویلی کا ہر چہرہ بشاش ہوگیا۔ ستار نے اس کا ہاتھ چوم لیا اور آہستہ سے کہا۔''اگر آپ نے مثبت فیصلہ نہ کیا ہوتا تو اس کا بہت برا نتیجہ نکلتا اور آپ کے حریف جانے آپ کے خلاف کون سی چال چل جاتے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''ستار! میں نے ابھی ابھی فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنے کاروبار کو ترقی دوں گا اور سستی اور غفلت کو خیرباد کہہ دوں گا۔''

ستار نے پُرجوش آواز میں کہا۔''آمین، ثم آمین۔''

اس کے بعد اس نے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور بڑی دیر تک فرخندہ سے جنگ کرتا رہا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ وہ فرخندہ کا خیال ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دے لیکن وہ اس میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا۔ ہر بار دل یہی مشورہ دیتا کہ معاملے کو التوا میں ڈال کر وقت کا انتظار کر...... ممکن ہے کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔

وہ فرخندہ سے ایک ہفتے کا وعدہ کرکے آیا تھا لیکن اب سورت جانے کے بعد وعدے کے مطابق فرخندہ سے ملاقات نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ اپنی سورت روانگی سے فرخندہ کو مطلع کردینا چاہتا تھا لیکن وہ خود فرخندہ کے پاس جا بھی نہیں سکتا تھا۔ سوچا ستار کو بھیج دیا جائے لیکن دوسرے ہی لمحے رسوائی کے خوف نے اس ارادے سے باز رکھا۔

دوسرے دن وہ اپنی حویلی سے نکلا تو خاصا پریشان تھا کیونکہ ابھی تک کوئی ایسی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی جس سے وہ فرخندہ کو اپنی سورت روانگی سے مطلع کردیتا۔ باہر نسیم سحر کے جھونکوں میں شامل کیف وسرور نے اس کے رگ وپے میں فرخندہ کے عشق کی لہریں دوڑا دیں۔ سوئی ہوئی محبت انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور سورت جانے کے چٹان جیسے ارادے میں شگاف پڑگیا۔ ستار اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کا رخ پتوہ آباد کی طرف کردیا۔ ستار نے پوچھا۔''میرے آقا! آپ کے گھوڑے نے اپنا رخ بدل دیا ہے۔''

اس نے جواب دیا۔''تجھے غلط فہمی ہوئی ہے، رخ گھوڑے نے نہیں خود میں نے بدلا ہے۔''

ستار نے حیرت سے پوچھا۔''گستاخی معاف، ادھر آپ کہاں جارہے ہیں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''میں پتوہ آباد جارہا

ہوں، شاہ قطب عالم بخاری کے مزار پر...... میں ان سے اپنی کامیابی کی دعا مانگوں گا۔''

ستار نے خوش ہو کر عرض کیا۔''تب پھر میں بھی چلوں گا آپ کے ساتھ۔''

فیروز بخت نے کہا۔''نہیں، میں وہاں تنہا جاؤں گا۔ تو کاروباری حویلی پہنچ۔ میں بھی وہیں آرہا ہوں۔''

وہ دونوں یہاں سے جدا ہو گئے۔ ستار اپنی راہ چلا اور فیروز بخت پتوہ آباد روانہ ہو گیا۔

آبادی کو پیچھے چھوڑتا ہوا جب وہ اس چھوٹی سی کچی سڑک پر پہنچا جو سیدھی قطب عالم بخاری کے مزار تک جاتی تھی تو اس نے کپاس کے پودوں کی آڑ سے ایک جوڑے کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ ایک شوخ و شریر لڑکی اپنے ساتھی کا ہاتھ پکڑے احمد آباد کی طرف جا رہی تھی۔ لڑکی کے جسم پر سرخ لباس تھا اور نوجوان نے ہلکے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ نیلے رنگ میں سے نوجوان کا سرخ و سفید رنگ پھوٹ رہا تھا۔ اسے لڑکی پر کچھ شبہ گزرا۔ وہ گھوڑے کو بھگا کر ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا، ٹاپوں کی آواز پر دونوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

فیروز کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ بے اختیار گھوڑے سے کود پڑا۔''فرخندہ! یہ تو ہے۔'' پھر نوجوان کی طرف دیکھ کر پوچھا۔''یہ کون ہے؟''

فرخندہ سکتے میں رہ گئی پھر ہوش میں آکر بولی۔''ہاں، یہ میں ہوں، کیوں کیا بات ہے؟''

اس نے پھر وہی سوال کیا۔''یہ کون ہے؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔''یہ میرے چچا کا بیٹا علی ہے اور میں نے تیری جگہ اسے دے دی ہے۔''

فیروز بخت کانپ گیا، آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور گلا خشک ہو گیا۔ بہ مشکل پوچھا۔''اور میرا کیا بنے گا؟''

فرخندہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔''میں کیا جانوں...... یہ تو، تو اپنے دل سے پوچھ جو تجھے ڈانواں ڈول کیے ہوئے ہے۔''

فیروز بخت نے درخواست کی۔''فرخندہ! تو اس کا ہاتھ چھوڑ دے، اس سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔''میں بار بار ہاتھ پکڑنے اور چھوڑنے کی عادی نہیں ہوں۔''

فیروز بخت نے عاجزی سے کہا۔''اس وقت میں حسب وعدہ تیرے ہی پاس آرہا تھا لیکن تو یہاں راستے میں ہی مل گئی۔''

فرخندہ نے بے دلی سے پوچھا۔''تو نے کیا فیصلہ کیا؟''

فیروز بخت نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔''مجھے تیری خاطر تیری برادری اور تیرے پنچوں کی شرط منظور ہے۔ میں تیری خاطر فرخندہ...... صرف تیری خاطر زہر کا یہ جام پی لوں گا۔'' پھر شرما کر آہستہ سے کہا۔''میں چھ ماہ تک بھیک مانگنے کے لیے تیار ہوں۔''

فرخندہ نے فرطِ جوش سے پوچھا۔''سچ؟''

فیروز بخت نے نیم مدہوشی میں جواب دیا۔''سچ...... مگر خدا کے لیے فرخندہ اب اس کا ہاتھ چھوڑ دے۔''

فرخندہ نے اپنے چچا کے بیٹے علی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور فیروز بخت کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔''پھر کب اپنی اس آزمائش سے گزرے گا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔''ٹھیک آٹھویں دن...... آج سے سات دن بعد۔''

علی ہکا بکا ان دونوں کی صورتیں دیکھنے لگا۔ فیروز بخت کو اس کی موجودگی تکلیف پہنچا رہی تھی۔ ناگواری سے فرخندہ سے کہا۔''فرخندہ اس کو تو چلتا کر دے ورنہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں گا۔''

فرخندہ زور سے ہنسنے لگی بولی۔''یہ تو میرے ساتھ ہی واپس جائے گا۔''

فیروز بخت نے عاجزی سے کہا۔''میری خاطر فرخندہ...... صرف میری خاطر۔ میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔''

فرخندہ نے علی کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ فیروز بخت حسد کی آگ میں جلنے لگا۔

فرخندہ نے کہا۔''بخت! علی سے نہ ڈرو۔ اب جبکہ تو نے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ تو میری برادری کی شرائط مان کر مجھے حاصل کر لینے پر آمادہ ہے تو میں بھی اصل بات کو راز کیوں رہنے دوں۔'' پھر ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔''علی سے مت ڈر کیونکہ یہ شادی شدہ ہے۔ اس کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بچہ بھی ہے۔''

فیروز بخت نے حیرت سے پوچھا۔''پھر تو نے ایسی بات کیوں کی تھی؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔''میں اسے ساتھ لے کر تیرے پاس آرہی تھی کیونکہ میں تیرے تذبذب سے بہت پریشان تھی۔ خوب سوچ سمجھ کر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں علی کو ساتھ لے کر تیرے پاس پہنچوں اور تیرے دل میں موجود آتشِ عشق کو رقابت کی ہوا سے بھڑکا دوں۔ میں خوب

جانتی تھی کہ میرے اس عمل سے تیرا تذبذب دور ہو جائے گا اور جس فیصلے پر تو مہینوں نہ پہنچ سکتا، اس طرح گھنٹوں میں پہنچ جائے گا۔ چنانچہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔''

علی منہ لٹکائے کھڑا تھا اور فیروز بخت کو اپنی عاجلانہ شکست کا صدمہ تھا۔ فیروز بخت نے کھسیا کر کہا۔ ''فرخندہ! اگر تو یہ سب نہ کرتی تب بھی میں نے وہی فیصلہ کر لیا تھا جس کا میں نے ابھی اعلان کیا ہے۔ تجھے اس طرح جلانا نہیں چاہیے تھا۔''

فرخندہ نے فیروز بخت کے گھوڑے کی لگام پکڑی اور اس کو ایک برگد کے نیچے کھڑا کر کے موٹی سی شاخ سے باندھ دیا اور خود بھی وہیں بیٹھ گئی، بولی۔ ''تو بھی یہیں آجا۔'' اور علی سے کہا۔ ''تیرا جی چاہے تو میرے ساتھ بیٹھ جا ورنہ واپس چلا جا۔''

علی نے جواب دیا۔ ''فرخندہ! تو اپنے منصوبے میں کامیاب ہو چکی ہے، اب میرا یہاں کیا کام۔ شاید مجھے چلے جانا چاہیے۔''

''تیری خوشی۔'' فرخندہ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

☆☆☆

فرخندہ اور فیروز بخت زمانے کی فکروں سے بے نیاز مسائل حاضرہ سے بے فکر اور وقت کی پروا کیے بغیر باتوں میں کھو گئے۔

فرخندہ نے کہا۔ ''میں یہی سمجھ رہی تھی کہ تو میری برادری کی شرط پوری نہیں کر سکے گا۔''

فیروز بخت کے ہونٹوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہو کر غائب ہو گیا۔ ''کیوں؟ کیا تجھے میری محبت کا یقین نہیں ہے؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''یقین تو ہے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ تو میری خاطر چھ ماہ تک دریوزہ گری بھی کر سکتا ہے۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''فرخندہ! میں خوب جانتا ہوں کہ تجھ سے شادی کر کے مجھے کئی محاذوں پر جنگ لڑنی پڑے گی لیکن میں نے تیری خاطر سب کچھ کر گزرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔''

فرخندہ نے منہ بنایا۔ ''میری خاطر، گویا تو مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے۔''

''نہیں، یہ بات نہیں ہے بلکہ میں تیری حصولیابی کی خاطر جو کچھ بھی کروں گا اپنے لیے اور اپنی روح کی تسکین کی خاطر کروں گا۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''تیرے فیصلے سے میں برادری کو مطلع کر دوں گی مگر اس پر عمل درآمد کب سے ہوگا، یہ بھی معلوم ہو جائے تو اچھا ہے۔''

فیروز بخت اپنی سورت روانگی کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس سے فرخندہ شک وشبے میں پڑ سکتی تھی۔ جواب دیا۔ ''امکان تو یہی ہے کہ میں اس آزمائش سے پانچ سات دنوں کے بعد گزرنا شروع کر دوں لیکن میرے سامنے میری کاروباری اور غیر کاروباری مصروفیات بھی ہیں۔ اگر میں ان میں الجھ کر تاخیر سے دوچار ہو جاؤں تو، تو کسی شک وشبے میں تو نہیں پڑے گی؟''

فرخندہ کھنک گئی۔ ''میں تیرا مطلب نہیں سمجھی۔''

فیروز بخت ہنس دیا۔ ''تو نے پھر شبہ کیا۔ مجھ پر کاروباری اور غیر کاروباری ذمے داریوں کا بوجھ ہے۔ اسے چھ ماہ کے لیے دوسروں کے کاندھوں پر رکھنا ہے اور ان کاندھوں کے انتخاب میں مجھے کچھ وقت تو دینا ہی پڑے گا۔''

فرخندہ نے دکھ سے کہا۔ ''لیکن وقت کا تعین تو ہونا چاہیے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''وقت کا تعین دشوار ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ میں ادھر سے مطمئن ہوتے ہی تیرے پاس آجاؤں گا......''

فرخندہ نے افسردگی سے کہا۔ ''اپنی مجبوریاں تو خود ہی سمجھ سکتا ہے لیکن معلوم نہیں کیوں میرا دل منتشر ہے اور اس کو کسی بات کا یقین نہیں آتا۔ اگر تو نے پسپائی اختیار کی تو میرا کیا بنے گا، میں کیا کروں گی؟''

تین چیزوں کا غلبہ

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ امت مسلمہ شریعت پر اس وقت تک ثابت قدم رہے گی جب تک تین چیزیں غالب نہ آجائیں۔ 1۔ علم اٹھا لیا جائے گا۔ 2۔ ناجائز بچوں کی کثرت ہونے لگے۔ 3۔ سقارون کا غلبہ ہو جائے۔ لوگوں نے پوچھا۔ ''یارسول اللہ (ﷺ) سقارون سے کیا مراد ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔'' وہ لوگ جو آخری زمانہ میں ہوں گے اور ان کی باہمی ملاقات (سلام کے بجائے) ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرکے ہوا کرے گی۔'' (مسند احمد بن حنبل)

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ،
نیو سینٹرل جیل ملتان

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''علی جیسے کسی نوجوان کو تلاش کرلینا۔''

فرخندہ تڑپ گئی، تلملا کر کھڑی ہوگئی۔ ''بخت! معلوم نہیں کیوں میں اس وقت تک تیرے وعدے پر اعتبار نہیں کروں گی جب تک کہ تو اس پر پوری طرح عمل نہیں کرے گا۔''

فرخندہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ فیروز بخت نے کہا۔ ''میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تجھ سے یہ عہد کررہا ہوں کہ میں تیری خاطر، صرف تیری خاطر چھ ماہ کی دریوزہ گری جیسا شرمناک کام کروں گا۔ اگر اپنے اس عہد کے سلسلے میں رتی بھر بھی میرے دل میں کھوٹ ہوتا تو میں یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ عہد نہ کرتا۔''

فرخندہ پسپا ہوگئی۔ ''مجھے تجھ پر اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔ بہرحال میں انتظار کروں گی۔''

فیروز بخت نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''شکریہ کہ تو نے مجھ پر اعتبار کیا۔ اب تجھ سے ایک گزارش اور کروں گا کہ یہ انتظار کی گھڑیاں چونکہ موت سے زیادہ سخت ہوتی ہیں اس لیے اگر شدید لمحوں میں توقع سے زیادہ طوالت آجائے تو، تو میری طرف سے دل برداشتہ یا مایوس بالکل نہیں ہوگی اور اس پر یقین رکھے گی کہ تیرا عاشق فیروز بخت اپنی زندگی میں تجھے مایوس نہیں کرے گا۔''

اس کے بعد ان دونوں نے آہستہ آہستہ سرگوشی جیسے انداز میں بڑی پیاری پیاری باتیں کیں۔ ان باتوں سے ان دونوں کی ایک ایک ادا اور ایک ایک بات سے ان کے دلوں میں کیف و سرور کی بارشیں ہورہی تھیں۔ یہ دونوں کئی گھنٹے پرکیف باتیں کرتے رہے۔ آخر فرخندہ نے اس کو ہوش دلایا کہ باتوں میں بہت زیادہ وقت گزر چکا ہے اور ہمیں واپس جانا چاہیے۔

فیروز بخت نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اری پگلی یہ بات کس سے سن کر آئی ہے کہ وقت بہت زیادہ گزر چکا ہے۔ میں تو یہ محسوس کررہا ہوں کہ وقت ٹھہر چکا ہے اور جب تک ہم دونوں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے بدن کی خوشبو اور باتوں میں رس اور کیف محسوس کررہے ہیں وقت ٹھہرا رہے گا۔''

فرخندہ نے ہنس کر کہا۔ ''یہ ساری شاعرانہ باتیں ہیں، مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ شادی کے بعد کوئی ایسی ویسی بات تو نہ ہوگی...... مجھ پر پابندیاں تو نہیں لگ جائیں گی؟''

فرخندہ نے کہا۔ ''اس کا کوئی امکان تو نہیں ہے۔ ہاں اگر تیرے گھر والے ہی تیرا ذکر بری طرح کریں، تیرا معاشرتی محاصرہ کریں اور عدم تعاون کی روش اختیار کریں تو ان حالات میں تو کیا کرے گا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''یہ میرا مسئلہ ہے۔ ان کا میں مقابلہ کروں گا اور میں تجھ سے درخواست کروں گا کہ تو یہ مت سوچ۔''

باتیں کرتے کرتے ان دونوں کی نظریں اچانک شاہراہ پر چلی گئیں جو احمد آباد سے پتوہ آباد تک چلی آرہی تھی۔ ایک گھوڑا گاڑی ان کی طرف بھاگی آرہی تھی۔ معلوم نہیں کیوں فیروز بخت کا دل اندیشوں سے دھڑکنے لگا۔

فرخندہ نے کہا۔ ''اس راہ پر گاڑی میں نے پہلی بار دیکھی ہے۔''

فیروز بخت کی نظریں گاڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ بے خیالی میں جواب دیا۔ ''گاڑی بان شناسا سا معلوم ہوتا ہے۔''

اتنے میں گاڑی ان دونوں کے قریب برگد تلے آکر رک گئی۔ گاڑی بان کی جگہ سے ستار اترا اور ڈرتے ڈرتے شرمندگی سے کہا۔ ''میرے آقا! آپ کے علاوہ میں حویلی کی دونوں بیگمات کے احکام ماننے پر بھی مجبور ہوں۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''تو یہاں کیوں آگیا؟''

لیکن ستار کے جواب سے پہلے گاڑی کے اندر سے کیفیہ نمودار ہوئی اور بے پردہ ان دونوں کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ اس نے فرخندہ کو بڑے غور سے دیکھا اور طنزاً کہا۔ ''تو یہ ہے وہ بھکارن جس نے تیرے ہوش و حواس اور عقل و خرد کو سلب کرلیا ہے۔'' پھر ستار کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''میرا اندازہ کتنا درست تھا۔ کیا میں نے تجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ فیروز بخت قطب عالم بخاری کے مزار پر نہیں اس بھکارن کی بارگاہ میں ہوگا۔''

فرخندہ نے فیروز بخت سے پوچھا۔ ''یہ عورت کون ہے؟''

فیروز بخت کی آنکھوں تلے اندھیرا اچھل رہا تھا، کہیں دور سے جواب دیا۔ ''میری ماں۔''

کیفیہ نے فرخندہ سے کہا۔ ''میں تجھے دیکھنے، تجھ سے ملنے اور باتیں کرنے کے لیے بڑی بے چین تھی...... آخر میں نے تجھے پالیا۔''

فرخندہ نے حیرت سے پوچھا۔ ''مجھ سے ملنے کے لیے بے چین تھی...... وہ کیوں؟ خیریت؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔ ''لڑکی! تو اتنی بھولی تو نہیں ہو سکتی جتنی نظر آرہی ہے۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''عورت! نہ تو میں بھولی ہوں اور نہ ہی بھولی نظر آتی ہوں۔ جو بات کہنا ہے صاف صاف کسی تمہید کے بغیر کہہ دے۔''

کیفیہ نے فیروز بخت کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس سے میرا کیا رشتہ ہے، یہ تو تجھے معلوم ہی ہو گیا؟''

''ہاں، معلوم ہو گیا اور کچھ؟''

کیفیہ نے ترشی سے کہا۔ ''اور کچھ یہ کہ تو اس سے بالا ہی بالا اپنے معاملات نہیں طے کر سکتی۔ اگر تو نے یہ خطرناک کام کیا تو اس کے برے نتائج بھی بھگتے گی کیونکہ میں ان معاملات کو تسلیم ہی نہیں کروں گی۔''

فرخندہ نے فیروز بخت سے کہا۔ ''بخت! یہ عورت کیا کہہ رہی ہے، ذرا اس کا مطلب تو سمجھا مجھے۔''

فیروز بخت نے کیفیہ سے کہا۔ ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ خاموش رہیں اور دخل نہ دیں۔''

کیفیہ نے گرج کر جواب دیا۔ ''جب تک میں موجود ہوں تیرا کوئی ذاتی معاملہ ہو ہی نہیں سکتا۔'' پھر غصے میں اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''اسی وقت چل میرے ساتھ۔''

فیروز بخت نے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن نہ چھڑا سکا کیونکہ زور آوری میں کیفیہ کے ہاتھ کو تکلیف پہنچ سکتی تھی۔ وہ فیروز بخت کو گاڑی تک کھینچ کر لے گئی۔ فرخندہ حسرت و یاس اور غصے میں یہ منظر دیکھتی رہی۔ کیفیہ نے دور ہی سے فرخندہ کو حکم دیا۔ ''لڑکی! اپنے گھر واپس جا اور خبردار جو اب بھی اس سے ملنے کی کوشش کی۔''

فیروز بخت نے ایک بار پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور غصے میں کہا۔ ''میرا ہاتھ تو چھوڑیے، یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟ میں فرخندہ سے چند باتیں کر کے واپس آتا ہوں۔''

کیفیہ نے خنجر نکال لیا، بولی۔ ''فیروز بخت! مجھ سے ضد نہ کر اور میں حویلی سے یہ عہد کر کے نکلی ہوں کہ اگر تو نے یا کسی اور نے میرے معاملات میں دخل دیا تو میں اسے ٹھکانے لگا دوں گی۔ اس لیے تو خاموش ہو جا۔''

فیروز بخت خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کیفیہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اس نے ستار کو حکم دیا۔ ''حویلی واپس چل، جلد از جلد۔''

لیکن ستار تو فرخندہ کو سمجھانے میں مشغول تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تو نے بھی کس نوجوان کا انتخاب کیا ہے؟ کیا تیری برادری میں کوئی خوب صورت نوجوان نہیں ہے؟''

فرخندہ کٹ گئی، بولی۔ ''تو ملازم ہے تو ملازم ہی جیسی بات کر۔''

ستار نے جواب دیا۔ ''میں تو اپنی حیثیت اور اہلیت سے اچھی طرح واقف ہوں لیکن تو بھی اپنی حیثیت کو ہر وقت اپنے ذہن میں رکھ اور سوچ کہ کیا تو نے جو انتخاب کیا ہے وہ درست ہے؟''

فرخندہ کا دل بھر آیا۔ وہ برگد کی جڑ میں پھیلتی چلی گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ ستار اپنی گاڑی کی طرف بھاگا اور بھاگتے بھاگتے کہا۔ ''لڑکی! میری طرف سے بے فکر رہ لیکن میں نے اس خاندان کا نمک کھایا ہے اس لیے نمک حرامی نہیں کر سکتا۔''

اس کے بعد کسی ایک کو بھی بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ بڑی دیر کے بعد فیروز بخت نے گاڑی کے اندر سے جھانکا اور فرخندہ کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔

فرخندہ نیم مدہوشی میں ان کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ ان حالات میں فیروز بخت اپنا وعدہ پورا کرے گا یا نہیں؟

☆☆☆

حویلی میں اترنے کے بعد کیفیہ نے فیروز بخت سے کہا۔ ''میں تجھے کہاں سے لائی ہوں اس کا میں کسی سے ذکر نہیں کرنا چاہتی لیکن یہ بات میں تجھ سے ضرور پوچھوں گی کہ تیرا اس لڑکی سے کیا چکر چل رہا ہے؟''

فیروز بخت نے ہمت کر کے جواب دیا۔ ''میں آپ کو ایک بلیغ تنبیہ کر رہا ہوں کہ آپ اس میں مداخلت نہ کریں۔ میں نے فرخندہ سے شادی کا وعدہ کر لیا ہے اور میں بدعہدی نہیں کروں گا۔''

کیفیہ نے طنزاً پوچھا۔ ''اور شازیہ، یہ کس سے شادی کرے گی؟ اس کا کیا ہو گا؟''

''میں نہیں جانتا کہ اس کا کیا ہو گا۔ اس کی شادی ہو سکتی ہے۔ شازیہ کی شادی کر دیجیے۔''

''مگر کس سے...... اس کی شادی کس سے کر دوں؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں کیا بتاؤں؟''

کیفیہ نے غصے میں کہا۔ ''اے نوجوان! کان کھول کر سن لے، تیری شادی شازیہ ہی سے ہو گی۔ اگر تو نے شازیہ کے علاوہ کسی اور حسین مگر اعلیٰ حسب نسب کی حامل لڑکی کو دیکھا اور پسند کیا ہوتا تو میں کوئی اعتراض نہ کرتی لیکن کچھ بھی ہو، میں اس بھکارن کو نہیں برداشت کر سکتی۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں آپ پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر میں فرخندہ سے شادی نہ کر سکا

تو میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا۔ یہ میرا عہد ہے اور میں اس عہد پر پورا اتر کر دکھاؤں گا۔''

کنیز نے یہ تیور دیکھے تو نرمی سے کہا۔ ''اتنی جلدی کوئی قدم نہ اٹھا..... جا، ٹھنڈے دل سے پہلے غور کر لے۔ میں اس وقت تجھ سے کوئی بات نہ کروں گی۔''

فیروز بخت حویلی میں نہیں رکا، باہر نکل گیا۔ حویلی کے پھاٹک پر علی اس کے گھوڑے پر سوار دربانوں سے کچھ پوچھ رہا تھا لیکن اس کی جیسے ہی فیروز بخت پر نظر پڑی، بولا۔ ''تیرا یہ گھوڑا وہیں رہ گیا تھا۔ فرخندہ نے واپس بھیجا ہے۔''

فیروز بخت نے گھوڑا لے لیا اور بولا۔ ''شریف نوجوان! میری طرف سے اس کا شکریہ ادا کر دینا اور کہہ دینا کہ آج جو کچھ پیش آیا ہے، اس سے مایوس نہ ہو اور ہمت نہ ہارے۔ ہوگا وہی جو فرخندہ چاہے گی۔''

علی نے گھوڑے سے اتر کر گھوڑا فیروز بخت کے حوالے کر دیا۔ فیروز بخت نے پوچھا۔ ''تو واپس کس طرح جائے گا؟''

علی نے جواب دیا۔ ''میرے ساتھ میرا بھائی بھی آیا ہے۔ میں اس کے گھوڑے پر بیٹھ کر واپس چلا جاؤں گا۔''

اب فیروز بخت کو ستار کی تلاش تھی۔ ستار کچھ دیر بعد ہاتھ آیا۔ فیروز بخت نے افسوس سے کہا۔ ''ستار! افسوس کہ آج تک میرے دل میں تیرا جو مقام تھا تو وہاں قائم نہ رہ سکا۔''

ستار نے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میں مجبور تھا۔ بے بس اور عاجز..... مجھے ساتھ چلنے پر مجبور کیا گیا اس لیے میں چلا گیا۔''

فیروز بخت نے بدستور غصے میں کہا۔ ''کوئی بھی بہانہ کر سکتا تھا..... تو اس کو ٹال سکتا تھا۔''

ستار نے سر جھکا لیا۔ ''اگر میں خطاکار ہوں تو سزا دیجیے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں تجھے کیا سزا دوں گا۔ اگر تو میرے لیے مخلص ہے تو بتا اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

ستار نے نظریں چرائیں۔ ''اگر آپ مجھے اپنا مخلص اور ہمدرد سمجھتے ہیں تو میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ اس بھکارن کو بھلا دیں۔ اس سے قطع تعلق کر لیں کیونکہ اسی میں ہماری بہتری ہے۔''

فیروز بخت نے بے چینی سے جواب دیا۔ ''ناممکن، میں تیرا یہ مشورہ نہیں مان سکتا۔ آخر فرخندہ میں برائی کیا ہے؟''

ستار نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ ''اس میں برائی یہ ہے کہ وہ بھکارن ہے اور آپ ملک التجار مرحوم داؤد کے بھتیجے، منہ بولے بیٹے۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''انسان کی اس سے بڑی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس سے خود اس کی نسل نفرت کرنے لگے۔ میں نے کسی شیر کو نہیں دیکھا جو دوسرے شیروں کو کمتر سمجھے۔ میں نے بلی کو بلی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا۔ نسلی مساوات ہر کہیں مل جاتی ہے لیکن اگر نہیں ملتی تو انسانوں میں۔''

ستار کے پاس ایک ہی مختصر جواب تھا۔ ''وہ بھکارن آپ کے لائق نہیں ہے۔ آپ منصوبے کے مطابق میرے ساتھ سورت چلیے اور وہاں کوشش کیجیے کہ بھکارن آپ کے دل سے نکل جائے۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''لیکن میں اسے بھلا نہیں سکتا۔ تو مجھے منفی مشورہ کیوں دے رہا ہے حالانکہ میں نے مثبت مانگا تھا۔''

ستار نے خوشامد کی۔ ''میرے آقا! آپ نہیں سمجھ رہے کہ تقدیر آپ کے خلاف جا رہی ہے اور زمانہ ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ یہ سب آپ کو نہیں معلوم لیکن میں یہ باتیں محسوس کر رہا ہوں۔''

''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''آپ اپنے کاروبار میں دلچسپی لیجیے اور سورت چلے چلیے اور وہاں جہاز کا معاملہ کیجیے اور سورت کے انتظامی امور کو مضبوط کر کے واپس آ جائیے۔ اگر آپ نے میرے مشورے پر عمل کیا تو میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ آپ زندگی کا ہر معرکہ سر کر لیں گے اور ہر محاذ پر سرخرو رہیں گے۔''

فیروز بخت سوچتا رہا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے ستار کا مشورہ مان لینا چاہیے اور سورت چلے جانا چاہیے۔

وہ فرخندہ کو مطلع کیے بغیر سورت روانہ ہو گیا کیونکہ فرخندہ کی طرف سے اسے یقین تھا کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور سے محبت نہیں کر سکتی اور وہ اس کا انتظار کرے گی۔

وہ سورت پہنچا تو ہر طرف افراتفری دیکھی۔ اس کا کاروباری عملہ انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس کے ناظم اعلیٰ نے تاجر وصی احمد کے پاس نوکری کر لی تھی اور اب وہ سورت کے کاروباری حلقوں میں سب سے بڑا آدمی بن چکا تھا۔ وہ جس چینی جہاز کے سامان کا سودا کرنے آیا تھا، اس کو بھی وصی احمد خرید چکا تھا۔

فیروز بخت نے ستار کے ذریعے اپنے سابقہ ناظم اعلیٰ کو بلوایا اور اسے خاصا لالچ دیا کہ وہ اپنی سابقہ جگہ سنبھال لے تو اسے پہلے سے زیادہ مراعات دی جائیں گی لیکن ناظم اعلیٰ نے اس کی پیشکش کو ہنسی میں اڑا دیا، بولا۔ ''جناب! آپ نے دیر کر دی۔ اب تو نقشہ ہی بدل چکا ہے اور اگر میں

یہ کہوں کے حالات اور وقت آپ کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں تو غلط بات نہیں ہوگی۔"

اسے یاد آیا کہ یہی بات احمد آباد میں تھوڑے دنوں پہلے ستار نے بھی کہی تھی۔ اس نے کہا۔ "تو میری پیشکش پر ٹھنڈے دل سے غور کر میں تیرے جواب کا انتظار کروں گا۔"

ناظم اعلیٰ نے جواب دیا۔ "انتظار کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جو جواب میں نے آج دیا ہے، وہ کل بھی دوں گا اور یہی جواب کل کے بعد بھی ملتا رہے گا۔"

فیروز بخت جب بالکل مایوس ہو گیا تو اسے غصہ آ گیا، بولا۔ "اگر تو اپنی ضد پر قائم ہے تو قائم رہ...... میں بھی تیرے غرور کو اگر خاک میں نہ ملا دوں تو فیروز بخت نام نہیں۔"

فیروز بخت نے اپنے سورت کے عملے ہی میں سے ایک شخص کو ناظم اعلیٰ بنا دیا اور اسے اختیار دیا کہ وہ یہاں کے ہر کاروباری محاذ پر وصی احمد اور ناظم اعلیٰ کا مقابلہ کرے۔

لیکن سابقہ ناظم اعلیٰ کہیں زیادہ تجربہ کار انسان تھا۔ اس نے فیروز بخت اور اس کے عملے کو ہر ہر قدم پر شکست دی اور اس کے کچھ اور آدمی توڑ لیے۔ اس جھگڑے میں فیروز بخت کو چھ ماہ لگ گئے۔ وقت جیسے جیسے گزر رہا تھا فیروز بخت کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ کاروباری ناکامیوں کے ساتھ ساتھ اسے فرخندہ کی طرف سے بھی شک و شبہ اور مایوسی پیدا ہو رہی تھی۔ جب وہ تنہائی میں فرخندہ کے احساسات پر غور کرتا تو بڑی کوفت ہوتی اور دل لرز جاتا۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں فرخندہ نے مایوس ہو کر اپنا فیصلہ ہی نہ بدل دیا ہو۔

سورت میں پریشانیوں اور ناکامیوں نے فیروز بخت کو پژمردہ کر دیا اور اس نے ستار سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب وہ سورت میں ایک دن بھی نہیں ٹھہرے گا لیکن ستار برابر یہی سمجھا رہا تھا۔ "میرے آقا! ہمت سے کام لیجیے، حوصلہ رکھیے۔ ناکامیاں اور مایوسیاں کوئی چیز نہیں، ہمت مرداں مدد خدا۔"

لیکن وہ ہمت ہار چکا تھا۔ وہ ستار کے مشورے کو پس پشت ڈالتا ہوا احمد آباد روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک منزل پر جب وہ رات کو سویا ہوا تھا، اس نے خواب میں داؤد مرحوم کو اداس اور افسردہ اپنے پاس کھڑے دیکھا۔ وہ فیروز بخت سے شکایتاً کہہ رہا تھا۔ "فیروز بخت! تو نے عشق کے چکر میں میرے کاروبار کو تباہ و برباد کر دیا۔ کیا تو نے مجھ سے شادی نہ کرنے کا عہد نہیں کیا تھا؟"

ابھی وہ داؤد کو جواب بھی نہ دے سکا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ سرہانے ایک دیا روشن تھا، اس سے ذرا فاصلے پر ستار خراٹے لے رہا تھا۔ باہر کہیں دور سے کتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ آہستہ سے بستر چھوڑ کر خیمے سے باہر نکل گیا۔ باہر تاجروں اور مسافروں کے خیمے دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ قافلے کے طلایہ گرد یا تو خیموں کے چاروں طرف گھوم پھر رہے تھے یا پھر خیموں کے چاروں طرف آگ روشن کیے رات گزرنے کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ کچھ دیر اپنے خیمے کے در پر اندھیرے میں کھڑا داؤد کی بابت سوچتا رہا۔ اسے خواب سے یہ بات تو معلوم ہو گئی تھی کہ داؤد کی روح اس سے خوش نہیں ہے۔ وہ دوبارہ خیمے میں داخل ہو گیا اور دیے کی کمزور روشنی میں داؤد کو تلاش کرنے لگا۔ اس کا دل بار بار یہی سمجھا رہا تھا کہ داؤد مرحوم کی روح اسی خیمے میں اس کے آس پاس کہیں موجود ہے۔ اس نے داؤد کو خیمے میں موجود فرض کر کے جواب دیا۔ "اگر آپ نے شادی نہ کی ہوتی تو میں بھی اس سے دور رہتا لیکن آپ خود سوچیں کہ شادی کے بعد آپ نے مجھے بھی شادی کی اجازت دے دی تھی۔"

اسے معلوم نہیں کیوں رہ رہ کر داؤد مرحوم پر غصہ آ رہا تھا پھر اچانک اسے یوں محسوس ہوا گویا داؤد مرحوم کی شعلہ بار آنکھیں اسے غصے سے گھور رہی ہیں۔ اس نے زور زور سے کہنا شروع کیا۔ "آپ کا کاروبار، دولت، جائداد اور آپ کی بیویاں اور ان کے متعلقین میرے حق میں مصیبت ثابت ہو رہے ہیں۔ میں ان سے عاجز آ چکا ہوں۔ میں اکتایا ہوا ہوں۔ جھگڑے، لوگوں کی چالاکیاں، اندیشے اور خدشے ان باتوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ میں کیا کروں آخر...... میں کیا کروں؟"

اس کی باتوں سے ستار کی آنکھ بھی کھل گئی۔ پوچھا۔ "میرے آقا! کیا آپ جاگ رہے ہیں؟"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "ہاں، میں جاگ رہا ہوں۔ کیوں کوئی خاص بات؟"

ستار نے کہا۔ "میرے آقا! میں نے اپنے بڑے آقا کو ابھی ابھی خواب میں اپنے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ کہہ رہے تھے ستار تو اپنے آقا کو سمجھا کہ وہ بھکارن کے عشق میں میری زندگی بھر کی محنتوں کو کیوں ضائع کرنے پر تل گیا ہے۔"

فیروز بخت نے منہ بنا کر تختی سے پوچھا۔ "میں مرحوم کی جائداد اور دولت کو ٹھوکر مارتا ہوں۔ مرحوم نے آخر مجھے سمجھا کیا ہے؟"

ستار اپنا بستر چھوڑ کر فیروز بخت کے پاس چلا گیا۔ ''میرے آقا! مجھے ایسا لگتا ہے جیسے بڑے آقا مرحوم کی روح اس وقت اس خیمے میں موجود ہے۔'' اس کے بعد اس نے گویا مرحوم آقا کو مخاطب کیا۔ ''آقائے مرحوم! کیا آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے کاروبار، مال وزر، دولت اور جائداد پر دوسروں کا تصرف اور اختیار بڑھ گیا ہے اور ان سب کی یہ کوشش ہے کہ وہ فیروز بخت کو ان سب سے محروم کردیں، آپ فیروز بخت کی مدد کیجیے۔''

فیروز بخت نے مسکرا کر کہا۔ ''تیرے مرحوم آقا کی روح میری کیا مدد کرے گی بلکہ مجھے تو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ داؤد نے مجھے مایا جال میں پھنسا کر کوئی سزا دی ہے۔ میں اس مایا جال کو توڑ دوں گا۔ ستار! تو فکر نہ کر، میں اس جال میں زیادہ دنوں اسیر نہیں رہوں گا۔''

ستار نے دعائیہ انداز میں آمین کہا۔

دوسرے روز علی الصباح قافلے کے ساتھ فیروز بخت اور ستار احمد آباد روانہ ہوگئے۔ منشی اور اہل کار کو احمد آباد ہی میں چھوڑ دیا گیا۔ کئی دن بعد سرخ کھپریلوں کی چھتیں نظر آنے لگیں اور یہ لوگ احمد آباد میں داخل ہوگئے۔ اب فیروز بخت کا فیصلہ بدل چکا تھا۔ اس نے ستار کو بطور خاص سمجھایا۔ ''ستار! میں تیرے ساتھ حویلی نہیں جاؤں گا میں کہیں اور جاؤں گا۔ تو میری عدم موجودگی میں حویلی والوں کو میری طرف سے مطمئن رکھنے کی کوشش کرے گا۔''

ستار نے پوچھا۔ ''میرے آقا! اس وقت آپ کہاں جارہے ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ستار! میں اب تجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤں گا۔ مجھے ہواؤں میں فرخندہ کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ اب میں سیدھا اسی کے پاس جاؤں گا کیونکہ میں کئی محاذوں پر شکست اٹھانے کے بعد اپنے آپ میں اتنا حوصلہ نہیں پاتا کہ فرخندہ والے محاذ پر بھی ناکام رہوں۔''

ستار لاجواب ہوگیا۔ ''خدا حافظ میرے آقا۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے مگر مصائب اور بدقسمتی کا کوندا لپک رہا ہے اور اس سے ایسا لگتا ہے کہ طوفان کہیں قریب ہی موجود ہے اور کسی وقت اچانک ظاہر ہوسکتا ہے۔''

فیروز بخت نے ستار کی پوری بات نہیں سنی اور اپنے گھوڑے کو پتوہ آباد کی طرف سرپٹ دوڑا دیا۔ وہ بھکاریوں کی بستی سے پہلے ہی گھوڑے سے اتر پڑا اور لگام پکڑ کر پیدل چلنے لگا۔ عورتوں اور بچوں نے اپنے درمیان اس اجنبی کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور ذرا سی دیر میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ فرخندہ کا چاہنے والا مہینوں غائب رہنے کے بعد اچانک آگیا ہے۔ ایک بڑے میاں لاٹھی ٹیکتے ہوئے فیروز بخت کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے اور جھریوں والا چہرہ اوپر اٹھا کر چندھی آنکھوں سے فیروز بخت کو دیکھا اور حقارت سے پوچھا۔ ''تو آگیا؟''

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''فرخندہ کہاں ہے؟''

بڑے میاں نے جواب دیا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔ ''وہ کہاں چلی گئی؟''

بڑے میاں نے نفرت سے کہا۔ ''تیرے سوالوں کے جواب میرے پاس نہیں ہیں۔ تو برادری کے سرپنچ سے مل لے، وہی تیرے سوالوں کے جواب دے سکے گا۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''پھر اپنی برادری کے سرپنچ ہی کے پاس لے چل مجھے۔''

بڑے میاں نے ایک لڑکے کو پاس بلا کر حکم دیا۔ ''اسے سرپنچ کے پاس پہنچادے۔''

لڑکے نے فیروز بخت کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کے لیے کہا۔ ایک دروازے پر پہنچ کر فیروز بخت نے اسے پہلی نظر میں پہچان لیا کہ یہ بوڑھا برادری کا سرپنچ اور فرخندہ کا دادا ہے۔ لڑکے نے کہا۔ ''اپنا گھوڑا یہیں کسی درخت سے باندھ دے اور اندر آجا۔''

فیروز بخت نے گھوڑے کو املی کے درخت سے باندھ دیا اور خاموشی سے بوڑھے کے ساتھ اندر چلا گیا۔ یہ مکان باہر سے جتنا بوسیدہ اور شکستہ نظر آتا تھا، اندر سے اتنا ہی صاف ستھرا اور شاندار تھا۔ بوڑھے نے اس کو جس کمرے میں بٹھایا تھا وہ نہایت آراستہ تھا۔ فرش پر نہایت قیمتی قالین بچھا ہوا تھا اور طاقوں میں چاندی کے برتن رکھے ہوئے تھے اور چھت سے چند بالشت نیچے چاروں طرف دیواروں پر بیل بوٹوں کی پٹیاں تھیں۔

ایک گوشے میں ایک چوڑی چوکی بچھی ہوئی تھی۔ جس پر دری اور سفید چادر بچھی ہوئی تھی جو اتنی صاف تھی کہ داغ دھبے کا کوئی شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ کہیں ذرا سی شکن تک نہیں تھی۔ چوکی پر طشت نما موبج کی بڑی بڑی ڈلیوں میں پھل رکھے تھے اور ایک طشت میں خشک میوہ بھی سجا ہوا تھا۔ ایک دوسری چوکی کے بالمقابل گوشے میں قالین کے اوپر گلابی رنگ کا غالیچہ بچھا ہوا تھا۔ یہیں چھوٹے بڑے گاؤ تکیے بھی رکھے تھے۔ فیروز بخت یہاں کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر اتنا حیران ہوا کہ اس کے ہوش وحواس بجا نہ رہے۔ بوڑھے نے اس کی بدحواسی اور حیرت سے بڑا حظ اٹھایا بولا۔ ''ادھر

بیٹھ جا کھڑا کب تک رہے گا؟''
فیروز بخت نے کھسیا کر بوڑھے کی طرف دیکھا۔ بوڑھا ایک گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ چکا تھا۔ اس کے پاس ہی فیروز بخت بھی بیٹھ گیا۔
بوڑھے نے کہا۔ ''شاید تو اس کمرے میں آ کر حیرت زدہ رہ گیا ہے؟''
''بے شک۔'' فیروز بخت نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا کہ اس وقت میں فرخندہ کے دادا کے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے تو یہ کمرا کسی مغل بادشاہ یا گجرات کے کسی فرماں روا کا نظر آتا ہے حالانکہ یہ مکان باہر سے نہایت شکستہ اور بوسیدہ ہے۔''
بوڑھے نے پھلوں کی ڈلیاں اور طشت اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ ''انہیں کھاتا بھی جا اور باتیں بھی کرتا رہ۔''
فیروز بخت نے معذرت کی۔ ''شکریہ، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ فرخندہ کہاں ہے؟''
بوڑھے نے جواب دیا۔ ''اب فرخندہ کی بات نہ کر نوجوان تاجر۔''
فیروز بخت کا دل بیٹھنے لگا۔ ''کیوں؟ وہ کہیں چلی گئی یا پھر اس کی کسی اور سے......''
بوڑھے نے بات کاٹ دی۔ ''بس بس، میں نے کہہ جو دیا کہ اب فرخندہ کی بات ہی نہ کر۔ وقت گیا بات گئی۔''
فیروز بخت نے کہا۔ ''تو فرخندہ کا دادا ہے اور تو ہم دونوں کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا ہے کہ میں نے برادری اور پنچوں کے سامنے اس کی عائد کردہ شرط پر پورا اترنے کا وعدہ کیا تھا اور وعدہ کر کے ایک دم چھ سات ماہ کے لیے غائب ہو گیا اور تیری نظر میں میرا یہی قصور ہے جس کی سزا میں تو مجھ سے بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ میں فرخندہ کی بات ہی نہ کروں۔''
بوڑھے نے نفرت سے کہا۔ ''کیا یہ قصور میری نفرت کے لیے کافی نہیں ہے؟''
فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''بے شک کافی ہے لیکن میں نے فرخندہ سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر میں بتائے بغیر ہی کچھ عرصے کے لیے غائب ہو جاؤں تو وہ پریشان نہ ہو چنانچہ میں اپنی کاروباری مصروفیات میں ایسا الجھا کہ چھ سات ماہ کے لیے احمد آباد ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب میں آگیا ہوں اور فرخندہ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اب بھی مجھے بھولی نہیں ہے اور میرے عہد و پیمان پر تکیہ کیے ہوئے ہے تو میں ہر آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ جو حکم دے گی میں تعمیل کروں گا۔''
بوڑھے نے بیزاری سے کہا۔ ''تم دونوں نے کیا عہد کر رکھا ہے میں نہیں جانتا۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ تو نے برادری اور پنچوں کے سامنے جو وعدہ کیا تھا، اس سے منحرف ہو گیا۔''
''یہ بات نہیں ہے، اگر ایسی کوئی بات تھی تو، تو اس وقت مجھے اس کمرے میں بیٹھا ہوا نہ دیکھتا۔''
بوڑھے نے کہا۔ ''تجھے کیا معلوم کہ غریب فرخندہ کو تیری مفقود الخبری نے کتنا پریشان کر رکھا تھا۔ وہ تیری طرف سے بالکل مایوس ہو گئی تھی اور اس مایوسی میں مالوے چلی گئی۔ اس کا باپ اس کے ساتھ ہے۔ وہ تین چار مہینے مالوے میں رہ کر واپس آئے گی۔''
فیروز بخت کا دل ڈوبنے لگا۔ ''کہیں وہ مالوے میں کسی نوجوان سے شادی تو نہیں کرے گی؟''
بوڑھے نے جواب دیا۔ ''عین ممکن ہے۔''
فیروز بخت نے پوچھا۔ ''یہ تین چار ماہ کی مدت کب ختم ہو گی؟''
دادا نے جواب دیا۔ ''کب کی ختم ہو چکی۔ اب تو ان دونوں کو یہیں ہونا چاہیے تھا۔''
فیروز بخت نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کیا جائے؟
بوڑھے نے نہایت فاخرانہ شان سے کہا۔ ''جب تو اچانک غائب ہو گیا اور مہینوں تیری کوئی خبر نہ ملی تو ہم سب اسی نتیجے پر پہنچے کہ تو دریوزہ گری سے بھاگ نکلا ہے حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہماری برادری کے لوگ بھکے بھوکے نہیں ہیں۔ ہمارا آبائی پیشہ ہی دریوزہ گری ہے پھر ہم لوگ اپنے آبائی پیشے کو کس طرح ترقی دیتے رہے ہیں۔ آج ہم لوگ بھی اپنے پیشے کے اعتبار سے معزز لوگ ہیں۔ اس لیے تجھے یا کسی اور کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ خود کو بڑا اور اعلیٰ وارفع سمجھ کر ہمیں حقیر اور ذلیل سمجھے۔''
فیروز بخت نے پوچھا۔ ''تو ہی بتا اب میں کیا کروں؟ بہرحال یہ بات میں تیرے علم میں بھی لا رہا ہوں کہ اب میں تیری اور تیری برادری کی عائد کی ہوئی آزمائش سے گزرنے کے لیے اور ہر کام کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہوں۔''
بوڑھے نے پھل فیروز بخت کی طرف رکھ دیے اور کہا۔ ''انہیں بھی تو کھا۔ تو کھاتا کیوں نہیں؟''
فیروز بخت نے تکلفاً ایک سیب اٹھا لیا اور بچوں کی طرح دانت سے کاٹ کر کھانے لگا۔ منہ چلاتے ہوئے ذرا سی کراہیت بھی ہوئی کہ وہ بھیک کی کمائی کا پھل کھا رہا ہے

لیکن اپنی اس کراہیت کو یہ سوچ کر دبا گیا کہ اگر بوڑھے نے اسے محسوس کر لیا تو اسی وقت اسے چلتا کر دے گا۔

بوڑھا اسے تنہا چھوڑ کر اندر چلا گیا اور دوبارہ جب واپس آیا تو فرخندہ اس کے ساتھ تھی۔ فرخندہ کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر فیروز بخت سٹپٹا گیا۔ احتراماً کھڑا ہو گیا، بولا۔ ''فرخندہ! تو کہاں تھی؟''

فرخندہ کا چہرہ ستا ہوا تھا اور ایک نظر میں یہ پتا چل گیا کہ وہ بیمار ہے۔ اس نے پھیکی اور افسردہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''خوب، یہ سوال تو مجھے کرنا تھا کہ تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟''

بوڑھے نے فرخندہ سے کہا۔ ''فرخندہ! تو اس چالاک اور فریبی نوجوان سے باتیں کر، میں ذرا دیر میں آتا ہوں...... اور ہاں باتوں کے دوران اس کو سب بتا دینا۔ میں نے تیرے لیے مالوے کے ایک امیر زادے کو پسند کر لیا ہے، جو تیری خاطر ایک سال تک بھیک مانگنے کو تیار ہے۔''

بوڑھا چلا گیا۔ فرخندہ نے کہا۔ ''بخت! تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟ سچ بات تو یہ ہے کہ برادری کے دوسرے لوگوں کی طرح میں خود بھی مایوس ہو گئی تھی۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''جب میں نے تجھے یہ جتا دیا تھا کہ اگر کچھ عرصے کے لیے بغیر بتائے کہیں چلا جاؤں تو، تو گھبرائے گی نہیں کیونکہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور تیری برادری کی عائد کردہ آزمائش سے گزر کر تجھ کو حاصل ضرور کروں گا۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''مجھے یاد پڑتا ہے کہ تو نے یہ بات کہی ضرور تھی لیکن مجھے یاد نہیں رہی۔''

فیروز بخت نے کسی قدر خوش ہو کر کہا۔ ''اگر میری یہ بات تجھے یاد نہیں رہی تو اس کی تمام ذمے داری کس کے سر ہو گی؟ میں تو بے قصور ٹھہرا۔''

فرخندہ روہانسی ہو گئی۔ ''ساری ذمے داریاں مجھ پر ڈال دے۔ ماں، بابا، دادا، برادری کے پنچ اور پوری برادری ہر کوئی مجھ ہی کو ذمے دار ٹھہراتا ہے۔ تو آیا ہے تو، تو بھی مجھ ہی کو موردِ الزام قرار دے رہا ہے۔''

فیروز بخت نے کسی قسم کی پروا کیے بغیر اپنے رومال سے فرخندہ کے آنسو پونچھنے شروع کر دیے۔ ''اگر تو یہ چاہتی ہے کہ میں اپنی کوتاہی کی ذمے داری قبول کر لوں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔''

فرخندہ نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے فیروز بخت کو دیکھا۔ ''اب تو یہاں کیا لینے آیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ چھ ماہ کی آزمائش سے کامیاب گزر کر تجھے حاصل کر لوں لیکن ابھی ابھی تیرے دادا کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مالوے کا کوئی امیر زادہ بھی تیرا طلب گار ہے اور وہ ایک سال کی آزمائش سے گزرنے کو تیار ہے۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''پھر اب تو کیا کہتا ہے؟''

فیروز بخت نے مایوسی سے کہا۔ ''پھر یہ کہ اگر بات بالکل ہی ختم ہے تو میرا یہاں مزید رکنا بیکار ہے۔ میں فوراً ہی واپس چلا جاؤں گا لیکن اگر کوئی گنجائش ہے اور مالوے کے امیر زادے پر مجھے ترجیح دی جا سکتی ہے تو میں خود بھی اس امیر زادے کی طرح چھ ماہ کے بجائے ایک سال تک بھیک مانگنے کو تیار ہوں۔''

فرخندہ فرطِ جذبات میں اس سے چمٹ گئی۔ ''کیا سچ؟ کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''نہیں، تو خواب نہیں دیکھ رہی۔ میں فیروز بخت تیرے سینے سے لگا کھڑا ہوں اور تجھے یہ یقین دلا رہا ہوں کہ میں تیری خاطر آگ کے سمندر کو بھی عبور کر سکتا ہوں۔''

فرخندہ کا سر فیروز بخت کے سینے سے لگا ہوا تھا۔ ''یہ وعدہ کر کے جب تو اپنی حویلی واپس جائے گا تو پھر واپسی کب تک ہو گی؟''

فیروز بخت نے اس کے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔ ''اب میں حویلی نہیں جاؤں گا۔ میں آزمائش سے گزرنے کے لیے تیار ہوں۔''

فرخندہ اور جوش میں آ گئی۔ ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تو مجھے واقعی چاہتا ہے اور حاصل کر لے گا۔''

مالوے کا امیر زادہ کانٹے کی طرح فیروز بخت کے دل میں چبھ رہا تھا بولا۔ ''پھر اس امیر زادے کا کیا بنے گا؟''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''کچھ بھی نہیں، میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا۔ میں صاف صاف کہہ دوں گی کہ مجھے وہ امیر زادہ پسند نہیں آیا۔''

کچھ دیر بعد فرخندہ کا دادا واپس آیا۔ اب اس کے ساتھ فرخندہ کا باپ بھی تھا اور اس کی ماں بھی۔ ماں نے فیروز بخت کو تیز اور بے مروت نظروں سے دیکھا۔ فرخندہ سے پوچھا۔ ''یہ ابھی تک تیرے پاس ہی موجود ہے۔ اسے چلتا کیوں نہیں کر دیا؟''

فرخندہ نے تینوں کو مخاطب کیا۔ ''میرے بزرگو! اس وقت میں بہت خوش ہوں اور اس خوشی کی وجہ یہ ہے کہ فیروز

بخت نے مجھ سے وعدہ کرلیا ہے کہ مالوے کے امیرزادے کی طرح یہ بھی ایک سال تک بھیک مانگے گا۔ میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔ اگر یہ اس شرط پر پورا اترا تو میں اس سے شادی کرلوں گی اور اس شادی پر برادری کا کوئی شخص بھی اعتراض نہیں کرے گا۔''

ماں نے غصے میں کہا۔ ''اس کی باتوں پر تو یقین کرے تو کرے، میں یقین نہیں کرسکتی۔ اس لیے اب مزید وقت ضائع کرنا عقلمندی نہیں ہے۔ مالوے کا امیرزادہ اس کے مقابلے میں ہرلحاظ سے موزوں ہے۔''

دادا نے کہا۔ ''فرخندہ! میں تیرا دادا ہی نہیں اپنی برادری کا سرپنچ بھی ہوں اس لیے تیرے لیے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ اپنے شوہر کے انتخاب میں تو عجلت اور جذبات سے کام نہ لے۔''

فرخندہ نے سختی سے کہا۔ ''معاملہ میرا ہے اس لیے فیصلہ بھی میں ہی کروں گی۔ افسوس کہ میں بخت پر کسی بادشاہ کو بھی ترجیح نہیں دے سکتی۔''

فیروز بخت نے فرطِ جوش میں فرخندہ کا ہاتھ پکڑلیا۔ ''فرخندہ! میں تیرا شکرگزار ہی نہیں، احسان مند بھی ہوں کہ تو نے بادشاہ تک پر مجھے ترجیح دے دی ہے۔''

فرخندہ کی آنکھوں میں آنسو آچکے تھے۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تو کل ہی سے اپنا کام شروع کردے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''بہتر ہے۔ اللہ نے چاہا تو میں تجھے مایوس یا شرمندہ نہیں کروں گا۔''

دادا نے فرخندہ کی ماں اور باپ کو حکم دیا۔ ''اب تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں فیروز بخت کی حمایت کروں گا۔ میں اس نوجوان میں شرافت اور خوئے وفاداری کی بو محسوس کررہا ہوں۔'' اس کے بعد دادا نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ ''اور اب تم دونوں بھی میری بات ذرا غور سے سنو۔''

دونوں ہمہ تن گوش ہوگئے۔

دادا نے کہنا شروع کیا۔ ''ملک التجار داؤد کے بیٹے! دنیا کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ تم دونوں نے آپس میں جو بھی عہد کیا ہو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن میں......''

فرخندہ نے دادا کی بات کاٹ دی۔ ''دادا آپ بخت کو نصیحتیں نہ کیجیے کیونکہ یہ سردست ہمارا مہمان ہے۔ آپ جو کچھ کہنا چاہیں مجھے کہہ لیں۔ میں اپنے مہمان کی دل آزاری نہیں ہونے دوں گی۔''

دادا کو ہنسی آگئی۔ ''شریر لڑکی، چل میں تیری خوشی میں اس تاجرزادے کو کوئی نصیحت نہیں کروں گا۔'' پھر فیروز بخت سے کہا۔ ''نوجوان! تو خوش قسمت انسان ہے جس کو فرخندہ جیسی وفاشعار اور محبت کرنے والی لڑکی ملے گی۔ سن، میں فرخندہ کو جو نصیحت کررہا ہوں اس سے تو بھی فائدہ اٹھاسکتا ہے۔'' فرخندہ اپنے دادا کی چالاکی پر مسکرادی۔

دادا نے کہا۔ ''فرخندہ! استقلال اور وفاداری ساری زندگی یہی دو اوصاف انسان کے کام آتے ہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ جو فیصلہ بھی کرے خوب سوچ سمجھ کر کرے اور جب کوئی فیصلہ کرچکے تو اس پر استقلال اور وفاداری سے قائم رہے...... نفع نقصان کی پروا کیے بغیر۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔ اللہ نے چاہا تو اب میں خود کو شرمندہ اور آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔''

دادا یہ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ ''تب پھر میری بھی یہی دعا ہے کہ تم دونوں ہمیشہ خوش وخرم رہو۔''

☆☆☆

رات کو دونوں بستی سے ذرا دور ایک کنوئیں کی جگت پر بیٹھ گئے۔ دونوں نے باری باری کنوئیں میں جھانک کر دیکھا اور بچوں کی طرح زور زور سے ہنسنے لگے لیکن فرخندہ نے محسوس کیا کہ فیروز بخت کی ہنسی میں بے ساختگی نہیں ہے۔ اس میں کوئی سوچ کوئی فکر بھی شامل ہے۔ پوچھا۔ ''بخت! کیا بات ہے؟ میرا خیال ہے تو اس وقت کہیں اور ہے؟''

فیروز بخت نے کہا۔ ''فرخندہ! اس وقت ہم دونوں تنہا ہیں، یہاں کوئی تیرا نہیں ہے۔ میں تیری برادری کے پیشے پر تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

فرخندہ نے فکروتشویش سے فیروز بخت کو دیکھا۔ ''میری برادری کے پیشے پر؟ کرباتیں میں بہت شوق سے کروں گی۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''باتیں کرنے سے پہلے میں تجھے یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں نے تجھ سے... تیرے دادا اور برادری سے جو عہد کیا ہے اس پر کل سے عمل درآمد شروع ہوجائے گا لیکن ایفائے عہد سے پہلے میں اپنے ضمیر اور اپنی انا کی تسکین کے لیے چند وضاحتیں چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ تو یا تیری برادری کا کوئی دانا مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرے گا۔''

فرخندہ نے بے صبرے پن سے کہا۔ ''دیرنہ کر جو کچھ کہنا ہے جلد از جلد کہہ ڈال...... میرے صبروتحمل کا امتحان نہ لے۔''

فیروز بخت نے سنبھل سنبھل کر کہا۔ ''تیری برادری اپنے بھیک مانگنے کے پیشے پر نازاں کیوں رہتی ہے؟ بھیک مانگنے کو اگر پیشوں میں شمار کرلیا جائے تب بھی اس کے معزز

ہونے میں تو شبہ باقی رہے گا۔"

فرخندہ نے آہستہ سے ہنکاری بھری اور کہا۔ "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو اب بھی پس و پیش اور تذبذب کا شکار ہے، یعنی میں اب بھی تیرے عہد پر یقین نہیں کر سکتی۔"

فیروز بخت نے جواب دیا۔ "نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ میں نے تجھ سے جو کہہ دیا کہ میں اپنے عہد پر کل ہی سے عمل شروع کر دوں گا لیکن اس سے پہلے اگر ممکن ہو تو میرے ضمیر اور انا کو مطمئن کر دیا جائے۔ اس طرح میں اپنی آزمائش سے نہایت فاتحانہ شان سے گزر جاؤں گا ورنہ ایک کانٹا سا چبھتا رہے گا۔"

فرخندہ نے کہا۔ "شاید تجھے معلوم نہیں کہ پیشہ حبیب اللہ ہوتا ہے۔ شاید تو یہ بھی نہیں جانتا کہ میری برادری کا پیشہ اپنے تقدس کے اعتبار سے دنیا کے تمام پیشوں سے افضل ہے۔ اس پیشے میں جھوٹ، عیاری اور مکاری شامل نہیں۔ پھر یہی وہ پیشہ ہے جو پانڈو نے اپنے بارہ سالہ بن باس میں اختیار کر لیا تھا اور یہی وہ پیشہ ہے جس کو گوتم بدھ نے اختیار کیا تھا اور اس کے پیرو نہایت فخر اور شان سے خود کو بھکشو کہا کرتے تھے۔ اتنے بڑے لوگ بھکشو بن کر حقیر تو نہیں ہو گئے تھے۔ جب ان کی بڑائی اور عظمت میں شبہ نہیں کیا جاتا تو میری برادری کس طرح حقیر اور ذلیل ہو سکتی ہے۔"

فیروز بخت لاجواب ہو گیا۔ کچھ سکوت کے بعد کہا۔ "اچھا فرخندہ! میں تجھ سے ایک رعایت چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا؟ اگر ممکن ہوئی تو ضرور دی جائے گی۔"

فیروز بخت نے کہا۔ "میں احمد آباد میں بھیک نہیں مانگ سکتا، اس کام کے لیے مجھے کہیں اور بھیج دیا جائے۔"

فرخندہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہ کوئی خاص بات نہیں۔ تو جہاں بھی جائے گا، تنہا نہیں جائے گا۔ تیرے ساتھ برادری کے چند اور لوگ بھی جائیں گے تاکہ وہ بھیک مانگنے کے آداب سکھا سکیں۔ تو ہماری تربیت کے بغیر یہ کام نہیں کر سکتا۔"

وہ دونوں رات کے اندھیرے میں بڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے کیونکہ وہ دونوں خوب جانتے تھے کہ اس رات کے بعد وہ دونوں ایک سال کے لیے جدا ہو جائیں گے۔

دوسرے دن صبح فیروز بخت بھکاری برادری کے دو آدمیوں کے ساتھ مالوے روانہ کر دیا گیا۔ انہی دونوں سے فیروز بخت کو یہ گر کی بات معلوم ہوئی کہ وہ عام بھکاریوں سے ذرا مختلف لوگ ہیں۔ یہ ہمیشہ امراء تجار اور نوابوں کو بھیک کے لیے پسند کرتے تھے۔ کسی بھی طرح جوڑ توڑ کر کے خاص خاص امراء اور دوسرے اہل مال و زر کو اپنا مربی اور گاہک بنا لیتے تھے اور وہاں اپنے لیے سالانہ یا ماہانہ ایک رقم مخصوص کروا لیتے تھے۔ ان کا کام بس اتنا ہوتا تھا کہ وقتِ مقررہ پر ان دروں پر پہنچ کر اپنا حصہ حاصل کر لیں۔ اس طرح انہیں بھیک میں نہ صرف خاصا مال و زر مل جاتا تھا بلکہ دوسری چیزیں بھی ہاتھ آ جاتی تھیں۔ کپڑے، برتن، کمبل اور روزمرہ کے استعمال کی اشیا، اناج، پھل، خشک میوہ اور معلوم نہیں کیا کیا۔ یہ بھکاری جب اپنا دورہ مکمل کر کے اپنی برادری میں لدے پھندے واپس آتے تھے تو بڑا جشن منایا جاتا تھا۔

فیروز بخت کو راستے بھر بڑی شرم دامن گیر رہی اور وہ حوصلہ شکنی میں مبتلا رہا۔ جس قافلے میں وہ سفر کر رہا تھا، اس میں چند صراف اور سوداگر بھی تھے۔ فیروز بخت کے ایک ساتھی نے اس سے کہا۔ "موقع اچھا ہے تو اسی وقت سے بسم اللہ کر دے۔"

فیروز بخت نے پوچھا۔ "میں ان سے کس طرح بھیک مانگوں گا؟"

ساتھی نے جواب دیا۔ "تو انسانی سرشت کے چند نکتے ذہن نشین کر لے، ان کی روشنی میں تو کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھے گا۔"

فیروز بخت نے پوچھا۔ "کون سے نکتے مثلاً؟"

ساتھی نے جواب دیا۔ "انسان بنیادی طور پر خود غرض ہے۔ یہ دوسروں کے ساتھ جو مہربانیاں، نوازشیں یا سلوک کرتا ہے تو اس وقت جب اس کو اپنی انا یا ہیجانی کیفیت کو سکون پہنچانا ہوتا ہے، آدمی میں ایک جذبہ ہوتا ہے رحم اور ہمدردی کا۔ اگر تو ہٹا کٹا بن کے کسی سے بھیک مانگے گا تو تجھے جھڑک دیا جائے گا۔ تجھے گالیاں دی جائیں گی، لعنت ملامت کی جائے گی کیونکہ صحت مند آدمی کے بھیک مانگنے سے آدمی میں اس کا جذبہ رحم بیدار نہیں ہوتا لیکن اگر یہی ہٹا کٹا اور صحت مند انسان کسی بھی طرح خود کو بیمار، مفلوج، اپاہج یا معذور ثابت کر کے بھیک مانگے گا تو اپنے مقابل انسان میں جذبہ رحم اور ہمدردی بیدار کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ دینے والا ایسے بھکاری کو جو کچھ بھی دیتا ہے اپنی ہیجانی اور انتشاری کیفیت کو تسکین پہنچانے کی خاطر دیتا ہے جس سے انسان کی خود غرضی کا پتا چلتا ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انسان میں حد درجہ انانیت ہوتی ہے، اس انانیت اور خود پسندی یا خود پرستی کی تسخیر خوشامد سے ہوتی

ہے۔ خود پسندی اور انانیت کو خوشامد سے تسکین پہنچا کر مطلب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ بس یہی دو موٹی موٹی حقیقتیں ہیں جو ہمارے پیشے کی اساس ہیں۔ بہترین بھکاری بہترین ذہن کا حامل ہوتا ہے۔''

فیروز بخت کو ابھی تک ان بھکاریوں کی عقل کا اتنا بڑا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

بھکاری ساتھی فیروز بخت کی حیرت اور پریشانی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، بولا۔ ''ایک بات اور...... شرم و حیا نام کی کمزوریوں سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کر لینا اور جس دریا دل شخص سے کوئی مطالبہ کیا جائے جب تک مطلب حاصل نہ ہو جائے پیچھا نہ چھوڑا جائے کیونکہ مستقل مزاجی کے بغیر ذہانت کچھ بھی نہیں۔''

ان ہدایات اور نصیحتوں پر عمل کر کے فیروز بخت نے وہ کامیابی حاصل کی جس سے وہ ابھی تک محروم تھا۔ شروع شروع میں تو وہ خاصا پریشان اور بدحواس رہا لیکن رفتہ رفتہ اپنی اس پریشانی پر قابو پا لیا اور اس نے جس شکار کا انتخاب کیا، اسے اپنی مدد پر آمادہ کر لیا، مال و زر ہن کی طرح برسنے لگے۔

دوسری طرف فیروز بخت کی مفقود الخبری سب کو پریشان کر رہی تھی۔ جب ستار نے حویلی والوں کو یہ بتایا کہ فیروز بخت راستے ہی سے الگ ہو گیا تھا اور یہ وعدہ کر کے گیا تھا کہ چند دنوں بعد خود بخود حویلی چلا آئے گا تو اس پر پہلے دن تو کسی کو بھی نہ حیرت ہوئی نہ پریشانی لیکن جب ایک ہفتہ گزر گیا تو ہر کسی کو فکروں نے گھیر لیا۔

کیفیہ کو شبہ تھا کہ فیروز بخت کے ساتھ کسی نے شرارت کی ہے۔ ستار جانتا تھا کہ فیروز بخت، فرخندہ کے پاس گیا ہے لیکن وہ ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا؟ یہ بڑا پریشان کن سوال تھا جو اسے ہلکان کر رہا تھا۔ آخر ایک دن وہ کسی کو بتائے بغیر فرخندہ کے پاس چلا گیا۔ فرخندہ نے بڑی خوش اخلاقی سے ستار کی پذیرائی کی اور پوچھا۔ ''تو یہاں کسی خاص کام سے آیا ہے؟''

ستار نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر فیروز بخت کو تلاش کیا لیکن جب وہ کہیں نظر نہ آیا تو فرخندہ سے پوچھا۔ ''میرا آقا فیروز بخت کہیں نظر نہیں آتا، وہ کہاں چلا گیا؟''

فرخندہ نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ''پتا نہیں کہاں چلا گیا، وہ میرے پاس آیا ضرور تھا لیکن دوسرے ہی دن میرے پاس سے چلا گیا۔''

ستار کی آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا، بولا۔ ''اس شریف انسان کا پتا ضرور چلنا چاہیے ورنہ میں تباہ و برباد ہو جاؤں گا۔ خدا نہ کرے مجھے یہ شبہ ہے کہ میرے آقا کے دشمن بہت ہیں اور بھی چالاک ہیں۔ کہیں ان میں سے کسی شریر نے میرے آقا کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچا دیا ہو۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''جا اپنے آقا کی تلاش جاری رکھ اور دوبارہ میرے پاس مت آنا۔'' ستار منہ لٹکا کر واپس چلا گیا۔

☆☆☆

فیروز بخت نے ایک سال تک وہ ہتھکنڈے استعمال کیے کہ مال و زر کا ڈھیر لگا دیا اور اس نے ایک سال میں ایک لاکھ روپے کما لیے۔

ایک سال گزار کر وہ فرخندہ کے پاس واپس پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ جو کچھ لایا تھا، اس سے برادری کے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے فیروز بخت کو اپنی آنکھوں کا تارا بنا لیا۔ فرخندہ، فیروز بخت کی باتوں اور طور طریق سے یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ اب فیروز بخت کے پاس شرم و حیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

فیروز بخت نے فرخندہ سے پوچھا۔ ''فرخندہ! حویلی سے مجھے پوچھتا ہوا کوئی آیا تو نہیں تھا؟''

فرخندہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تجھے میرا آقا کہنے والا آیا تھا۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ فیروز بخت میرے پاس آیا تو تھا لیکن دوسرے ہی دن واپس چلا گیا تھا۔''

فیروز بخت نے مسکرا کر کہا۔ ''بہت خوب، بہت خوب۔''

فرخندہ کا دادا، باپ، ماں اور پوری برادری فیروز بخت سے بہت خوش تھی۔ دادا نے شاباش کہی اور پھر پوچھا۔ ''نوجوان تاجر! تو ہماری آزمائش پر پورا اترا۔ اب فرخندہ تیری ہے، تو جب کہے شادی کر دی جائے گی۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں نے جو کچھ فرخندہ کی خاطر کیا اور میں اس مشکل ترین آزمائش سے فرخندہ کی محبت ہی کے سہارے گزرا ہوں، اس لیے یہ سوال فضول اور مضحکہ خیز ہے کہ فرخندہ کی شادی کب کی جائے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ ابھی، اسی وقت اور اسی لمحے۔''

دادا ہنسنے لگا۔ ''اسی لمحے تو نہیں، اس ہفتے فرخندہ تیرے حوالے کر دی جائے گی۔''

رات کو چاند پوری آب و تاب سے طلوع ہوا۔ وہ دونوں چاندنی رات سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنی محبت کی یادگار پر ہر اس جگہ گئے جہاں جہاں وہ دونوں ایک

سال پہلے آئے گئے تھے۔

چوتھے دن فرخندہ کی شادی کردی گئی۔ پوری برادری میں بڑی خوشی منائی گئی۔ شادی کی پہلی رات فرخندہ نے اس کی آغوش میں ذرا سی آنکھ کھولی اور کہا۔ ''فیروز بخت! آج میں بہت خوش ہوں۔ اب میں ملک التجار فیروز بخت کی بیوی ہوں۔ اب میں حویلی میں رہوں گی۔ عظیم الشان حویلی میں۔''

فیروز بخت نے کہا۔ ''جب تو ملک التجار کی بیوی ہی بننا چاہتی تھی اور اس میں فخر و انبساط محسوس کرتی تھی تو مجھ سے ایک سال تک بھیک خوامخواہ منگوا ڈالی...... تو سال بھر پہلے ہی ملک التجار کی بیوی بن سکتی تھی۔''

فرخندہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں برادری کے کسی فیصلے کو کسی طرح نہیں بدل سکتی تھی۔ یہ آزمائش برادری کا فیصلہ تھا اور یہ طے تھا کہ اگر تو نے یہ آزمائشی مرحلہ طے نہ کیا ہوتا تو اب تک میری شادی کسی اور سے ہو چکی ہوتی۔''

شادی کے تیسرے دن فرخندہ کے مجبور کرنے پر فیروز بخت اپنی حویلی کی طرف چل پڑا۔ اس وقت اس کے دل کی عجیب سی حالت تھی۔ وہ معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہا تھا۔ دور ہی سے اپنی حویلی کی جھلک دیکھ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ حویلی کے پھاٹک پر اپنے گھوڑے سے اترا تو اس کا خیال تھا کہ حویلی کے دربان اسے دیکھتے ہی دوڑے دوڑے اس کے پاس آئیں گے اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے حویلی کے اندر داخل ہوں گے پھر یکایک حویلی کے اندر ہلچل مچ جائے گی اور حویلی کا ہر فرد اور ہر شخص والہانہ اور بے تابانہ بھاگا بھاگا اس کے پاس آئے گا اور اس کی مفقود الخبری کی داستان سننے پر مصر ہوگا...... لیکن یہ ساری فکر اور ساری خوش فہمی اس وقت دور ہوگئی جب دو اجنبی چہروں نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔ ''اے شخص! تو کون ہے...... کہاں سے آیا ہے اور کس سے ملنا چاہتا ہے؟''

فیروز بخت کو بڑا غصہ آیا، بولا۔ ''اگر یہی سوال میں تم دونوں سے کروں کہ تم دونوں کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور مجھ سے یہ فضول سوال کیوں کر رہے ہو تو تم دونوں کیا جواب دو گے؟''

دونوں اجنبیوں نے ایک دوسرے کو فکر و تشویش سے دیکھا اور ایک نے جواب دیا۔ ''حالانکہ تیرا سوال فضول اور بیکار ہے لیکن پھر بھی اس کا جواب دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ہم دونوں اس حویلی کے دربان ہیں۔''

فیروز بخت نے ان دونوں کو ذرا غور سے دیکھا۔ یہ بالکل نئے چہرے تھے۔ ''پرانے دربان کہاں چلے گئے؟'' اس نے دونوں دربانوں سے پوچھا۔ ''تم دونوں یہاں کب سے دربانی کا فرض ادا کر رہے ہو؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''تقریباً آٹھ نو ماہ سے۔''

فیروز بخت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''اس حویلی کا مالک کون ہے؟ اس میں کون رہتا ہے؟''

دربان نے جواب دیا۔ ''ملک التجار وصی احمد۔''

فیروز بخت چکرا گیا۔ اسی وقت ایک طرف سے ستار نمودار ہوا اور آتے ہی فیروز بخت سے چمٹ گیا۔ ''میرے آقا! آپ آگئے؟ آپ چلے کہاں گئے تھے؟ بخدا میں نے آپ کو معلوم نہیں کہاں کہاں تلاش کیا اور ادھر چند ماہ سے میں آپ کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔''

فیروز بخت کا دل بھر آیا۔ ستار کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ''ستار! میں کہاں چلا گیا تھا، یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے پھر کبھی فرصت میں سناؤں گا۔ تو یہ بتا کہ وصی احمد ملک التجار کس طرح ہو گیا اور یہ حویلی اس کے قبضے میں کس طرح چلی گئی؟''

ستار نے دونوں دربانوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرے آقا! میں اندر آپ کی آمد کی اطلاع کر دوں، اس کے بعد آپ سے باتیں کروں گا۔''

دونوں دربان ان دونوں کی باتیں حیرت و استعجاب سے سن رہے تھے۔ ستار اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور فیروز بخت کو اندر لیے چلا گیا۔ وہاں کیفیہ اور نرجس نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دونوں نے سوالات کی بوچھاڑ کردی لیکن فیروز بخت نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''میں اس وقت تک تم لوگوں کی کسی بات کا جواب نہیں دوں گا جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو جائے گا کہ وصی احمد ملک التجار کب سے بن گیا اور تم لوگوں کی موجودگی میں وہ اس حویلی کا مالک کس طرح ہو گیا؟''

نرجس نے جواب دیا۔ ''جب تو یہاں آئے بغیر احمد آباد سے آتے ہوئے راستے ہی سے کہیں غائب ہو گیا تھا تو ہم سب نے کئی دن تک تیرا بڑی بے چینی سے انتظار کیا پھر تلاش بھی کروایا لیکن تیرا کہیں کوئی پتا نہ چلا۔ تیری گمشدگی کی خبر عام ہوئی تو ہمارے حاسدوں نے سر اٹھایا اور ہمیں بے یار و مددگار سمجھ کر مال و دولت پر قبضے کی تدبیریں کرنے لگے۔ اس وقت ہم دونوں نے صلاح و مشورہ کر کے ایک ایسی تدبیر سوچی جس پر عمل کر کے ہم نے اپنے سارے حاسدوں کو شرمندہ اور حیران کر دیا اور وہ تدبیر یہ تھی کہ ہم

دونوں نے تاجر وصی احمد سے شادی کرلی۔ اس طرح تاجر وصی احمد ہم دونوں کا شوہر بھی بن گیا اور ملک التجار بھی۔ اس طرح وہ اس حویلی کا بھی مالک ہو گیا۔''

فیروز بخت نے تھکے تھکے لہجے میں پوچھا۔'' میری عدم موجودگی میں آخر وہ کون سا حاسد اور بداندیش تھا جس نے اس حویلی، کاروبار اور مال و زر پر ہاتھ صاف کرنا چاہا تھا؟''

نرجس نے جواب دیا۔'' نظام...... اور اگر وصی احمد درمیان میں نہ آجاتا تو نظام اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔''

فیروز بخت نے افسوس سے کہا۔'' تم لوگوں نے وہی سب کچھ کر ڈالا جو اس سے پہلے داؤد مرحوم نے کیا تھا اور اب میں نے تم دونوں کی بابت یہ رائے قائم کرلی ہے کہ اگر تم دونوں مرد ہوتیں تو یا تو کامیاب تاجر ہوتیں اور اگر تاجر نہ ہوتیں تو کسی دربار میں جوڑ توڑ کرنے والی کامیاب سازشی ہوتیں۔''

نرجس نے جواب دیا۔'' ہم دونوں مجبور تھے اور اگر ایسا نہ کرتے تو آج یہ حویلی شاید نظام کے قبضے میں جا چکی ہوتی۔''

فیروز بخت نے بڑے دکھ سے کہا۔'' بہر حال تم دونوں نے چالاکی اور عجلت میں مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا۔ اس حویلی میں اب میری کیا حیثیت ہوگی؟''

نرجس نے کہا۔'' اگر تو بتائے بغیر اتنے طویل عرصے تک لاپتا نہ ہو جاتا تو کچھ نہ ہوتا، اب رہی یہ بات کہ اس حویلی میں تیری کیا حیثیت ہوگی تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ شام کو وصی احمد ہی اس کا کوئی جواب دے سکے گا۔''

فیروز بخت نے پوچھا۔'' وصی احمد کے آنے تک میں یہاں رہ سکتا ہوں یا نہیں؟''

نرجس نے جواب دیا۔'' ضرور رہ، یہاں رہنے سے تجھے کون منع کر سکتا ہے۔''

فیروز بخت اپنی ہی حویلی میں مہمان کی طرح رک گیا۔ ستارا سے شام تک یہی سمجھاتا رہا کہ وصی احمد، نرجس اور کیفیہ متفق اور متحد ہو کر یہی کوشش کریں گے کہ آپ کو بالکل بے دخل کر دیا جائے لیکن آپ کا یہ فرض ہے کہ کسی طور بے دخل نہ ہوں۔ اگر آپ کسی مزاحمت کے بغیر بے دخل ہو گئے تو آپ کا مستقبل کیا ہوگا؟ آپ کریں گے کیا؟''

اب فیروز بخت کو اس حویلی اور کاروبار وغیرہ سے بس اتنی ہی دلچسپی رہ گئی تھی کہ فرخندہ اس حویلی میں رہنا چاہتی تھی اور خود ملک التجار کی بیوی کہلانے میں خوشی محسوس کر رہی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ بالکل مایوس ہو چکا تھا اور وصی احمد سے مقابلے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ ستار کو جواب دیا۔'' ستارا! میں مزاحمت کروں گا لیکن اس معرکے میں مجبوری یہ ہے کہ کیفیہ اور نرجس نے بغلی گھونسا رسید کر دیا ہے اور ان دونوں کی وجہ سے وصی احمد ناقابلِ شکست ہو گیا ہے۔''

ستار کو بڑا قلق تھا اور وہ اپنی بے بسی پر ہاتھ مل رہا تھا۔

شام کو وصی احمد بھی آگیا۔ وہ فیروز بخت کو حویلی میں غیر متوقع طور پر دیکھ کر حیران بھی ہوا اور پریشان بھی۔ حقارت سے پوچھا۔'' اسے حویلی میں کس نے داخل ہونے دیا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔'' اپنی حویلی میں داخلے کے لیے میں اجازت کس سے لیتا۔ ہاں تو نے جو چالاکی کی ہے اس کی میں داد دیتا ہوں لیکن اب ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ اس حویلی میں ہم دونوں مل جل کر رہیں۔''

وصی احمد، نرجس اور کیفیہ پر گرم ہو گیا۔'' تم دونوں نے میری اجازت کے بغیر اسے اندر کیوں آنے دیا؟''

کیفیہ نے جواب دیا۔'' کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ لڑنے جھگڑنے کے بجائے مفاہمت کرلی جائے۔ میں شازیہ کی اس سے شادی کر دوں گی اور یہ حسبِ سابق کاروباری امور میں دلچسپی لینے لگے گا۔ آخر یہ بھی تو ہمارے کاروبار اور مال و زر میں حصے دار ہے۔''

وصی احمد غصے میں ٹہلنے لگا۔'' بکواس، ایک بھکاری سے تو اپنی بیٹی کی شادی کس طرح کر دے گی؟ یہ بھکاری ہے۔ یہ وہ فیروز بخت نہیں ہے جسے ملک التجار داؤد مرحوم نے اپنا بیٹا بنایا تھا۔ یہ دوسرا فیروز بخت ہے۔ بھکارن فرخندہ کا شوہر، مالوہ اور اس کے مضافات میں ایک سال تک بھیک مانگنے والا فیروز بخت بھکاری۔''

وصی احمد کے اس انکشاف نے ہر ایک کو چونکا دیا۔ فوری طور پر کسی کی بھی سمجھ میں پوری بات نہیں آئی۔ فیروز بخت، وصی احمد کی باخبری پر حیران رہ گیا اور تردید یا تصدیق میں ایک لفظ بھی نہ ادا کر سکا۔

وصی احمد نے اسے جھنجوڑا۔'' تو خاموش کیوں ہو گیا؟'' پھر نرجس، کیفیہ اور ستار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' بولتا کیوں نہیں؟ ان سب کو اپنی ساری روداد سنا کیوں نہیں دیتا؟ تو ایک سال تک لاپتا رہا، یہ لوگ اس ایک سال کی روداد بڑی توجہ سے سنیں گے لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو پچھلے ایک سال کی داستان ہم میں سے کسی کو بھی نہیں سنائے گا...... لیکن تو مت شرما۔ میں نے تیرے پیچھے اپنے چند آدمی سائے کی طرح لگا دیے تھے۔ انہوں نے مجھے وہ سب کچھ بتا دیا جس کے اظہار اور بیان پر تو بالکل قادر نہیں ہے۔''

کیفیہ نے وصی احمد سے کہا۔ ''آپ نے ابھی ابھی جو کچھ کہا ہے، ذرا دوبارہ تو بیان فرمائیے۔''

وصی احمد نے فیروز بخت کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''کیوں جناب! میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

فیروز بخت بدستور خاموش رہا۔ وصی احمد نے اندازہ لگایا کہ فیروز بخت ہار مان چکا ہے اور ایک آدھ زوردار حملہ کر کے اس کو چاروں شانے چت کیا جا سکتا ہے۔ وصی احمد نے کیفیہ سے پوچھا۔ ''کیا تو اب بھی اپنی بیٹی کی شازیہ کی شادی اس بدنام اور رسوائے زمانہ نوجوان سے کر دینا چاہتی ہے؟ اگر ایسی کوئی بات ہے تو بھی میں اس رشتے کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اس پر غور کر کے اپنا وقت ضائع کروں۔''

وصی احمد نے مزید کہا۔ ''حویلی والو! ابھی ابھی میں نے جو کچھ کہا ہے، اس میں حقیقت ہے سچائی ہے۔ اس لیے میری باتوں پر غور کرنا تم سب کی ذمے داری ہے۔'' پھر فیروز بخت سے پوچھا۔ ''کیوں جناب، بھکاری صاحب! کیا سارا کچا چٹھا بیان کر دوں؟''

فیروز بخت نے خود ہی بیان کر دیا۔ ''اب جبکہ میری زندگی کا پچھلا سال اہانتوں، ذلتوں اور خواریوں میں گزر چکا ہے اگر میں خود ہی ان کا ذکر کروں تو شاید زیادہ مناسب ہوگا۔''

کمرے میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ فیروز بخت نے اپنی داستانِ عشق اور دریوزہ گری سنا ڈالی اور آخر میں یہ خوشخبری بھی سنا دی کہ اب اس کی فرخندہ سے شادی بھی ہو چکی ہے۔

کیفیہ نے غضب ناک ہو کر دریافت کیا۔ ''تو، تو شادی بھی کر چکا۔ تو نے ایک سال تک بھیک مانگ کر ان کی شرط بھی پوری کر دی۔''

ستار کو اس داستان کی سچائی پر کوئی شبہ نہیں تھا کیونکہ وہ فیروز بخت اور فرخندہ کی محبت کی شدت سے کسی حد تک واقف ہو چکا تھا۔ اس نے بڑی حسرت سے کہا۔ ''اے کاش، خدایا! یہ جو کچھ میں نے سنا ہے غلط ہو۔''

کیفیہ رونے لگی۔ ''افسوس کہ میں نے یہ سوچا تھا کہ اپنی شازیہ کی شادی تجھ سے کر کے تیری عزت اور مرتبے میں چار چاند لگا دوں گی لیکن تو، تو انتہا کا بدقسمت نکلا۔''

وصی احمد نے سختی سے کہا۔ ''برخوردار! میں ملک التجار ہوں۔ اس وقت تو یہاں سے چلا جا ورنہ میں دربانوں کی مدد سے تجھے دھکے دے کر نکلوا دوں گا۔''

فیروز بخت اکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں نہیں جاؤں گا کیونکہ اس کاروبار اور اس سے متعلقہ مال و زر کا سب سے بڑا حق دار میں ہوں۔ داؤد مرحوم نے مجھے اپنی ہر چیز کے دو تہائی کا حق دار بنایا تھا۔''

وصی احمد نے اسے شانوں سے پکڑ لیا اور پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''کہاں کا حصہ، کہاں کا حق...... تو فوراً ہی دفعان ہو جا یہاں سے ورنہ میں تجھے قتل بھی کروا سکتا ہوں۔''

ستار نے فیروز بخت کی خوشامد کی۔ ''میرے آقا! ان سب کا کہا مان لیجیے اور یہاں سے چلے جائیے۔''

فیروز بخت کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا۔ ستار اس کے ساتھ تھا۔ حویلی کے پھاٹک پر گھوڑا اس کے حوالے کر دیا گیا اور فیروز بخت اس پر سوار ہو کر پتوہ آباد روانہ ہو گیا۔ اس وقت اسے یہ ملال نہیں تھا کہ اسے حویلی، کاروبار، مال و زر اور جائداد سب کچھ اس سے چھینا جا چکا ہے بلکہ صرف یہ ملال تھا کہ اب فرخندہ کی وہ سب سے بڑی خواہش بھی پوری نہ ہو سکے گی۔ ایک یہ کہ اب وہ ایک شاندار حویلی میں نہ رہ سکے گی اور دوسری یہ کہ اب وہ ملک التجار کی بیوی نہیں کہلائے گی۔

جب وہ قریب قریب پتوہ آباد میں داخل ہو گیا تو اسے اپنے پیچھے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ایک نامعلوم شخص اپنے گھوڑے کو بھگائے لیے چلا آ رہا تھا۔ جب وہ بالکل قریب آ گیا تو فیروز بخت نے اسے پہچان لیا۔ یہ تو اپنا نظام تھا۔

نظام نے آواز دی۔ ''فیروز بخت! رک جا۔ میں تیری مدد کو آیا ہوں۔''

فیروز بخت نے اپنے گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ ''نظام! تو میری کیا مدد کرے گا؟''

نظام نے جواب دیا۔ ''ابھی ابھی ستار کی زبانی تیرے ساتھ وصی احمد کی زیادتی کا حال معلوم ہوا۔ تو اس شاطر کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اگر تو میرے مشوروں پر عمل کرے تو میں وصی احمد کو وہ مزہ چکھا سکتا ہوں کہ زندگی بھر یاد رکھے گا کہ کس سے پالا پڑا تھا۔''

فیروز بخت، نظام کی چالاکیوں اور خود غرضیوں سے اچھی طرح واقف تھا، بولا۔ ''پہلے میں غور کر لوں، اس کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔''

اس جواب سے نظام کو بڑی مایوسی ہوئی، پوچھا۔ ''تب پھر کب دو گے جواب؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''دو تین دن بعد۔''

''کہاں ملو گے؟''

''تیرے پاس میں خود ہی آجاؤں گا۔'' نظام منہ بنا کر چلا گیا۔

فیروز بخت کی عقل کام نہیں کر رہی تھی کہ وہ فرخندہ کو ساری باتیں کس طرح بتائے۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ اپنے اندرونی کرب اور ذہنی مایوسی کو فرخندہ سے چھپائے رکھے لیکن فرخندہ نے اس کے اداس چہرے کو بڑی آسانی سے محسوس کرلیا، پوچھا۔ ''سارا دن حویلی میں کیا کرتے رہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب دنگ رہ گئے اور پھر اتنی خوشیاں منائیں کہ اٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔ بڑی مشکلوں سے پیچھا چھڑا کر آیا ہوں۔''

فرخندہ کسی سوچ میں پڑگئی۔ ''شادی کی بابت بتادیا؟''

''ہاں بتادیا، اس خبر نے ان سب کو اور زیادہ خوش کردیا۔ وہ سب شکایت کررہے تھے کہ اپنے ساتھ دلہن کو کیوں نہیں لائے۔''

فرخندہ نے پوچھا۔ ''ان لوگوں نے یہ نہیں پوچھا کہ تو نے کہاں اور کس سے شادی کی ہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''ہاں، انہوں نے یہ سوال بھی کیا تھا۔''

''پھر تو نے کیا جواب دیا؟''

فیروز بخت نے زبردستی خوشی کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ''فرخندہ! میں نے سوچا کہ اب کوئی بات راز نہیں رہے گی اس لیے سب کچھ صاف صاف بتادینا چاہیے چنانچہ میں نے سب کچھ بتادیا۔ ایک بات بھی نہیں چھپائی۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''تب تو ان سب کے چہرے اتر گئے ہوں گے؟''

''نہیں تو، وہ سب تو اس سے بھی بہت خوش ہوئے اور کہا کہ انہیں تو میری خوشی عزیز ہے۔ میں کہیں بھی شادی کرتا وہ خوش ہوتے۔''

فرخندہ نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو کل میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی اور اب اس حویلی میں رہوں گی۔ میں بہت خوش ہوں کہ اب میں ملک انتجار کی بیوی کہلاؤں گی۔''

اب اس کی اندرونی پریشانی اور ذہنی کرب اس کے چہرے پر بھی نمودار ہوا، بولا۔ ''نہیں، میں کل وہاں نہیں جاؤں گا پھر کسی دن لے چلوں گا۔''

فرخندہ تو پہلے ہی کھٹکی ہوئی تھی۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ فیروز بخت کے معاملات بگڑ گئے ہیں اور یہ کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، پوچھا۔ ''پھر میں تیرے ساتھ حویلی میں کب چلوں گی؟''

فیروز بخت نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''فرخندہ! فضول کے سوال جواب سے مجھے تنگ نہ کر۔ میں خود جس دن مناسب سمجھوں گا تجھے حویلی میں لے جاؤں گا۔ آخر حویلی میں جانے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے؟''

فیروز بخت پوری رات جاگتا رہا۔ رات کی تاریکی، سناٹے اور تنہائی نے اسے بہت زیادہ فکرمند کردیا تھا اور وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہورہا تھا کہ فرخندہ کو حویلی میں کس طرح لے جائے گا اور اگر نہیں لے جاسکے گا تو اس کا سبب کیا بتائے گا؟

دوسرے دن دوپہر کے بعد فیروز بخت کو تلاش کرتا ہوا ستار بھکاریوں کی بستی میں پہنچ گیا اور فیروز بخت کو مشورہ دیا کہ وہ نظام سے گٹھ جوڑ کرکے وصی احمد کا مقابلہ کرے لیکن اس وقت برادری کے سرپنچ اور فرخندہ کے دادا کی طرف سے بلاوا آگیا۔ برادری کے پنچوں کو اپنے آدمیوں کا انتخاب کرنا تھا جو بھیک مانگنے کے سالانہ دوروں پر مالوہ، برہانپور، گجرات اور اجمیر بھیجے جانے والے تھے۔ اس مجلس میں اسے یہ خوشخبری سنائی گئی کہ پنچوں نے باالاتفاق رائے اسے بھی اپنی مجلس عاملہ کا رکن بنایا ہے۔ چند گھنٹوں کی مشاورت کے بعد چار چار چھ چھ افراد پر مشتمل چار جماعتیں تیار کرلی گئیں۔ اس موقع پر فیروز بخت نے برادری کے سرپنچ سے درخواست کی۔ ''میں برادری کے سرپنچ اور پنچوں سے یہ درخواست کروں گا کہ وہ ایک سال کے لیے مجھے ایک موقع اور دیں تاکہ میں اپنے اس نئے خاندان میں زیادہ لائق اور ہوشیار کیا جاؤں۔''

دادا نے پوچھا۔ ''تیری حویلی اور کاروبار کا کیا ہوگا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''اس برادری میں شامل ہوجانے کے بعد میرے رشتے داروں نے بغاوت کردی ہے اور اگر میں ان کی بغاوت کو کچلنا چاہوں تو مجھے کئی خطرے مول لینا ہوں گے۔ پہلا خطرہ تو یہ ہے کہ میں قتل کیا جاسکتا ہوں۔ دوسرا یہ کہ میری موجودہ حیثیت کا علم ہر شخص کو ہوچکا ہے اس لیے وہ تمام حضرات مجھے میرے خاندان سے نکال چکے ہیں جنہیں میں ہمیشہ اپنا عزیز اور رشتے دار سمجھتا رہا ہوں۔''

دادا نے جواب دیا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

فیروز بخت نے اپنی صفائی میں مزید کہا۔ ''اور پھر یہ کہ جب میں اس برادری کا ایک فرد بن چکا ہوں، مجھے دو

گھوڑوں کی سواری نہیں کرنا چاہیے۔ جب تک میں نے بھیک نہیں مانگی تھی اس کی افادیت اور گہرائی سے واقف نہیں تھا لیکن اب میں پختہ ہو چکا ہوں اور شاید میں اس برادری کے لیے بہت زیادہ سودمند ثابت ہوں گا۔''

دادا نے کہا۔ ''تیری مرضی، پہلے تو مالوہ گیا تھا اب برہانپور چلا جا۔''

فیروز بخت نے خوشی میں جواب دیا۔ ''میں اپنے موجودہ پیشے کی افادیت اور تقدیس سے واقف ہو چکا ہوں اس لیے اس پیشے سے مستقلاً وابستگی کو کسی دوسرے پیشے پر ترجیح دوں گا۔''

پنچوں نے فرطِ خوشی میں نعرہ ہائے تحسین بلند کیے اور تالیاں بجائیں۔ دادا نے کہا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پہلے پہل تو نے ہمارے آبائی پیشے کو کتنی بری نظر سے دیکھا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ایک نہ ایک دن ہمارے آبائی پیشے کی تقدیس اور فضیلت تجھ پر ظاہر اور ثابت ہو کر رہے گی اور مجھے خوشی ہے کہ وہ دن ایک سال کے اندر ہی آگیا۔''

پنچوں کے فیصلے کے بعد سات دنوں کے اندر اندر ہر ٹکڑی کو اپنے اپنے سفر پر روانہ ہو جانا تھا۔ اس بار فیروز بخت کو برہانپور جانا تھا۔ اس نے برہانپور جانے سے دو دن پہلے نظام سے ملاقات کی۔ نظام اسے دیکھتے ہی بشاش ہو گیا کیونکہ اسے پورا یقین تھا کہ وہ فیروز بخت سے مل کر وصی احمد کے خلاف جو جنگ کرے گا، اس میں کسی نہ کسی حد تک جیت ضرور ہو گی جس سے نظام کا اپنا مستقبل سنور جائے گا لیکن جب فیروز بخت نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ وصی احمد سے نہیں لڑے گا اور اپنے حق سے دستبردار ہو رہا ہے تو نظام حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''پھر تو زندگی کس طرح گزارے گا؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''نظام! میں نے اب جو پیشہ اختیار کیا ہے، وہ داؤد مرحوم اور وصی احمد وغیرہ کے پیشوں سے بدرجہ بہتر ہے۔ میرے اس پیشے میں دوسرے پیشوں کی طرح جان نہیں کھپانا پڑتی اور پھر یہ کہ میں جو کچھ کماؤں گا، وہ سب میرا ہی ہوگا اور اس میں کوئی اور شخص دعویدار نہیں بن سکے گا۔''

نظام کی رال ٹپکنے لگی۔ ''فیروز بخت! میں خود بھی بہت پریشان ہوں، مجھے بھی اپنے پیشے میں شامل کرلے۔''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''میں اپنے پیشے میں تجھے شریک تو کر سکتا ہوں لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ تو کم ظرف انسان ہے اور جب تک تو ان حالات کا شکار نہ ہو جائے جو کسی بھی شخص کو اس پیشے کی طرف مائل کر سکے تو ادھر نہیں آئے گا۔''

نظام نے کہا۔ ''آخر اس پیشے کا نام کیا ہے؟ تو کس پیشے کا ذکر کر رہا ہے؟''

فیروز بخت نے جواب دیا۔ ''بھیک...... میری طرح، گوتم بدھ اور اس کے پیروؤں کی طرح تو بھی بھکشو بن جا اور پھر اس پیشے کی افادیت کے مزے لوٹ۔ کم محنت زیادہ دولت، مزے ہی مزے ہیں۔''

نظام کو شبہ گزرا کہ فیروز بخت غالباً پاگل ہو گیا ہے اور یہ پاگل پن وصی احمد، کیفیہ، نرجس اور ان سے متعلق لوگوں کی زیادتی اور ناانصافی کی وجہ سے طاری ہوا ہے۔

فیروز بخت نے جواب کا انتظار کیے بغیر واپس جاتے ہوئے کہا۔ ''میں جا رہا ہوں، اللہ نے چاہا تو ایک سال بعد ملاقات ہوگی۔ اس ایک سال میں تو کسی نہ کسی نتیجے پر ضرور پہنچ جائے گا۔''

فیروز بخت اپنی برادری میں واپس پہنچا اور دو دن بعد وہ ٹکڑی کے ساتھ برہانپور چلا گیا۔

فیروز بخت سے پوری برادری بہت خوش تھی کیونکہ اس نے برادری کے آبائی پیشے کی عظمت اور تقدیس کا عملاً اقرار کیا تھا لیکن فرخندہ بہت اداس اور مایوس تھی کیونکہ اب اسے اچھی طرح یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اب وہ کبھی فیروز بخت کی حویلی نہیں جا سکے گی اور یہ کہ کوئی اسے ملک التجار کی بیوی بھی نہیں کہے گا۔

ان غموں نے اس کے دل پر بوجھ رکھ دیا تھا چنانچہ فیروز بخت کی موجودگی میں تو وہ خاموش رہی لیکن اس کے جاتے ہی فرخندہ پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ برادری کے لوگ یہ سمجھے کہ فرخندہ اپنے شوہر کی عارضی جدائی پر رو رہی ہے لیکن وہ اپنی اندرونی کیفیات اور غموں کی وجہ سے زار و نزار ہو رہی تھی۔ برادری کے لوگوں نے بڑی فراخ دلی سے فرخندہ کو صبر کی تلقین کی۔ فرخندہ نے اس وقت تو دکھاوے کا صبر کر لیا لیکن بعد میں جب تنہائی میسر آئی تو بستر میں منہ چھپا کر خوب روئی۔

ماخذات
آئین اکبری، ابوالفضل۔ دربار اکبری، مولانا محمد حسین آزاد۔ منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر جیلانی۔
ہند کی معاشی حالت اول، ڈبلیو ایچ مورلینڈ۔ معاشی حالات ہند از اکبر تا اورنگ زیب، ڈبلیو ایچ مورلینڈ

سائنس کی دنیا میں ایک انتہائی خوفناک مسافت کا دلچسپ احوال

اکثر و بیشتر عقل کے ایسے مظاہر بھی ہوتے ہیں کہ اپنے ہی فعل پر عقل خود بھی دنگ رہ جاتی ہوگی... ایسا ہی ایک کارنامہ اس نے بھی انجام دیا جو بہ ظاہر دنیاوی علوم کا ایک کرشمہ تھا لیکن اس کے رونما ہونے پر اس کرشمہ ساز کو بھی پچھتاوؤں نے گھیر لیا... اس کے بعد وہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا... کیونکہ خلائی سفر کے شوق اور ایک مبہم عکس کے تعاقب میں اس کا دامن ہر خوشی سے خالی ہو چکا تھا۔

عذابِ ماضی

کاشف زبیر



زمین کے مدار میں گردش کرتے بین الاقوامی خلائی اسٹیشن پر زیرِ تعمیر خلائی جہاز مددگار اپنے آخری مراحل میں تھا۔ اس کے مختلف حصے کامیابی سے جوڑ کر انہیں ٹیسٹ کر لیا گیا تھا اور اب انجن کی آزمائش تھی جو اس خلائی جہاز کو طویل سفر پر روانہ کرتا۔ چند گھنٹے پہلے ایک شٹل آخری مسافر اور سامان خلائی اسٹیشن پر لائی تھی جسے مددگار کے ساتھ جانا تھا جو پہلے ہی خلائی اسٹیشن پر موجود تھا۔ اس عملے کا کمانڈر فلپس تقریباً پچاس برس کا مضبوط جسامت اور سپاٹ چہرے والا

شخص تھا۔ گریگ اس کا نائب اور مددگار کا پائلٹ تھا۔ اینا کمیونیکیشن کی ماہر تھی اور مددگار کے تمام مواصلاتی امور اس کی ذمے داری تھی۔ ریڈ مکینکیشن تھا اور وہ آلات کی دیکھ بھال اور مرمت کرتا تھا۔ وہ خوش شکل اور نوجوان تھا۔ ڈاکٹر کیتھرین ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ فزکس کی ماہر بھی تھی۔ کارن بیل مدد اور بیرونی مرمت کا ماہر تھا۔ ساتواں فرد میک گاور انجینئر تھا اور یہ جہاز اسی کی نگرانی میں مکمل ہوا تھا۔ وہ سب اس وقت مددگار کے نچلے ہال میں جمع تھے جہاں سامان رکھا گیا تھا۔ وہ آنے والے فرد کے بارے میں تجسس تھے لیکن سوائے کمانڈر فلپس کے اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ ریڈ نے کہا۔

''کمانڈر، کیا یہ کوئی خفیہ مشن ہے؟''

''نہیں... لیکن اس کے بارے میں تمہیں آنے والا شخص ہی بریف کرے گا۔''

اسی لمحے خلائی اسٹیشن کا مددگار کے ساتھ لگنے والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی اندر آیا۔ سیاہ بالوں اور ہم رنگ آنکھوں کی وجہ سے وہ تاریک تاثر دے رہا تھا مگر وہ سفید فام ہی تھا۔ اس نے سب کو دیکھا اور بولا۔

''ہائے...... میں ڈاکٹر مارک روز برگ ہوں۔''

''ہمارے پاس پہلے ہی ایک ڈاکٹر موجود ہے۔'' میک نے کیتھرین کی طرف اشارہ کیا۔ ''بلکہ یہ ڈبل ڈاکٹر ہے۔''

''میں صرف سنگل ڈاکٹر ہوں۔ میٹلرلوجی میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔'' مارک خفیف سا مسکرایا۔ ''میں تمہارے خلائی جہاز کا آخری مسافر ہوں۔''

''آخری مسافر...'' ریڈ نے پر خیال انداز میں کہا۔ ''آخری سفر کا آخری مسافر۔''

''معاف کرنا یہ ہومر کا عاشق ہے۔'' اینا نے کہا اس کا اشارہ ریڈ کی طرف تھا۔

''وہ ہر زمانے کا شاعر ہے۔'' ریڈ نے تائیدی انداز میں کہا۔

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں لیکن اس وقت ہمیں ہومر کے بجائے اپنے مشن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، جس کے بارے میں مارک بتائے گا۔'' کمانڈر فلپس نے سرد لہجے میں کہا۔

مارک نے کھنکھار کر کہا۔ ''آج سے سات سال پہلے ایک خاص خلائی جہاز نظام شمسی کی حدود کی جانچ کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ آخری تین بڑے سیاروں سیٹرن، یورینس اور نیپچون سے ہوتا ہوا نظام شمسی کی حد سے نکل جاتا۔''

''نکل جاتا۔'' اینا نے کہا۔ ''لیکن وہ نکلا نہیں؟''

''اس کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں۔'' میک گاور نے اعتراض کیا۔

''میکا... ایک خفیہ مشن تھا، اس کے بارے میں عام طور سے بہت کم لوگوں کو علم ہے۔'' مارک نے کہا۔ ''جب میکا نیپچون کے پاس پہنچا اور اس نے سیارے کے گرد مدار بنایا تو چند گھنٹوں بعد اس کا رابطہ زمین سے ختم ہو گیا۔''

''ختم ہو گیا۔'' گریگ نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے میکا تباہ ہو گیا۔''

''نہیں، میکا اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کا سسٹم ہمارے سگنل وصول کررہا ہے لیکن وہاں سے کوئی جواب نہیں دیا جارہا۔''

''اس کا عملہ؟'' ریڈ نے سوال کیا۔

''اس کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔''

''تب کیسے پتا چلے گا کہ جہاز اور اس کے عملے پر کیا گزری؟''

''یہی جاننے کے لیے ہم اس طرف جارہے ہیں۔'' مارک نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے اتنا جاننا کافی ہے' اب ہمیں تیاری کرنی ہے کیونکہ سفر کے آغاز میں ایک گھنٹا رہ گیا ہے۔'' فلپس نے کہا اور وہ اوپر مددگار کے کاک پٹ میں آگئے۔ یہاں فلپس کے ساتھ گریگ، اینا اور ریڈ کے لیے نشستیں تھیں۔ انہوں نے اپنی نشستیں سنبھال لیں اور مددگار کے تمام آلات کو چیک کرنے لگے۔ مارک نے اپنے کیبن میں آکر اپنا سامان رکھا اور بیڈ کے سرہانے میکا کی تصویر لگائی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر باہر نکل آیا۔

ایک گھنٹے بعد مددگار کے انجن اسٹارٹ ہوئے۔ خلائی اسٹیشن سے جوڑے رکھنے والی سرنگ پہلے ہی الگ کی جاچکی تھی۔ مددگار کو پکڑے خلائی اسٹیشن کے آہنی بازو نے اس کے انجن اسٹارٹ ہوتے ہی اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں وہ زمین سے اوپری مدار سے دور خلا میں نکل آیا۔ انجن تین منٹ تک پوری قوت سے کام کرتے رہے اور پھر انہیں بند کردیا گیا۔ خلا میں مزاحمت نہیں ہوتی ہے اس لیے مددگار کو جو رفتار حاصل ہوگئی تھی وہ قائم رہتی اور یہ رفتار اتنی تھی کہ وہ ستر دن میں نیپچون کے پاس پہنچ جاتے۔ گریگ نے مددگار کو مکمل آٹو پائلٹ کردیا تھا اب وہ سب سونے کی تیاری کرنے لگے تھے۔

اس قسم کے طویل سفر اور بے انتہا رفتار کے جسم پر پڑنے والے منفی اثرات سے نمٹنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ایک مخصوص چیمبر میں جو پانی سے بھرا ہوتا تھا وہ سو

جاتے اور ان کا جسم مخصوص طریقے سے خوراک اور آکسیجن حاصل کرتا رہتا۔ پانی کے اندر وائبریشن ان کے جسم کی تھراپی کرتی اور وہ جب طویل نیند کے بعد بیدار ہوتے تو ان کے جسم وذہن تروتازہ ہوتے تھے۔ اس طریقے سے خوراک اور آکسیجن کی بچت بھی ہوتی تھی۔ کاک پٹ کے پیچھے رہائشی کیبنوں کے ساتھ ساتھ ہائبرنیٹ چیمبر تھے۔ وہ اپنا لباس اتار کر صرف زیر جاموں میں آگئے۔ ڈاکٹر کیتھ سب کو ایک مخصوص انجکشن دے رہی تھی، اس کے اثر سے ان کا جسم پانی میں بھی ٹھیک رہتا۔ وہ سب باری باری اپنے چیمبروں میں چلے گئے ان کے شیشے کے شفاف دروازے بند ہوئے تو انہوں نے منہ پر غوطہ خوروں کے سے نقاب پہن لیے۔ یہ بیلٹ کی مدد سے سر کو جکڑ کر رکھتے اور کسی طرح خود منہ سے نہیں نکل سکتے تھے۔ اسے منہ پر لگاتے ہی وہ سوتے چلے گئے کیونکہ آکسیجن میں سلانے والی گیس بھی شامل تھی۔ چند لمحے بعد ان کے چیمبر پانی سے بھرنے لگے اور پھر ہال اور جہاز کی تمام غیر ضروری روشنیاں اور آلات بند ہو گئے۔ انہیں ستر دن تک اسی حالت میں سوتے رہنا تھا۔

☆☆☆

مارک کی آنکھ کھلی تو وہ پانی کے اندر تھا حالانکہ جب اس کی آنکھ کھلتی تو چیمبر کا پانی نکل جانا چاہیے تھا۔ اس نے ایک طرف دیوار پر لگا ہوا بٹن دبایا تو چیمبر سے پانی خارج ہونے لگا۔ اس نے منہ سے نقاب ہٹایا اور شیشہ کھول کر باہر نکل آیا تب اس نے دیکھا اس کے باقی ساتھی ویسے ہی اپنے چیمبروں میں سو رہے تھے۔ پھر وہ کیوں جاگ گیا تھا؟ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا تھا تب اس کی نظر ایک اور خالی چیمبر پر گئی۔ اس نے دیکھا کہ فرش پر چیمبر کے پاس سے گیلے قدموں کے نشانات کاک پٹ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ کاک پٹ کی طرف بڑھا، اسے پائلٹ کی سیٹ پر ایک عورت دکھائی دی۔ اس کے سرخی مائل بال نمایاں تھے۔ مارک کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''میکا...''

''ہاں، میرے محبوب۔'' عورت نے گنگنا کر کہا۔

''لیکن تم یہاں کیسے آئیں؟'' مارک نے کرسی اپنی طرف گھمائی۔ اب میکا اس کے سامنے تھی اس کی... حسین آنکھیں بند تھیں، اس نے پھر گنگنا کر کہا۔

''میں تمہارے ساتھ ہوں میں نے تمہیں بلایا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میکا نے اچانک آنکھیں کھولیں تو مارک لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ اس کی آنکھوں میں اندر تاریک خلا تھا۔ مارک لڑکھڑا کر نیچے گرا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے سانس نہیں آ رہی تھی۔ پھر کیتھ نے اس کی مدد کی، اس نے عقب سے اس کے سینے کے گرد ہاتھ ڈال کر اوپر کھینچا تو مارک کی سانس کی نالی میں چلا جانے والا پانی نکلنے لگا... وہ کھانس رہا تھا۔ باقی سب آس پاس موجود تھے اور ان میں بعض ہنس اور مسکرا رہے تھے۔ مارک کی حالت ٹھیک ہوئی تو وہ سوچنے لگا۔ تو یہ خواب تھا۔ کارن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے انکار کیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

''تم نے پانی میں ہی نقاب اتار دیا تھا۔'' کیتھ نے کہا۔ ''تم جاگ گئے تھے مگر شاید صورت حال سمجھ نہیں سکے تھے۔''

اس بار کارن نے اس کی طرف کافی کا مگ بڑھایا۔ ''اس سے تمہیں مدد ملے گی۔''

مارک نے مگ لے لیا۔ ایک طرف سے فلپس مکمل یونیفارم میں نمودار ہوا اور باقی سب کو ایسے ہی گھومتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''کیا پکنک کا ارادہ ہے؟''

''کمانڈر! ہم ابھی ستر دن بعد جاگے ہیں۔'' ریڈ نے احتجاج کیا۔

''اور ہمارے پاس صرف اڑتالیس گھنٹے ہیں ہمیں پھر ستر دن کے لیے سونا ہے۔ اگر واپس جانا ہے تو۔'' فلپس نے سرد انداز میں کہا۔ ''اس لیے سب ڈریس اپ ہو کر اپنی ڈیوٹی پر آ جائیں۔''

''یس سر۔'' سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

مددگار خودکار طریقے سے نیپچون کے گرد مدار قائم کر چکا تھا اور اب اس کے گرد گردش کر رہا تھا۔ مارک اپنے کیبن میں آیا اس نے سرہانے لگی میکا کی تصویر دیکھی اور گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مارک نے اتنی بڑی دنیا میں اگر کسی سے محبت کی تھی تو وہ میکا تھی۔ حسین اور دلکش میکا جو اس کی بیوی اور اس کی زندگی تھی مگر اب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے تصویر کو ہاتھ لگایا اور باہر نکل آیا اس کے جسم پر بھی عملے والا لباس تھا۔ کاک پٹ میں تقریباً سب جمع تھے اور وہ نیپچون کو دیکھ رہے تھے، اس کی پانی جیسی نیلی سطح بالکل ہموار لگ رہی تھی۔ اینا نے سحر زدہ لہجے میں کہا۔ ''خوب صورت ہے۔''

''جوپیٹر، سیٹرن اور یورینس کے مقابلے میں یہ کسی قدر کم ماس والا سیارہ ہے لیکن زمین سے سات گنا بڑا ہے۔'' مارک نے کہا۔ ''یوں سمجھ لو کہ یہ جیسے پگھلی ہوئی برف پر مشتمل ہے۔''

''کیا یہ اس کی سطح ہے؟'' ریڈ نے اشارہ کیا۔

''نہیں یہ بادل ہیں... ان کا سلسلہ دو ہزار کلومیٹرز کی

بلندی سے شروع ہو جاتا ہے اور نیچے جاتے ہوئے بالآخر یہ سیارے کی سطح سے مل جاتے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ سطح اور کرۂ ہوائی میں خاص فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ زمین پر ہے۔''

اچانک ان کی توجہ گہرے رنگ کے ایک بہت بڑے مرغولے نما دائرے کی طرف گئی۔ یہ نیلے سے گہرے رنگ کا ہو رہا تھا اور اس کے وسط میں بالکل سیاہ ہو گیا تھا۔ اس میں کہیں کہیں لہریں اٹھ رہی تھیں اور اس کے نیچے رہ رہ کر بجلی چمک رہی تھی۔ اس کے نیچے اور عقب میں کہیں کہیں سفید رنگ بھی جھلک رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' کیتھ نے پوچھا۔

''یہ طوفان ہے، اسے عظیم سیاہ دھبا کہتے ہیں جیسے جوپیٹر کی سطح پر عظیم سرخ دھبا نامی طوفان ہے۔ جب سے یورینس کو دوربینوں سے دیکھا گیا ہے یہ طوفان اسی طرح جاری ہے، اس کا سائز زمین کے کل رقبے سے بھی کہیں بڑا ہے اور اس میں ہواؤں کی رفتار آواز کی رفتار سے دوگنا زیادہ ہے۔ نظام شمسی کے کسی سیارے پر اتنی تیز ہوائیں نہیں چلتی ہیں۔'' مارک نے کہا۔ ''یہ طوفان ایک سیکنڈ میں اتنی توانائی خارج کر رہا ہے جتنی توانائی زمین پر آغاز سے اب تک آنے والے تمام طوفانوں نے بھی خارج نہیں کی ہو گی۔''

اینا نے جھرجھری لی۔ ''خوفناک...''

''میکا اسی طوفان میں کہیں موجود ہے۔''

مارک کی بات پر سب نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ گریگ نے کہا۔ ''اس طوفان میں... یہ ناممکن ہے... اس میں کوئی مدار بھی قائم نہیں کیا جا سکتا۔''

''درست ہے۔'' مارک نے تسلیم کیا۔ ''لیکن یہ حقیقت ہے کہ میکا کے سگنل اسی طوفان سے آ رہے ہیں اور اسی وجہ سے یہ مشن یہاں آیا ہے۔''

''مجھے اپنے جہاز کو اس طوفان میں لے جانا پڑے گا؟'' گریگ نے کہا۔ ''شاید ہم اس سے واپس نہ آ سکیں۔''

''پھر کوئی ہمارے لیے آئے گا۔'' کارن ہنسا۔

''پلیز ایسی باتیں نہ کرو۔'' اینا نے گھبرا کر کہا۔

''تم موت سے ڈر رہی ہو۔'' کارن بہ دستور موڈ میں تھا۔ اس نے اینا کو دیکھا۔ ''مجھے کسی حسین لڑکی کے ہمراہ مرتے ہوئے بالکل ڈر نہیں لگے گا۔''

کیتھ نے سوال کیا۔ ''میکا سے آخری رابطہ کب ہوا تھا؟''

''رابطہ ختم ہونے کے دو دن بعد یہاں سے آخری ٹرانسمیشن موصول ہوئی تھی۔'' مارک نے کہا اور جیب سے ایک چھوٹا سا ریکارڈر نکال کر اسے آن کیا۔ ''یہ مشکل سے دس سیکنڈ کی ہے۔''

مارک نے بٹن دبایا تو ریکارڈر سے انسانی شور اٹھا جیسے بہت سے لوگ چلا رہے ہوں۔ کوئی کچھ کہہ رہا تھا مگر آواز غیر نمایاں تھی۔ ''ایسا لگ رہا ہے کوئی بول رہا ہے ہمیں بچاؤ۔''

باقی سب نے بھی یہی سنا تھا۔ ریڈ نے پوچھا۔ ''میکا پر کتنے افراد کا عملہ تھا؟''

''انیس افراد تھے اور وہ سب نہایت تجربے کار اور منجھے ہوئے افراد تھے۔''

''مشن کا مقصد کیا تھا؟'' گریگ نے سوال کیا۔

مارک چند لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ''نظام شمسی کے پاس کسی بلیک ہول کی تلاش اور اس کی مدد سے دور دراز فاصلوں تک سفر کرنا... یہ خلائی جہاز اصل میں اسی مقصد کے تحت بنایا گیا تھا ورنہ مقامی تحقیق کے لیے اتنا بڑا جہاز بنانا ضروری نہیں تھا۔''

''دور دراز فاصلوں تک سفر کرنا؟'' گریگ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو مارک نے آس پاس نظر دوڑائی اور ایک طرف موجود رسالہ اٹھالیا۔ گریگ نے جلدی سے کہا۔ ''یہ میرا ہے۔''

رسالہ نظر نواز تصاویر پر مشتمل تھا۔ مارک نے اس کا درمیانی فل سائز پوسٹر والا صفحہ پھاڑا تو گریگ کراہا۔ ''یہ میری فیورٹ ماڈل ہے۔''

مارک نے صفحہ سامنے کیا اور اس کے دونوں سرے پھیلا کر بولا۔ ''یہ اے پوائنٹ ہے اور یہ بی پوائنٹ ہے۔ اب ان دونوں کے درمیان اگر سفر کرنا ہو تو سب سے آسان طریقہ کیا ہو گا؟''

''سیدھ میں سفر کرنا۔'' ریڈ نے جواب دیا۔

''غلط جواب۔'' مارک نے پوسٹر کے دونوں سرے موڑے اور انہیں آپس میں ملا کر اس میں پین پرو دیا۔ ''خلا اس طرح تہ ہو جاتا ہے اور دیکھو دونوں سروں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے۔''

اینا نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے بلیک ہول اسی طرح خلا کو آپس میں ملا دیتے ہیں؟''

''بالکل کیونکہ وہ عام مادے کے قوانین سے ماورا ہوتے ہیں۔ وہاں وقت صفر اور مادہ لامحدود ہو جاتا ہے۔ اس لیے بلیک ہول میں اپنے قوانین ہوتے ہیں۔''

''نہیں... نہیں میں کسی بلیک ہول کے پاس جانا پسند نہیں کروں گا۔'' کارن ہنسا۔ ''بلیک ہول بس ایک گڑھا ہے جو کبھی نہیں بھرتا، اس کا فاصلوں سے کیا تعلق؟''

''جدید فزکس کہتی ہے کہ تعلق ہے اور میکا اسی لیے بنایا

اور روانہ کیا گیا تھا۔''

کارن پھر ہنسا۔ ''وہ نیپچون پر آکر یہاں پھنس گیا... آخر کس احمق نے اسے سوچا اور بنایا تھا؟''

مارک نے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''وہ احمق تمہارے سامنے کھڑا ہے۔''

کیتھ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ ''یہ خلائی جہاز تم نے ڈیزائن کیا ہے؟''

مارک نے سر ہلایا۔ ''یہ میری ہی تھیوری کی تصدیق کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ اسی لیے میں اس جہاز پر موجود ہوں۔''

''تم دیکھنے آئے ہو کہ تمہاری تھیوری کا کیا حشر ہوا ہے؟'' گریگ نے طنز کیا۔

''ہاں، یہ میری ذمے داری ہے۔'' مارک نے سرد لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے ہمیں باتوں کے بجائے کام کرنا چاہیے۔'' فلپس نے مداخلت کی۔ ''ٹھیک بارہ گھنٹے بعد ہمیں میکا تک جانے کی کوشش کرنی ہے۔''

''کوشش؟'' کیتھ کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''ہاں کیونکہ یہ کہنا مشکل ہے ہم اس کے پاس جا سکیں گے یا نہیں۔ وہ بہرحال کسی اچھی جگہ نہیں ہے۔''

انہوں نے نیپچون پر جاری طوفان کو دیکھا اور کمانڈر سے اتفاق کیا.... سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ کیتھ باری باری سب کا معائنہ کر رہی تھی کہ اس طویل سفر اور نیند نے ان پر کوئی منفی اثر تو نہیں ڈالا ہے۔ مارک کی باری آئی تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب مجھے یاد آرہا ہے تمہاری بیوی...''

''اس نے خودکشی کر لی تھی۔'' مارک نے آہستہ سے کہا۔ ''میکا کی روانگی سے صرف ایک برس پہلے کی بات ہے میں اس وقت پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔''

''مجھے یاد ہے اور مجھے افسوس ہے۔'' کیتھ نے کہا۔ ''اس کی یاد میں تم نے خلائی جہاز کا نام میکا رکھا تھا۔''

مارک نے جواب نہیں دیا، صرف سر ہلایا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سب کچن کے ساتھ ڈائننگ میز پر جمع تھے۔ یہ ستر طویل دنوں بعد پہلا باقاعدہ کھانا تھا جو وہ کھا رہے تھے۔ مارک نے پاستا لیا تھا ساتھ میں کافی کا مگ تھا۔ اس مشن پر الکوحل کی اجازت نہیں تھی اور ان میں سے کوئی عادی بھی نہیں تھا، اس لیے وہ شراب کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ فلپس نے کہا۔ ''مشن کے باقاعدہ آغاز سے پہلے سب کم سے کم چھ گھنٹے کا آرام کریں۔''

''اگر ہم نے میکا تلاش کر لیا تو اس میں کون کون جائے گا؟''

''تین افراد جائیں گے اور پانچ پیچھے رہیں گے۔ جانے والوں کا فیصلہ روانگی سے دو گھنٹے پہلے کیا جائے گا۔''

جنہوں نے آرام کرنا تھا وہ کھانے کے بعد اپنے کیبنوں میں چلے گئے اور باقی اپنے کاموں میں لگ گئے۔ اینا اور کیتھ مددگار پر رہتیں اب باقی چھ مردوں میں سے کوئی تین جاتے۔ مارک بھی اپنے کیبن میں آگیا تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی سی جیبی ڈائری نکالی اور اب تک کے سفر کی روداد لکھنے لگا۔ اس دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا میکا کے بعد اس نے شادی نہیں کی اور نہ کسی اور عورت سے تعلق رکھا۔ ان کا کوئی بچہ بھی نہیں تھا۔ بچپن میں ایک حادثے کے نتیجے میں میکا ہمیشہ کے لیے ماں بننے سے محروم ہو گئی تھی۔ ان کے جاننے والے کہتے تھے کہ میکا نے اسی وجہ سے خودکشی کی تھی لیکن مارک جانتا تھا صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی۔ روداد لکھ کر اس نے ڈائری بند کی اور اپنی یونیفارم کی جیب میں رکھ لی۔ اس خلائی جہاز پر کوئی ذاتی جگہ نہیں تھی، یہ ڈائری صرف اس کے پاس محفوظ رہ سکتی تھی۔ چند گھنٹے بعد وہ باہر آیا تو کمانڈر فلپس اپنے کنسول پر مددگار کے مختلف حصوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ نیپچون کی فضا میں داخل ہونے سے پہلے اس کے تمام آلات کا مکمل ٹھیک ہونا اور کام کرنا لازمی تھا۔ مارک نے کہا۔

''نیپچون کی فضا میں کوئی غیر معمولی عنصر موجود نہیں ہے۔ یہاں پانی امونیا اور میتھین کی صورت میں ہے۔''

''لیکن درجۂ حرارت خوفناک حد تک کم ہے۔'' فلپس نے کہا۔ ''منفی دو سو اٹھارہ سینٹی گریڈ، اس پر پورا جہاز سپر کنڈکٹر بن سکتا ہے۔''

''نہیں، یہ محفوظ رہے گا۔'' مارک نے اسے تسلی دی۔ وہ جانتا تھا مددگار بہت اچھا خلائی جہاز ہے، یہ توازن اور مضبوطی کے اصول پر بنایا گیا تھا۔ اگرچہ یہ میکا جیسا بڑا مضبوط اور غیر معمولی نہیں تھا مگر اپنی کیٹیگری کے خلائی جہازوں میں سب سے بہتر ضرور تھا۔ فلپس نے سیارے کی طرف دیکھا۔

''حیرت کی بات ہے اتنے کم درجۂ حرارت پر بھی یہ منجمد نہیں ہے۔''

''ہاں کیونکہ سیارے کے وسط کا درجۂ حرارت پانچ ہزار ڈگری سینٹی گریڈ ہے۔ اندر سے اٹھنے والی گرمی اس کی اوپری سطح کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور اسی سے یہ طوفان وجود میں آیا ہے۔''

فلپس نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ڈاکٹر تمہارا کیا خیال

ہے میکا اس طوفان میں کیسے موجود اور برقرار ہے جب کہ یہاں ہوا کی رفتار آواز سے دوگنی ہے؟"

"بہت تیز رفتار طوفان کے وسط میں ہے اور وہ ان سفید بادلوں میں کہیں ہے جو طوفان کے کنارے پر ہیں یا شاید اس کے کنارے سے بھی باہر ہیں۔" مارک نے طوفان کے نیچے اشارہ کیا۔

روانگی سے دو گھنٹے پہلے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں پر آگئے اور اینا نے سب سے پہلے میکا سے مواصلاتی رابطہ قائم کیا، اس کے کمپیوٹرز نے سگنل کا جواب دیا تھا۔ انہیں اسی سگنل کی مدد سے میکا تک جانا تھا۔ اینا نے ڈیٹا گریگ کے چینل پر منتقل کیا اور اس نے اس کا تجزیہ کر کے انہیں آگاہ کیا۔ "میکا بادلوں کے اندر تقریباً دس کلومیٹر کی گہرائی میں موجود ہے۔"

"کیا وہ ساکت ہے؟" فلپس نے سوال کیا۔

"بالکل ساکت ہے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" میک نے کہا۔

"ممکن ہے یہاں ہوا اتنی ہلکی ہو کہ میکا نے مدار قائم کر لیا ہو۔" مارک نے وجہ پیش کی۔

"دو ہزار کلومیٹر نیپچون جیسے بڑے سیارے کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ زمین پر چار سو کلومیٹر کی بلندی پر بھی مدار قائم ہو جاتا ہے یہاں ممکن نہیں ہے۔" کیتھ نے اس کا خیال مسترد کر دیا۔

"وجہ کچھ بھی ہو ہمیں میکا تک رسائی حاصل کرنی ہے۔" فلپس نے کہا۔ "یاد رہے ہمارا مشن کسی قسم کی تحقیق نہیں بلکہ صرف یہ جاننا ہے کہ عملے کا کیا ہوا اور اگر ان میں سے کوئی زندہ ہے تو اس کی مدد کی جائے۔ یہ کام مکمل کر کے ہم واپسی کی راہ لیں اور اس کے لیے ہمارے پاس صرف چوبیس گھنٹے ہیں۔"

"میکا پر کون جائے گا؟" گریگ نے پوچھا۔

"ریڈ، کارن اور میں۔" فلپس نے کہا تو مارک آگے آیا۔

"میں بھی جاؤں گا۔"

"نہیں..."

"کمانڈر، یہ جہاز میرا بنایا ہوا ہے اور اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔"

"اسی لیے تمہاری یہاں موجودگی لازمی ہے تم سب کی بھیجی ویڈیو دیکھو گے اور ہماری رہنمائی کرو گے۔ اگر تم جہاز پر گئے تو ہم تمہاری رہنمائی سے محروم ہو جائیں گے، امید ہے تم سمجھ گئے ہو گے۔"

بادل ناخواستہ مارک نے سر ہلایا۔ یہاں فلپس باس تھا اور اس کا حکم ماننا لازمی تھا۔ گریگ نے اعلان کیا۔ "ایک گھنٹا چالیس منٹ بعد ہم مدار سے اترنا شروع کر دیں گے۔"

مددگار نیپچون کے گرد اپنا چکر دو گھنٹے میں مکمل کر رہا تھا۔ ریڈ اور کارن تیاری کرنے لگے۔ وہ آلات چیک کر رہے تھے اور پریشرائزڈ سوٹ جانچ کر دیکھ رہے تھے جنہیں پہن کر وہ میکا میں جاتے۔ روانگی سے ایک منٹ پہلے گریگ نے خبردار کیا۔ "سب سیٹ بیلٹ باندھ لیں اور ہوشیار رہیں۔"

جیسے ہی وہ مقررہ جگہ پہنچے اس نے مددگار کے راکٹ انجن چلائے اور وہ مدار سے ہٹ کر سیاہ دھبے کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک منٹ میں انجنوں نے اسے نیچے کی طرف دھکیل دیا تھا۔ چند منٹ پہلے مکمل طور پر ساکت مددگار نے اب لرزنا اور جھٹکے لینا شروع کر دیا تھا۔ جیسے جیسے وہ سیاہ دھبے کے پاس ہو رہے تھے اس کی تھرتھراہٹ بڑھ رہی تھی۔ اینا نے کہا۔ "یہاں کرۂ ہوائی موجود ہے۔ وہ مزاحمت کر رہا ہے۔"

"مددگار اسی وجہ سے لرز رہا ہے۔" گریگ بولا۔ وہ تھرسٹر کی مدد سے پرواز کو قابو رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب وہ سیاہ دھبے کے کنارے کے پاس تھے۔ اینا مسلسل میکا کو سگنل بھیج کر اس کا جائے وقوع دیکھ رہی تھی۔ اس نے اعلان کیا۔

"وہ سو کلومیٹرز دور ہے۔"

نیچے جاتے ہوئے مددگار کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ گریگ اسے قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر یہ رفتار ایک حد سے بڑھ جاتی تو وہ راکٹ چلا کر بھی اسے قابو نہیں کر سکتا تھا اور نتیجے میں مددگار سیارے پر جا گرتا۔ اینا مسلسل فاصلہ بتا رہی تھی۔ "پچاس کلومیٹرز... تیس کلومیٹرز... دس کلومیٹرز..."

"ایک راکٹ چلاؤ۔" فلپس نے حکم دیا۔ گریگ نے حکم کی تعمیل کی اور مددگار کی رفتار کم ہونے لگی۔ اب وہ میکا سے دو کلومیٹرز سے بھی کم فاصلے پر تھا مگر یہاں سوائے سفید بادلوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ مارک فلپس کے پیچھے تھا۔ اس نے کہا۔

"یہ ناممکن ہے... وہ ہے تو نظر کیوں نہیں آرہا۔"

"ایک ہزار میٹرز..." اینا بولی... "پانچ سو میٹرز۔"

"تینوں راکٹ چلا دو۔" فلپس چلایا۔ جھٹکے بڑھ گئے تھے۔ گریگ نے الٹے راکٹ چلائے اور یک دم مددگار کی رفتار میں بہت زیادہ کمی آگئی اور پھر دھند چھٹی تو ان کے سامنے عظیم الجثہ میکا نمودار ہوا۔ وہ اسے دیکھ کر مبہوت رہ گئے تھے۔ گریگ نے راکٹ بند کیے تو مددگار یوں ساکت ہو گیا جیسے وہ کسی مدار میں ہو حالانکہ وہ کسی مدار میں نہیں تھا۔ یہاں

چاروں طرف دھند تھی اور اس کے پاس کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ میکا کی چند ایک لائٹس ہی روشن تھیں۔ اینا میکا کا تجزیہ کرنے لگی۔ اس نے کہا۔

''اس کا انجن بند ہے... لیکن برقی نظام کام کررہا ہے... اندر مصنوعی کشش پیدا کرنے والا نظام اور حرارت پیدا کرنے والا نظام بھی بند ہے۔''

اسکرین پر پورے جہاز کا خاکہ آرہا تھا لیکن اس میں کہیں کوئی زندہ جسم دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فلپس نے کہا۔

''ایسا لگ رہا ہے یہاں کوئی زندہ جسم نہیں ہے۔''

گریگ نے آہستہ سے کہا۔ ''سات سال بعد اس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی ہے۔''

''اس کے برعکس اس جہاز میں کوئی شخص ساری عمر بھی گزار سکتا ہے۔'' مارک نے کہا۔ ''اسے اسی لحاظ سے ڈیزائن کیا گیا ہے۔''

''مگر اس کا عملہ یہاں چند دن سے زیادہ نہیں رہ سکا۔'' کارن نے طنز کیا۔ ایسا لگ رہا تھا اسے مارک پسند نہیں آیا تھا۔ گریگ گیس فائر کی مدد سے مددگار کو میکا کے گرد گھما رہا تھا۔ اس نے ایک گول دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا خیال ہے یہ داخل ہونے کا راستہ ہے۔''

''مددگار کو اس سے منسلک کرو۔'' فلپس نے حکم دیا۔

گریگ اپنے جہاز کو میکا کی سیدھ میں لے آیا۔ اس سے دو آہنی بازو نکلے اور انہوں نے دروازے کے دائیں بائیں نکلی دو راڈز کو پکڑ لیا اب مددگار میکا سے جڑ گیا تھا۔ پھر مددگار کے نیچے سے ایک لمبا پل نکل کر میکا کے دروازے تک گیا۔ اس کے دونوں طرف ریلنگ لگی تھی۔ فلپس اٹھا تو مارک نے ایک بار پھر اس سے ساتھ چلنے کی درخواست کی مگر اس نے پھر انکار کیا۔ ''تمہاری یہاں ضرورت ہے اس لیے تم یہیں رہو گے۔''

چند منٹ بعد فلپس، ریڈ اور کارن پریشرائزڈ سوٹ پہن رہے تھے۔ سوٹ پہن کر وہ باہر نکلنے والے ائر لاک خانے میں آئے اور اس کے اندر آنے کے بعد انہوں نے بیرونی دروازہ کھول دیا۔ اگر انہوں نے ہینڈل نہ پکڑا ہوتا تو ہوا انہیں کھینچ لے جاتی۔ وہ پل کی ریلنگ پکڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ ان کے پیچھے مددگار کا دروازہ بند ہوگیا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے وہ میکا کے دروازے کے سامنے تھے۔ انہوں نے ہینڈل کے ذریعے اس کا دروازہ کھولا۔ ہوا کا جھکڑ باہر آیا اور پھر وہ اندر گئے۔ خانہ بند کرکے انہوں نے میکا کے اندر جانے والا دروازہ کھولا۔ وہ جہاز کے وسطی حصے میں داخل ہوئے

تھے۔ یہ ایک طویل اور عظیم الجثہ راہداری کی طرح تھا جو جہاز کے اگلے اور پچھلے حصے کو ملا رہی تھی۔ عقبی حصہ کارگو اور انجن پر مشتمل تھا۔ جب کہ اگلا حصہ کنٹرول، رسد اور رہائش کے لیے تھا۔ فلپس نے ریڈ سے کہا۔

''تم میرے ساتھ چلو اور کارن تم اگلے حصے میں جاؤ گے۔''

کارن نے سر ہلایا اور اس طرف بڑھ گیا۔ وہاں ہر طرف اوزار اور مختلف چیزیں تیر رہی تھیں۔ اگر ان کے جوتوں میں مقناطیس نہ لگے ہوتے تو وہ بھی تیر رہے ہوتے۔ عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے فلپس کی نظر دونوں طرف لگے کچھ الیکٹرانکس آلات پر گئی۔ اس نے سوٹ کے کیمرے کا رخ ان کی طرف کرکے مارک سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہیں؟''

''یہ جیٹ بم ہیں ان کی مدد سے ایک منٹ میں اس راہداری کو تباہ کرکے میکا کے دونوں حصوں کو الگ کیا جاسکتا ہے۔''

''کیا اس کی ضرورت پڑسکتی ہے؟''

''بالکل... اگر میکا کا انجن بے قابو ہوجائے تو اس کی ضرورت پڑے گی۔''

''میکا کا انجن؟'' فلپس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ابھی تم دیکھ لوگے۔'' مارک نے کہا۔ فلپس اور ریڈ ایک چھوٹی سی سرنگ کے سامنے پہنچے۔ اس کا دروازہ ان کے سامنے خود بہ خود کھل گیا وہ اندر داخل ہوئے تو خود بہ خود بند ہو گیا۔ سرنگ تیس میٹرز سے زیادہ طویل تھی۔ وہ اس کے دوسرے سرے تک پہنچے تو یہاں کا دروازہ بھی خود بہ خود کھل گیا۔ فلپس نے اندر جانے سے پہلے اس کا لاک ہینڈل کھینچ لیا، اب یہ مستقل کھلا رہتا۔ وہ اندر آئے تو انہیں ایک چاروں طرف سے اندرونی حصے جیسا گول کمرا نظر آیا۔ اس میں چاروں طرف آہنی پٹیوں کے درمیان ابھرے ہوئے سلینڈرز جیسی چیزیں لگی تھیں اور کمرے کے وسط میں ایک سیاہ گیند تھی جس کے اوپر تین گھومتے رنگ تھے اور یہ گیند معلق تھی۔ رنگ کے کناروں پر تیز سفید رنگ کی روشنیاں جل رہی تھیں۔ فلپس دنگ رہ گیا اس نے بے ساختہ کہا۔

''یہ بلیک ہول ہے؟''

''ہاں ایک مصنوعی بلیک ہول، یہ میری ایجاد ہے اور یہی اس جہاز کا انجن ہے۔ تم جانتے ہو کائنات میں بلیک ہول سے زیادہ طاقتور چیز اور کوئی نہیں ہے۔''

''کیا یہ بند ہے؟''

''یہ بھی بند نہیں ہوتا مسلسل کام کرتا رہتا ہے اور لامحدود توانائی پیدا کرتا ہے۔'' مارک نے کہا۔

''یہ اس کے گرد رنگ کیسے گھوم رہے ہیں؟''

''یہ اس کا مقناطیسی میدان بناتے ہیں اور اسے قابو میں رکھتے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو یہ بلیک ہول سیکنڈ کے کروڑویں حصے میں اس پورے جہاز کو اپنے اندر سمو لے گا۔''

ریڈ گھوم کر دیکھ رہا تھا۔ بلیک ہول کے نیچے پانی سے بھرا ہوا تالاب تھا۔ یہاں دیواروں کے درمیان رخنے تھے۔ ریڈ نے پوچھا۔ ''یہ خطرناک نہیں ہے؟''

''قطعی نہیں... کوئی بھی اس کے پاس جا سکتا ہے اسے چھو سکتا ہے۔'' مارک نے جواب دیا۔ وہ مددگار کے کاک پٹ میں موجود تھا۔ گریگ، میک، اینا اور کیتھ اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب ان کیمروں کی ویڈیو دیکھ رہے تھے۔ کارن میکا کے تاریک کنٹرول روم میں پہنچ گیا تھا، وہ ٹارچ کی روشنی میں سب دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔

''یہاں کوئی نہیں ہے۔'' سوٹ میں لگی ٹارچ کی روشنی کنٹرول پینل پر گئی تو اس پر لگا خون کا داغ نمایاں نظر آیا۔ اس نے اسے دستانے سے چھو کر دیکھا۔ ''یہ خون ہے۔''

''جہاز کا سسٹم شیئر کرو۔'' اینا نے کہا تو کارن مرکزی پینل کی طرف آیا۔ یہ سارا جدید ترین ٹچ پینل تھا، اس میں کہیں کوئی بٹن یا ایسی کوئی چیز نہیں تھی جسے عملی طور پر دبایا جاتا۔ اس نے ایک چھوٹی اسکرین سے یہاں کا سسٹم آن کیا۔ بڑی اسکرین آن ہوتے ہی اس نے سسٹم شیئر کر دیا اور اب اینا اسے اپنی مرضی سے استعمال کر سکتی تھی۔ اس نے سب سے پہلے میکا کی پاور آن کی۔ اس کی بیٹریز سات سال میں بھی بہترین حالت میں تھیں۔ دو منٹ میں میکا کی برقی طاقت مکمل طور پر کام کرنے لگی تھی اور اس کی اندر اور باہر کی تمام روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ اب اینا اس کی اندرونی فضا کا دباؤ، مصنوعی کشش اور آکسیجن کے نظام کو بحال کر رہی تھی۔ فلپس اور ریڈ انجن والے حصے کا معائنہ کر کے اب اگلے حصے کی طرف آ رہے تھے۔ یہاں کارن کنٹرول روم کا معائنہ کر رہا تھا اور وہاں خاصا خوفناک منظر تھا، دیواروں پر جا بہ جا خون اور گوشت کے ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔ کارن نے کہا۔

''میرے خدا، یہاں کیا ہوا ہے کوئی قتل عام... یا کوئی ایلین اندر گھس آیا تھا؟''

اب تک انہیں نہ تو کوئی زندہ انسان ملا تھا اور نہ ہی کوئی لاش دکھائی دی تھی۔ فلپس اور ریڈ اندر داخل ہوئے۔ ریڈ ذرا پیچھے رک گیا، ایسا لگا جیسے اس نے کوئی آواز سنی ہو۔ اس نے سر جھٹکا۔ آواز ایک راہداری سے آئی تھی۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس طرف بڑھ گیا۔ اسی لمحے اس کے سوٹ سے لگا ہوا کیمرا بند ہو گیا۔ گریگ نے اسے پکارا۔ ''ریڈ اپنا کیمرا چیک کرو یہ آف ہو گیا ہے۔''

ریڈ کو پتا نہیں چلا کیونکہ اسے گریگ کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی کیمرے کے ساتھ ریڈیو نے بھی کام چھوڑ دیا تھا۔ آواز اسے جانی پہچانی لگی تھی۔ اسے سن کر اسے اپنا بچپن کا دوست جیف یاد آ گیا تھا۔ جیف جواب بھی اس کا دوست تھا لیکن اب وہ عام انسانوں کی دنیا سے کٹ گیا تھا۔ وہ گزشتہ دس سال سے ایک نفسیاتی اسپتال میں داخل تھا۔ اس نے حد سے زیادہ منشیات استعمال کی تھی جس نے اس کا ذہن ہمیشہ کے لیے ماؤف کر دیا تھا۔ وہ، سارہ اور ریڈ اسکول کے زمانے کے دوست تھے۔ اسکول کے بعد یہ دوستی کسی حد تک تبدیل ہوئی تھی۔ اب سارہ ریڈ کی بیوی تھی۔ ریڈ نے راہداری میں آگے جاتے ہوئے آواز دی۔ ''جیف، یہ تم ہو؟''

''ہاں۔'' جیف کی آواز آئی۔ ریڈ نے جھانک کر دیکھا مگر یہ جگہ خالی تھی پھر اسے لگا کہ کھڑکی کے پاس کوئی تھا مگر وہ خلائی جہاز کے اندر نہیں بلکہ باہر تھا۔ شیشے سے رہ رہ کر روشنی اندر آ رہی تھی۔ وہ چلتا ہوا کھڑکی کے سامنے پہنچا اور جب اس نے باہر دیکھا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

☆☆☆

ریڈ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ گریگ نے فوراً فلپس اور کارن کو خبردار کیا۔ وہ پلٹ کر کنٹرول روم کے داخلی حصے کی طرف آئے یہاں سے کئی راہداریاں میکا کے مختلف حصوں میں جا رہی تھیں۔ فلپس نے کارن کو ایک طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود دوسری طرف بڑھ گیا۔ وہ ریڈ کو آواز دے رہے تھے مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ فلپس ایک راہداری میں مڑا تو اسے ریڈ نظر آیا، وہ اس طرف موجود ایک شیشے کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ فلپس نے اسے پکارا تو اس نے سر موڑ کر دیکھا اور اشارے سے کھڑکی سے باہر دیکھنے کو کہا۔ فلپس آگے آیا۔ کھڑکی کے باہر اسے سفید بادلوں میں ایک لہر سی مچلتی نظر آئی۔ اس نے تشویش سے کہا۔

''یہ کیا ہے؟''

ریڈ نے کوئی جواب نہیں دیا وہ ساکت کھڑا تھا۔ اسی لمحے وہ مچلتی چیز تڑپ کر میکا کی طرف آئی۔ ایک کڑاکا ہوا اور یوں لگا جیسے میکا ریزہ ریزہ ہو گیا ہو۔ فلپس کھڑکی سے ذرا دور تھا پھر بھی وہ جھٹکے سے پیچھے گیا تھا۔ ریڈ تو اڑ کر دور جا گرا تھا۔ چاروں طرف چنگاریاں سی اڑ رہی تھیں۔ فلپس نے چلا کر گریگ سے پوچھا۔ ''وہاں سب ٹھیک ہے؟''

مگر اس طرف سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا، ریڈیو کام

نہیں کر رہا تھا۔ فلپس ریڈ کی طرف بڑھا جو ساکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں کچھ دیر بعد وہ مددگار کے طبی امداد کے یونٹ میں میز پر اسی طرح ساکت پڑا تھا اور کیتھ ٹارچ کی روشنی اس کی آنکھوں میں ڈال کر معائنہ کر رہی تھی۔ میک اس کے ساتھ تھا۔ اس نے طبی معاون کا کورس کر رکھا تھا اور کسی ہنگامی صورت حال میں وہ کیتھ کا اسسٹنٹ بن جاتا تھا۔ کیتھ نے ٹارچ بند کی تو اس نے پوچھا۔ ''یہ ہوش میں ہے؟''

''بہ ظاہر۔'' کیتھ بولی۔ ''پتلیاں بھی ردعمل دے رہی ہیں لیکن ایسا لگ رہا ہے اسے آس پاس کا احساس نہیں ہے۔''

''یعنی یہ ٹرانس میں ہے؟'' میک نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جسمانی حالت کیسی ہے؟''

''بہترین ہے کسی جگہ زخم یا اندرونی چوٹ کا نشان نہیں ہے۔'' کیتھ نے کہا۔ ''الیکٹرک شاک کی علامات بھی نہیں ہیں۔''

اس وقت فلپس کاک پٹ میں تھا جہاں بجلی جیسی لہر آنے کے بعد آلات سے چنگاریاں نکلی تھیں اور ان کا رابطہ میکا سے ٹوٹ گیا تھا۔ نیٹ ورک ختم ہو گیا تھا اور اینا کو اسے پھر سے تشکیل دینا پڑا تھا، تب کہیں جا کر رابطہ بحال ہوا اور اب وہ میکا کے اندر کی مصنوعی کشش اور ماحول بحال کر رہی تھی۔ فلپس نے مارک سے پوچھا۔ ''تم بتا سکتے ہو یہ کیا تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ چیز میرے لیے بھی اجنبی ہے۔''

''کیا کسی چیز بادلوں کے اندر کہیں چمک رہی ہے؟'' کارن نے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے یہ بجلی ہے۔''

''یہ بجلی نہیں ہے کیونکہ میکا یا مددگار پر کرنٹ کے کوئی آثار نہیں ملے ہیں۔'' اینا نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔

''تب نیٹ ورک کیسے ختم ہو گیا؟''

''اس بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' میک وہاں آگیا۔ ''کیتھ کا کہنا ہے الیکٹرک شاک کا کوئی نشان نہیں ملا ہے۔''

''ریڈ کی حالت کیسی ہے؟''

''وہ ٹرانس میں لگ رہا ہے، ویسے جسمانی اور ذہنی لحاظ سے ٹھیک ہے۔''

''میں میکا کا مکمل سسٹم اپ ڈیٹ کرنے جا رہی ہوں۔'' اینا نے کہا۔ ''اس میں پانچ منٹ لگ سکتے ہیں۔''

مارک میکا سے کی جانے والی آخری ٹرانسمیشن کی ریکارڈنگ سن رہا تھا، گریگ اس کے پاس تھا۔ اس نے مارک سے ریکارڈز لے کر غور سے سنا اور بولا۔ ''اب میں بھی

گیا وہ کیا کہہ رہے تھے؟''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''وہ کہہ رہے تھے خود کو بچاؤ... وہ اپنی نہیں یہاں آنے والے دوسرے لوگوں کی بات کر رہے تھے۔''

اسکرین پر میکا کا سسٹم آن ہونے کا عمل گرافک کی صورت میں نظر آرہا تھا' پانچ منٹ پورے ہوتے ہی میکا کا سسٹم آن ہو گیا اور پھر کمپیوٹر نے بتایا کہ میکا کا مصنوعی کشش اور آکسیجن کی فراہمی کا نظام کام کرنے کے لیے تیار تھا۔ میکا کے عملے پر کیا گزری تھی' اس کا پتا صرف اس کے مرکزی کمپیوٹر میں موجود ڈیٹا سے لگایا جا سکتا تھا۔ یہ ڈیٹا یہاں مددگار میں شیئر نہیں ہو سکتا تھا اور اس کے لیے دوبارہ میکا کے کنٹرول روم تک جانا لازمی تھا۔ وہ پھر تیاری کرنے لگے۔ گریگ اپنی نشست پر مددگار کے آلات کا جائزہ لے رہا تھا' اس نے فلپس کو پکار کر کہا۔ ''کمانڈر یہاں ایک مسئلہ ہے۔''

''کیا ہوا؟'' فلپس نے پوچھا۔

''نچلے حصے میں کچھ ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔''

وہ باہر جانے کی تیاری کرنے لگے۔ مارک فلپس کے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ ''میں بھی جاؤں گا۔''

فلپس نے پریشرائزڈ سوٹ پہنتے ہوئے کہا۔ ''سوائے گریگ' کیتھ اور اینا کے سب چلیں گے۔''

مارک نے دیکھا۔ سب سوٹ پہن رہے تھے۔ مارک نے اپنے لیے سوٹ نکالا۔ وہ مددگار سے باہر آئے۔ مسئلہ فوراً سامنے آ گیا تھا' مددگار کے نچلے حصے میں چادر پھٹ گئی تھی اور اس سے گیس خارج ہو رہی تھی۔ تار کٹ گئے تھے اور ایک پائپ پھٹ گیا تھا۔ فلپس پریشان ہو گیا' اس نے کارن سے کہا۔ ''ہمارے پاس بیس گھنٹے ہیں اس دوران میں لازمی طور پر اس کی مرمت کرنی ہے۔''

کارن نے ٹوٹ پھوٹ کا جائزہ لیا۔ ''مشکل ہے کمانڈر اس کے لیے کم سے کم تیس گھنٹے کا وقت درکار ہے۔''

''بیس گھنٹے۔'' فلپس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پھر ہمیں روانہ ہونا ہے۔ میک' تم اور کارن مل کر یہ کام کرو گے۔ مارک تم میرے ساتھ آؤ۔''

وہ پل سے گزرتے ہوئے میکا تک آئے اور اس کے اندر داخل ہو گئے۔ فلپس نے اپنے دستی کمپیوٹر سے وہاں کی ہوا اور دباؤ کا جائزہ لیا اور اسے نارمل پا کر اپنا ہڈ اتار دیا۔ مارک نے بھی ہڈ اتار دیا تھا۔ ہوا اور دباؤ کو نارمل پا کر انہوں نے سوٹ اتارے۔ فلپس نے کہا۔ ''کیا اس جہاز کو واپس لے جانا ممکن ہے؟''

''بالکل ممکن ہے۔'' مارک نے عقبی حصے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے اس کے انجن کا اسٹارٹ ہونا لازمی ہے۔''

''انجن ٹھیک ہے؟''

''یہ دیکھنا پڑے گا۔'' مارک بولا۔

وہ انجن والے کمرے میں آئے۔ ساری روشنیاں آن ہونے کے بعد وہاں سب واضح دکھائی دے رہا تھا۔ مارک نے وہاں لگے چھوٹے سے کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے مگر کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ اس نے فلپس سے کہا۔ ''ممکنہ طور پر کسی سرکٹ میں خرابی ہے اس لیے انجن اسٹارٹ نہیں ہو رہا ہے۔''

☆☆☆

کیتھ ریڈ کے پاس تھی۔ وہ اب تک ساکت تھا۔ کیتھ ٹہل رہی تھی۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے کوئی بچہ ہنسا ہو۔ وہ چونک گئی اس نے اس طرف دیکھا جہاں سے آواز آئی تھی۔ وہاں ایک میز پر قرنطینہ باکس لگا ہوا تھا۔ شفاف پلاسٹک کے باکس پر ریشمی چادر چڑھی ہوئی تھی۔ کیتھ کو لگا جیسے اس باکس میں کوئی ہو' ایک سایہ سا حرکت کر رہا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر چادر کھینچ لی۔ پھر وہ تڑپ گئی۔ اندر ایڈم بیٹھا ہوا تھا اس کا اکلوتا بیٹا... اس کے ہاتھوں پر نلکیاں لگی تھیں اور اس کے دونوں پاؤں زخمی تھے۔ ان زخموں میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ ایڈم نے اس کی طرف دیکھا اور دکھی لہجے میں بولا۔ ''مام... میرے پاؤں۔''

''ایڈم۔'' کیتھ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

اسی لمحے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اس نے چونک کر دیکھا وہ گریگ تھا۔ ''میں اتنی دیر سے تمہیں کال کر رہا تھا تم جواب کیوں نہیں دے رہی تھیں؟''

''یہاں ایڈم...'' کیتھ نے کہتے ہوئے باکس کی طرف دیکھا۔ وہ خالی تھا۔

''کیا ایڈم...'' گریگ نے نرمی سے کہا۔

''یہاں ایڈم تھا میں نے خود اسے دیکھا تھا۔''

گریگ نے اس کا شانہ تھاما۔ ''کیتھ' میری بات سنو... ایڈم اس دنیا میں نہیں ہے۔''

کیتھ جانتی تھی لیکن وہ اس بات کو اپنا وہم سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی' اس نے خود ایڈم کو دیکھا تھا۔ وہ ایڈم جو کینسر کے ہاتھوں صرف آٹھ سال کی عمر میں دنیا سے گزر گیا تھا۔ اسکیٹ بورڈ سے گرنے کے بعد اس کے گھٹنوں پر چوٹ آئی تھی جو بگڑ کر کینسر بن گئی۔ کیتھ مصروف تھی۔ وہ نئی نئی ناسا کی جاب پر آئی تھی اور بعض اوقات اسے کئی کئی دن گھر جانے کا

موقع نہیں ملتا تھا۔ جب تک پتا چلتا کینسر اس کے جسم میں پھیل چکا تھا اور پھر وہ بچ نہیں سکا۔ اچانک عقب میں روشنی کا جھماکا ہوا۔ مددگار کی روشنیاں ایک لمحے کو بند ہوئیں اور پھر آن ہوگئیں۔ وہ دونوں تیزی سے ریڈ کی طرف آئے جو لیٹے لیٹے لرز رہا تھا۔ کیتھ نے انجکشن تیار کرتے ہوئے گریگ سے کہا۔ ''اسے پکڑو۔''

گریگ اسے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک ریڈ نے اٹھتے ہوئے گریگ کا سر تھام لیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''وہ میرے اندر ہے۔''

''کون؟''

''وہ جو مجھے آئینہ دکھا رہا ہے۔''

''کون؟'' گریگ نے پھر پوچھا۔

''اس نے مجھے سارہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا، وہ سارہ سے محبت کرتا تھا۔'' ریڈ نے کہا اور بے دم سا ہو کر واپس گر گیا۔ کیتھ اسے انجکشن لگاتے لگاتے رک گئی۔ اس نے ریڈ کی نبض اور آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں اور تشویش سے بولی۔

''یہ واپس اسی کنڈیشن میں چلا گیا ہے۔''

''پتا نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔'' گریگ نے کہا۔

''یہاں کچھ ہے، میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ میں نے ایڈم کو ہی دیکھا تھا۔''

گریگ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اس کا شانہ تھپکا اور واپس کاک پٹ کی طرف چلا گیا۔ کیتھ پھر مضطرب انداز میں ٹہلنے لگی۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر وہی منظر آ رہا تھا جب اس نے ایڈم کو قرنطینہ باکس میں دیکھا تھا۔ وہ ہر بار ریڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیکھتی تھی اور ایک بار جب اس نے ریڈ کی طرف دیکھا تو وہ اسے بیڈ پر نظر نہیں آیا۔

☆☆☆

مارک اور فلپس انجن روم میں تھے۔ فلپس نے پوچھا۔ ''خرابی کہاں ہو سکتی ہے؟''

''بلیک ہول کو قابو کرنے والا سسٹم ہزاروں سپر کمپیوٹرز پروسیسرز کی مدد سے کام کرتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی کام نہ کرے تو انجن کام نہیں کرتا ہے۔ مجھے اندر جا کر دیکھنا ہوگا۔'' مارک نے ایک طرف خانے میں موجود ٹول کٹ نکالی اور پھر کنٹرول پینل پر چند بٹن دبائے تو ایک طرف چوکور خانہ کھل گیا۔ مارک نے کہا۔ ''تم یہیں رکو... کوئی مسئلہ ہوا تو میں تمہیں آواز دوں گا۔''

مارک اس چوکور راہداری میں داخل ہوا جو تین فٹ اونچی اور اتنی ہی چوڑی تھی۔ اس کی دیواروں سے ہلکی پیلی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دیواروں پر پروسیسرز تھے۔ وہ اس میں چاروں ہاتھوں پاؤں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اندر سے راہداریاں بہت طویل تھیں اور یہ انجن روم کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ ہر راہداری میں جھانک رہا تھا۔ اگر کوئی پروسیسر کام کرنا چھوڑ دیتا تو جہاں وہ لگا ہوتا دیوار کی روشنی بند ہو جاتی۔ بالآخر ایک راہداری میں اسے خرابی نظر آگئی۔ وہ اندر داخل ہوا۔ پروسیسر کی شیٹ سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اس نے کھینچ کر اسے باہر نکالا اور چھوٹے سے کٹر سے اس کے تار کاٹ دیے۔ پھر اس نے ساتھ رکھا ہوا متبادل پروسیسر نکال کر فٹ کیا اور خانہ بند کیا تو اس کی دیوار بھی روشن ہوگئی تھی۔ اسی لمحے مارک کو قریب سے کسی کی آواز آئی۔ وہ چونکا۔

''میکا...'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''میرے محبوب۔'' میکا کی گنگناتی آواز آئی۔

''یہ ناممکن ہے۔''

''یہاں سب ممکن ہے۔'' میکا اسی انداز میں بولی۔

''تم بھول رہے ہو یہ میکا ہے۔''

اچانک ہی وہاں تاریکی چھا گئی۔ مارک نے جیبی ٹارچ نکال کر روشن کی۔ وہ دونوں طرف روشنی گھما کر دیکھ رہا تھا، اس نے میکا کو پکارا مگر کوئی جواب نہیں ملا۔

☆☆☆

کیتھ نے گریگ کو اطلاع دی۔ ''ریڈ غائب ہے۔''

''کہاں گیا؟''

''پتا نہیں، میں اسے تلاش کر رہی ہوں۔'' کیتھ کہتے ہوئے راہداری میں آئی تو اسے ریڈ لفٹ میں دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف لپکی لیکن اتنی دیر میں لفٹ نیچے جا چکی تھی۔ اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے گریگ کو بتایا کہ ریڈ نیچے گیا تھا۔ وہ نیچے پہنچی تو ائرلاک خانے کا دروازہ بند ہو رہا تھا ریڈ دوسری طرف دکھائی دے رہا تھا۔ کیتھ نے چیخ کر ریڈ کو آواز دی مگر اس نے نہیں سنا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کیتھ نے لپک کر اسے کھولنے والا بٹن دبایا مگر اس نے کام نہیں کیا۔ ریڈ نے اسے اندر سے لاک کر دیا تھا۔ کیتھ نے اسے آواز دی۔ ''تم سن رہے ہو نا پلیز... دروازہ کھولو۔''

''ریڈ کہاں ہے؟'' گریگ نے ریڈیو پر پوچھا۔

''وہ ائرلاک چیمبر میں چلا گیا ہے۔'' کیتھ بولی اور اس نے دوبارہ ریڈ سے التجا کی۔ ''بیٹے دروازہ کھول دو۔''

ریڈ اس کی طرف مڑا۔ ''نہیں... وہ میرے اندر ہے۔''

''کون اندر ہے؟''

”وہ جو مجھے آئینہ دکھا رہا ہے۔“ ریڈ نے کہا۔
اسی اثنا میں گریگ اور اینا بھی آگئے۔ اینا نے تیزی سے دروازے کے پینل کو چیک کیا اور اس کا لاک کھولنے لگی۔ کیتھ نے پوچھا۔ ”کتنی دیر لگے گی؟“
”کم سے کم پانچ منٹ۔“ اینا نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ گریگ نے فلپس سے رابطہ کر کے اسے صورتِ حال بتائی، اس نے کہا۔
”اسے روکنے کی کوشش کرو میں آرہا ہوں۔“
”اسے باتوں میں لگاؤ۔“ گریگ نے کیتھ کو اشارہ کیا۔
”ریڈ بیٹے! میری بات سنو... اگر تم نے ائر لاک کا باہر کا دروازہ کھول دیا تو تم مر جاؤ گے۔“
”مجھے مر جانا چاہیے۔“ اس نے کہا۔
”نہیں تمہاری بیوی ہے، وہ تمہارے پہلے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“
”وہ بچہ کبھی اپنے باپ کو نہیں دیکھ سکے گا۔“
”اگر تم زندہ رہے تو اسے دیکھو گے۔“ کیتھ نے اسے امید دلائی۔ ”پلیز دروازہ کھول دو۔“
ریڈ کا ہاتھ دروازہ کھولنے والے سبز بٹن کی طرف بڑھا لیکن اس نے اچانک سبز کے بجائے سرخ بٹن دبا دیا جو باہر کا دروازہ کھولتا تھا۔ مشینی آواز نے بتایا کہ دروازہ ایک منٹ میں کھل جائے گا۔ کیتھ چلانے لگی تھی۔ وہ اینا سے جلدی یہاں کا دروازہ کھولنے کو کہہ رہی تھی۔ ان کی چیخ و پکار پر اچانک ریڈ جیسے ہوش میں آگیا، اس نے آس پاس دیکھا اور بولا۔ ”میں یہاں کیوں ہوں...؟“ پھر اس نے ائر لاک کھلنے کا اشارہ دینے والی روشنی دیکھی اور چلایا۔ ”یہ ائر لاک کس نے آن کیا؟ مجھے یہاں سے نکالو۔“
”یہ تم نے آن کیا ہے۔“ کیتھ بولی، وہ روہانسی ہو رہی تھی۔
فلپس کی آواز آئی۔ ”خود کو قابو میں رکھو میں آرہا ہوں۔“
”میں مر جاؤں گا۔“ ریڈ ہراساں ہو گیا۔ ”مجھے نہیں یاد میں نے کب ایسا کیا۔“
”تم فکر مت کرو، ہم دروازہ کھول رہے ہیں۔“ گریگ نے اسے تسلی دی۔ اسی لمحے ائر لاک کا دروازہ کھلنے لگا۔ کیتھ نے چیخ ماری تھی۔ پریشر کم ہوتے ہی ریڈ نے چیخ ماری اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ دباؤ کم ہونے سے آنکھیں باہر آرہی تھیں۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا تھا پھر باہر جاتی ہوا اسے بھی کھینچ کر لے گئی مگر اس دوران میں فلپس ائر لاک کے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا، اس نے جمپ لگائی اور ریڈ کو واپس خانے میں دھکیلتا ہوا اندر آگیا۔ اس نے بٹن پر ہاتھ مارا اور خانہ بند ہونے لگا۔ اسی اثنا میں اینا نے لاک کو توڑ دیا اور اندر والا دروازہ کھل گیا۔ کیتھ اور گریگ تیزی سے اندر آئے جہاں ریڈ فرش پر تڑپ رہا تھا اور اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ گریگ نے اسے اٹھا لیا اور تیزی سے کیتھ کے ساتھ چلا گیا۔ فلپس نے اپنا ہڈ اتارا۔ اینا ہراساں کھڑی تھی، اس نے پوچھا۔
”کمانڈر! یہ کیا ہو رہا ہے؟“
”پتا نہیں، مارک انجن روم کے پروسیسنگ یونٹ میں گیا تھا اور پھر میرا اس سے رابطہ نہیں ہوا، یہاں یہ مسئلہ ہو گیا اور مجھے واپس آنا پڑا۔“
اینا نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ”کمانڈر! ہمیں جلد از جلد اس جگہ سے واپس چلے جانا چاہیے۔“
”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن ہمیں اپنا مشن پورا کرنا ہے۔“
”کیسا مشن کمانڈر جب میکا پر کوئی فرد زندہ نہیں ہے۔“ اینا نے کہا۔ ”یہاں موجود تمام افراد مارے جا چکے ہیں۔“
”ہاں لیکن ہمیں معلوم تو کرنا ہے کہ یہاں کیا ہوا ہے۔“ فلپس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگ رہا ہے میکا کے کنٹرول روم سے ڈیٹا حاصل کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اینا! تمہیں وہاں جانا ہوگا۔“
”میں تیار ہوں۔“
کارن اور میک مرمت کا کام کر رہے تھے اور کیونکہ وقت نہیں تھا اس لیے وہ اسے چھوڑ کر اندر نہیں آسکتے تھے۔ ویسے انہیں صورتِ حال کا پتا چل رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد کیتھ نے بتایا کہ ریڈ کی حالت خطرے سے باہر تھی لیکن اس کے جسمانی ٹشوز اور کئی نسیں متاثر ہوئی تھیں، اگر وہ ہوش میں ہوتا تو شدید تکلیف محسوس کرتا، اس لیے اس کا بے ہوش رہنا درست تھا۔ ریڈ کی طرف سے اطمینان کے بعد کیتھ اور اینا میکا میں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ کیتھ اینا کی مدد کرتی۔ گریگ یہیں رکتا۔ وہ پریشرائزڈ سوٹ پہن کر باہر آئے۔ اس دوران میں فلپس مارک سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ مارک کی طرف سے خاموشی تھی۔ وہ میکا میں داخل ہوئے۔ فلپس نے اینا اور کیتھ سے کہا۔ ”تم کنٹرول روم کی طرف جاؤ میں مارک کو دیکھتا ہوں۔“

☆☆☆

مارک ہراساں تھا وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ ٹارچ کی روشنی میں سرنگ میں آگے بڑھنے لگا۔ تاریکی کی وجہ سے اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ باہر جانے کا راستہ کون سا

تھا۔ اچانک سرنگ ایک لمحے کے لیے روشن ہوئی اور پھر تاریکی میں ڈوب گئی۔ اب رہ رہ کر روشنی اور تاریکی کا کھیل شروع ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے چاروں ہاتھوں پیروں سے چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک بار روشنی ہوئی تو اس نے چند انچ کے فاصلے پر میکا کو دیکھا۔ وہ ہڑبڑا کر رک گیا مگر جب دوبارہ روشنی ہوئی تو وہ وہاں نہیں تھی۔ بالآخر وہ دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس نے خانہ ایسے ہی کھلا چھوڑا اور انجن روم سے نکل گیا۔ وہ اندھا دھند آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک اسے لگا جیسے وہ میکا کے کسی ایسے حصے میں آ نکلا ہو جو اس کے لیے اجنبی تھا لیکن نہیں یہ اجنبی نہیں تھا یہ تو اس کا گھر تھا، اس کا اپارٹمنٹ اور وہ بیڈ روم میں کھڑا تھا۔ تب اس نے باتھ روم کے کھلے دروازے سے میکا کی جھلک دیکھی، وہ باتھ روب میں تھی۔ مارک باتھ روم میں آیا۔ میکا ٹب میں پانی بھر رہی تھی۔ مارک اس کے پاس آیا لیکن ایسا لگ رہا تھا وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھی۔

مارک نے اسے پکارا مگر اس نے کوئی ردعمل نہیں دکھایا۔ تب مارک جان گیا یہ کون سا منظر تھا۔ اس نے میکا سے التجا کی۔ ”پلیز ایسا مت کرو۔“

میکا خود سے بول رہی تھی۔ ”مارک میرے محبوب، میں تمہاری مزید بے رخی برداشت نہیں کر سکتی۔“

وہ ٹب میں بیٹھ گئی، اس نے مارک کا شیو کا استرا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ مارک نے اپنا سر تھام لیا اور جیسے ہی میکا نے کلائی پر استرا چلایا، وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی تھی۔ ”نہیں، میں یہ منظر نہیں دیکھنا چاہتا۔“ اس نے کہا اور پھر اس نے دونوں انگوٹھے اپنی آنکھوں پر رکھ کر دبائے۔ اس بار اس کے منہ سے جو چیخ نکلی اس میں کرب نمایاں تھا۔

☆☆☆

فلپس انجن روم میں آیا۔ اس نے کنٹرول پینل چیک کیا اور انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی انجن اسٹارٹ نہیں ہوا، ایسا لگ رہا تھا کہ خرابی دور نہیں ہوئی تھی۔

اس نے ریڈیو پر اینا سے پوچھا۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں اور کیتھ کنٹرول روم میں ہیں۔ میرے خدا یہاں ہر طرف خون اور گوشت کے لوتھڑے بکھرے ہوئے ہیں۔“

”انہیں نظر انداز کر دو اپنا کام کرو۔“ فلپس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ہمیں جلد از جلد یہاں سے روانہ ہونا ہے۔“

”مارک کہاں ہے؟“

”میں اسے دیکھ رہا ہوں لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔“

”کمانڈر! مجھے لگ رہا ہے اس جہاز میں کچھ گڑبڑ ہے ہمیں جتنی جلد ہو سکے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ فلپس نے کہا اور کارن سے رابطہ کیا۔ ”مرمت کی کیا پوزیشن ہے؟“

”نقصان زیادہ نہیں ہے ہم تین گھنٹے میں مکمل کر لیں گے۔“

”کیا یہ کام تم اکیلے کر سکتے ہو؟“

”ہاں میک کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے میک کو یہاں بھیج دو، میں چاہتا ہوں یہ آ کر میکا کا انجن دیکھ لے اگر یہ کام کر سکتا ہے تو میکا کو زمین پر ساتھ لے جا سکتے ہیں۔“

”میں آ رہا ہوں کمانڈر۔“ میک کی آواز آئی۔

فلپس فکر مند تھا، اس نے ریڈیو پر کئی بار مارک کو پکارا لیکن اس کی طرف سے جواب نہیں مل رہا تھا۔ انجن کی مرمت کے لیے کھولا جانے والا خانہ ایسے ہی کھلا ہوا تھا مگر اس کے اندر مارک نظر نہیں آ رہا تھا۔ فلپس نے فیصلہ کیا کہ وہ میک کے آنے پر خانے میں جا کر اسے دیکھے گا۔ دس منٹ بعد میک وہاں آ گیا۔ فلپس نے اسے انجن پر لگایا اور خود کھلے خانے میں داخل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میک کنٹرول پینل پر انجن کے فنکشن چیک کرنے لگا۔ اسے تعجب ہوا کہ انجن کے تمام فنکشن بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے لیکن جب اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔ اچانک اسے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا مگر کوئی نہیں تھا۔ وہ دوبارہ پینل کی طرف متوجہ ہوا چند لمحے بعد پھر آہٹ ہوئی اس نے مڑ کر دیکھا پھر کوئی نہیں تھا۔ میک چند لمحے دیکھتا رہا۔ وہ پھر پینل کی طرف مڑا۔۔۔ تیسری بار آہٹ ہوئی تو اسے مڑنے کا موقع نہیں ملا تھا کوئی چیز اس کے سر سے ٹکرائی اور وہ اوندھے منہ پینل پر گرا پھر اس سے ہوتا ہوا نیچے آ گرا۔ تب اس نے مارک کو دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک رنچ پانہ تھا لیکن میک کی توجہ اس کے چہرے پر تھی جس پر خون پھیلا ہوا تھا اور آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے۔ اس کا رنچ پانے والا ہاتھ نیچے آیا، میک نے بچنے کی کوشش کی لیکن بچ نہیں سکا۔ رنچ پانہ پوری قوت سے اس کے سر پر لگا تھا۔

☆☆☆

فلپس تیزی سے آگے جا رہا تھا کہ اچانک سرنگ تاریک ہو گئی۔ وہ رک گیا، اس نے ٹارچ نکال کر جلائی۔

اس نے سہارے کے لیے ایک طرف دیوار پر ہاتھ لگایا تھا کہ اچانک جھماکا سا ہوا اور اس کی نظروں کے سامنے ایلن کا چہرہ ابھرا۔ وہ خلائی اسٹیشن کے کنسول میں تھا اور بار بار شیشے پر ہاتھ مار رہا تھا۔ فلپس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے کنسول کا اسکٹ کا بٹن دبا دیا اور اس کا کنسول تیزی سے زمین کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا جس کنسول میں ایلن تھا اس سے اب شعلے نکل رہے تھے اور اچانک وہ دھماکے سے پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جھماکے کے ساتھ منظر غائب ہو گیا تھا۔ پھر سرنگ کی لائٹ آن ہو گئی۔ فلپس ہانپ رہا تھا اس کے چہرے پر پسینا اور خوف تھا۔

☆☆☆

کیتھ اور اینا کنٹرول روم میں تھیں۔ اینا مختلف پینل آن کر رہی تھی۔ بجلی والی لہر کے بعد نیٹ ورک ٹوٹنے سے یہ تمام پینل آف ہو گئے تھے۔ کیتھ ایک طرف قطاروں میں بنے چھوٹے پینلز اور ان کے سامنے موجود کرسیوں پر بکھرا خون دیکھ رہی تھی، یہاں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے جیسے کسی دھماکے میں جسم کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں لیکن وہاں کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا۔ ہر چیز صحیح سلامت تھی صرف اس پر خون اور گوشت بکھرا ہوا تھا۔ اسی طرح نہ کوئی ایسا آلہ تھا جس سے انسانوں کا یہ حشر کیا جا سکتا ہو۔ کیتھ نے پلٹ کر اینا سے کہا۔ ”یہاں کیا ہو سکتا ہے؟“

”پتا نہیں اگر یہ سسٹم آن ہو جائے تو شاید پتا چل جائے یہاں کے کیمروں نے بہت کچھ ریکارڈ کیا ہو گا۔“ اینا تیزی سے ہاتھ چلا رہی تھی۔

”میں نے کمانڈر سے کہا ہے کہ ہمیں جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

”ہاں لیکن اپنا کام مکمل کرنے کے بعد۔“ اینا نے کہا۔

”کمانڈر تم کہاں ہو؟“ کیتھ نے ریڈیو پر فلپس کو پکارا۔ اس کی طرف سے جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر کہا۔ ”کمانڈر تم کہاں ہو؟“

اینا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کمانڈر جواب نہیں دے رہا ہے۔“ کیتھ نے کہا اور پھر گریگ کو کال کی۔ ”کمانڈر جواب نہیں دے رہا ہے ذرا تم اس سے رابطہ کرو۔“

گریگ نے ریڈیو پر فلپس سے رابطہ کیا مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آ رہا تھا۔ گریگ نے کہا۔ ”میں آ رہا ہوں۔ میک کہاں ہے؟“

”وہ کمانڈر کے ساتھ ہے۔“ کیتھ نے جواب دیا۔

”اس کی طرف سے بھی جواب نہیں آ رہا ہے۔“

”یہ کیا ہو رہا ہے۔“ کیتھ بولی۔ ”ہمیں جلد از جلد روانہ ہو جانا چاہیے۔“

”کیسے؟“ گریگ نے کہا۔ ”ہم کمانڈر اور میک کے بغیر نہیں جا سکتے۔“

”میرا مطلب ہے ان کو تلاش کر کے ہمیں نکل جانا چاہیے۔“

”ابھی مددگار کی مرمت مکمل ہونے میں دو گھنٹے اور لگ سکتے ہیں۔“ گریگ بولا۔ ”تم فکر مت کرو میں آ رہا ہوں۔“

کیتھ ایک بار پھر فلپس کو کال کرنے لگی۔ وہ ہر دس سیکنڈ بعد اسے پکار رہی تھی۔ اچانک کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھل پڑی پھر فلپس کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ”کمانڈر! میں تمہیں کال کر رہی تھی تم جواب نہیں دے رہے تھے۔“

”مجھے تمہاری کوئی کال نہیں ملی۔“ فلپس نے کہا اور اینا سے پوچھا۔ ”تم نے اپنا کام کر لیا ہے؟“

”مجھے دس منٹ اور لگ سکتے ہیں سسٹم ری اسٹور کرنے میں۔“ وہ بولی۔

”ٹھیک۔“ فلپس نے سر ہلایا۔ ”کیتھ! تم میرے ساتھ آؤ۔“

وہ کیتھ کو لے کر راہداری سے ہوتا ہوا انجن روم تک آیا اور اس نے کنٹرول پینل دکھایا جس پر اب خون بکھرا ہوا تھا۔ ”میں میک کو یہاں چھوڑ کر گیا تھا واپس آیا تو وہ غائب تھا اور یہاں یہ خون بکھرا ہوا تھا۔“

”میرے خدا... اسے کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔“

”کچھ کہہ نہیں سکتے۔“ فلپس نے گہری سانس لے کر کہا۔ وہ واپس برج پر آ گئے۔ اس نے اینا اور کیتھ کو دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”یہ جہاز زندہ ہے۔“

کیتھ نے شک سے اسے دیکھا۔ ”کیا... کیا کہا تم نے؟“

اینا بھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ فلپس نے بات جاری رکھی۔ ”یہی کہ یہ جہاز زندہ ہے، یہ ہمارے بارے میں سب جانتا ہے۔ پچیس سال پہلے جب میں اپنے پہلے مشن پر خلا میں آیا تھا تب ایک حادثے کے نتیجے میں مجھے ایمرجنسی کنسول میں زمین پر جانا پڑا تھا میں اپنے ساتھی ایلن کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت میں نے خود غرضی کا ثبوت دیا تھا، اسے بچانے کی کوشش نہیں کی۔ میں بچ گیا اور مجھے اس حادثے سے بری الذمہ قرار دیا گیا۔ یہ بات سوائے میرے

کوئی نہیں جانتا لیکن یہ جہاز جانتا ہے، اس نے میرے دماغ کو پڑھ لیا۔''

اینا نے نفی میں سر ہلایا۔''کمانڈر! ایسا ممکن نہیں ہے، یہ دھات اور دوسرے مادوں کا بنا ہوا بے جان جہاز ہے۔''

''میری بات کا یقین کرو۔'' فلپس نے کہا۔''ہمیں یہاں سے جلد از جلد جانا ہوگا۔ اینا تم جلد از جلد اپنا کام ختم کرو اور کیتھ تم یہاں سے زیادہ سے زیادہ پاور اسٹکس لے لو ممکن ہے ہمیں واپس مدار میں جا کر مددگار کی مرمت کے لیے ان کی ضرورت پڑے۔''

اسی لمحے گریگ اندر آیا۔ وہ سیدھا ان کی طرف آیا تھا۔''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''میک اور مارک غائب ہیں۔'' فلپس نے کہا۔ ''میں انہیں تلاش کر رہا ہوں، تم کیتھ کے ساتھ مل کر یہاں سے پاور اسٹکس لے جاؤ ہمیں راستے میں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

پاور اسٹکس انجن روم کے ساتھ والی راہداری میں رکھی تھیں۔ کیتھ گریگ کے ساتھ یہاں آئی اور فلپس اینا کے ساتھ برج پر موجود رہا۔ وہ دونوں اوپر بنے خانوں سے پاور اسٹکس نکال نکال کر ڈھیر کرنے لگے۔ یہ سائز میں بڑی تھیں لیکن ان کا وزن زیادہ نہیں تھا۔ کسی ایمرجنسی میں یہ ایندھن کا کام کرتی تھیں۔ ان سے انجن بھی چلایا جا سکتا تھا اور بجلی کی ضرورت بھی پوری کی جا سکتی تھی۔ ہر خلائی جہاز میں یہ ہنگامی حالات کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ اوپر سے ساری اسٹکس نکال کر کیتھ سائڈوں کی اسٹکس نکالنے لگی۔ گریگ نے چلا کر کہا۔''میرا خیال ہے کافی ہیں میں اس سے زیادہ نہیں لے جا سکتا۔''

''باقی میں اٹھا لوں گی۔'' کیتھ نے کہا۔ گریگ ممکنہ حد تک اسٹکس اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کیتھ اب اسٹکس جمع کر رہی تھی۔ گریگ چلا گیا تھا وہ اس کے پیچھے جا رہی تھی کہ اچانک اسے پیچھے سے ہنسنے کی آواز آئی۔ کیتھ رک گئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اسے انجن روم کے دروازے پر ایک چھوٹا سا سایہ نظر آیا وہ پلٹ کر اس طرف آئی۔ اس نے بے ساختہ آواز دی۔''ایڈم...''

''ممی۔'' ایڈم کی آواز آئی تو کیتھ کے ہاتھ سے اسٹکس چھوٹ گئیں، اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ وہ انجن روم میں آئی۔ اسے ایک طرف سے اوپر جاتی سیڑھیوں پر کسی کے چھوٹے پاؤں نظر آئے۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے آئی تو اس پر کوئی نہیں تھا لیکن اوپر سے ہنسنے کی آواز آ رہی

تھی، اسے یاد تھا جب وہ ایڈم کے ساتھ کھیلتی تھی اور وہ اس سے چھپتا پھرتا تھا تب وہ اسی طرح دل سے ہنستا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اوپر جانے لگی۔ انجن روم کے اوپر ایک گول خلا تھا اس میں مختلف فلورز بنے ہوئے تھے۔ اسے پہلے فلور پر ریلنگ پر ہاتھ دکھائی دیے۔ وہ اوپر آئی۔ فلور پر چاروں طرف گیلری تھی اور اس میں مختلف راستے نکل رہے تھے۔ کیتھ ایک راستے میں داخل ہوئی اور پھر دیوانہ وار چکرانے لگی۔ وہ ایڈم تک پہنچنے کے لیے مرنے کو بھی تیار ہوگئی۔ اسے بالکل یاد نہیں رہا کہ ایڈم اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ پھر وہ ایک راستے پر مڑی تو ایڈم اسے سامنے کھڑا نظر آیا۔ اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ ”ممی...“

کیتھ بے قرار ہو کر اس کی طرف بڑھی اور اچانک اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ خلا میں گر گئی اور تقریباً ستر فٹ نیچے انجن کے گولے کے نیچے فولادی جالی پر گری جس پر پانی لہریں لے رہا تھا۔ وہ پشت کے بل گری تھی اور اس کا جسم شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا تھا اس نے دھندلائی آنکھوں سے اوپر دیکھا تو اسے ایڈم ریلنگ سے جھانکتا دکھائی دیا اور پھر اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔

☆☆☆

فلپس پہلے اینا کے پاس آیا، اس نے میکا کا سسٹم آن کر لیا تھا اب اس کا ڈیٹا مددگار کے مرکزی کمپیوٹر کو بھیج رہی تھی۔ فلپس نے اسے مختصر الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہوشیار رہنے کا کہہ کر وہ برج سے اتر کر میکا کے رہائشی حصے میں آیا۔ اس نے احتیاطاً راستے سے لوہے کی ایک راڈ اٹھالی تھی وہ مختلف خانوں اور جگہوں پر جھانکتا پھر رہا تھا پھر ایک جگہ اسے ایک شخص کرسی پر بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کا شانہ اور بازو دکھائی دے رہے تھے اور اس نے ان کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ یہ شاید کھانے کا کمرا تھا اور یہاں بھی جا بہ جا خون بکھرا ہوا تھا۔ فلپس دبے قدموں راڈ اوپر کیے آگے آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے راڈ اوپر کی اور دوسرے ہاتھ سے کرسی گھمائی پھر اس کا ہاتھ خود نیچے آگیا۔ کرسی پر میک کی لاش تھی اور اس کا چہرہ بگڑا ہوا تھا۔ اسے مارک کا خیال آیا اور وہ دانت پیسنے لگا.... اس نے ریڈیو پر اینا سے کہا۔ ”ہوشیار رہو مارک نے میک کو قتل کر دیا ہے۔“

”وہ نہیں۔“ اینا بولی۔

”میں اسے تلاش کر رہا ہوں، اگر وہ برج پر آجائے تو فوراً مجھے خبردار کرنا۔“

”اوکے کمانڈر۔“ اینا نے کہا۔

فلپس نے گریگ کو کال کی۔ ”تم کہاں ہو؟“

”میں کاک پٹ میں آگیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”جہاز چیک کرو مارک وہاں تو نہیں ہے اس نے میک کو قتل کر دیا ہے، بہت ہوشیار رہنا۔“

گریگ بھی حیران ہوا تھا۔ ”لیکن کیوں، کیا وہ پاگل ہوگیا ہے؟“

”وقت ضائع مت کرو اسے تلاش کرو، مددگار خطرے میں ہے۔“ فلپس نے چلا کر کہا اور پھر کارن کو کال کی۔ ”مرمت کا کتنا کام ہوگیا ہے؟“

”تقریباً نوے فیصد۔“

”کیا مددگار کو اوپر مدار میں لے جایا جاسکتا ہے؟ باقی کام وہاں کرلیا جائے۔“

”بس یہ آخری کچھ ٹانکے لگا رہا ہوں پھر مددگار سفر کر سکے گا۔“

”ٹھیک ہے جلد از جلد مکمل کرو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے، میک مر چکا ہے اور مارک اس کا قاتل ہے۔“

وہ اگلے حصے سے نکل کر راہداری میں آیا۔ اس نے اگلے حصے کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا مارک وہاں نہیں تھا، اسے عقبی حصے میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ انجن والے حصے کی طرف جا رہا تھا کہ اس کی نظر راہداری کے وسط میں لگے جیٹ بموں پر گئی جن کا کام خلائی جہاز کو دو حصوں میں تقسیم کرنا تھا۔ وہ چونکا کیونکہ ان میں سے ایک بم غائب تھا۔

☆☆☆

گریگ پریشان ہوگیا تھا۔ وہ عقبی حصے کی طرف آیا تو اس نے مارک کو لفٹ سے نیچے جاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ گریگ سیڑھیوں سے نیچے لپکا لیکن جب تک وہ نیچے جاتا مارک ائر لاک میں جاچکا تھا اور باہر کا دروازہ کھول رہا تھا تب گریگ نے دیکھا اس کے ہاتھ میں تمام پریشرائزڈ سوٹ تھے۔ باہر نکل کر اس نے ہاتھ لہرایا جیسے اسے خدا حافظ کہہ رہا ہو۔ پھر اس نے تمام سوٹ خلا میں چھوڑ دیے اور خود میکا کی طرف بڑھ گیا۔ گریگ پاگلوں کی طرح وہاں رکھے سامان کو کھنگالنے لگا۔ اسے اضافی سوٹس کی تلاش تھی لیکن مارک سب لے جاچکا تھا اس نے ایک بھی نہیں چھوڑا تھا۔ گریگ نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ اچانک فلپس کی آواز آئی۔ ”گریگ ہوشیار، فوراً جہاز سے نکل آؤ... مارک کہاں ہے؟“

''کیسے؟'' گریگ نے چلا کر کہا۔ ''وہ حرامزادہ ابھی یہاں سے تمام سوٹ سمیٹ کر لے گیا ہے۔ کمانڈر جہاز میں ایک بھی پریشرائزڈ سوٹ نہیں ہے۔''

''میرے خدا... یہاں ایک جیٹ بم غائب ہے۔ گریگ، تلاش کرواسے۔ وہ اسے مددگار پر کہیں لگا گیا ہے۔ کیتھ کہاں ہے؟''

''وہ میرے ساتھ تھی لیکن وہ مددگار پر نہیں آئی۔'' گریگ نے پاگلوں کی طرح ایک ایک چیز کو دیکھتے ہوئے کہا مگر جیٹ بم اسے ایک طرف کپڑے کے پیچھے دیوار سے چپکا ملا۔ اس نے کپڑا ہٹایا تو اس پر اسٹاپ واچ چل رہی تھی اور صرف پانچ سیکنڈ کا وقت رہ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کمانڈر ٹل گیا ہے اور اب وقت نہیں ہے۔''

اسی لمحے دھماکا ہوا اور مددگار کا میکا کے ساتھ ملا ہوا حصہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

☆☆☆

فلپس میکا کی ایک کھڑکی سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے... مددگار کی تباہی دیکھ رہا تھا پہلے اس کا پچھلا حصہ تباہ ہوا اور پھر اگلا حصہ بھی ٹکڑے ہو کر بکھر گیا تھا۔ گریگ، ریڈ اور کارن کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فلپس نے کھڑکی کے شیشے پر دونوں ہاتھ مارے۔ اب وہ اس جہاز پر پھنس کر رہ گئے تھے۔ بس وہ اور دونوں عورتیں بچی تھیں۔ اب یہاں سے نکلنے کی ایک ہی صورت تھی۔ میکا کے اگلے حصے کو الگ کر دیا جاتا تو اس کے محدود طاقت کے انجن اس قابل ضرور تھے کہ اسے واپس زمین کی طرف دھکیل دیتے۔ لیکن اس کے لیے لازمی تھا کہ اسے پچھلے حصے سے الگ کر دیا جاتا۔ وہ راہداری میں نصب واحد جیٹ بم کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

کارن اس وقت مددگار کے نچلے حصے میں تھا۔ جب بلاسٹ ہوا تو اس نے اسے دور خلا میں دھکیل دیا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا سوٹ نقصان سے محفوظ رہا تھا۔ لیکن وہ تیزی سے سیارے اور میکا سے دور ہوتا جا رہا تھا، اس نے مددگار کو کسی کھلونے کی طرح بکھرتے دیکھا۔ اس میں موجود کسی فرد کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کارن اپنے سوٹ کا جیٹ چلانے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ جیٹ اسے واپس میکا کی طرف لے جا سکتا تھا۔ مگر اتنی دیر تک باہر رہنے کے بعد اس کے سوٹ کی بیٹری کی طاقت کم ہو گئی تھی۔ اس نے جیٹ چلانا چاہا مگر وہ اسٹارٹ نہیں ہوا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیٹری کی باقی رہ جانے والی طاقت کو جیٹ چارج کرنے میں استعمال کرتا۔ اس کے بغیر وہ واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے بیٹری کی باقی طاقت جیٹ کو دے دی۔ اس کی کلائی پر لگی اسکرین پر جیٹ کی طاقت بڑھ رہی تھی اور بالآخر وہ پوری ہو گئی اور اس نے بٹن دبایا تو اس کے سوٹ کے پیچھے لگے جیٹ نے چل کر اسے واپس میکا کی طرف دھکیل دیا۔

کارن کے حلق سے خوشی کے مارے چیخ نکل گئی تھی۔ وہ بچ گیا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مددگار کیوں تباہ ہوا تھا۔ بیٹری ختم ہونے سے اس کے سوٹ کے تمام برقی آلات نے کام چھوڑ دیا تھا۔ وہ ریڈیو پر کسی سے رابطہ نہیں کر سکتا تھا اسے اتنا معلوم تھا کہ فلپس، اینا اور کیتھ میکا پر تھے۔ مارک نے میک کو قتل کر دیا تھا۔ قریب آنے پر اسے میکا کا داخلی دروازہ نظر آیا اور اس نے جیٹ کی مدد سے اپنا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ اس نے ہاتھ آگے کیے اور خود کو تصادم سے بچایا اور دروازے کا ہینڈل پکڑ لیا۔ اسے گھما کر اس نے ائر لاک کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ پریشر نارمل ہونے پر اس نے میکا میں جانے والا دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا ہڈ اتارا اور میکا کے برج کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

فلپس واحد جیٹ بم کے پاس آیا، اس کا پینل کھول کر اس نے چند بٹن دبائے اور ڈیوائس آن ہو گئی۔ لیکن اس نے اس پر وقت مقرر کرنے کے بجائے بس اسے ایکٹو کر دیا۔ جیسے ہی اس نے ایکٹو کا بٹن دبایا برابر میں ایک چھوٹا خانہ کھلا جس میں ایک چھوٹا سا ریموٹ پڑا تھا اس پر واحد سرخ بٹن تھا جو ایک شفاف کور سے ڈھکا ہوا تھا۔ بس یہ کور ہٹا کر بٹن دبانے کی دیر تھی کہ جیٹ بم دھماکے سے میکا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا۔ اس نے ریموٹ اٹھایا اور انجن روم کی طرف آیا۔ اس نے دروازہ کھولا، اندر آتے ہی اس نے بلیک ہول کے نیچے پانی میں کیتھ کو پڑے دیکھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف آیا۔ ''کیتھ۔''

اس نے کہتے ہوئے اس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں تھی۔ دکھ کی شدت سے فلپس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کا اور کیتھ کا ساتھ پرانا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ یوں اس کا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔ اس نے گھومتے دائروں کے نیچے سے دوسری طرف کسی کے پاؤں دیکھے تھے۔ وہ اٹھ کر اس طرف آیا تو اس نے مارک کو دیکھا اور اس کی حالت دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اس کی آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے اور پورے چہرے پر خون پھیلا ہوا تھا۔ فلپس

نے بے ساختہ کہا۔ ''مارک، یہ کیا ہوا تمہاری آنکھیں؟''

''بیکار تھیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''میں نے نکال دیں... یہاں آکر مجھے پتا چلا میرے حواس کتنے غیر ضروری تھے۔ جب میں اپنے قریب ترین لوگوں کی سوچوں سے بے خبر تھا۔''

اچانک فلپس کو یاد آیا کہ اب تک کیا ہو چکا تھا اور اسے غصہ آنے لگا۔ ''مارک، یہ سب تم نے کیا ہے؟''

''ہاں...'' اس نے بلاجھجک اقرار کرلیا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میکا کو نئے عملے کی ضرورت ہے۔ ہم اس کا نیا عملہ بنیں گے۔''

''تمہارا دماغ درست ہے تم نے میک کو ماردیا۔ کیتھ کو قتل کیا۔ تم نے مددگار میں بم لگایا اور اس کے نتیجے میں گریگ، ریڈ اور کارن مارے گئے۔''

''کیتھ کو میں نے نہیں میکا نے مارا ہے۔ یہ اوپر سے گری ہے۔''

''اب صرف میں، تم اور اینا بچے ہیں۔''

''تین بھی کافی ہیں۔'' مارک بولا۔ ''درحقیقت میکا کو کسی کی ضرورت نہیں ہے، یہ جہاز اب خود سب کچھ کرسکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے یہ زندہ ہے؟''

''ہاں یہ ایک ایسی زندگی رکھتا ہے جس میں ضمیر نہیں ہے۔''

''اس لیے انیس افراد کی جان لینے کے بعد اب یہ ہمارے پیچھے پڑا ہے اور تم اس کے نمائندے ہو۔'' فلپس کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔ ''مارک، یہاں کیا ہورہا ہے؟''

''وہی جو تم سمجھ رہے ہو... وہی جو تم نے دیکھا... میکا اب ایک آئینہ ہے یہ تم کو تمہارا ماضی دکھاتا ہے وہ ماضی جو سب سے چھپا ہوا ہے۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا... میں نے محسوس کیا کہ یہ جہاز زندہ ہے یہ میرے ماضی کے بارے میں جانتا ہے اس نے میری سوچ پڑھ لی ہے۔ مگر یہ سب کیسے ہوا؟''

''میرے بنائے ہوئے انجن کے بلیک ہول نے کسی دوسری دنیا سے رابطہ کرلیا ہے۔ کوئی ایسی دنیا جہاں زندگی ہم سے مختلف شکل رکھتی ہے۔ وہ زندگی بلیک ہول کے راستے یہاں آگئی۔''

''زندگی یا شیطانی قوت؟''

''تم چاہو تو ایسا بھی کہہ سکتے ہو۔'' مارک نے سر ہلایا۔ ''وہ بڑھ نہیں سکتی ہے اس میں پیدائش کی قوت نہیں ہے ہاں وہ دوسروں کو اپنے جیسا بنا سکتی ہے۔ وہ مادے کو پھر سے ترتیب دے سکتی ہے۔''

فلپس نے بے یقینی سے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ میکا کا عملہ اور اب میرے ساتھی بھی...''

''ہاں وہ بھی اس قوت کا ایک حصہ بن جائیں گے۔ صرف وہی نہیں بلکہ یہاں موجود ہر فرد چاہے وہ زندہ ہو یا مر چکا ہو۔''

''اس کے لیے یہ قوت پہلے ہمیں ذہنی طور پر منتشر کرتی ہے اور پھر قابو کرلیتی ہے۔''

مارک نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''یہ جنگ، سیاست اور غلبے کا اصول ہے، پہلے دشمن کو ذہنی طور پر مغلوب کرو اس کے بعد جسمانی شکست آسان ہوتی ہے۔''

''لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔'' فلپس نے کہا، اس نے ریموٹ والا ہاتھ بلند کیا تھا کہ مارک حیرت انگیز تیزی سے لپک کر اس کے قریب آیا، اس نے ایک ہاتھ فلپس کے ہاتھ پر مارا اور ریموٹ چھوٹ کر دور جا گرا۔ فلپس نے اس کے منہ پر مکا مارا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس کے بجائے اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبوچ کر اسے فضا میں بلند کرلیا۔ فلپس کا دم گھٹنے لگا، وہ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اس نے مارک کو کئی ٹھوکریں ماریں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر مارک نے خود اسے اچھال دیا۔ وہ ایک طرف گول دیوار سے ٹکرایا اور لڑھک کر انجن کے نیچے پانی میں جا گرا۔ اس کی کمر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ مارک گھومتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔

''کمانڈر، تم بیکار میں مزاحمت کررہے ہو... وہ قوت ناقابلِ شکست ہے۔ جلد ہم سیارے پر جاری طوفان کی مدد سے یہاں سے روانہ ہوجائیں گے اور جلد اس قوت کا ایک حصہ بن کر خود بھی ناقابلِ شکست ہوجائیں گے۔''

فلپس پیچھے کھسکنے لگا۔ ''میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''تم کچھ نہیں کرسکتے۔'' مارک نے اس کے قریب آکر اسے ٹھوکر ماری تو وہ اڑ کر دور گرا۔ اس بار بھی اسے شدید چوٹ آئی تھی، ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا اور پیچھے سرکنے لگا۔ جسمانی طور پر وہ مارک سے کہیں زیادہ مضبوط تھا لیکن اس وقت مارک اسے کسی بچے کی طرح مار رہا تھا۔ سب سے حیرت ناک بات یہ تھی کہ اس کی آنکھیں نہیں تھیں اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا

جیسے اسے سب نظر آرہا ہو۔ پیچھے کھسکتے ہوئے فلپس لڑکھڑا کر نیچے گرا اور کوئی چیز اس کی کمر سے چبھی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم میکا لے جاؤ گے؟''

''بالکل، اس کے بغیر ہم اس قوت تک کیسے جا سکتے ہیں۔'' مارک نے کہا۔ ''یہی تو ہمیں اس لامتناہی فاصلے پر لے جائے گا۔''

''مارک تم ایسا کیوں کر رہے ہو؟'' فلپس نے پوچھا۔ اس کا ہاتھ پشت پر پڑی چیز کو ٹٹول رہا تھا۔

''کیونکہ وہ قوت مادے کو پھر ترتیب دے سکتی ہے' وہ لاشوں کو زندہ کر دے گی اور مجھے میری میکا واپس مل جائے گی۔ اسی کے لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے۔''

''لیکن اب تم وہاں نہیں جا سکو گے۔'' فلپس نے اپنا ہاتھ سامنے لاتے ہوئے کہا۔ اس میں بلاسٹ ڈیوائس کا ریموٹ تھا۔ اس نے بٹن پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''کبھی نہیں۔'' مارک اس کی طرف لپکا مگر وہ اسے بٹن دبانے سے نہیں روک سکا تھا۔

☆☆☆

کارن اندر آیا تھا کہ کوئی اچانک اس کے سامنے آیا اور وہ بھڑک اٹھا۔ مگر پھر اینا کو دیکھ کر پرسکون ہو گیا۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔ ''میرے خدا تم بچ گئے ہو۔ میں اور کمانڈر سمجھ رہے تھے کہ تم بھی مارے گئے ہو۔''

''بس قسمت تھی عین موقع پر جیٹ چل گیا اور میں واپس آگیا ورنہ میں خلا میں جا رہا تھا۔'' کارن نے کہا۔ ''کمانڈر کہاں ہے؟''

''انجن روم میں... وہ کیتھ اور مارک کو دیکھنے گیا ہے۔''

''وہی لعنتی شخص اس تباہی کا ذمے دار ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمیں یہاں کیوں بھیجا گیا جب کہ انیس افراد پہلے ہی اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔''

''میرا اندازہ ہے کہ ناسا حکام کو مارک نے اس مشن کے لیے راضی کیا تھا۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ اس جہاز کے لوگوں پر کیا گزری۔''

اینا اسے لے کر جہاز کے اگلے حصے میں آئی اور جب راہداری کی طرف کھلنے والا دروازہ بند ہو رہا تھا، درمیان میں لگے جیٹ بم سے آگ برآمد ہوئی اور راہداری بہت تیزی سے تباہ ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ یہ تباہی ان کی طرف آتی دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اینا کے منہ سے نکلا۔ ''میرے خدا کمانڈر...''

وہ دونوں جھپٹ کر نزدیکی کھڑکی تک آئے جس سے میکا کا انجن والا حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ راہداری تباہ ہو چکی تھی اور دھماکے کی شدت نے میکا کے دونوں حصوں کو مخالف سمتوں میں دھکیل دیا تھا۔ اگلا حصہ جس میں وہ تھے' اوپری مدار کی طرف جا رہا تھا اور انجن والا سیاہ دھبے کی طرف بڑھ رہا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس میں سما گیا۔ اینا رو رہی تھی اور کارن اس کے شانے کے گرد بازو تھمائے کھڑا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ہم بچ گئے، کمانڈر نے ہمیں بچا لیا یہ دھماکا اسی نے کیا ہے۔''

اینا نے سر ہلایا۔ ''ہمیں بچانے کا واحد راستہ یہی تھا۔ اب ہمیں واپس جانا ہوگا لیکن پہلے میں تمہیں دکھا دوں یہاں کیا ہوا تھا۔''

اینا اسے برج پر لائی جہاں ایک بڑی اسکرین پر اس نے ریکارڈ ویڈیو چلائی۔ اس میں میکا کا عملہ برج میں جمع تھا اور وہ خود کو نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ انہوں نے اپنی آنکھیں نکال دی تھیں۔ اپنے چہروں اور جسموں سے گوشت نوچ نوچ کر پھینک رہے تھے۔ جگہ جگہ یہ گوشت اور ان کا خون لگا ہوا تھا۔ پھر وہ سب ائرلاک والے خانے میں جمع ہوئے اور باہر کا دروازہ کھول دیا۔ خلا نے انہیں باہر کھینچ لیا اور پھر ان کے وجود ہمیشہ کے لیے خلا میں غائب ہو گئے۔ کارن پھٹی پھٹی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔ ''میرے خدا...''

''اب ہمیں واپس جانا ہے۔''

کارن نے سر ہلایا۔ ''جتنی جلدی ہو سکے۔''

اینا نے میکا کے انجن اسٹارٹ کر کے اس کا رخ زمین کی طرف کر دیا اور سسٹم کو آٹو پائلٹ کر کے وہ ہائبرڈ چیمبر میں سونے کی تیاری کرنے لگے۔ اس دوران میں اینا نے کارن کو فلپس کے خیال سے آگاہ کیا تھا کہ میکا کسی قوت کے زیر اثر زندہ جسم میں بدل گیا تھا اور وہ ان کے خیالات جان کر ان پر ان کی کمزوریوں کے حوالے سے دباؤ ڈال کر انہیں احساس جرم میں مبتلا کر رہا تھا اور بالآخر خودکشی پر مجبور کر رہا تھا۔ کارن نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تب ہم کیسے بچ گئے؟''

اینا نے اس کے شانے پر سر رکھ لیا۔ ''شاید اس لیے کہ ہمارے ماضی میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ان سب کے لیے ان کا ماضی عذاب بن گیا تھا۔''

سودائے جنوں

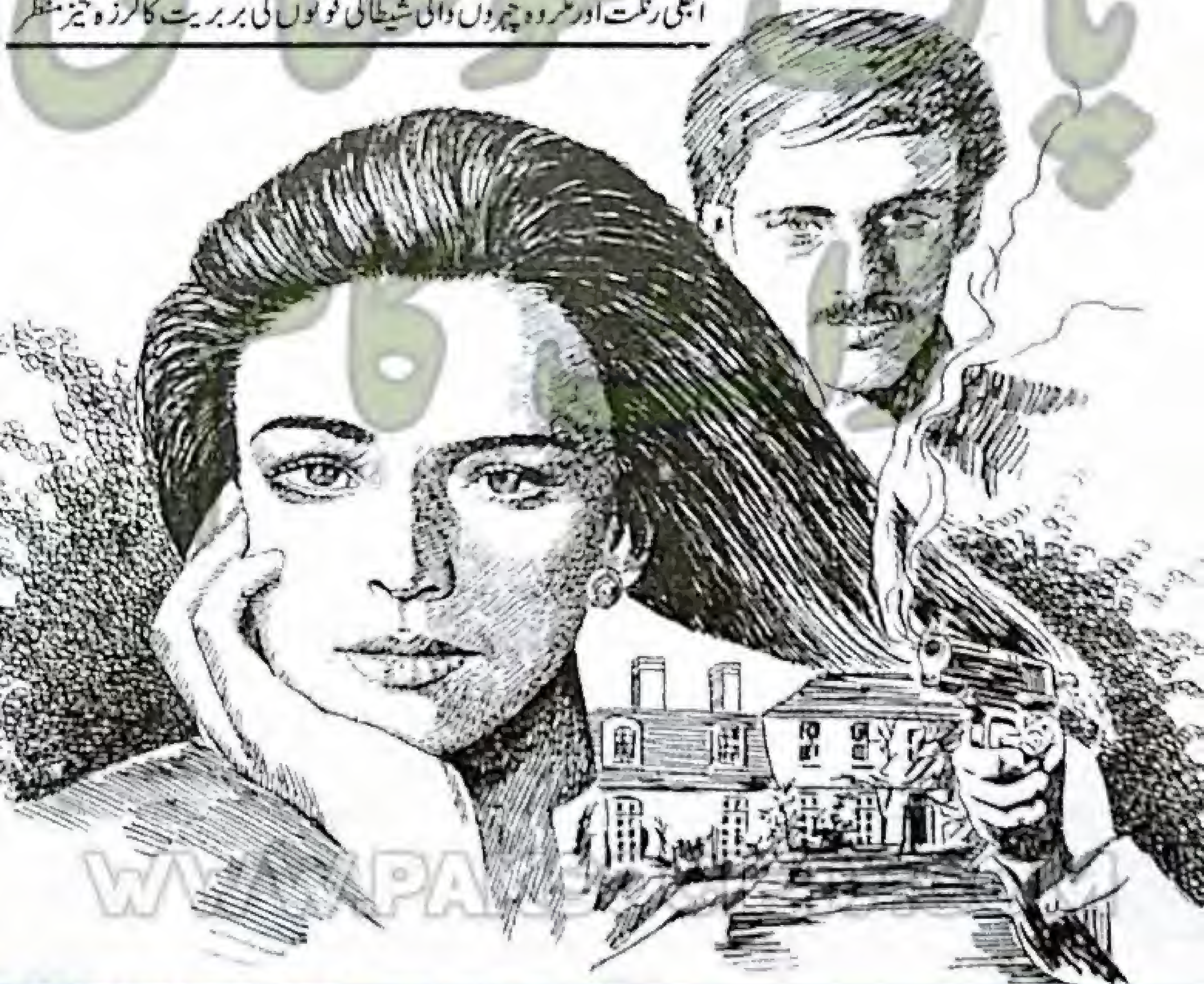
پانچواں حصہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

عرصۂ دراز سے صیہونی قوتیں امتِ مسلمہ کے عزم و حوصلے کو سبوتاژ کرنے کی سازشوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس ربِّ کائنات کا بھی کیسا انوکھا انصاف ہے۔ ہر دور میں فرعون پیدا کرتا ہے اور ہر دور کا موسیٰ بھی الگ بناتا ہے جو انہی کے درمیان رہ کر پرورش پاتا ہے اور فرعونی طاقتوں سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ آج بین الاقوامی منظرنامہ جو داستان دل گیر سناتا ہے اس نے تمام عالمِ اسلام میں دکھ کی ایک لہر پیدا کی ہوئی ہے۔ حساس دلوں میں آج بھی ارضِ مقدس میں صیہونی یلغاں ان کی چیرہ دستیوں کے خلاف نفرت و غیظ کی آگ بھری ہوئی ہے کیونکہ غاصب یہودیوں نے مسجد اقصیٰ کو نذرِ آتش کرکے ہیکلِ سلیمانی تعمیر کرنے کی مذموم اور ناپاک سازش تیار کی تھی... جسے روکنے کے جرم میں اسرائیلی فوجیوں نے نادار اور مجبور فلسطینی عوام کو اپنی چنگیزیت اور بربریت کا نشانہ بنانا شروع کیا اور فلسطینی بستیوں میں خون کی ہولی کھیلی۔ اسرائیلی سازشوں کے تانے بانے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ آج بھی موت وہاں گلی گلی دروازوں پر دستک دیتی گھوم رہی ہے لیکن... آج بھی کچھ پاگل لوگ عصمتوں کے محافظ بنے ایک سودائے جنوں میں مبتلا ہیں...

اب اس بازی کا انجام...

اجلی رنگت اور مکروہ چہروں والی شیطانی قوتوں کی بربریت کا لرزہ خیز منظر





عابد شیکھری کی پیشانی پر یکلخت شکنوں کا جال سا بن گیا تھا۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ نائمہ نیم بے ہوش تھی جسے دھیرے دھیرے ہوش آرہا تھا لیکن عابد کے پاس مزید وقت نہ تھا، اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے اس دروازے کی طرف لپکا جس طرف اس کے مار گرائے دشمنوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ جیسے ہی وہ گن سنبھالے سیدھا ہوا، اسے سامنے تنگ سی راہداری میں کئی اسرائیلی گن بہ دست نظر آئے۔ مگر انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ عابد نے ان پر فائر کھول دیا، گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور کئی اسرائیلی کربہ انگیز چیخوں کے ساتھ تیورا کر گر پڑے، باقی اکا دکا دائیں بائیں پوزیشن سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر عابد انہیں بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا، اس نے ان پر ایک بار پھر اپنی گن برسا دی۔ گولیوں کی خوں ریز بارش ان بچے کھچے اسرئیلیوں کو بھی چاٹ گئی۔ وہ واپس نائمہ کی طرف پلٹا، وہ اس شور وشغب کے باعث جلد ہی ہوش میں آکر اٹھ کھڑی ہوئی تھی، اس کا چہرہ متوحش سا ہو رہا تھا۔ تاہم صورت حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو سنبھالنے کی بھی کوشش کررہی تھی، اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ اس وقت کس قدر مخدوش اور سنگین لمحات سے دوچار تھے۔

''آگوسٹا'' آبدوز کے سائرن ہنوز سمع خراش آواز میں چلا رہے تھے، تاہم عابد نے اپنے حواس قائم رکھے ہوئے تھے، اس نے نائمہ کو سنبھالا دیا، اس کی اپنی سانسیں تیز چل رہی تھیں، وہ بولا۔

''نن۔ نائمہ! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' نائمہ نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور اپنی شرٹ کی آستین سے اپنے نچلے ہونٹ سے بہتی خون کی لکیر کو پونچھا، تو عابد نے اس کی بدحواسی کو دور کرنے کی غرض سے اسے قلیل ترین الفاظ میں وہ سب بتایا جو ذرا دیر پہلے اندر پیش آچکا تھا۔

اس کے بعد وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھے، اپنا پستول عابد نے نائمہ کو پکڑا دیا تھا اور خود گن سنبھالی ہوئی تھی۔ یہ جدید آٹومیٹک رائفل تھی۔ ایک بار پھر اسے بھاری قدموں کی دھمک سنائی دی۔ تب تک وہ دونوں اس تنگ سی راہداری سے گزر کر ایک سیدھے ہاتھ کی جانب اچانک دکھائی دینے والے ایک دروازے سے اندر داخل ہو چکے تھے مگر جلد ہی انہیں یہ احساس ہوا کہ یہ کوئی کمرا نہیں بلکہ ایک مختصر اور تنگ سا فولادی زینہ تھا، جو نیچے کہیں جا رہا تھا۔ وہ بلا دھڑک زینے اترنے لگے۔ جلد ہی ان کے پیروں نے فرش چھو لیا۔ یہاں اترنے کے بعد فوراً ہی انہیں یہ احساس بھی ہوا تھا کہ وہ کسی بڑے مشینری روم میں تھے۔ یہ بھی سردست اچھا ہی ہوا تھا۔

کیونکہ عابد کے خیال کے مطابق یہاں دشمنوں کی نفری نسبتاً کم ہوسکتی تھی۔ یہاں کی فضا بھی پرشور سی تھی، عجیب قسم کی۔ شوں شوں۔ گھوں گھوں ماحول میں گونج رہی تھی۔ درحقیقت یہ سیل نمبر پانچ تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے، نائب کیپٹن پیٹر نوت، ایک انجینئر اور ویپن آفیسر کوچ جن کے ساتھ معائنے کے لیے آیا تھا اور اس سیل میں نائٹرک ایسڈ بننے کا خدشہ تھا لیکن ویپن آفیسر نے کیپٹن... پیٹر نوت کی تسلی کر دی تھی کہ مذکورہ خرابی دور کرلی گئی ہے وغیرہ۔

یہاں بھی پانچ فٹ قطر کے چار والٹ تھے جن کے اندر چار عدد آر، ایس، ایم۔ 28 قسم کے اینٹی میزائل نصب تھے۔ ویپن آفیسر کوچ جن یہاں اپنے دو نائب ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا، خطرے کا الارم یہاں بھی گونج رہا تھا اور یہ تینوں ہی فکر مند نظر آرہے تھے، انہیں ایسی کسی بھی قسم کی صورت حال میں اپنا روم چھوڑ کے باہر جانے کی سختی سے ممانعت تھی، جس وقت کوچ جن اپنے ایک ساتھی کو دروازہ لاک کرنے کا حکم دے رہا تھا، وہ اس وقت والٹ نمبر 3 کے silos میں پمپ چلانے میں مصروف تھا، تاکہ پانی جمع نہ ہوسکے۔ یہی سبب تھا کہ اسے اپنے آفیسر کے حکم کی تعمیل کرنے میں تھوڑی تاخیر ہوئی، جو عابد شیکھری اور نائمہ کے اس کمرے میں داخل ہونے کے لیے ''معاون'' ثابت ہوئی تھی۔ لہٰذا جیسے ہی یہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے، وہ شخص فوراً اپنا اہم کام نمٹا کے دروازے کی طرف بڑھا تھا، عابد اور نائمہ ایک گوشے میں جا چھپے تھے۔ باہر ان دونوں کی... زبردست ''ڈھنڈیا'' پڑی ہوئی تھی۔ اس کمرے میں بھی کوچ جن کی آواز گونج رہی تھی، وہ تازہ حالات جاننے کے لیے اس وقت کسی سے انٹرکام پر باتیں کر رہا تھا۔

''کیا۔؟ امپاسیبل! یہ۔ کک... کیسے ہوسکتا ہے؟''

وہ غیر یقینی انداز میں تقریباً چلا کر بول رہا تھا۔ اس پر تشویش آمیز حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ وہ کیا، اس وقت آبدوز میں موجود سب کی یہی ''حالت'' ہو رہی تھی۔

''تم جانتے ہو، یہ کون سی آبدوز ہے؟ جہاں چڑیا کا ایک بچہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ اوہو۔ مجھے یقین کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔ امپاسیبل۔ امپاسیبل۔'' اس کی حالت واقعی غیر ہو رہی تھی۔

''ٹھ۔ ٹھیک ہے۔ خبردار! ہتھیار کے استعمال میں غیر معمولی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ میں کسی

کو اس آبدوز میں اس کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتا۔ نو۔ نیور۔" کوچ جن بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ "سنو، سنو۔ وارہیڈ کے تمام رومز فوراً لاک کردو۔ خبردار۔ اپنے سیکشن کا کوئی فرد اپنا کمپارٹمنٹ نہیں چھوڑے گا۔ باقی کام دوسروں کے لیے چھوڑ دو... واٹ؟ او۔ یو شٹ اپ۔ اس وقت میرا حکم چلے گا۔ آئی ایم وتھین آفیسر۔ کلیئر؟ میں ابھی کیپٹن سے بات کرتا ہوں۔"

اس کی حالت واقعی غیر ہو رہی تھی۔ ابھی تو اسے یہ نہیں پتا تھا کہ عابد اور نائمہ اسی کمرے میں موجود تھے۔ ورنہ کوچ جن حیرت سے ہی مر جاتا شاید۔ ادھر عابد اور نائمہ اس کی... بدحواسیوں کو چھپ کے دیکھ رہے تھے کہ ان کی وجہ سے نہ صرف اسرائیلیوں کی اس ایٹمی آبدوز میں کس قدر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ بلکہ ان کی توجہ اپنے اہم مشن سے بھی ہٹ گئی تھی۔ عابد شکری کے چہرے پر جوش کی سی سرخی پھیل گئی تھی۔

☆☆☆

وہ چیخ لیلیٰ کی نہیں، بلکہ محمود الحسن کی تھی۔ کسی نے عقب سے اس کی پشت پر گولی ماری تھی جس کے باعث اس کے حلق سے ایک تیز چیخ خارج ہوئی تھی اور وہ کمزور اور بوڑھا تھا، ایک ہی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا، کیونکہ گولی کھاتے ہی وہ گرا اور دم توڑ دیا۔ لیلیٰ کو گولی مارنے کی اسے حسرت ہی رہ گئی۔ ماحول پہ ایکا ایکی سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ لیلیٰ بال بال موت کے منہ سے بچی تھی۔ محمود الحسن کے گرتے ہی سب کی پھٹی پھٹی آنکھوں نے اس کے عقب میں ایک پختہ العمر عورت کو ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پستول پکڑے کھڑے ہوئے دیکھا جس نے سفید سی چادر اوڑھ رکھی تھی اور چہرے پہ کالا نقاب تھا۔ یہ عورت لیلیٰ اور باقر وغیرہ کے لیے اجنبی ہی تھی، تب ہی کمرے کے دھڑکتے ماحول میں حسن علی کی ہلکی آواز ابھری، اس نے ہولے سے زیر لب کوئی آیت پڑھی تھی پھر وہ اس عورت کی طرف متوجہ ہو کے مغموم سی آواز میں بولا۔

"بہن رخسانہ! یہ تم نے کیا کیا؟ اپنے خاوند..... کو گولی مار دی؟"

"ہاں۔" سیاہ نقاب کے پیچھے ہونٹ متحرک ہوئے۔

"میں نے بھی وہی کیا، جو لیلیٰ نے میرے غدار بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ لیلیٰ جیسی مجاہدائیں ارض فلسطین کی وہ بہادر بیٹیاں ہیں جن پر میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔" رخسانہ نامی اس خاتون کے لہجے سے ایک جوش مترشح تھا مگر آواز کی تہ میں ایک غم کی تھچٹ بھی دبی دبی محسوس ہوئی تھی۔

"آفرین ہے تم پر عزیزی رخسانہ! مگر ہمیں دکھ بھی ہے اس کا، محمود اپنے اندر کیسا بغض چھپائے بیٹھا تھا۔ اگر ہمیں پہلے ہی اس کا ذرا بھی اندازہ ہو جاتا، بخدا ہم اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش ضرور کرتے، لیکن صد افسوس۔"

حسن علی کے لہجے سے گہرا تاسف ہویدا تھا، پھر وہ قدرے الجھ کر اس کی طرف تکتے ہوئے مستفسر ہوا۔ "لیکن عزیزی رخسانہ! اگر تمہیں پہلے ہی اپنے شوہر کی طرف سے ایسا کچھ اندازہ ہو گیا تھا تو تمہیں کم از کم ہمیں تو بتا ہی دینا چاہیے تھا، ہم اسے سمجھانے کی اپنی سی کوشش کر دیکھتے؟"

تب ہی رخسانہ بولی۔

"محترم آقا! ہم ایسا ضرور کرتے، مگر ہمیں بھی کبھی انہوں نے اپنے رویے سے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا، یہ تو ہمیں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی معلوم ہوا تھا، جب وہ اپنے کمرے میں پستول نکال کر اپنے جبے میں چھپا رہے تھے اور ہم نے اس وقت ان کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کی تھی، جو اس وقت سرخ ہو رہا تھا اور ان کی آنکھیں ہمیں شعلے برساتی محسوس ہو رہی تھیں، پھر وہ ہم سے کچھ کہے بنا ہی نکل گئے، ہم پھر بھی ان کے جوش کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے لیکن بعد میں اچانک ہمیں خیال آیا کہ انہوں نے ہمیں بتایا تھا کہ محترم آقا کے ہاں آج مجاہدہ لیلیٰ تشریف لا رہی ہیں، تب ہمیں گمان گزرا کہ کچھ غلط نہ ہو جائے، کیونکہ جب ہمارے فرزند کی عزیزی لیلیٰ کے ہاتھوں ہلاکت ہوئی تھی تو ہم نے انہی دنوں ابتدا میں اپنے خاوند کو اندر ہی اندر جلتے سلگتے پایا تھا، وہ شاید اسد کی ہلاکت سے بہت دکھی رہتے تھے، کبھی کبھی اپنے غم و غصے کا بھی اظہار کرتے، پھر چپ چپ رہنے لگے، ہم بھی اپنے دل پر پتھر رکھے ہوئے تھے، کیونکہ مجھے اپنے بیٹے کی ہلاکت سے زیادہ اس کی غداری پر دکھ تھا، لہٰذا آج جب ہمیں یہ سب پتا چلا تو ہمارے بھی ذہن میں کھٹک پیدا ہوئی اور پھر ہم بھی عین وقت پر یہاں آن پہنچے۔" وہ یہ سب بتانے کے بعد سسک پڑی۔ ایسے میں لیلیٰ نے آگے بڑھ کر اسے محبت سے تھام لیا اور مغموم سے لہجے میں اس سے بولی۔

"رخسانہ بہن! اللہ گواہ ہے ہم نے آخری وقت تک یہ کوشش چاہی تھی کہ اسد کو سمجھا سکیں مگر۔"

"بس! اب اس موضوع کو یہیں دفن کر دیں، اور آپ لوگ اپنی نشست جاری رکھیں، اللہ آپ کو نیک مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔" غیور رخسانہ یہ کہہ کر واپس پلٹ گئی۔

کمرے کی فضا کچھ دیر بوجھل رہی۔

اس ناخوشگوار واقعے کے کوئی گھنٹے بھر بعد یہ پانچوں مجاہد حسن علی کے فارم سے روانہ ہو چکے تھے۔ اس بار تیو نائی

آپریشن مکمل طور پہ ''کمانڈو ایکشن'' پر انحصار کرتا تھا، یعنی بغیر کسی بھاری نفری کے صرف چند انتہائی تربیت یافتہ کمانڈوز کی اپنی صوابدیدی کارروائی اور حکمت عملی کے بل بوتے پر اور جان کی بازی لگا کر مشن کو ہر صورت میں کامیابی سے ہمکنار کرنا تھا۔

یہ پانچوں کمانڈوز رات کی تاریکی کا حصہ بنے محتاط روی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ باقر چلنے پھرنے کے قابل تھا مگر اس کے بائیں کاندھے کا زخم ابھی پوری طرح بھرا نہیں تھا۔ تاہم وہ خود کو مکمل ''ایکٹو'' رکھے ہوئے تھا۔

صحرا میں محاق چاند کی تاریک رات اتری ہوئی تھی اور ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ لیلیٰ اور باقر کے پاس تاریکی میں دیکھنے کے لیے انفراریڈ دوربین تھی، جسے وہ گاہے بہ گاہے استعمال میں لا رہے تھے۔ ایسے ہی ایک موقع پر جب لیلیٰ دوربین اپنی آنکھوں سے لگا کر ایک ذرا گردوپیش کا جائزہ لینے میں مصروف تھی تو اچانک وہ ٹھٹکی۔ اسے سامنے کے رخ پر کوئی دھبا سا متحرک نظر آیا، وہ چونکی اور بہ غور آنکھوں سے دوربین لگائے دیکھتی رہی یہاں تک کہ اس نے حرکت کرتے اس سیاہ دھبے کی شبیہ کافی حد تک واضح کر ڈالی۔

''ایمبولینس۔'' دفعتاً اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ اس کا ساتھی باقر ٹھٹکا اور پھر اس نے بھی فوراً اپنی دوربین آنکھوں سے لگالی۔

''اوہ۔ یہ تو واقعی کوئی ایمبولینس ہے۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ ''اور میرا خیال ہے اس کا رخ تل ابیب کی طرف ہے۔''

''یقیناً۔'' اس کی تائید لیلیٰ نے بھی کی۔ ''شاید کسی مریض کو تل ابیب کے کسی بڑے ہاسپٹل لے جایا جارہا ہے؟''

''مگر لیلیٰ! سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں موجود مریض کو آخر کس مقام سے لے جایا جارہا ہے؟'' باقر نے اپنی آنکھوں سے ہنوز انفراریڈ دوربین لگائے ہوئے کسی خیال کے تحت لیلیٰ سے کہا تو وہ بھی اسی طرح پرسوچ انداز میں بولی۔

''ایمبولینس جس راستے سے تل ابیب کی طرف بڑھ رہی ہے اس جانب تو ڈیوڈ اسٹار کا ہیڈ کوارٹر پڑتا ہے۔''

''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' باقر بولا۔ ''شاید ہماری گزشتہ ناکام تیونائی مہم میں زخمی ہونے والے کسی اسرائیلی افسر کو شفٹ کیا جارہا ہے۔ کاش، یہ ایمبولینس قریب ہوتی تو اس پر دھاوا بولا جاسکتا تھا۔''

''ضروری تو نہیں کہ اس میں کوئی اسرائیلی افسر ہی مریض ہو؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر میں اسرائیلی کتوں کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟''

''تم محسن کو بھول رہے ہو شاید؟'' لیلیٰ نے اسے یاد دلایا تو وہ فوراً جیسے فرط عقیدت سے بولا۔

''ہرگز نہیں بھولا محسن جیسے بہادر مجاہد کو میں بھول سکتا ہوں، لیکن شاید میں ہی تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ پایا ہوں؟''

''میں یہی کہنا چاہ رہی تھی کہ اس ایمبولینس میں ہمارا ساتھی محسن بھی تو ہوسکتا ہے؟''

''یقیناً ہوسکتا ہے، اور پہلے میرے دماغ میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔'' وہ شاید اب لیلیٰ کی بات کا مطلب سمجھا تھا اور کسی فوری خیال کے تحت بولا تھا۔

''ہمیں فوراً اس ایمبولینس پر اٹیک کرنا چاہیے تھا، مگر اب تو یہ ہماری پہنچ سے دور ہے۔'' دفعتاً وہ چونکا۔

''یہ تو نظروں سے اوجھل بھی ہوچکی۔ کاش، ہمارے پاس کوئی گاڑی ہوتی، یا پھر کوئی سواری کہ اس ایمبولینس کا پیچھا کیا جاسکتا۔'' وہ پھر کف افسوس ملنے لگا تو لیلیٰ بولی۔

''آگے بڑھو باقر! گزشتہ حملے کے بعد سے تیونائی میں پہلے سے بھی زیادہ سیکیورٹی کے اقدامات کیے جاچکے ہوں گے۔ ایسے میں ہم کسی سواری میں ہوتے تو چھپے ہوئے دشمنوں کی نظروں میں بھی آسکتے تھے، ہمیں پہلے سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔''

وہ آگے بڑھ گئے۔ ابھی انہیں آگے قدم بڑھائے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک یہ پانچوں بری طرح ٹھٹکے۔ ایک ''گڑگڑاتی'' آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ اس مخصوص آواز کو سنتے ہی لیلیٰ سرسراتی آواز میں بولی۔ ''ریت میں دھنس جاؤ، جلدی۔''

پھر اسی دوران لیلیٰ نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگا لی اور چونک پڑی، ایک فائٹر ہیلی کاپٹر تیزی کے ساتھ اس سمت کی جانب پرواز کرتا نظر آیا جس طرف وہ ایمبولینس غائب ہوئی تھی۔ لیلیٰ کے ذہن طباع میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا تھا۔ یکایک اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی، اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاس بہت قلیل وقت ہو۔

''بال بال بچے، دشمنوں کا ہیلی کاپٹر یہاں آئے بنا آگے چلا گیا۔'' باقر کی طمانیت بھری آواز ابھری، مگر ابھی تک شاید اس کا ذہن لیلیٰ کی پرمغز سوچ تک رسائی حاصل نہ کرسکا تھا کہ وہ کن خطوط پر سوچ رہی تھی اور اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتی تھی، چونکا تو اس وقت جب اس نے لیلیٰ کو

یکدم اٹھ کر کھڑے ہوتے اور یہ حکم صادر کرتے سنا۔
''فوراً میرے پیچھے آؤ سب۔'' یہ کہتے ہی اس نے اس طرف دوڑ لگا دی جدھر تھوڑی دیر پہلے ایمبولینس اور بعد میں ایک اسرائیلی ہیلی کاپٹر غائب ہوا تھا۔ باقی ساتھیوں کے ساتھ باقر کو بھی لیلیٰ کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی تھی، بے شک لیلیٰ سے اس کا لاکھ قلبی تعلق صحیح، مگر اس وقت وہ اس کی لیڈر تھی اور ایک عظیم کاز میں وہ ان کی رہنما بھی، باقر کیا، کسی کو بھی اس کے حکم سے سرتابی کرنے کی جرأت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سوال کرنے کی بھی، جب تک وہ خود نہ بتاتی۔

یہ چاروں لیلیٰ کی تقلید میں مذکورہ سمت دوڑتے جارہے تھے۔ باقر ان میں سب سے پیچھے تھا، اسے لیلیٰ کی یہ اچانک حرکت دیوانگی کے سوا کچھ نہیں لگ رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ ادھر لیلیٰ کا چہرہ کسی اندرونی جوش کے ابال سے تمتمایا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے ایک عجیب سی بے چینی میں مبتلا کیے رکھا تھا۔ کچھ دور اسی طرح دوڑتے رہنے کے بعد معاً ہی وہ چونک پڑی اور اسے نہ صرف فوراً رکنا پڑا بلکہ ایک قریبی ریتیلے ٹیلے کی آڑ بھی لینا پڑی، اس کے چاروں ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ لیلیٰ کو سامنے ذرا دور وہی ایمبولینس کھڑی دکھائی دی تھی، مگر چونک کر رکنے اور گھات لگانے کا سبب، اس ایمبولینس کے قریب کھڑے ہیلی کاپٹر کا بھی موجود ہونا تھا۔ یہ وہی ہیلی کاپٹر تھا، جو تھوڑی دیر پہلے انہیں فضا میں گردش کرتا ہوا دکھائی دیا تھا۔ لیلیٰ نے ایک ہاتھ سے اپنے ساتھیوں کو ریتیلے ٹیلے کی ڈھلوانی ریت پر اسی طرح لیٹے رہنے کا اشارہ کیا اور خود آنکھوں سے انفرا ریڈ دوربین لگائے سامنے کا جائزہ لینے میں مصروف ہو گئی۔ اس نے دیکھا، اسرائیلی ہیلی کاپٹر سے پانچ، چھ کے قریب کمانڈو وردیوں میں ملفوف اسرائیلی گن بردار..... ایمبولینس کے پاس کھڑے تھے، جس کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر اسٹریچر پر دو مریض نظر آنے والے افراد سے وہ پوچھ تاچھ میں مصروف تھے، پھر دفعتاً ہی جانے کیا ہوا کہ وہ سب اسرائیلی کمانڈوز یکدم حرکت میں آئے، اور اتنی ہی تیزی کے ساتھ وہ دوبارہ ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے لگے، اس کے چند ثانیوں بعد ہی ہیلی کاپٹر نے اوپر اٹھنا شروع کردیا۔

لیلیٰ کا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا اور اس کے اعصاب تن گئے تھے، ایمبولینس کا یوں اچانک نظر آنا اور پھر تھوڑی دور جا کر رکنا، پھر اس کے فوراً بعد...... اسرائیلی کمانڈوز کے ہیلی کاپٹر کا وہاں پہنچنا، اور پھر اندر موجود گنتی کے دو مریضوں سے پوچھ تاچھ کے فوراً بعد دوبارہ فضا میں پرواز کرنا کیا معنی رکھتا تھا اس کا کچھ کچھ اندازہ لیلیٰ کو اس کی غیر معمولی چھٹی حس کے حوالے سے خوب اچھی طرح ہونے لگا تھا۔ اور تب یکایک وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے ساتھیوں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرکے ایک بار پھر اسی جانب دوڑ لگا دی، جس سمت ہیلی کاپٹر تیزی سے پرواز کر گیا تھا۔

لیلیٰ کو کچھ ایسا احساس ہوا تھا کہ یہ سارا معاملہ کسی کے ''فرار'' اور ''تعاقب'' کی جانب اشارہ کررہا تھا۔

☆☆☆

''اونٹ کٹارا'' یہ مخصوص قسم کی ایسی جھنڈ دار اور موٹی جھاڑیاں ہوتی ہیں جو بنجر ویرانوں اور لق و دق صحراؤں میں بہ کثرت پائی جاتی ہیں۔ وہ دونوں ایسی ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں آگئے تھے۔ فضا میں گردش کرتا ہوا ہیلی کاپٹر لحہ بہ لحہ ان کے قریب آتا جارہا تھا۔ ایک بڑی سی سرچ لائٹ اس کے نچلے حصے میں نصب تھی، جس کا بڑے قطر کا دائرہ صحرا کی وسعتوں کو کافی حد تک منور کیے دے رہا تھا۔ محسن اور اس کے ساتھ لگی بیٹھی بازغہ دم بہ خود سے دبکے بیٹھے تھے۔ ان کے دل سینوں میں بے طرح دھڑک رہے تھے۔ بازغہ کو شاید حالات کی سنگینی کا اتنا احساس نہ تھا جتنا محسن کو تھا کہ دیکھ لیے جانے کی صورت میں سر پہ منڈلاتا ہوا اسرائیلی ہیلی کاپٹر بلا دریغ ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کرسکتا تھا اور اس کے ساتھ بازغہ بھی زندہ نہیں بچتی۔ جبکہ ہتھیار کے نام پر ان کے پاس فقط ایک پستول تھا جس کے چیمبر میں پانچ گولیاں تھیں۔ ایک لمحے کو تو محسن کو یوں لگا جیسے وہ یہاں چھپے بیٹھے نہ ہوں بلکہ اپنی بے رحم موت کا انتظار کررہے ہوں مگر محسن نے اب تک نہ حوصلہ ہارنا سیکھا تھا نہ ہی وہ کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس ہوا تھا، اس کا اس پر پختہ ایمان تھا کہ موت کا ایک دن مقرر ہے، ابھی آنی ہے تو ابھی آئے گی ورنہ جب لکھی ہوگی اسے سوائے اللہ کے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اس کا حوصلہ سوا ہونے لگا۔

اچانک محسن کی ٹکٹکی ہوئی نظروں نے دیکھا کہ ہیلی کاپٹر ان سے تھوڑی دور ہی فضا میں معلق ہوگیا۔ پھر اس وقت محسن کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا جب اس نے دیکھا کہ ہیلی کاپٹر اب دھیرے دھیرے نیچے ریت پر لینڈ کرنے لگا۔ اس کے مخصوص ساخت کے بنے ہوئے ''لینڈنگ اسکڈز'' ہیلی کاپٹر کو بہ وقت ضرورت ہر جگہ بہ آسانی لینڈنگ میں مدد دے سکتے تھے۔

بہر طور ہیلی کاپٹر کے ریت پر اترتے ہی پانچ اسرائیلی کمانڈوز، جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں جدید گنیں تھامی ہوئی تھیں، جمپ لگا کر ہیلی کاپٹر سے اترے، ان میں چند ایک کے

پاس طاقت ور نارچیں بھی تھیں، یہ وہی سات ٹاپ کمانڈوز کا خطرناک ٹولہ تھا جنہیں ڈیوڈ اسٹار کے سربراہ جنرل آئزک فرناش نے محسن اور بازغہ کی تلاش میں روانہ کیا تھا اور اس وقت ان تربیت یافتہ کمانڈوز کو پالی مور لیڈ کر رہا تھا، محسن کو یقین سا ہونے لگا تھا کہ اب شاید اس کے دن گنے جا چکے ہیں کیونکہ ایک تو وہ خود بھی زخمی تھا پھر ان کمانڈوز کے مقابلے میں اس کی اپنی قوت صفر تھی، بس ایک معمولی پستول سے اور جس کے چیمبر میں بھی صرف پانچ گولیاں تھیں، ان کا بھلا کیسے مقابلہ کر سکتا تھا؟ آسانی سے تو وہ بھی مرنے والا نہیں تھا، چاہے اسے مقابلہ ہی کیوں نہ کرنا پڑتا لیکن ایک، دو کو تو اس نے مار گرانے کا عزم کر رکھا تھا، اصل دکھ اسے بازغہ کا تھا۔ وہ ایک نوخیز دوشیزہ تھی۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، جو محض اس کی محبت میں اپنا آرام اور سکھ چین سب تیاگ کر نہ صرف اس کے ساتھ چلی آئی تھی بلکہ اپنی زندگی بھی داؤ پہ لگا بیٹھی تھی، اس کی خاطر اپنے لوگوں سے، حتیٰ کہ اپنے باپ تک کو بھی چھوڑ آئی تھی اور اب اس کے ساتھ اس کا بھی جانے کیا حشر ہونے والا تھا، اصل دکھ محسن کو یہی تھا، اس نے بازغہ سے کہا۔

''بازغہ! مجھے افسوس ہے، میں تمہاری حفاظت نہ کر سکا، دیکھو... مرنے سے پہلے تم کلمہ ضرور پڑھ لینا لیکن تم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔ میں جب تک ان کتوں کے سامنے ڈھال بننے کی کوشش کرتا ہوں۔''

بازغہ کو خود بھی اب تک کی سنگینی کا بہ خوبی اندازہ ہو چلا تھا۔ محسن نے دیکھا اس کی بات پر بازغہ کے چہرے پر ایک ذرا بھی ڈر یا خوف کا شائبہ تک نہ ابھرا تھا۔ اس کے برعکس، وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی تھی، پھر جیسے اپنے دل کی عمیق گہرائی تلے بولی۔

''اپنے محبوب کے ساتھ، اس کی بانہوں میں دم توڑنے والی، بھلا مجھ سے زیادہ اور کون خوش قسمت لڑکی ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنا جینا مرنا تو بہت پہلے ہی تمہارے نام کر ڈالا تھا، میں تمہیں چھوڑ کے بھلا کہاں جاؤں گی؟ تم کلمہ پڑھو اور دشمن پر گولی چلاؤ، میں تمہارے ساتھ کلمہ پڑھتی جاؤں گی۔''

وقت نہیں بچا تھا، محسن نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہلکی آواز میں کلمہ پڑھتا چلا گیا اور بازغہ اسے دہراتی چلی گئی۔ دشمن قریب آرہے تھے۔ انہیں شاید یقین کی حد تک شبہ ہونے لگا تھا کہ ان کا ''شکار'' زیادہ دور نہیں ہے۔ ادھر جیسے ہی کلمہ مکمل ہوا۔ محسن نے ایک دشمن کو تاک کر فائر کر ڈالا، گولی اس کے سینے میں لگی اور وہ کربہ انگیز چیخ مار کے گرا۔ باقیوں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ دائیں بائیں ریت پر خود کو گرا کر پوزیشنیں سنبھال لیں اور فائر کھول دیے۔ محسن نے بازغہ کو اپنے پیچھے کر رکھا تھا، سردست وہ دشمنوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے محفوظ رہا تھا اور اسی دوران اسے ایک اور دشمن پر یکے بعد دیگرے دو تین گولیاں داغنے کا بھی موقع مل گیا، مگر اب دشمن نہ صرف سنبھل چکا تھا بلکہ اسے گھات بھی میسر آچکی تھی، اسی سبب محسن کے تینوں فائر خالی گئے۔ بالآخر اس نے آخری گولی بھی چلا دی اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے پستول... ایک طرف پھینک دیا۔ بازغہ نے اپنے محبوب کی یہ حالت دیکھی تو بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اسی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ ابھری اور محسن کو یقینی موت کی چاپ اپنے بالکل قریب محسوس ہوئی۔ تائید ایزدی کو ابھی کیا مقصود تھا یہ دونوں شاید نہیں جانتے تھے۔ گولیوں کی خوں ریز تڑتڑاہٹ ابھرنے کے ساتھ ہی محسن کو متعدد دشمنوں کی... کربہ انگیز چیخوں کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ یک لخت ایک خوشگوار حیرت ہوئی، وہ تو اپنی اور بازغہ کی یقینی موت کا تصور کیے بیٹھا تھا، جبکہ معجزہ یہ کوئی اور ہو چلا تھا۔

ادھر اپنے ساتھیوں کو لیڈ کرنے والا پالی مور، جسے اب تک اپنا مشن کامیابی کے بالکل قریب محسوس ہونے لگا تھا، اس اچانک کایا کلپ پر وہ ایک لمحے کے لیے پھر کچھ سمجھ ہی نہیں سکا تھا کہ یہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا؟...

ہوش اسے تب آیا تھا جب اس نے اپنے دو تین ساتھیوں کو ریت پر تڑپتے ہوئے پایا۔ پھر اس کے ہوش ٹھکانے آئے، وہ تیزی کے ساتھ پلٹا تو اسی وقت ایک ہینڈ گرنیڈ اس کے قریب ہی کہیں گرا، اس نے اپنی جگہ سے بہ سرعت جست بھری، اگلے ہی لمحے ایک کان پھاڑ دھماکا ہوا اور کئی سلگتے ہوئے شیل اس کے چہرے اور جسم کو زخمی کر گئے۔

یہ معرکہ لیلیٰ اور اس کے چار ساتھیوں نے انجام دیا تھا۔ جس کا سہرا لیلیٰ کے سر ہی جاتا تھا۔ اس کی بروقت حکمت عملی اور بیدار مغزی نے اسرائیل کے سات ٹاپ ایجنٹوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ پالی مور سمجھ گیا تھا کہ اس کا پالا کسی حریت پسند فلسطینی گروپ سے پڑ چکا ہے، جو پہلے ہی ان کی گھات میں بیٹھے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے تلے اوپر جہنم واصل ہوتے ہی اس نے راہ فرار کی ٹھانی اور اندھا دھند فائرنگ کرتا ہوا ذرا فاصلے پر موجود اپنے ہیلی کاپٹر کی جانب دوڑ پڑا۔ اس پر مجاہدین کی ایسی دہشت سوار ہوئی کہ اسے فرار پہ مجبور ہونا پڑا مگر لیلیٰ اسے کہاں چھوڑنے والی تھی۔ اس نے اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔ تب

تک پالی مور اپنے ہیلی کاپٹر کے قریب پہنچ چکا تھا مگر ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرا اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اندر موجود پائلٹ نے اگرچہ بہت پہلے ہی صورت حال کی خطرناکی کا اندازہ لگا لیا تھا مگر اس نے شاید پالی مور کو تیزی سے ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑتے ہوئے آتے دیکھ لیا تھا اسی لیے وہ اس کے قریب پہنچنے کا منتظر رہا تھا مگر دروازے کے قریب پہنچ کر اسے اپنے بھیانک انجام سے دوچار ہوتے دیکھ کر اس نے بھی فوراً راہ فرار اختیار کرنے کی ٹھانی اور ہیلی کاپٹر کے پنکھے چلا دیے۔ وہ اوپر اٹھنے لگا۔ لیلیٰ حلق کے بل چلا کے اپنے ساتھیوں سے بولی۔

''ہیلی کاپٹر جانے نہ پائے۔ ورنہ ہمارا مشن خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسے نشانہ بناؤ۔''

اپنی مجاہدہ لیڈر کی یہ آواز سنتے ہی عبداللہ، علی ارسلان اور لئیق احمد اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر ریت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور فضا میں بلند ہوتے ہیلی کاپٹر پر فائرنگ کرتے ہوئے دوڑ کر اس کے قریب بھی ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ جبکہ باقر کو شکار ہاتھ سے جاتا محسوس ہو رہا تھا، لیلیٰ کے حکم کے مطابق کوئی بھاری ہتھیار استعمال کرنے کی ممانعت تھی مگر باقر دیکھ رہا تھا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا تو اس نے چشم زدن میں اپنی کمانڈو کٹ سے آر پی جی گرنیڈ لانچر نکالا، اس ٹیم کے پاس فقط ایک یہی بھاری ہتھیار تھا، باقر نے لانچر ریڈی کیا اور اپنے کاندھے پر رکھ کر آپٹیکل سائٹ پر آنکھ لگا کے پوری تسلی کے ساتھ ہیلی کاپٹر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز کے ساتھ گرنیڈ فائر ہوا اور گاڑھے کثیف دھوئیں کی لکیر چھوڑتا ہوا وہ تیزی سے ہیلی کاپٹر کی طرف لپکا اور چشم زدن میں اس سے جا ٹکرایا، ایک سماعت شکن دھماکے سے ہیلی کاپٹر کے فضا میں پرخچے اڑ گئے۔ چند ثانیے کے لیے تاریک آسمان بھی روشن ہو گیا۔

''یہ تم نے بروقت اچھا فیصلہ کیا باقر!'' لیلیٰ نے اس کے قریب آ کر توصیفی لہجے میں کہا، تب تک عبداللہ اور ارسلان وغیرہ بھی قریب آ چکے تھے اسی لیے باقر نے لیلیٰ کے مرتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے سنجیدہ سے لہجے میں اس سے کہا۔

''عزیزی لیلیٰ! ہم نے شاید اپنے اہم مشن سے ہٹ کر ایک غیر متعلقہ اور غیر اہم کام میں ہاتھ ڈال کر اپنے دشمنوں کو چونکا دیا ہے، اس حملے کے بعد یقیناً انہیں ہماری یہاں موجودگی کا پتا چل گیا ہوگا اور وہ اب پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ ہمارا اصل راستہ کھوٹا کرنے کی کے لیے ... ریشہ ہو جائیں گے۔'' اس کی بات سن کر لیلیٰ خاموش رہی اور اس کی طرف سے توجہ ہٹا کر اس نے ایک نگاہ گردوپیش پر دوڑائی پھر باقر سے بولی۔

''کیا تم نہیں دیکھ پائے کہ یہ دشمن یہاں کس مقصد سے اترے تھے؟ اور کن پر دھاوا بولے ہوئے تھے؟'' اس کی بات پر باقر کو ایک دھچکا سا لگا، ابھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ معاً ہی لئیق احمد چلایا۔

''عزیزی لیلیٰ! وہ دیکھیے۔ میرا خیال ہے دشمن انہی پر ہلّا بولے ہوئے تھے؟'' اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔ سب نے بیک وقت مذکورہ سمت دیکھا اور بری طرح چونکے۔ خاص طور پر لیلیٰ کے چہرے پہ ایک پرجوش تمتماہٹ سی ابھری اور پھر وہ دیوانہ وار اس سمت میں دوڑی۔ ساتھیوں نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ وہ ان دو افراد کو دیکھ کر چونکے تھے جو سامنے تاریکی سے نمودار ہوئے تھے، اپنی وضع قطع سے ایک لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ دوسرا اس کا ساتھی کوئی مرد تھا جسے اس نے سہارا دے رکھا تھا، جب یہ لوگ دوڑ کر ان کے قریب پہنچے تو حیرت و مسرت سے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ محسن اور بازغہ تھے۔

☆☆☆

ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر کے وار روم میں موجود جنرل آئزک فرناش کی حالت اس وقت جنونیوں کی سی ہو رہی تھی۔ اسے ابھی تک کہیں سے بھی ایسی کوئی اطلاع نہیں موصول ہو رہی تھی جو اس کے شل پڑے اعصاب اور جھنجلائے ہوئے پریشان دل و دماغ کے لیے باعث تسکین ثابت ہوتا اور نہ ابھی تک اس زخمی کا پتا چل سکا تھا اور نہ ہی کمشنر پیریز ٹاؤن کی بیٹی کا کچھ سراغ مل پا رہا تھا کہ آخر وہ ڈیوڈ اسٹار کی اسٹیٹ کے ہاسپٹل سے کون سے مریض کو فرار کروا کے نکل بھاگی ہے؟ علاوہ ازیں ان کی تلاش میں بھیجے گئے ساتھ ٹاپ ایجنٹ بھی ایک ہیلی کاپٹر میں روانہ کیے جا چکے تھے، ان کی طرف سے بھی ابھی تک کوئی خبر نہیں آ رہی تھی، جبکہ اس نے انہیں سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ اسے پل پل کی خبر دیتے رہیں گے۔ پھر جب خود جنرل فرناش نے پالی مور سے رابطہ کرنا چاہا تو کوشش پیہم کے باوجود، رابطہ نہ ہو پایا۔

اب وہ اس وقت اپنا طیش اور جنونی غصہ اتارنے کے لیے سخت بے چین نظر آ رہا تھا اس نے اپنی ان سب ناکامیوں اور پریشانیوں کا ذمہ دار کمشنر ٹاؤن اور اسٹیٹ کے ہاسپٹل کے ایڈمن جنرل کو ٹھہرایا اور اس کا مکروہ چہرہ غصے اور طیش کے باعث مزید بگڑ گیا، اس نے اسی وقت ان دونوں کو سر میں گولی مار دینے کے احکامات جاری کر دیے۔

تھوڑی دیر بعد اسے بتا دیا گیا کہ اس کے حکم کے

مطابق دونوں کو گولی مار کے ہلاک کر دیا گیا ہے مگر جنرل فرناش کا ابال پھر بھی کم نہیں ہوا۔ اس نے اسی وقت ایک پانچ رکنی سرچنگ ٹیم تشکیل دے کر انہیں اپنے ساتھ ٹاپ کمانڈوز ایجنٹ کی تلاش میں روانہ کر دیا۔ جنہوں نے اس کی ہدایت کے مطابق غیر معمولی تیزی کے ساتھ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جلد ہی اسے یہ رپورٹ پیش کر دی کہ اسٹیٹ کی حدود سے تیس، چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہیلی کاپٹر کے جلے ہوئے ملبے کے ساتھ ان ساتوں کمانڈوز کی بھی لاشیں پائی گئی ہیں۔ اس اطلاع نے گویا جنرل آئزک فرناش کا نروس بریک ڈاؤن کر ڈالا۔ اس کی حالت بگڑنے لگی تو وہ بہ مشکل اپنی چیئر سے اٹھا اور قریب وائن کیبنٹ سے اپنے لیے ایک بوتل نکال کر فوراً اپنے منہ سے لگالی۔ کئی گھونٹ بھرنے کے بعد بھی اس کی حالت معمول پہ نہ آسکی تو اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک سلور کلر کی ڈبیا نکالی، اس کے اندر ایک سرنج رکھی تھی اور ایک کانچ کا دوسی سی محلول بھرا ایمپول رکھا تھا۔ ٹورنی کٹ اور اسپرٹ .... بھی تھا۔ اس نے جلدی سے ٹورنی کٹ اپنے بائیں بازو پہ باندھ دیا، جس سے اس کے بازو کی نس ابھر آئی، پھر اس نے ایمپول سے سرنج بھری اور اس کی سوئی اپنی ابھری ہوئی نس میں گھونپ دی۔ ساری دوا انجیکٹ کرنے کے بعد وہ قریب دھرے بیڈ پر جا گرا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کی حالت اب بہ بتدریج معمول پہ آنے لگی تھی۔

موساد نے ڈیوڈ اسٹار کی کارکردگی پر نظر رکھنے کے لیے اپنے کچھ ایجنٹ ان کی فورس میں شامل کر رکھے تھے۔ ایسی ہی فورس کے ایک آدمی نے ڈیوڈ اسٹار کے ہیڈ کوارٹر سے موساد کے سیکنڈ ان ڈائریکٹر بارق شمعون کو اپنے خفیہ پیغام میں یہ رپورٹ دی کہ جنرل آئزک فرناش کو پے در پے ناکامیوں نے بری طرح اعصابی جنون میں مبتلا کر ڈالا ہے اور اس نے اپنے ہی کمشنر پیریز ناون اور اسٹیٹ ہاسپٹل کے ایڈمن جنرل کو گولی مار کے ہلاک کر ڈالا ہے۔ موساد ایسے کسی اقدام کے سخت خلاف ہوتی تھی جس میں اپنے ہی آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنایا جاتا۔ لہٰذا اسے جنرل فرناش کا یہ اقدام ایک آنکھ نہیں بھایا، اس نے اس کی شکایت چیف سے کر ڈالی۔ اس نے یہ معاملہ اسی کے سپرد کر دیا، کیونکہ خود موساد کا چیف اپنے ”باپ“ (یگانہ آرمی اور یہودیوں کو اسرائیل میں ہجرت کر کے بسانے اور ایک جگہ اکٹھا کرنے کے بانی، موروثی ہیرو آئزر مین بیری جونیئر) کی ہدایت کے مطابق بھارت کے خفیہ دورے پر گیا ہوا تھا۔ جہاں اس نے بیک وقت بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ کے چیف اور بھارتی وزیر اعظم سے ملاقات کرنا تھی اور انہیں پاک، چین کی گہری ہوتی دوستی پر تشویش کے علاوہ ایک ایجنڈا یہ بھی رکھنا تھا جس کے تحت اس خفیہ ”ملاقات“ کے بعد بھارت، امریکا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتا کہ پاک، چائنا دوستی خطے کے امن کے لیے سخت ترین خطرے کا باعث ہے۔ اسرائیل جانتا تھا کہ امریکا اور بھارت کی آنکھوں میں پاک چین دوستی ہمیشہ سے کھٹکتی رہی ہے۔ خود امریکا، چین کو ایک اقتصادی، سپر پاور کے روپ میں ابھرتا ہوا دیکھ رہا تھا بھارتی اور پاکستانی ایٹمی دھماکوں کے بعد جب امریکا کے سپریم ویپن ایکسپرٹیز نے جب دونوں ممالک کے ایٹمی دھماکوں کا موازنہ کیا تو وہ دنگ رہ گئے تھے۔

کسی وجہ اور مصلحت کی بنا پر دنیا کے سامنے پاکستان کی خوبی چھپائی گئی۔ مگر امریکا اس تشویش میں اندر ہی اندر گھل کے رہ گیا اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی لاحق تھی کہ پاکستان اپنی یہ ٹیکنالوجی دیگر اسلامی ممالک کو نہ ٹرانسفر کر ڈالے۔ چین بھارت کا سب سے بڑا تجارتی پارٹنر ہے۔ چین نے حال ہی میں بھارت میں توانائی پوری کرنے کے لیے بیس ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا سمجھوتا کیا۔ امریکا دہرے معیار کا ملک ہے، درحقیقت امریکا چین کی بڑھتی ہوئی معاشی اور عسکری ترقی سے خوف زدہ ہو گیا ہے اور علاقے میں بالادستی کو قائم رکھنے کے لیے اس نے بھارت کا انتخاب کیا ہے۔ عالمی امن کا داعی کہلانے والے امریکا کا یہ پرانا مشغلہ ہے کہ وہ کسی بھی ملک کے لیے پہلے مسائل کھڑے کرتا ہے پھر اچھے بھلے امن پسند خطے کو انتشار کی طرف لاتا ہے، پھر اسی ملک کے مسائل کے ”حل“ اور وہاں ”امن و امان“ کے لیے بے چین بھی ہو جاتا ہے۔

اس ملک سے دشمنی، اس ملک سے دوستی۔ عالمی بساط پر بچھی یہ شطرنج کی ایسی بازی تھی جہاں خلوص سے زیادہ جنگی حکمت عملی اور مفادات کی نادیدہ زنجیروں نے ایک دوسرے کو جکڑ رکھا تھا۔

اسرائیل جو امریکا کے کاندھے پر بندوق رکھ کے چلاتا تھا اور اس کے ہر کلیدی محکموں میں گھسا بیٹھا تھا، مگر اپنی پالیسی اس سے خفیہ ہی رکھتا تھا، موساد کے چیف کا یہ دورہ بھی اس سے خفیہ رکھا گیا تھا۔

بارق شمعون، جنرل آئزک فرناش کی ان حرکتوں کی وجہ سے گہری سوچ میں پڑ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فرناش کے خلاف کون سا قدم اٹھائے؟ جبکہ یہ حقیقت وہ بھی جانتا تھا کہ جنرل فرناش کو یگانہ آرمی کے

آئزر مین بیری جونیئر کی بھی "آشیرواد" حاصل تھی۔ جبکہ ملکتی عہدے داروں سے اس سلسلے میں وہ کس منہ سے بات کرتا، جنھوں نے ابتدا میں موساد کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی تھی کہ ڈیوڈ اسٹار کے قیام کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اس وقت اسرائیلی پارلیمنٹ میں ان مذکورہ عہدے داروں کی تعداد کم تھی مگر اب وہ اکثریت میں بیٹھے تھے۔

بارق شمعون نے بالآخر کسی متوقع امید کے سہارے آئزر مین بیری سے ہی ملاقات کی ٹھانی۔

☆☆☆

"کیا ہوا؟ تمہارے چہرے کی رنگت بدلی ہوئی ہے، خیریت تو ہے نا عزیزی زبیدہ؟" اس کے سوئٹ میں داخل ہوتے ہی خالد بن جنید نے اس کی طرف قدرے چونک کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت وہ چاروں ایک ہی سوئٹ میں موجود تھے۔ زبیدہ نے پہلے اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اس کے بعد ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خاصے اسرار بھرے لہجے میں دھیرے سے بولی۔

"لگتا ہے ہمارے علاوہ اور لوگ بھی اس کروز ر میں سفر کر رہے ہیں جن کی اصل منزل ہماری طرح کوانڈو ہے۔"

"کیا مطلب عزیزی زبیدہ؟ ذرا کھل کر بتاؤ، معاملہ کیا ہے؟" شیخ دانیال نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو زبیدہ نے انہیں، روجر اور چک کی گفتگو کے بارے میں تفصیلاً آگاہ کر دیا، جسے سن کر چند ثانیوں کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر جنید نے ہی اس پر اظہار خیال کرنے میں پہل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ کسی مافیا کے آدمی لگتے ہیں جو کسی خاص ڈیلنگ کے لیے کوانڈو جا رہے ہیں۔"

"لگتا تو مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسرائیل نے سسلی میں اپنے اس اسپائی اسٹیشن کو اس قدر خفیہ رکھا ہوا تھا، ان کا یہ منصوبہ لیک آوٹ کیسے ہو گیا؟"

زبیدہ الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"اٹلی اور بالخصوص سسلی پر تاب پروفیشنل مافیا کا راج ہے، آئے روز ان کی آپس میں "گینگ وار" چلتی رہتی ہیں، جو زیادہ طاقت ور گروپ ہوتے ہیں ان کی تو باقاعدہ حکومتی حلقوں تک بھی رسائی ہوتی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عمل دخل ہوتا ہے، ایسے بعض طاقت ور مافیائی گروپ بڑی بڑی اہم شخصیات سے بھتا بھی لیتے رہے ہیں۔ یہ یہاں کی ایک "اسٹیبلشڈ" صورت حال ہے۔"

خالد بن جنید نے سسلی کی مختصراً سیاسی و سماجی صورت حال... کی تصویر کشی کی تو زبیدہ ہولے سے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "خوب! عزیزم خالد بن جنید یہاں کے بارے میں اچھی خاصی معلومات رکھتے ہیں۔"

"اس کی وجہ یہی ہے عزیزی زبیدہ کہ میں پہلے بھی ایک مشن پر یہاں آچکا ہوں۔"

"گڈ، آپ کی ہم رکابی میں ہمیں بہت حوصلہ ملے گا۔" فاروق خوش دلی سے بولا۔ تو زبیدہ اسی موضوع پر آگے تبادلہ خیال کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"اب سوچنا یہ ہے کہ یہ دونوں مافیائی گماشتے روجر اور چک ہمارے لیے کس طرح سود مند ثابت ہو سکتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے ہمیں اٹلی میں ملنے والے اپنے سکندر نامی ساتھی کی نصیحت کو یاد رکھتے ہوئے کسی مافیائی قسم کے لوگوں سے دور رہنا چاہیے۔" خالد بن جنید نے کہا۔ ماسوائے زبیدہ کے سب نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ یہ بات خالد بن جنید کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکی۔ وہ زبیدہ کی طرف ہلکی مسکراہٹ سے تکتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں میری بات سے اختلاف ہے؟"

"اختلاف کی کوئی خاص وجہ تو نہیں، ویسے ان لوگوں کو استعمال تو کیا ہی جا سکتا ہے؟"

"وہ کیسے؟ اگر تمہارے ذہن میں ایسا کوئی لائحہ عمل ہے تو بتا سکتی ہو؟" خالد نے اس سے کہا تو زبیدہ بولی۔

"فی الحال میرے ذہن میں کوئی ایسا واضح لائحہ عمل تو نہیں آ رہا ہے، البتہ ان دونوں کو چونکائے بغیر اگر ان کی خفیہ ریکی کی جائے تو آگے کچھ سوچا جا سکتا ہے۔ جہاں یہ ہمارے کام کے ثابت نہ ہو سکے ہم ان کے راستے سے ہٹ جائیں گے۔"

"تو پھر یہ کام تمہیں اپنے ذمے لینا ہوگا۔" خالد نے کہا۔ "ممکن ہے ہمارے اس اہم مشن میں خاص پیش رفت ہو سکے۔"

"بالکل، میں بھی اسی خطوط پر ہی سوچ رہی تھی۔" زبیدہ نے پورے جوش سے کہا اور اسی لہجے میں آگے بولی۔

"مجھے ان کے قریب ہونا پڑے گا، کیوں کہ یہ ان کی طے شدہ ملاقات لگتی ہے، ممکن ہے ان کی رسائی تک کوئی آسان راستہ مل جائے کوانڈو تک پہنچنے کا؟"

"کیا اس طرح آپ بھڑوں کے چھتے میں تو ہاتھ نہیں ڈال رہی ہو، عزیزی زبیدہ؟" اس کے ساتھی فاروق نے اس موضوع پر پہلی بار لب کشائی کی تو زبیدہ مسکرائی۔ اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالے بغیر بھلا کب مقصد حاصل ہوا ہے؟"

''عزیزی زبیدہ! اس پری پلان مشن میں کیا میں آپ کے ہمراہ ہو سکتا ہوں؟''

''ہاں فاروق! تم میرے ساتھ آؤ گے، لیکن مجھے کور کرنے کی حد تک۔'' زبیدہ نے کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔ اس کے بعد دونوں سوئٹ سے باہر آ گئے۔

عرشے پر آ کر فاروق زبیدہ کی ہدایت کے مطابق اس سے ذرا دور ہو گیا۔ زبیدہ نے سیدھا بار روم کا رخ کیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ دونوں مذکورہ مافیائی گماشتے اٹھ کر کہاں گئے تھے۔ بار روم میں خلاف توقع ''ہلڑ بازی'' دیکھنے میں نہیں آتی تھی۔ البتہ خوش فکروں کی خاصی تعداد وہاں موجود تھی۔

بار روم خاصا دیدہ زیب اور فینسی اسٹائل کا تھا جس کا فرش چکنا اور شطرنج جیسی سیاہ سفید بساط جیسا تھا، لمبے چوڑے بار کاؤنٹر کے ساتھ ساتھ سلیقے سے چھوٹے مگر آرام دہ ... اسٹول رکھے ہوئے تھے۔ بارٹینڈر ایک سرخ و سپید اور سنہری بالوں والی اٹالین حسینہ تھی جس نے مختصر سا چست لباس پہنا ہوا تھا، قد بوٹا تھا، اس کے ہمراہ ایک کالی رنگت کا موٹا سا گنجا آدمی بھی تھا۔ ایک حسینہ کے ساتھ ادھیڑ عمر نیگرو عجیب ہی تاثر پیش کرتا تھا۔ ایک جانب نفیس قسم کے صوفے بھی دھرے تھے اور قریب سینٹر میں اسنوکر کی میز تھی۔ گویا بغیر کسی شور شرابے کے بھی بار روم کی گہما گہمی عروج پر تھی۔ شوخ و شنگ حسینائیں مردوں کے ساتھ پینے پلانے اور ''معنی خیز اٹھکیلیوں میں مشغول تھیں، کچھ لوگ اسنوکر ٹیبل پر بھی کھیلنے میں معروف تھے۔ شہد رنگ بالوں والی، سرو قد اور دلکش خدو خال کی مالک ایک پرکشش خاتون کو بار میں تنہا داخل ہوتے دیکھ کر وہاں موجود کچھ ایسے لوگ اس کی طرف زیادہ دلچسپ نظروں سے دیکھ رہے تھے جو وہاں خود بھی کسی وجہ سے اکیلے تھے، اور رائج دستور کے مطابق زبیدہ پر اپنا حق سمجھتے ہوئے اس پر ''قربت'' کی امید لگا رہے تھے مگر زبیدہ نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھنا گوارا نہ کیا تھا اور سیدھا جا کر کاؤنٹر ٹاپ کے قریب دھرے ایک اسٹول پہ جا بیٹھی۔ سنہری بالوں والی لڑکی نے تو اسے نظر انداز کر دیا، البتہ ادھیڑ عمر موٹا نیگرو فوراً اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

''یس میڈم؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر استفساریہ بولا۔

''شیمپیئن، بلیک ڈاگ، لائم بیئر، وہسکی، ڈاکٹر برانڈی؟''

''سافٹ ڈرنک۔'' زبیدہ نے کہا۔

''شیور!'' نیگرو نے ہولے سے مسکرا کر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ اس کے بعد وہ اس کے لیے ایک خوب صورت نفیس سے بلوریں پیگ میں آئس کیوب ڈالنے لگا، زبیدہ نے بہ ظاہر یوں اسٹول پہ بیٹھے بیٹھے ایک ذرا گردن موڑ کے پیچھے بے اعتنا سی نگاہ ڈالی اور دوسرے ہی لمحے وہ اندر سے چونکی، ان دونوں مذکورہ مافیائی گماشتوں میں سے ایک چک نامی گماشتہ میز پر اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک وہسکی کی بوتل اور دو پیگ پڑے تھے۔ ایک خالی تھا، دوسرا ادھ بھرا، اس کا دوسرا ساتھی دکھائی نہیں دیا۔ اسی اثنا میں نیگرو بارٹینڈر نے اس کے لیے سافٹ ڈرنک تیار کر کے اس کے آگے سرکا دیا۔ زبیدہ ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگی۔ اسی وقت دو تین مرد اس کے دائیں بائیں والے اسٹولز پر آن بیٹھے اور اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے، ایک نے خاصے اوچھے انداز میں کہا بھی۔

''اتنی خوب صورت حسینہ کے ہاتھوں میں سافٹ ڈرنک؟ اگر میری طرف سے ڈبل بلیک ڈاگ ہو جائے تو سفر بھی حسین ہو جائے گا اور...''

''سوری! آئی ہیو اے بوائے فرینڈ۔'' زبیدہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا اور اپنا پیگ لیے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ دانستہ اسی جانب کو چلی تھی جدھر چک اکیلا بیٹھا تھا۔ باقی ارد گرد قریب کی میزیں لوگوں سے پر تھیں۔

''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں ادھر بیٹھ سکتی ہوں؟''

چک ایک جوان مرد تھا، شکل صورت سے خاص نہ تھا مگر مردانہ وجاہت کا حامل تھا، ایک جوان خوبصورت عورت کی بات بھلا کیسے ٹھکراتا، فوراً مسکرا کر بولا۔ ''اٹس مائی پلیژر۔ ضرور، بیٹھیے، پلیز۔''

''تھینکس، میں بس اپنا سافٹ ڈرنک ختم کر کے اٹھ جاؤں گی، آپ شاید اپنی گرل فرینڈ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' زبیدہ نے مسکرا کر دانستہ کہا۔

''او۔ نو۔ نو۔ نیور۔ آئی ہیو ناٹ۔ میں بھی آپ کی طرح اکیلا ہی ہوں۔ ویسے مجھے چک کہتے ہیں، اینڈ یو مادام؟''

''ڈیبورا، تم مجھے ڈیبی کہہ سکتے ہو۔ میرے ہبی (ہسبینڈ) بھی مجھے اسی نام سے ہی پکارتے ہیں۔'' زبیدہ نے ایک دلنشیں سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے جھوٹ بولا تو اس کی توقع کے عین مطابق چک کی آنکھوں میں معنی خیز سی چمک ابھری۔

''او، گریٹ۔ یو میرڈ! میں اپنے اندر ایک سنسنی خیزی محسوس کرتا ہوں جب کوئی پہلی میرڈ خاتون مجھ سے مخاطب ہو، نائس ٹو میٹ یو۔'' چک نے اپنے دانت نکالتے ہوئے

اس کی طرف دیکھ کر کہا اور ساتھ ہی زبیدہ کی طرف مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ طوعاً و کرہاً زبیدہ کو بھی اس سے ہاتھ ملانا پڑا۔

پھر مسکرا کر بولی۔ ''میرڈ تو مجھے نہیں کہہ سکتے ورنہ میں اس شپ میں تنہا سفر نہیں کر رہی ہوتی۔''

''نائس ٹو۔'' چک باچھیں پھیلا کر بولا۔ ''کمال ہے آپ جیسی حسین خاتون جس کی بیوی ہو اور وہ، کہیں اور تنہا بیٹھا ہو۔ بدقسمت انسان ہی ہوگا وہ۔''

''اسے ہر وقت مجھ سے زیادہ اپنے کاروبار کی فکر رہتی ہے۔'' زبیدہ کی بات پر چک کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک ابھری، قدرے نیچی آواز میں بولا۔

''کیا کاروبار کرتا ہے تمہارا شوہر؟'' زبیدہ اسے جس لائن پر لانا چاہ رہی تھی چک اسی جانب آ رہا تھا۔ منہ بسور کر بولی۔

''مجھے اس کے کاروبار سے کیا لینا دینا، مجھے تو اس کے ہر وقت ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے، مگر ایک وہ بے وقوف ہے کہ ایک جوان خوب صورت عورت کی تنہائی کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا اور مجھے بہلانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ او، ڈیئی! مائی سوئٹ ہارٹ! میں تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ دولت کمانا چاہتا ہوں، تاکہ تم ملکاؤں جیسی شاہانہ زندگی گزارو، ویسے اس میں شک بھی نہیں کہ وہ مجھ پر کوئی پابندی نہیں رکھتا، وہ جب اپنے کسی بزنس ٹور پر جاتا ہے تو میرے لیے نوٹوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے، وہ بلاشبہ مجھ سے محبت بھی تو بہت کرتا ہے۔ دولت میں بھی بہت کشش ہوتی ہے، اب شاید میں بھی اس کی عادی ہو گئی ہوں، مگر میری تنہائی۔'' اس نے ایک حسرت زدہ سی ہمکاری بھری اور دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''تمہارا شوہر کیا کاروبار کرتا ہے؟'' چک نے اپنے اندر کی سنسنی پر بمشکل قابو پاتے ہوئے پھر وہی سوال کیا، اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

زبیدہ اس جرائم پیشہ مافیائی گماشتے کی نفسیاتی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''وہ سونے اور ہیروں کی کھدائی کے ٹھیکے لیتا ہے۔ افریقا اور برازیل سے لوٹے ہوئے ابھی اسے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ وہ دوبارہ ایمازون کے جنگلوں کی خاک چھاننے کے لیے چلا گیا، مجھے بھی ساتھ لے جاتا ہے اکثر، مگر مجھے اب اس کے ساتھ خوار ہونے کا کوئی شوق نہیں، میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اس بار وہ کہیں گیا تو پھر میں بھی کہیں نکل جاؤں گی۔ جب تک وہ لوٹے، میں اپنی مرضی سے سیر سپاٹے کروں گی مگر افسوس، مجھے اب تک کوئی وفادار اور شائستہ انسان نہیں ملا۔''

یہ سب سن کر چک کو زبیدہ ایک سونے کی چڑیا کی صورت میں نظر آنے لگی، اسے زبیدہ ایک ایسی روایتی Rich Wife محسوس ہونے لگی جس کے پاس دولت کی کمی تو نہیں تھی مگر ہم سفر ساتھی کی وہ طلب گار ضرور تھی اور وہ بھی یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ایسی ''خواتین'' اپنے پارٹنر کے انتخاب کے سلسلے میں کس قدر سخت بھی ہوتی ہیں، اس نے سوچا، آسامی اچھی ہے مگر حلوا ٹھنڈا کر کے کھائے گا تو اسے بہت کچھ ملے گا۔ لہٰذا وہ اب پہلے سے زیادہ مؤدب نظر آنے اور خود کو بھی اسی کے رنگ میں پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''مادام! کیسی عجیب بات ہے کہ میری کہانی بھی آپ کی کہانی سے مختلف نہیں، چھوڑیں، کہ میں اب کیا اپنی سیلفش بیوی کا رونا روؤں، بس مادام! مجھے اپنی اپنی طرح ایک تنہائی کا مارا ہوا انسان ہی سمجھیں، آپ نے خود دیکھ ہی لیا ہوگا کہ یہاں کتنی حسین و رنگین تتلیاں اڑتی پھر رہی ہیں مگر میں نے کسی کو منہ نہیں لگایا، اور یہاں اکیلا بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔''

''ہاؤ امیزنگ۔!'' زبیدہ کمال کی اداکاری کرتے ہوئے مسرت آمیز حیرت سے بولی۔ ''پھر تو ہم دونوں محض محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً ایک ہی کشتی کے سوار ہوئے۔''

''آف کورس۔''

''اگر تمہارے ساتھ واقعی کوئی اور نہیں ہے تو پھر میرا خیال ہے کہ ہماری اچھی گزرنی چاہیے۔''

پھر اس نے مطلب کی بات پر آتے ہوئے اس سے پوچھ لیا۔ ''ویسے تم کہاں کا ارادہ رکھے ہوئے ہو؟''

چک نے کچھ سوچتے ہوئے شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔ ''جہاں یہ کم بخت! تقدیر لے جائے۔ اور آپ؟''

''میرا بھی وہی جواب ہے جو تمہارا ہے۔'' زبیدہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دلنشیں انداز میں مسکرائی پھر نہایت چالاکی سے گویا اسے ایک ''حد'' میں رکھنے کی غرض سے آگے بولی۔ ''ویسے تم مجھے خاصے مہذب نظر آتے ہو۔'' وہ بھی اس کے جھانسے میں آتے ہوئے اپنا سر خم کرتے ہوئے بولا۔

''مادام! میں مہذب نظر نہیں آتا بلکہ مہذب ہوں۔''

ٹھیک اسی وقت اس کے چہرے کے تاثرات تبدیل ہوئے، زبیدہ کی بھی بھانپتی آنکھوں نے یہ تاڑ لیا مگر وہ لاعلم سی بیٹھی رہی، تو چک نے ایک جانب نگاہ ڈالنے کے بعد اس سے خاصی عجلت میں کہا۔ ''مادام! پلیز ڈونٹ مائنڈ، میں

ابھی آیا، آپ یہاں سے جانا مت۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور ایک طرف بڑھ گیا۔ زبیدہ اپنی گردن ذرا موڑے بہ ظاہر بے نیازی سے چک کو ایک طرف جاتا دیکھنے لگی اور پھر قدرے چونکی، جب اس نے چک کو اپنے دوسرے ساتھی روجر سے ملتے دیکھا۔ چک کی "باڈی لینگویج" سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ روجر کو اس طرف آنے سے مانع رکھے ہوئے تھا، جدھر زبیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ زبیدہ دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی، صاف دکھائی دے رہا تھا کہ روجر، اپنے ساتھی چک پر کسی بات پر برہم ہو رہا تھا، پھر بڑی مشکل سے وہ اسے فارغ کر کے اس کی طرف لوٹا اور اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہو کے جھینپے جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔

"مادام! اس ڈسٹربنگ پر معافی چاہوں گا۔ وہ میرا دوست تھا، خفا ہو رہا تھا مجھ پر کہ میں اس کے ہمراہ بال روم میں نہیں گیا اور مجھے یہاں تمہارے ساتھ دیکھ کر ناراض ہونے لگا کہ عورتیں تو بال روم میں بھی تھیں، اب اسے میں کیا بتاتا کہ میری طرح تم بھی ذرا مختلف نیچر کی ہو اور ہمارے ستارے آپس میں مل چکے ہیں۔"

"یقیناً، مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی۔" زبیدہ ایک دل آویز مسکراہٹ اس پر نچھاور کرتے ہوئے بولی تو چک ایک بار پھر معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

"آپ برا نہ منائیں تو مجھے ذرا دیر کے لیے ایکسکیوز کریں، میں اپنے دوست سے مل کر اس کی ناراضگی ذرا دور کر لوں۔"

اس کی بات سن کر زبیدہ نے تھوڑا سا برا منہ بنا لیا اور اسی لہجے میں اس سے شکوہ کیا۔ "تم تو کہہ رہے تھے کہ تم بھی میری طرح اکیلے ہی شپ میں سفر کر رہے ہو لیکن۔" اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو چک ذرا پریشان سا ہو گیا بولا۔

"میں نے کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہا تھا مادام! اکیلے سے میری مراد، میرے ساتھ کوئی ساتھی لڑکی نہیں تھی، یہ بھی بس شپ میں ہی اسنوکر کا ساتھی بننے کی وجہ سے دوست بنا تھا۔ ورنہ میرا اس سے کوئی گہرا رابطہ نہیں ہے۔"

"کلیئر۔" زبیدہ نے مسکرا کر کہا اور چک مطمئن ہو گیا۔ تاہم بولا۔ "ویسے میں پالرمو اتروں گا اور آپ؟"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم چاہو تو؟"

زبیدہ نے اک ادائے دلنوازی سے کہا تو چک کا دل اندر سے مارے خوشی کے بلیوں اچھل پڑا، بولا۔ "اٹس گریٹ مادام! میرے ساتھ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔"

"تھینکس۔" وہ مسکرائی پھر چک جب رخصت ہونے لگا تو زبیدہ بھی دانستہ اس کے ساتھ ہی بال روم سے نکلی اور مختصر سی راہداری سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی کھنکتے ہوئے لہجے میں چالاکی سے بولی۔ "لگتا ہے اتفاق سے ہم دونوں کے رہائشی کیبن بھی قریب قریب ہی ہیں۔"

"ہاں شاید، میرا وہ سامنے والا کیبن ہے اور تمہارا؟" اس نے سامنے ایک بائیں جانب والے دروازے کی طرف اشارہ کیا تو زبیدہ بولی۔

"میرا کیبن بھی اس کے دائیں موڑ پر ہی ہے۔"

"چلو اچھا ہوا، صبح ہم اکٹھے ناشتا کریں گے، اور اس شپ کو بھی ایک ساتھ ہی الوداع کریں گے، جو ہمارے لیے بہرحال خوش قسمت ہی ثابت ہوا۔"

"بالکل!" زبیدہ نے بھی اپنے سر کو..... اثباتی جنبش دیتے ہوئے اس کے خیال کی توثیق کر ڈالی۔

زبیدہ کا ایک مقصد پورا ہو گیا تھا، پھر جب وہ اس سے ایک دلنشین مسکراہٹ کے ساتھ رخصت ہوئی تو ذرا آگے جا کر وہ دیوار کی آڑ لے کر کھڑی ہو گئی، ایسے میں اسے اپنا ساتھی فاروق دکھائی دیا، زبیدہ نے اسے اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کا مخصوص اشارہ کیا، جسے سمجھ کر وہ وہاں سے ہٹ گیا تو زبیدہ تیزی کے ساتھ واپس پلٹی اور دوبارہ چک والے رہائشی کیبن کی طرف آ گئی۔ ایک نگاہ گرد و پیش پر ڈالنے کے بعد اس نے دروازے سے کان لگا دیے، اور دوسرے ہی لمحے اس کے لبوں پہ عیارانہ مسکراہٹ عود کر آئی، حسب توقع اندر چک اور روجر کے درمیان گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔

"تم جانتے ہو، چک کہ ہم کس قدر اہم مشن پر نکلے ہوئے ہیں؟ اور تمہیں ایسے میں عشق سوجھ رہا ہے۔"

زبیدہ کو روجر کی درشت آواز سنائی دی، چک جواباً اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "تم سمجھتے کیوں نہیں ہو روجر! یہ ایک لمبا ہاتھ ثابت ہو سکتا ہے ہمارے لیے۔ وہ ایک کھرب پتی بزنس مین کی ایسی بیوی ہے جو تنہائی کی ماری ہوئی ہے مگر محتاط بھی ہے، میں نے اسے بڑی مشکلوں سے شیشے میں اتارا ہے۔"

"اور تم اس کی تنہائیوں کے ساتھی بننا چاہتے ہو؟" روجر کی طنز میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری تو دروازے سے لگی کھڑی زبیدہ کو اندازہ ہونے لگا کہ چک کے مقابلے میں روجر ذرا محتاط آدمی ہے، پھر اسے چک کی تحمل ہی آواز سنائی دی۔

"روجر! اسے رجھانے کے لیے بہ وقت ضرورت مجھے شاید یہ بھی کرنا پڑ جائے، مگر دیکھو، ایسی بات نہیں جو تم سوچ رہے ہو، عورتوں کی بھلا ہمارے لیے کیا کمی رہی ہے؟ مگر

یہ عورت ہمارے لیے سونے کی چڑیا ثابت ہو سکتی ہے۔''

''اپنا پلان بتاؤ۔'' بالآخر روجر بولا۔

''گڈ! یہ کی نا سمجھداری کی بات، اب شاید تم میری بات صحیح طرح سمجھ پاؤ۔ بہت آسان اور سادہ پلان ہے میرا۔ اس کا شوہر اس سے بہت محبت کرتا ہے، وہ سونے اور ہیروں کا بہت بڑا بیوپاری ہے، تم میرا ساتھ دو تو ہم اس سونے کی چڑیا کو یرغمال بنالیں گے۔ اس کے بعد اس کے شوہر سے ایک لمبی رقم بہ طور تاوان کا مطالبہ کریں گے۔''

''اور اس مشن کا کیا ہوگا؟ جس کے پورا ہونے کے انتظار میں باس ہمارا منتظر بیٹھا ہے؟''

''پہلے باس کا مشن پورا کریں گے، اور ہم نے اس سلسلے میں کون سا پہاڑ کھودنا ہے روجر ڈیئر! مذاکرات ہی تو کرنے جا رہے ہیں، کامیابی، ناکامی ہمارے ذمے کب ہے؟ اس کے بعد باس جانے اور وہ لوگ۔ ہم آزاد ہو جائیں گے اور پالرمو سے واپس نیپلز کا رخ کریں گے، یاد ہے نا... ہمارا پرانا ٹھکانا، وہاں سے ہم اپنا اصل کام شروع کریں گے۔''

''باس کو بتائے بغیر؟''

''باس کو بتائیں گے تو ہمارے حصے میں کیا خاک آئے گا؟''

''اور اگر بعد میں باس کو پتا چل گیا تو ہمیں خاک میں ضرور ملا دے گا۔''

''ایک بڑی رقم ہتھیانے کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ ہمیں کسی کا کتا بننے کی ضرورت ہوگی، وہ بھی چیک ڈو کراس جیسے خنزیر آدمی کا کتا، سوچو ذرا روجر! یہ بھی ہماری کوئی زندگی ہے؟ قسمت نے ہمیں غلامی کی زنجیریں توڑنے کا ایک موقع دیا ہے، اپنا کام کرنے کے بعد ہم اسٹیٹ نکل جائیں گے، وہاں ہم مل کر اپنا گینگ بنائیں گے، اس وقت اولڈ میکسیکو اس سلسلے میں بڑا زرخیز ہے۔''

''تب تک اس چڑیا کا کیا کرو گے پھر؟''

''اسے فی الحال ساتھ ہی رکھنا ہوگا، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں، ورنہ یہ چڑیا پھر ہو جائے گی۔''

''کیا؟ تم اسے کوانڈو لے جاؤ گے؟''

''یہی کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں سیر و تفریح کا بہانہ چل سکتا ہے۔''

''امپاسیبل، اسے ہم پر شبہ ہو جائے گا کہ ہم کس قسم کے لوگ ہیں اور تمہاری ساری پلاننگ بری طرح ناکام ہو جائے گی۔''

''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو، مذاکرات والا کام کچھ زیادہ طویل نہیں ہے، واپس نیپلز آ کر اپنے اصل منصوبے پر عمل شروع کر دیں گے۔''

''میرے ذہن میں ایک شارٹ کٹ آتا ہے۔''

''کیسا شارٹ کٹ؟''

''ہمیں کوانڈو مذاکرات کا کھڑاگ پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ پالرمو جانے کے بجائے نیپلز اتر جاتے ہیں اور اپنے اصل منصوبے پر عمل شروع کر دیتے ہیں۔''

''یہ بات میرے ذہن میں بھی تھی، مگر اب ممکن نہیں، ہمیں کوانڈو مذاکرات کی خانہ پری اب کرنا ہی پڑے گی، کیونکہ باس اس کا سیٹ اپ تیار کر چکا ہے اور اس کی نظریں ہم پر ہوں گی، تاخیر کی صورت میں اسے ہمارے ''سلپ'' ہونے کا پتا چل جائے گا اور ہماری تلاش شروع ہو جائے گی، اس خطرناک صورت میں ہم اپنی جان بچائیں گے یا اپنے منصوبے پر عمل کریں گے؟''

''ہم۔'' روجر کی پر سوچ ہنکاری خارج کرنے کی آواز ابھری... تو چک آگے بولا۔

''باس کا کام کرنے کے بعد باس جانے اور کوانڈو والے، ہم مذاکرات کی رپورٹ باس کو دینے کے فوراً بعد اپنا پرسنل نچ کیں گے، کیونکہ ہم باس کے طریقہ کار سے واقف ہیں، وہ ایک کے بعد دوسری ذمے داری ہمارے بجائے کسی اور کے ہی سپرد کرے گا، تب تک ہم آرام سے نیپلز میں بیٹھ کر اپنے پرسنل منصوبے کو آگے بڑھائیں گے۔ ایگری؟''

چکسٹے اپنی بات مکمل کی تو روجر کی بھی پر جوش سی آواز ابھری۔ ''ایگریڈ، اینڈ ڈن۔''

زبیدہ جب وہاں سے ہٹ کر اپنے کیبن پہنچی تو کامیابی کے جوش تلے اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا، اس کے ساتھیوں، بالخصوص خالد بن جنید نے اس کی ذہنی فراست کی تعریف کی۔

''یہ لوگ پہلے ہی کوانڈو جانے کا ایک سیٹ اپ تیار کر چکے ہیں۔'' زبیدہ نے منصوبے سے انہیں مزید آگاہ کرتے ہوئے آئندہ کا لائحہ عمل بتایا اور آگے بولی۔ ''اور کوانڈو پہنچنے تک ان کا یہ ''سیٹ اپ'' چونکہ پہلے سے تیار اور طے شدہ اور نسبتاً آسان ہوگا، ہمیں اس سے ہی فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مشن کو آگے بڑھانا ہوگا، اس طرح ہمارا بہت سا وقت بھی بچ جائے گا اور ان کے طے شدہ اور محفوظ شارٹ کٹ سے ہم بھی کوانڈو پہنچ جائیں گے۔''

اس کے بعد زبیدہ انہیں باقی کی گفتگو سے آگاہ

کرنے لگی۔

صبح کاذب کی ایک چمکتی، سنہری دھوپ میں یہ لوگ سسلی کے دارالحکومت اور بندرگاہ "پالرمو" پر اتر چکے تھے۔

☆☆☆

اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کو جینی بہت پہلے اپنے باپ جان نسوینٹر کی محکماتی "جانبداری" سمیت، ڈاکٹر کمال کے حادثے والی رپورٹ، موٹر وہیکل کولیزن اینڈ ایکسیڈینٹل کیس (motor vehicle collisions and accidental case) بشمول عینی گواہوں اور ڈی کارلو کی چیرہ دستیوں کے متعلق پوری تفصیل کے ساتھ آگاہی دے چکی تھی۔ جینی نے یہ رپورٹ آن لائن کی تھی اور اس کے بارے میں ڈاکٹر کمال کو بھی نہیں بتایا تھا۔ چیف انسپکٹر آف اسکاٹ لینڈ یارڈ نے جینی کو ایک ری پلائی کیا کہ وہ اس سلسلے میں ساری "مینوئل پورٹ" لے کر، اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ہیڈکوارٹر "وہائٹ ہال پیلس" پہنچ جائے۔

جینی کو احساس تھا کہ اگر اس کی انکوائری ہوگئی تو اس کے باپ کے خلاف محکماتی ایکشن لیا جاسکتا ہے۔ اور نوکری سے بھی ہاتھ دھونے پڑ سکتے تھے لیکن جینی یہ بھی جانتی تھی کہ اس "جانبداری" میں اس کا باپ سر جان ملوث نہیں تھا وہ تو صرف رابطے کا کام کر رہا تھا اور "اوپر" سے اسے جو حکم دیا جارہا تھا وہ اس پر عمل کرنے پر مجبور تھا، اسی لیے اگر عتاب آیا تو اس کے باپ پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر آئے گا، جو کسی سیاسی مصلحت کے تحت شرپسند ڈی کارلو کو بچانا چاہتے تھے۔

حماد اندال جو پہلے جینی کی طرف سے بددلی کا شکار تھا، اس کی اس کوششوں کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ جینی بھی دھن کی پکی نکلی تھی اس نے بالآخر کمال کو قائل کر کے ہی چھوڑا، پھر ایک روز یہ تینوں دوست اسکاٹ لینڈ یارڈ کے ہیڈکوارٹر، وہائٹ ہال پیلس جا پہنچے۔ جینی نے مذکورہ کیس سے متعلق فائل پہلے ہی تیار کر رکھی تھی۔

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے چیف پولیس انسپکٹر نے غور سے ان کی باتیں سنیں پھر تقریباً گھنٹے بھر تک وہ کیس کا مطالعہ کرتا رہا، اس کے بعد اس نے اپنے تفتیشی لائحہ عمل کے لیے ان سے چوبیس گھنٹے کا وقت مانگا، یہ مدت گزرتے ہی ڈی کارلو کو گرفتار کر لیا گیا۔ سارے ثبوت اس کے خلاف جاتے تھے، بیتن ڈیوڈ، جو ڈی کارلو کا باپ تھا، جس کے لیے مذکور ہو چکا تھا کہ وہ ماضی میں برٹش پارلیمنٹ میں اقلیتی امور کا وزیر رہ چکا تھا ساتھ ہی جیوش ہوم کو بھی لیڈ کرتا تھا، ایک یہودی خواہ وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں ہو اپنی ذات میں ایک مکمل ٹیم ہوتا ہے اور اس کے خمیر میں یہ بات نہ شدہ ہوتی ہے کہ وہ موساد کا آلہ کار اور اپنے وطن اسرائیل کا جاسوس ہے جب بیتن ڈیوڈ برطانیہ میں اپنی پارلیمانی مدت پوری کر چکا تو موساد کی طرف سے اسے الیا بیتھ کے دیرینہ کاز پر امریکا روانہ کیا گیا، جیوش ہوم کی صورت میں جہاں بہت پہلے سے اس کی سیاسی ساکھ قائم تھی، اسے امریکی پارلیمنٹ میں شمولیت ملی اور وہ بیگانہ کی کاؤنٹر انٹیلی جنس الیا بیتھ کے آلہ کار کی حیثیت سے وہاں کام کرنے لگا۔ لہٰذا جب امریکی پارلیمنٹ میں موجود.... ڈی کارلو کے باپ، بیتن ڈیوڈ کو اپنے بیٹے کی گرفتاری کی خبر ہوئی تو اس نے پہلے متعلقہ محکمے اور پھر بعد میں اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کیں تو اسے اپنے بیٹے ڈی کارلو اور پاکستانی اسکالر ڈاکٹر کمال احمد کے درمیان "چپقلش" کا پتا چلا بیتن ڈیوڈ خود بھی ایک کٹر اور متعصب یہودی تھا اور امریکی پارلیمنٹ میں موجود الیا بیتھ کی "ڈکٹیشن" پر موساد کے لیے کام کرتا تھا۔ بیتن کارلو کا اپنا ماضی سان فرانسسکو کے ایک گھٹیا سے ساحلی علاقے "کیوٹی" سے شروع ہوا تھا۔ بیتن ڈیوڈ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کے ماں باپ اس سے پہلے جرمنی میں رہتے تھے جہاں انہیں وہاں بسنے والے چند دیگر یہودی خاندانوں کی طرح سخت ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ جنگ عظیم کے بعد سے جہاں دیگر یہودی خاندان بڑی مشکلوں سے چھپ چھپا کر اور اپنی جانیں بچا کر وہاں سے ہجرت کر کے امریکا پہنچے تو بیتن کے ماں باپ بھی اس میں شامل تھے، یہاں بھی ان کی زندگی کسمپرسی کا نمونہ رہی مگر یہاں انہیں جرمنی کے مقابلے میں بہرحال امان تھی کیوں کہ جرمنی میں یہودیوں کو سخت نفرت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایڈولف ہٹلر نے جب ہزاروں یہودیوں کو ایک سیلن زدہ تہ خانے میں "غسل" دینے کے بہانے ان پر زہریلی گیس چھوڑ دی تھی تو اس کے اس لرزہ خیز ظلم پر بڑی لے دے ہوئی تھی اس پر ہٹلر نے چند مٹھی بھر یہودیوں کو آزاد کر دیا تھا مگر ساتھ ہی یہ ضرب المثال جملہ بھی کہا تھا کہ "دنیا دیکھے گی کہ میں یہودیوں کو ہلاک کر کے ظلم کر رہا تھا یا دنیا پر احسان، بہت جلد تم ان کی عالمی کارستانیاں دیکھو گے۔"

بعد میں عالمی مبصروں نے تسلیم کیا تھا کہ عالمی جنگ انہی کی کارروائیوں کے باعث ہوئی تھی اور آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ اسرائیل اب بھی وہی کچھ کر رہا ہے، وہ دھیرے دھیرے ایک بار پھر دنیا کو تیسری عالمی جنگ کے دہانے پر دھکیل رہا ہے۔

یہودی قوم مسلمانوں کے ہی نہیں بلکہ وہ کسی کے بھی

دوست نہیں ہیں، وہ صرف اپنے اور اپنی قوم کے دوست ہیں، اپنے حلیفوں کو بھی وہ اپنے مفادات میں استعمال کرتے ہیں اور بس، بلکہ اکثر اپنے وسیع تر مفادات کی خاطر انہیں بھی "چونا" لگانے سے نہیں چوکتے۔

بہر طور پانی کے ایک دخانی بحری جہاز میں یہ دونوں میاں بیوی سان فرانسسکو پہنچے اور کیونی کے ہی ساحلی علاقے میں ایک ٹین کے ڈربا نما گھر میں رہائش اختیار کی، یہاں نیتن کا باپ ساحل پر ہی بار برداری کی نوکری کرنے لگا مگر وہ اب اکثر بیمار رہنے لگا تھا، یوں اس کی بیوی گھٹیا قحبہ خانوں میں ویٹریس کی نوکری کرنے لگی۔ نیتن نوعمر تھا، وہ اس زندگی سے سخت نفرت کرتا تھا، اسے تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا، امریکا میں وہ تعلیم یافتہ لوگوں کی وقعت سے آگاہ تھا۔ نیتن بلا کا چالاک، موقع پرست اور چال باز، چرب زبان تھا، اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں نے اسے مزید پڑھنے کے لیے شہر کی ایک بڑی یونیورسٹی میں داخل کروا دیا تھا، یونیورسٹی میں داخلے کے بعد اس نے گھر اور اپنے ماں باپ کو بھلا دیا اور وہیں کا ہو کے رہ گیا، وہیں اس نے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا اور پھر اپنے ہمنواؤں کی مدد سے وہ بتدریج اوج حاصل کرتا چلا گیا۔ وہیں اس نے جیوش ہوم کی باگ سنبھالی تھی، پھر اس کی "خدمات" کو دیکھتے ہوئے موساد نے اسے برطانیہ روانگی کا حکم دیا کہ وہاں بھی وہ ان کے وسیع تر مفادات کے لیے جیوش ہوم کو "فعال" کرے اور یہی اس نے کیا، پھر اسے واپس امریکا بلا لیا گیا، نیتن ڈیوڈ خود بھی یہی چاہتا تھا، کیونکہ اسے برطانیہ کے مقابلے میں امریکا میں بیٹھ کر "کھل" کے کام کرنے کے مواقع ملتے تھے۔

بہر طور ایک مسلم اور وہ بھی پاکستانی اسکالر کے ہاتھوں اپنے بیٹے کی یہ ہزیمت اسے برداشت نہ ہو سکی۔ اس نے ڈاکٹر کمال کے خلاف اپنے اختیارات کا استعمال شروع کر دیا۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اب ڈاکٹر کمال کو اس بین الاقوامی تعلیمی ادارے "لیڈز یونیورسٹی" سے نکلوا کر دم لے گا۔ اسے یہ بھی پتا چلا تھا کہ اس کے بیٹے پر ڈاکٹر کمال کو کار سے ٹکر مار کے ہلاک کرنے کا الزام بھی لگا ہے اور اس پر اب "اقدام قتل" کا مقدمہ بننے والا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کر کے لندن اپنے بیٹے سے فون پر بات کی جو اس وقت اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کے حوالے تھا۔ اسے "تسلیاں" دینے کے بعد اس نے اپنے بیٹے کی "ڈیل" کے لیے لندن کے ہی ایک قابل وکیل کو ہائر کیا تا کہ قانونی طور پر وہ اس کا مقدمہ لڑ سکے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے خود ساختہ دو عدد ایلچی بھی لندن روانہ کر دیے۔

یہ سارے کام نمٹانے کے بعد وہ ہنگامی بنیاد پر ایک روزہ ذاتی دورے پر اسرائیل روانہ ہو گیا۔ وہاں اس مکار شخص نے پہلے تو اس سلسلے میں ایک مختصر اور عمومی ملاقات موساد کے بارق شمعون سے کی پھر ہگانہ کے سربراہ آئزر مین بیری جونیئر سے تفصیلی ملاقات کی۔ جب وہ اسرائیل سے واپس امریکا روانہ ہو رہا تھا تو بڑا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ کیوں کہ وہ، ہگانہ کے سربراہ کی نظروں میں اپنے بیٹے کی "قابل فخر" کارکردگی گوش گزار کر کے اس کی مدد اور غیر معمولی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ ساتھ ہی اسے اب اطمینان بھی تھا کہ لندن میں موجود گریٹر اسرائیل کے وسیع تر مفادات میں مصروف "شن بیتھ" اس کے بیٹے کا اب وہاں خاطر خواہ دفاع کر سکتی تھی۔

لہٰذا شن بیتھ کی مادام میڈوسا کو نیتن ڈیوڈ کے دورے کے بعد ہی آئزر مین بیری کی جانب سے ہاٹ لائن پر ڈی کارلو کے حوالے سے اور اس کے "تحفظ" کے سلسلے میں پیغام موصول ہوا۔

مادام میڈوسا، جو پہلے ہی ایک دیرینہ مقصد کی خاطر جز بیلا کو ڈی کارلو کی مدد کے لیے لا چکی تھی اس پیغام کے فوراً بعد اس نے جز بیلا کو طلب کر کے اس سلسلے میں مزید بریف کر دیا جبکہ سیکریٹ کاؤنٹر یونٹ کے دوسرے انچارج بالی سور کو اس نے جز بیلا سے ہٹا کر ایک اور اہم مشن سونپ دیا کہ وہ جلد سے جلد یہاں خفیہ طور پر سرگرم اس سورسز کا پتا چلائے جو کہ فلسطینی حریت پسندوں کو آئی آر اے (آئرش ری پبلک آرمی) کے تعاون سے سپورٹ کر رہی تھی۔ وہ فلسطینی مجاہدین کی اس سورسز کا جلد سے جلد قلع قمع کرنے کے لیے بے تاب تھی، کیونکہ اسے وہ لرزا دینے والا لمحہ ابھی تک نہیں بھولا تھا جب ہگانہ کے آئزر مین بیری جونیئر نے اس کے اس "سورسز" والے انکشاف کے بعد، اس پر مارے طیش کے پستول تان لیا تھا کہ اس کی (شن بیتھ کی) موجودگی کے باوجود یہ فلسطینی سورسز اب تک وہاں کیوں فعال تھی؟ تاہم اب مادام میڈوسا کی گھاگ نگاہیں محسوس کر رہی تھیں کہ ممکن ہے ڈی کارلو اور ڈاکٹر کمال والے کیس کی وجہ سے یہ خفیہ سورسز حرکت میں ضرور آ سکتی ہے اور یہی وہ موقع ہو گا جب اس پر ہاتھ ڈالا جا سکے گا۔ یہ سب کر چکنے کے بعد وہ خود "مرینہ" والے اپنے منصوبے کے اگلے مرحلے کے بارے میں غور کرنے لگی۔ جس میں وہ فیری

میسن کے اصول (دشمن کو اسی کا بھیس بھر کے دھوکے سے مارنا) کو آزما رہی تھی، یعنی ایک برقع پوش مسلم خاتون کے روپ میں وہ ڈاکٹر کمال کو دھوکا دیتے ہوئے اس کے گرد ایک جال بن رہی تھی۔ مادام میڈوسا بڑی ذہانت، مکاری اور چال بازی کے ساتھ لندن میں بیٹھی بڑے مربوط طریقے سے اپنے مشن کی چوکھی چال چلنے میں مصروف کار تھی۔

ادھر جینی کی ذاتی کوششیں اس حد تک تو رنگ لائی تھیں کہ بالآخر شر پسند ڈی کارلو کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کا نام خراب ریکارڈ کی زد میں آ گیا تھا، وہ جو گڑھا ڈاکٹر کمال کے لیے کھود رہا تھا، اس میں وہ خود گر پڑا تھا۔ لیڈز یونیورسٹی ایک بین الاقوامی سطح کا تعلیمی ادارہ تھا، عالمی سطح پر اس کی ایک ساکھ تھی، اس کے اسکالرز یا اسٹوڈنٹس کی کسی غیر قانونی سرگرمی میں ذرا سی بھی غیر احتیاطی قطعاً برداشت نہیں کی جاتی تھی اور فوراً اسے یونیورسٹی سے خارج کر دیا جاتا تھا، یہی نہیں غیر ملکی اسکالرز کو ڈی پورٹ بھی کر دیا جاتا تھا مگر یہاں ڈی کارلو کا معاملہ مختلف تھا، وہ عام شخصیت کے زمرے میں نہیں آتا تھا مگر اب یہاں بھی معاملہ یونیورسٹی کی بین الاقوامی ساکھ کا تھا اسے داؤ پہ نہیں لگایا جا سکتا تھا، لہٰذا اس سلسلے میں یونیورسٹی انتظامیہ نے ایک میٹنگ بھی کی جس میں ڈی کارلو کی پولیس حوالگی زیر بحث رہی تھی۔ ڈی کارلو کو اب مزید ڈھیل نہیں دی جا سکتی تھی، نہ ہی اس کے حق میں اب اور کوئی جانب داری برتی جا سکتی تھی۔ اگلی میٹنگ میں لندن کے میئر کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ بالآخر اس فیصلے کو کورٹ کے فیصلے کے آنے تک محفوظ رکھنے پر اتفاق کر کے میٹنگ برخاست کر دی گئی۔

ادھر نیتن ڈیوڈ کے ہائر کردہ وکیل اپنی سی سر توڑ کوششوں سے ڈی کارلو کی ضمانت تو کروانے میں کامیاب ہو گیا مگر اس کا کیس ختم نہیں کرا سکا۔ جبکہ ڈی کارلو کی ضمانت بھی مشروط ہوئی تھی۔ یعنی کیس کا کوئی فیصلہ ہونے تک ڈی کارلو شہر تو کجا وہ علاقہ تک چھوڑ کر جانے کا مجاز نہیں ہو سکتا تھا، جہاں وہ رہتا تھا۔ اس طرح کی ''مشروط'' ضمانتیں مغربی معاشرے میں ملزم کو آدھا مجرم تو قرار ہی دیتی تھیں خواہ بعد میں فیصلہ اس کے حق میں ہی کیوں نہ ہو۔ نیتن ڈیوڈ کو جب یہ پتا چلا تو اس نے اپنے وکیل بیرسٹر ہاکن کی فون پر ہی اچھی خاصی کلاس لے ڈالی۔

''تمہیں کس الو کے پٹھے نے بیرسٹر بنایا ہے؟ لندن کے کتوں نے شور نہیں مچایا تمہاری جھوٹی شہرت پر، یہ کس طرح کی ضمانت کروائی ہے تم نے میرے بیٹے کی؟ تم نہیں جانتے وہ ایک کتنی بڑی درسگاہ میں زیر تعلیم ہے، اس کا کیریئر تباہ ہو کر رہ جائے گا، اس کا مستقبل داؤ پر لگ سکتا ہے، بلکہ لگ چکا ہے۔''

''ج۔ج۔جج۔جناب! کوئی عام وکیل تو یہ بھی نہیں کروا سکتا، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔''

بیرسٹر ہاکن بوکھلا کر بولا۔ ''آپ کے بیٹے کے خلاف motor vehicle collisions and accidental case کا مقدمہ بے حد مضبوط اور ٹھوس دلائل پر بنا ہے، خدا کرے کہ وہ بری ہو جائے تو اس پر بھی شکر بجا لائیے گا''۔ ہاکن نے بھی آخر میں نیتن کو ایک تلخ حقیقت سے آگاہ کر دینا ضروری سمجھا تھا اور پھر اسے کیس کی مختصر تفصیل سے بھی آگاہ کر دیا، جسے سن کر نیتن ڈیوڈ کے بھی ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اسے اندازہ ہوا کہ جو ہاکن نے کیا، یہ بھی کم نہ تھا۔ بہ طور اسے مزید اس سلسلے میں ہدایت دینے کے بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ڈی کارلو کی حالت اپنے باپ سے بھی زیادہ پر غیظ ہو رہی تھی، اس نے ڈاکٹر کمال کے خلاف یونیورسٹی میں نفرت و ذاتی بغض کا جو غبار اپنے سینے میں بھر رکھا تھا اس میں مزید اضافہ ہونے لگا تھا، بلکہ اب تو معاملہ ذاتی رنجش سے بڑھ کر جانی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اس کی ڈاکٹر کمال کے خلاف ہر وہ کوشش بری طرح ناکامی سے دوچار ہوئی تھی جس سے کمال کو یونیورسٹی میں بدنام کرانا مقصود تھا، اس کے برعکس وہ خود اپنے کالے کرتوتوں کے باعث اپنے ہی کھودے ہوئے گڑھے میں جا گرا تھا۔ ابھی اسے کورٹ کی طرف سے سزا تو نہیں ہوئی تھی لیکن اس کے وکیل بیرسٹر ہاکن نے اس کی بیل پر رہائی ملنے کے بعد اسے یہ تنبیہ ضرور کر ڈالی تھی کہ اسے محتاط رہنے کی ضرورت ہے، جب تک کہ اس پر لگا الزام دھل نہیں جاتا، بہ صورت دیگر کیس ابھی عدالت میں چل رہا تھا، اسے کڑی سزا ہو سکتی تھی۔ مگر ڈی کارلو کا سینہ اس وقت ڈاکٹر کمال کے خلاف نفرت و غیظ سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اس سے انتقام لینے کے لیے سخت بے چین تھا، بیل پر اپنی رہائی کو وہ موقع غنیمت جانتے ہوئے تھا۔ اس جنون میں اس نے اپنے باپ کے ہائر کردہ وکیل کی نصیحت کو بھی درخور اعتنا نہیں جانا اور ڈاکٹر کمال سے نمٹنے کے لیے نئے اوچھے ہتھکنڈوں پر غور و خوض کرنے لگا۔

ڈی کارلو کو پڑھائی وڑھائی سے کوئی شغف نہ تھا، امریکا کے مقابلے میں اسے لندن کی فضا زیادہ اچھی لگتی تھی۔ ماں کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا اور وہ لندن میں

ہی دفن تھی، اب اس کا دل بھی ادھر ہی لگتا تھا۔اس کے آوارہ اوباش دوستوں کی یہاں کوئی کمی نہ تھی۔

ادھر بیرسٹر ہاکن کو بھی ڈی کارلو کے اندرونی ابال کا شاید اندازہ ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اسے نصیحت کرنے کے باوجود اس کے باپ بیتن ڈیوڈ کو بھی حفظ ماتقدم کے تحت ایک عدد فون کھڑکا دیا کہ وہ خود بھی اپنے بیٹے کو ایسی نازک صورت حال میں اپنی طرف سے بھی نصیحت کا حق ادا کردے۔بیتن نے یہی کیا۔

جس وقت ڈی کارلو اپنی رہائش گاہ میں بیٹھا، ڈاکٹر کمال سے انتقام لینے کے طریقوں پر غور کر رہا تھا، اسے اپنے باپ کا فون موصول ہوا۔

''ہیلو! مائی سن، کارلو!''

''یس ڈیڈ!'' وہ بے دلی سے بولا۔باپ کو اس کے لہجے میں چھپی ایک سلگتی ہوئی تپش کا احساس ہوا، بولا۔

''مائی سن! بی کیئر فل اینڈ کول ڈاؤن۔جب تک تمہارا کیس ختم نہیں ہو جاتا، خود کو کول مائنڈ ڈرکھو۔''

''ڈیڈ! میں ڈاکٹر کمال کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا، ڈیس اٹ۔'' ڈی کارلو کے اندر بھرا ہوا زہر بالآخر زبان پہ آ گیا۔

''شیور۔اٹ ول بی ہیپن، بٹ، میں اس زندہ کو مردہ بنا دوں گا، میرے ہوتے ہوئے تم اس بات کی فکر کیوں کرتے ہو؟'' دوسری طرف سے بیتن کی زہر میں بجھی متحمانہ آواز ابھری۔''تم کیا کرو گے اس کا؟ زیادہ سے زیادہ...اسے گولی مار کر ہلاک کرو گے؟ مگر جو میں اس کے ساتھ کرنے والا ہوں وہ تم دیکھنا، اس سے تمہارا سیروں خون بڑھے گا، اسی لیے مائی سن! ابھی اپنا خون مت جلاؤ۔''

''ڈیڈ! میں یہ سب کچھ اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا ہوں۔'' ڈی کارلو پرغیظ لہجے میں بولا۔

''تمہارے ہاتھوں سے ہی سب ہوگا، مگر ابھی ذرا صبر سے کام لو۔'' دوسری طرف سے بیتن نے بیٹے کو سمجھانے کی کوشش چاہی۔''مت بھولو کہ تم اس وقت لندن میں ہو اور تمہارا کیس دنیا کی مشہور پولیس اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سپرد کیا جا چکا ہے، امریکا میں یہ سب کچھ ہوتا تو اور بات تھی، مگر اس کے باوجود میں نے اتنا تمہارا دفاع کیا کہ سٹی پولیس کو تم پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکے اور ایسا ہوا بھی مگر۔''

وہ دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک ثانیے کے لیے تھما، پھر بولا۔''خیر میں نے کہا نا مائی سن! ڈونٹ وری اباؤٹ اٹ، میں یہ سب دیکھ لوں گا، تم ایک کام کرو، ایک ایڈریس نوٹ کرو، یہ ڈیکسا میتھ ان کارپوریٹڈ کمپنی ہے، اس کی ڈائریکٹر ایک اسرائیلی خاتون ہے، نام مادام میڈوسا ہے، اس سے جا کر ایک ملاقات کرلو، وہاں یہ تمہارا مکمل تحفظ کرے گی، میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں، اوکے۔''

اس کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا، کارلو نے وہ ایڈریس نوٹ کرلیا تھا۔

جینی کی ان کاوشوں پر حماد اور ڈاکٹر کمال دونوں اس کے ممنون تھے، حماد کی بہن حبیبہ کی شادی حماد کی واپسی پر مشروط تھی، اسی لیے وہ عراق جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا، وہ بے حد خوش تھا جبکہ اس سے زیادہ خوش جینی اور کمال ہو رہے تھے، بلکہ جینی تو کچھ زیادہ ہی ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی، بہ قول اس کے، یہ سفر اس کے لیے ایک یادگار اور نہ بھولنے والا سفر ثابت ہو سکتا تھا، نیز وہ بہت انجوائے بھی کرے گی مگر جانے کیا بات تھی کہ حماد ایک عجیب سی نامعلوم بے چینی کا شکار ہو رہا تھا، سفر کی شاپنگ تینوں دوستوں نے بے حد خوشی خوشی اور اکٹھے کی تھی۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب یہ تینوں دوست عراق روانہ ہونے کے لیے ایک بھیگی بھیگی شام میں لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پہنچے، جینی اور ڈاکٹر کمال کے سفری کاغذات کا بندوبست وغیرہ حماد نے بہ آسانی کرا دیا تھا، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ حماد اندال نے Metallurgy میں انجینئرنگ کی تھی اور اب یہاں لندن لیڈز یونیورسٹی میں سبجیکٹ اسپیشلائزیشن کی غرض سے آیا ہوا تھا، یہ اسکالر تو نہیں تھا، تاہم اپنے خرچے پر یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔اس کا خاندانی بیک گراؤنڈ خاصا مضبوط تھا، جو عراق کے شہر بغداد کے مشہور اور پوش علاقے ''المنصور'' میں رہائش پذیر تھا، اس خاندان کا شمار بغداد کے متمول اور معزز گھرانوں میں ہوتا تھا، حماد کا باپ شمائل اندال بغداد میں ایک اعلیٰ اور کلیدی اہمیت کے حامل عہدے پر فائز تھا۔حماد کی والدہ ام کلثوم بھی ''موصل'' کے ایک معزز قبائلی سردار خاندان سے تعلق رکھتی تھی، جو ایک اچھی وفاشعار بیوی اور ماں بھی تھی۔

بہرطور لندن سے عراق تک قطرا ئرویز کی بھی فلائٹ تھی، دستیاب ائرلائن میں اس وقت تین فلائٹس تھیں۔انہوں نے دوسری فلائٹ کا انتخاب کیا تھا۔ویسے لندن سے عراق کا فاصلہ تقریباً دو ہزار پانچ سو بیالیس میل (چار ہزار نوے کلومیٹر) تھا۔

تینوں دوست اس سفر میں ایک عجیب سی اور جداگانہ سنسنی سی محسوس کر رہے تھے۔حماد کے لیے تو اس لیے یہ سفر خوش کن ثابت ہو رہا تھا کہ اس کے ہمراہ جینی اور ڈاکٹر کمال

جیسے دوست بھی ہم رکاب تھے۔ جبکہ کمال اور جینی کے لیے تو ویسے ہی یہ سفر منفرد اور نیا تھا کہ وہ دونوں پہلی بار عراق عازم سفر ہو رہے تھے۔

دورانِ سفر، شاید جینی نے تو نہیں البتہ ڈاکٹر کمال نے حماد کے چہرے سے گاہے بہ گاہے مترشح ہونے والے تاثرات ضرور بھانپ لیے تھے، بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے دوست! تم کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے کھو سے جاتے ہو؟ کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ؟'' چونکہ یہ دونوں اب اس کے ایک طرح سے مہمان بھی تھے، جانے یہ لوگ کیا سمجھیں؟ حماد کو اپنی نامعلوم سی اس بے چینی کے بارے میں بتانا ہی پڑا، بولا۔

''کچھ خاص تو نہیں دوست! بس، ویسے ہی۔ جب میں نے گھر ٹیلی فون پر بات کی تھی اور اپنے گھر والوں کو یہ بتایا کہ میرے دو دوست بھی ساتھ آ رہے ہیں تو انہیں یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی تھی۔ خاص کر میری چھوٹی بہن نے تو اس بات پر بہت مسرت کا بھی اظہار کیا تھا، وہ سب آپ دونوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے چین اور چشم ماروشن دل ماشاد کیے بیٹھے ہیں، لیکن...''

وہ اتنا کہہ کر رکا تو کمال بہ دستور اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے تکتا رہا، حماد چند ثانیے تھم کر بولا۔

''والد عزیزم سے بھی میری بات ہوئی تھی، مگر مجھ سے انہوں نے کوئی پریشانی والی بات نہ کی، بلکہ مجھ سے کیا وہ گھر میں کسی سے بھی اپنی کوئی پریشانی شیئر ہی نہیں کرتے ہیں، یہ تو عزیزی والدہ ہیں جو ان کے ساتھ ایک گہری ہم آہنگی رکھتی ہیں، ان سے کوئی بات نہیں چھپی رہتی، تاہم مجھ سے بھی انہوں نے سرسری سا ذکر کیا تھا، میرے والد چونکہ بغداد میں ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں، انہی سے پتا چلا ہے کہ عراق کی سیاسی فضا ایک بار پھر دگرگوں ہونے لگی ہے، کچھ اشارہ ایسا ملتا ہے کہ دوبارہ وہی کہانی عراق کے ساتھ دہرائی جانے والی ہے، یعنی کچھ عاقبت نااندیش عراقی جرنیل ایک بار پھر ''کٹھ پتلی'' کا رول پلے کرنے والے ہیں جس کی وجہ سے بغداد اور عراق کے آسمان پر ایک بار پھر جنگ کے بادل منڈلانے لگے ہیں، بس یار کمال! دعا کرو۔ سب ٹھیک رہے۔ بس! یہی وجہ تھی میرے پریشان ہونے کی، تم سے ذکر اس لیے نہیں کیا کہ جانے تم کیا سمجھو؟''

وہ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا، تو کمال کے چہرے پر بھی سنجیدگی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔

جہاز کو لندن ہیتھرو ائرپورٹ سے ٹیک آف کیے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ کمال نے حماد کی بات سن کر یوں ہی جینی کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھا، جو اس کے ساتھ کھڑکی کے قریب بیٹھی باہر تاریکی میں تیرتے کالے بادلوں کو دیکھنے میں محو تھی۔

پھر اس نے گردن موڑ کر حماد سے دھیمی آواز میں کہا۔

''حماد! دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں، خدا خیر کرے گا۔''

''ہاں! میں بھی یہی دعا کرتا ہوں دوست کہ خدا سب خیر ہی کرے۔''

''دیکھو! ابھی جینی سے اس قسم کی کوئی بات مت کرنا۔ ویسے تو بڑے حوصلے والی ہے لیکن اس طرح کی سیاسی صورت حال تو اچھے بھلے آدمی کو بھی پریشان کر ڈالتی ہے یہ تو پھر ایک نازک اندام عورت ہے، تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟'' اس کی بات پر حماد اندال نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی پھر بولا۔

''خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ ہم بغداد کے ائرپورٹ پر اتریں اور خدانخواستہ ہم پر بمباری شروع ہو جائے، میں ویسے ہی عراق کی تازہ صورت حال کی بات کر رہا تھا۔''

جہاز کچھ دیر کے لیے ترکی پر اترا اس کے بعد وہ بغداد کے ائرپورٹ پر لینڈ کر گیا۔

بغداد اس وقت روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ ائرپورٹ کے باہر ایک بھاری بھرکم گاڑی انہیں لینے آئی تھی، ایک ڈرائیور اور دو عدد مسلح گارڈ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ چوتھا شخص ایک ٹھگنے قد اور سرخ و سپید رنگت کا آدمی تھا، اس نے مخصوص وردی نما سا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا، جسے حماد نے ''انکل سعد بے'' کے نام سے پکارا تھا اور بڑے احترام کے ساتھ ان سے بغلگیر ہوا تھا، چہرے مہرے سے وہ ایک بردبار اور ذمے دار آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ کمال اور جینی بھی اس سے ملے۔ غائبانہ تعارف تو ان کا ہو چکا تھا، البتہ حماد نے انہیں بتایا کہ انکل سعد بے ان کے والد شائل اندال کے آفیشل سیکریٹری ہیں، اور ان کے گھر کے فرد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

کمال کو محسوس ہوا جیسے سعد بے کچھ عجلت کا شکار تھا۔ اس نے وہاں زیادہ گفتگو سے اعتراض ہی برتا تھا۔

بہر طور یہ سب اس بڑی سی بھاری بھرکم مگر خاصی آرام دہ جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

سفر کے دوران ہی حماد نے سعد بے سے اپنے گھر والوں کی خیر خیریت کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا

تھا، اور سعد بے اسے انتہائی مختصر جوابات دے رہا تھا، یہاں تک کہ حماد نے ہی چپ سادھ لی۔ اسے بغداد کی سڑکوں پر جانے کیوں غیر معمولی سناٹا سا محسوس ہوا، اگرچہ رات کافی بیت چکی تھی لیکن پھر بھی اسے پہلے کے مقابلے میں یہ سب کچھ بدلا بدلا سا دکھائی دے رہا تھا، حتیٰ کہ بغداد شہر بھی... ایک نامعلوم سی خاموشی میں ڈوبا ہوا سا لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد گاڑی ایک پوش علاقے میں داخل ہوئی... اور اس کے ذرا ہی دیر بعد ایک بڑے سے قلعہ نما حویلی کے بلند و بالا چوبی گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

ہشت فروزاں سے بنی یہ قلعہ نما حویلی بلاشبہ قدیم و جدید تعمیر صناعی کا شاہکار نظر آتی تھی۔ حماد کے لیے تو اس میں کوئی نیا پن نہ تھا، مگر حویلی کے گرد بنی چہار دیواری... بہرحال اس کے لیے نئی تھی۔ البتہ ڈاکٹر کمال اور جینی کے لیے یہ سب کسی الف لیلوی محل سے کم نہیں تھا، ان دونوں کی آنکھوں سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔ جب وہ اندر پہنچے تو ان پر ایک سحر کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ پرانے وقتوں کے کسی بادشاہ کے محل میں آ گئے ہوں، یہاں آ کر کمال اور جینی کو حماد اندال کی حیثیت اور امارت کا اندازہ ہوا تھا کہ وہ کتنے بڑے گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ بلند و بالا در و بام، سنگ مرمر کے چکراتے زینے، دیباو حریر کے خوش نما و دیدہ زیب پردے۔ خوبصورت محرابیں، غلام گردشیں اور فرش پر بچھے نرم و گرم غالیچے، چھتوں پر جھولتے مور کے پنکھ کی طرح بڑے بڑے کرسٹل فانوس، اخروٹ کی لکڑی کا بنا ہوا دیدہ زیب و بیش قیمت فرنیچر۔ ایک نسبتاً بڑے ہال نما کمرے میں انہی دیواروں پہ خاندان کے پرکھوں کی رعونت آمیز اور رعب دار تصویریں بھی آویزاں نظر آئیں۔

یہ بڑی آرام دہ اور پرتعیش نشست گاہ تھی جو شاید بیک وقت مہمان خانے کا بھی منظر پیش کرتی تھی کیوں کہ اس کے ایک جانب بڑی بڑی محرابی چوکھٹوں والے دروازے بھی نظر آ رہے تھے۔ کچھ خدام اور خادمائیں بھی نظر آ رہی تھیں، جو کمال اور جینی کے ساتھ بڑے احترام سے پیش آ رہے تھے۔ ان دونوں کو وہاں بیٹھا دیا گیا اور حماد خود ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حماد اپنے گھر والوں سمیت دوبارہ ان کے پاس آ گیا۔ اس کے ہمراہ تین افراد تھے۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹی جوان بہن حبیبہ تھی، جو ایک معصوم صورت اور درمیانے قد کی خوب صورت دوشیزہ ہی نظر آتی تھی۔ بال شہد رنگ کے لمبے اور گھنے تھے۔ جسم صحت مند تھا۔ وہ رات کی مناسبت سے بھی اچھے ہی لباس میں تھی جو عراقی اور مغلیہ طرز امتزاج کا نمونہ نظر آتا تھا، جس میں کلاسک ٹچ نمایاں تھا، حماد کی ماں بھی ایک باوقار خاتون کے روپ میں تھی۔ شمائل اندال بھی کمال کو ایک پروقار اور سنجیدہ مزاج انسان کے روپ میں دکھائی دیے تھے، اخلاق کے بھی اچھے انسان ثابت ہوئے، ان سب نے ڈاکٹر کمال اور جینی کا بڑی محبت اور آداب میزبانی کے ساتھ استقبال کیا تھا۔ حبیبہ تو جینی سے مل کر بہت خوش ہوئی تھی۔ رات کافی ہو گئی تھی، اس لیے کچھ زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکا، تاہم اس کے باوجود کھانے پینے کا بندوبست کیا گیا تھا۔

چونکہ ان کے بھی حماد کے ساتھ آنے کی انہیں اطلاع تھی، اسی لیے ان کی رہائش وغیرہ کا بھی بندوبست پہلے ہی سے کیا جا چکا تھا۔ جینی کو تو حبیبہ اپنے ساتھ ہی زنان خانے میں لے گئی جبکہ کمال کے لیے مہمان گاہ میں ہی ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔

اگلی صبح ان سب نے ایک بڑی سی میز پر اکٹھے اور گھر کے فرد کی طرح ناشتا کیا، جو بہت پرتکلف تھا، ناشتے کی ٹیبل پر بہت سی باتیں بھی ہوتی رہیں، جو زیادہ تر پڑھائی وغیرہ سے متعلق تھیں، اس کے بعد حماد نے اپنے باپ سے عراق کی تازہ سیاسی صورت حال کا موضوع چھیڑا، جس پر پہلے انہوں نے کترانے کی کوشش چاہی مگر جب حماد نے انہیں کمال اور بالخصوص جینی کے بارے میں اعتماد میں لیا تو بے اختیار مسکرا کے انہوں نے پہلے کمال اور جینی کی طرف دیکھا پھر اپنے بیٹے حماد سے شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ”بیٹے! میں صرف تمہیں جانتا ہوں، اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری دوستی کی کسوٹی کس قدر سخت اور محتاط ہے اور تم خود بھی ایک ذمے دار انسان ہو، رہی بات تمہارے ان معزز دوستوں کی تو میری بات یہ دونوں بھی سمجھ چکے ہوں گے۔“ اتنا کہہ کر وہ چند ثانیوں کے لیے تھمے پھر بولے۔

”تم نے صحیح اندازہ لگایا بیٹا! افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ ہم نے ماضی سے سبق نہیں سیکھا، پھر اقتدار کا نشہ بھی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے وفاداروں کی تمیز کھو دیتا ہے، اب بھی یہی کچھ ہونے چلا ہے، اسرائیل کی آنکھ میں جو اسلامی ممالک شروع سے ہی کھٹکتے رہے ہیں ان میں عراق سرفہرست رہا ہے، اور امریکا اس کا ہمنوا رہا ہے، مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ خود ہماری صفوں میں میر صادق اور میر جعفر جیسے غدار گھسے بیٹھے ہیں، یہ وہ مار آستین ہیں جنہوں نے پہلے بھی

عراقی صدر کو بڑی بڑی بڑکیں مارنے پر اکسایا لہٰذا عراق نے کویت پر چڑھائی کردی۔ دنیا جنگ کے دہانے پہ آکھڑی ہوئی، دشمنان اسلام اسرائیل کو موقع ملا جو پہلے ہی عربوں کا جانی دشمن تھا، امریکا سمیت اپنے اتحادیوں کے ساتھ عراق پر چڑھ دوڑا۔

اب پھر وہی کھیل کھیلا جانے والا ہے، بلکہ ہمیں تو یہاں تک بھی خبر ملی ہے کہ دو عراقی جرنیل، سی آئی اے سے بھی مل چکے ہیں اور اسرائیل کی شہ پر امریکا عراق پر دو واضح الزام عائد کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ... بین الاقوامی قوانین کے برخلاف عراق کے پاس کیمیائی اور وسیع تباہی پھیلانے والا اسلحہ ہے۔ دوسرے یہ کہ عراقی عوام کو عراقی صدر کے ظلم و جبر سے نجات دلانا، جہاں گزشتہ پینتیس برسوں سے مسلسل انسانی حقوق پامال کیے جا رہے ہیں جبکہ عراق اور ایران کی دس سالہ جنگ میں ان ممنوعہ ہتھیاروں کے استعمال کی اجازت خود امریکا نے دی تھی۔ امریکا نہ صرف خاموش رہا بلکہ جو ممالک ان ہتھیاروں کے غیر قانونی استعمال پر چیخ رہے تھے، ان کے الزامات بھی مسترد کرتا رہا۔ گویا امریکا اس طرح کل عالم اسلامی پر اپنا فوجی قبضہ چاہتا ہے، ساتھ ہی خام تیل کے ذخائر پر قبضہ جمانا اور اسرائیل کے لیے بقا کی ضمانت اور اس کے تحفظ کو یقینی بنانا، نیز دریائے نیل سے دریائے فرات تک اسرائیل کی رسائی کرانا ہے۔ جبکہ اسلامی بیداری کا قلع قمع کرنا تو اس کا اہم منشور ہے۔''

''مگر عزیزم والد! عراقی صدر کے پاس بھی آپ جیسے وفاداروں کی کمی نہیں، کیا کبھی آپ لوگوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ آخر کیوں بار بار صیہونی سازشوں کا شکار ہو رہے ہیں۔''

حماد نے باپ سے کہا، ناشتا کیا جا چکا تھا اور یہ لوگ ایک کشادہ نشست گاہ میں آکر بیٹھ چکے تھے، بیٹے کی بات پر شمائل اندال کے چہرے پہ ایک غمناک سی بجھی بجھی مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر وہ اسی لہجے میں بولے۔ ''ہماری باتوں کو وہ خاطر میں لائے جب نا، بلکہ اب تو خود صدر صاحب کے وفادار بھی ان سے کنی کترانے لگے ہیں، شاید میری طرح انہوں نے بھی جنگ کے بادل منڈلاتے ہوئے دیکھ لیے ہیں۔''

''تو پھر اس کا مطلب ہے اگر خدانخواستہ ایسی ویسی بات ہوئی تو آپ کو بھی خطرہ ہے۔''

''اللہ نہ کرے عزیزی فرزند! لیکن اگر ایسا ہوا تو ہم بھی کب محفوظ ہیں۔'' حماد اندال کی ماں نے درمیان میں کہا۔

ڈاکٹر کمال اور جینی بڑے غور و فکر سے ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ ذہنی و نظریاتی ہم آہنگی کے باعث یہ ان کا بھی پسندیدہ موضوع تھا۔ کمال سے نہ رہا گیا، وہ بھی اس اہم گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ ''آخر ہر بار عراق کو ہی کیوں نشانہ بنایا جاتا ہے؟''

''اسرائیل کی وجہ سے، کیونکہ اسرائیل کو اس وقت فوری طور پر جس ملک سے اپنی سلامتی کا خطرہ ہے وہ عراق ہی ہے۔'' حماد اندال کی ماں ام کلثوم نے کہا۔ وہ عراق کے ایک غیور اور محب وطن سردار کی بیٹی تھیں، ان کے دل میں بھی اپنے وطن کا درد جوش مارنا فطری بات تھی، بولیں۔

''یہ ہماری تاریخ ہے کہ بغداد پہلی بار نہیں لٹا۔ 1285ء میں ہلاکو خان نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے پندرہ لاکھ مسلمانوں کو قتل کروا دیا۔ کتب خانے جلا دیے گئے اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ 1401ء میں بغداد نے پھر تیمور لنگ کی صورت میں اس عذاب کا سامنا کیا تھا۔ اور ایک صدی بعد 1508ء میں مغربی حکمران شاہ اسمٰعیل نے بغداد پر قابض ہو کر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔

1534ء میں عثمانی خلافت یہاں آئی تو مسلمانوں نے کچھ سکون کا سانس لیا لیکن 1622ء میں پھر ایرانی حکمران شاہ عباس اول نے اپنے پیش رو شاہ اسمٰعیل کی تاریخ دہرائی اور 1638ء میں خدا خدا کر کے سلطان مراد نے یہاں عثمانی خلافت قائم کی تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا مگر بچو! ہماری بدبختی یہ ہے کہ بغداد کو اپنوں سے زیادہ غیروں نے لوٹا۔ یہ لٹیرے بھی تو غیر ملکی نہیں ہیں۔ بغداد کے مضافات میں سے بھی یہاں لوٹ مار کرنے آتے ہیں۔ ہماری بداعمالیوں کی سزا ہے یہ۔ کاش! ہمارے حکمرانوں نے تاریخ سے ہی سبق سیکھا ہوتا اور مسلمان اپنی ہی تاریخ سے سبق سیکھ لیں۔'' ام کلثوم غمگین سی ہونے لگیں تو حماد نے موضوع سخن فوراً اپنی بہن حبیبہ کی شادی کی طرف موڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کے بولا۔

''بھئی اب جنگوں کی باتیں، جنگجو جانیں ہم تو اپنی پیاری سی بہنا کو دلہنیا کے روپ میں دیکھنے کی خواہش دل میں لیے اتنی دور سے آئے ہیں، اب ذرا اس سلسلے میں بھی گفتگو ہو جائے۔''

حبیبہ شرما کے اندر کمرے میں بھاگ گئی، سب اس کی اس روایتی معصوم ادا پر ہنس دیے تو ام کلثوم نے ہنستے ہوئے، جینی کو حبیبہ کے پیچھے جانے کا کہا۔ جینی تو پہلے ہی تیار تھی، یوں بھی ساری رات دونوں آپس میں یوں گھل مل کر باتیں کرتی رہی تھیں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی

ہوں، خلوص اور محبت کی یہی تو پہچان ہوتی ہے کہ غیر بھی اپنے سے لگتے ہیں۔ حبیبہ نے جینی کو شرماتے ہوئے اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں بھی بتایا تھا، جینی کو اس کے شرمانے کی یہ ادا بہت بھانے لگی تھی۔

بہرطور وہ دن ان تینوں دوستوں نے بغداد کی سیر سپاٹے میں گزارا، ملکی سیاسی حالات اور حماد کے باپ کے ذمے دار عہدے کے باعث ان کے ہمراہ دو مسلح گارڈز بھی تھے، جبکہ سعد بھی ان کے ساتھ تھا، انہوں نے میوزیم کی سیر کی، بازار دیکھے، یہ سب کمال اور بالخصوص جینی کو بڑا طلسماتی اور انتہائی سحر انگیز لگ رہا تھا۔ عراق کی فضا انہیں نیم صحرائی محسوس ہو رہی تھی۔

ان کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے حماد بھی پورے جوش وخروش کے ساتھ انہیں اپنے وطن کے بارے میں بتا رہا تھا۔ جس کے مطابق عراق کا قدیم نام جو یونانیوں نے اسے دیا تھا وہ ''میسو پوٹیمیا'' تھا جس کا مطلب دو دریاؤں (فرات اور دجلہ) کا شہر ہے۔

عراق ایشیا کا اہم عرب اور مسلمان ملک ہے، تیل کے ذخائر میں دنیا میں دوسرے نمبر پر اس کا شمار ہوتا ہے۔ اس کے جنوب میں کویت اور سعودی عرب، مغرب میں اردن، شمال مغرب میں شام، شمال میں ترکی اور مشرق میں ایران ہے۔ اسے ایک محدود سمندری رسائی بھی حاصل ہے جو خلیج فارس کے ساحل ام قصر میں ہے جو بصرہ سے قریب ہے، عراق دنیا کے قدیم ترین ممالک میں شامل ہے جس نے کئی تہذیبوں کو جنم دیا، فلسطین کی طرح اسے انبیا کی سرزمین کہا جاتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اس کے شہر ''قرنہ'' کو اپنا وطن بنایا تھا۔ عراق کا دارالحکومت بغداد ہے۔ جو اس کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کے علاوہ، کوفہ، بصرہ، کربلا، سامرا، موصل، کرکوک اس کے مشہور شہر ہیں۔ بابل، سمیری، اکادی اور اسیریا کی تہذیبیں اسی علاقے میں پروان چڑھیں اور فنا ہوئیں۔ مسلمانوں نے ساتویں صدی عیسوی میں یہ علاقہ فتح کیا تھا، مسلمانوں کے خلیفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس کے شہر ''کوفہ'' کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اس کے بعد عربوں نے اموی اور عباسی سلطنت کی صورت میں عراق پر حکومت کی۔ عباسیوں نے پہلی بار بغداد کو دارالحکومت بنایا۔ 1258ء عیسوی میں... منگولوں نے ہلاکو خان کی قیادت میں بغداد کو تاراج کیا۔

اس کے بعد یہ سولھویں صدی عیسوی میں عثمانی سلطنت کا حصہ بنا، جس کی یہ حیثیت جنگ عظیم اوّل تک برقرار رہی۔ جنگ عظیم اوّل کے دوران برطانیہ نے اس پر قبضہ کرلیا۔ بعد میں فرانس اور برطانیہ نے بندر بانٹ کر کے مشرق وسطیٰ کے حصے بخرے کر دیے۔ 1932ء میں انگریزوں نے اسے آزادی دی مگر عراق میں برطانیہ کے فوجی اڈے برقرار رہے اور اصل طاقت اسی کے پاس تھی جنگ عظیم دوم کے بعد امریکا کا اثر اس خطے میں بڑھنا شروع ہوا۔

14 جولائی، 1958ء میں بریگیڈیئر جنرل عبدالکریم قاسم اور کرنل عبدالسلام عارف کی قیادت میں عراقی فوج نے انقلاب برپا کیا اور عراقی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ انہوں نے عراق کو جمہوریہ قرار دیا اور معاہدہ بغداد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بریگیڈیئر جنرل عبدالکریم قاسم اور کرنل عبدالسلام عارف میں بعد میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ 1963ء میں ایک اور فوجی بغاوت میں بعث پارٹی نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اور کرنل عبدالسلام عارف کو صدر بنا دیا گیا۔ یہ وہی پارٹی تھی جس کے رکن صدام حسین بعد میں صدر بن گئے۔''

حماد خاموش ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر کمال اور جینی بہت انہماک سے اس کی بات سننے میں محو تھے۔ پھر وہ یونہی مسکرا کر ان سے بولا۔ ''میں بھی کیا لمبی چوڑی تاریخ لے کر بیٹھ گیا، تم بھی بور ہوئے۔''

''ہرگز نہیں۔'' ڈاکٹر کمال نے فوراً کہا۔ ''ہمیں حقائق سے آگاہی ہونی چاہیے، اس سے ایک مضبوط دلیل جنم لیتی ہے، ہم کسی کے ساتھ مدلل گفتگو تو کر سکتے ہیں کہ ہم محض لکیر کے فقیر نہیں ہیں بلکہ حقائق جان کر کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں، امریکا اور اسرائیل پوری دنیا میں کیا گل کھلاتے پھر رہے ہیں، دلیل کے ساتھ اس کی آگاہی لازماً ہونی چاہیے۔''

جینی نے بھی کمال کی بات سے اتفاق کیا، تاہم اس نے ایک تلخ نکتے کی طرف بھی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ایک بات اپنی جگہ مسلمہ ہے، تم دونوں روشن خیال ہو، شاید میری بات سے اتفاق کرو؟ ان ساری ریشہ دوانیوں میں اپنوں کی عاقبت نااندیشی کا بھی ضرور عمل دخل ہوتا ہے۔''

دونوں کو اس کی بات سے اتفاق کرنا پڑا تھا۔

حبیبہ کی شادی سے متعلق سارے انتظامات ہو چکے تھے۔ اس کے ہونے والے شوہر کا نام احمد حمادی تھا، اس کا باپ ایک تاجر تھا۔ ماں باپ کا اکلوتا تھا، بغداد کا ہی رہنے والا تھا۔ حماد نے اس سے بھی ان دونوں کو ملوایا، وہ بھی ان

سے مل کے خوش ہوا تھا۔ اچھا وجیہہ نوجوان تھا۔ اس کے باپ جمشید حمادی سے بھی ملاقات ہوئی، وہ ایک پچاس پچپن سالہ خوش اخلاق آدمی تھا مگر وہ بھی انہیں، حماد کے باپ شمائل کی طرح ملکی حالات پر کچھ فکرمند دکھائی دیا تھا۔

اس کی زبان پر بھی بار بار عراق کی تیرہ و تار ہوتی سیاسی فضا اور کسی بھی وقت بغاوت پھوٹ پڑنے کی باتیں تھیں، بلکہ وہ تو یہاں تک بھی کہہ رہا تھا کہ کسی بھی وقت امریکا اور اس کے اتحادی عراق پر چڑھ دوڑنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

یہی محسوس ہوتا تھا کہ اسی وجہ کے تحت، شادی کی تقریب کو سادگی سے نمٹانے کا فیصلہ کیا گیا تھا، یوں لگتا تھا جیسے یہ دونوں خاندان جلد سے جلد اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہوں۔

شادی کی تقریب میں ابھی دو روز باقی تھے، جب متوقع ہنگامی حالات نے اچانک سر اٹھالیا۔

امریکا نے عراق کے تمام فضائی راستے بند کردیے۔

جس وقت کمال اور جینی حماد کے حویلی نما گھر میں تھے، آدھی رات کو سعد بے کی اچانک آمد نے سب کو پریشان کر ڈالا۔ اس نے حماد کے باپ شمائل کو بغاوت پھوٹنے کی تشویشناک اطلاع سے آگاہ کیا نیز مشورہ بھی دیا کہ اسی وقت وہ اپنے خاندان سمیت اس قلعہ نما حویلی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائے۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد کوچ جن کپتان پریمانن سے انٹرکام پہ بات کر رہا تھا، اس کے فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ عابد شکھری اور نائمہ اس کے کمپارٹمنٹ میں موجود تھے، اور دونوں اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اس ایٹمی آبدوز کو تباہ کرنے کا پختہ عزم کیے ہوئے تھے۔ وہ دونوں ایک گوشے میں دبکے بیٹھے، موقع کے منتظر تھے اور اس کی وہ گفتگو بھی بہ غور سن رہے تھے جو وہ اس وقت آبدوز کے کپتان پریمانن سے کر رہا تھا۔

''تو......تو......سر! میں اس کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا۔ ان دونوں (عابد اور نائمہ) پر بغیر کوئی ہتھیار چلائے پکڑنا ہوگا، آبدوز کے اندر کسی قسم کی معمولی آتش گیری بھی اسے فنا کر ڈالے گی۔''

''میری کوشش یہی ہوگی، جن!'' بزر میں کپتان پریمانن کی بھاری آواز ابھری تھی۔

''مگر مجھ میں نہیں آتا کہ تم نے یہ سارا اوپن سسٹم اسقدر highly کیوں کر رکھا ہے؟''

''کیپٹن! یہ آبدوز ہی نہیں بلکہ ایک چلتا پھرتا ایٹمی ری ایکٹر بھی ہے۔'' کوچ جن جوابا بولا۔

''ہم کافی عرصے سے سمندر گردی میں معروف ہیں، اس سارے سسٹم کو ری کولنگ کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، اگرچہ میں نے اس کا بھی خاطر خواہ بندوبست کر رکھا ہے لیکن، ایک معمولی خرابی کے باعث۔'' وہ کیپٹن کو اس خرابی سے متعلق بتانے لگا، جسے عابد بھی غور سے سن رہا تھا۔

''اوکے۔اوکے۔''

بزر میں پریمانن کی مفاہمانہ آواز ابھری۔

''تم ایسی ہدایات کے مجاز ہو جن! تم بھی محتاط رہو، ہم جلد ان دونوں گھس بیٹھیوں کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

ادھر عابد کے دل و دماغ میں زبردست ہلچل مچی ہوئی تھی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے کوچ جن نے کپتان پریمانن سے جس معمولی خرابی کا ذکر کیا تھا، عابد اس کے محرکات پر غور کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اس معمولی خرابی کو ''خاص'' بنادے، جسے بنانا اس کے لیے کیا بلکہ ایک عام آدمی کے لیے بھی مشکل نہ تھا، تو یقیناً یہ اسرائیلی آبدوز چشم زدن میں جہنم کا نمونہ بن جائے گی مگر عابد اور نائمہ بھی اس میں بھسم ہونے سے نہیں بچ سکتے تھے، اور عابد انہی عوامل پر غور کر رہا تھا کہ، کچھ ایسا ہو کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

''خبردار! اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت، ورنہ بھیجا اڑا دوں گا تمہارا۔''

دفعتاً عابد کی سماعت سے ایک سانپ کی طرح پھنکارتی آواز ٹکرائی اور ساتھ ہی ایک سرد نال بھی اس کی کنپٹی سے آن لگی تھی۔

☆☆☆

بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ اس آواز کو سن کر نائمہ ہی نہیں بلکہ عابد جیسا آہنی اعصاب کا مالک شخص بھی ایک لمحے کو لرز گیا۔ غالباً یہ وہی آدمی تھا، جو ذرا دیر پہلے والٹ نمبر 3 کے silos میں پمپ چلا رہا تھا۔ اور جسے کوچ جن نے دروازہ بند کرنے کے لیے کہا تھا، پتا نہیں کس طرح لوٹتے وقت اس کی نظر ان دونوں پر پڑی تھی۔

''شیر! ادھر آؤ۔'' ساتھ ہی وہ حلق پھاڑ کے چلایا بھی تھا۔

ٹھیک اسی وقت نائمہ نے، جو اس دوران غیر محسوس انداز میں بیٹھے بیٹھے ہی کچھ اس پوزیشن میں ہوگئی تھی کہ اس کی ٹانگ جب حرکت میں آئی تو وہ سیدھی اس آدمی کی

ٹانگوں کے بیچ میں پڑی، ضرب زوردار تھی جس کے باعث وہ آدمی درد سے دہرا ہوا اور تب عابد نے بھی حرکت میں آنے میں دیر نہیں لگائی، اس کا ہاتھ اس کے پستول والے ہاتھ پر پڑا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو نائمہ ہرگز ایسا خطرناک رسک نہیں لیتی، کیونکہ اس شخص نے اپنے پستول کی نال عابد کی کنپٹی سے لگا رکھی تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ وہ اس ضرب کے ساتھ ہی غصے میں لبلبی دبا دیتا، لیکن ذرا دیر پہلے ہونے والی ان لوگوں کی گفتگو سے انہیں بھی اندازہ ہو چکا تھا کہ کم از کم اس ''والٹ'' میں گولی چلانا کس قدر سنگین اور خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

عابد کا ہاتھ لگتے ہی اس آدمی کا پستول چھوٹ گیا، نائمہ کے ''بگ ٹو'' والے مخصوص جوتے کی ضرب نے اس آدمی کو شاید ''اندر'' تک توڑ کے رکھ ڈالا تھا، عابد کے دوسرے گھونسے نے اسے والٹ کی دیوار سے ٹکرا کے فرش بوس کر ڈالا تھا، اس ''گھڑبڑ'' پر جب تک کوچ جن اور اس کے باقی دو ساتھی سنبھلتے، عابد ان کے جہنم واصل ساتھیوں سے حاصل کی ہوئی گن ان پر تان چکا تھا، ان تینوں کو جیسے یکلخت سانپ سونگھ گیا تھا۔

اسی دوران عابد پر یہ عقدہ بھی کھلا کہ اس کے پاؤں کے نشان دروازے سے یہاں تک چلے آرہے تھے، جو انہی کے ساتھیوں کی لاشوں کے خون سے لت پت تھے، جس سے پہلے والے آدمی کو ان کی یہاں موجودگی کا پتا چلا تھا۔

''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے، ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔''

عابد نے ان تینوں دم بہ خود کھڑے اسرائیلیوں سے خوں خوار لہجے میں کہا۔ تو کوچ جن بڑی زہریلی نظروں سے اس کی طرف گھورتے ہوئے بھیڑیے جیسی غراہٹ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''انجام تو تمہارا بھی بڑا بھیانک ہوگا، بہتر یہی ہے کہ۔''

اس کی آواز درمیان میں ہی دب گئی۔ کیونکہ اسی لمحے عابد کی ٹانگ تیزی سے حرکت میں آئی تھی اور کوچ جن کراہ نما آواز کے ساتھ چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا تھا اور عقب میں بنے پینل بورڈ سے جا ٹکرایا تھا۔ عابد کی لات اس کے سینے پر لگی تھی۔

''کتے! اب اگر تو نے فضول بکواس کی تو گولیوں سے بھون کر رکھ دوں گا۔'' عابد نے دہشت جنون خیز لہجے میں اسے گھور کر کہا۔ ''فقط، اتنا سن لے کہ ہم اس وقت اپنے سر سے کفن باندھے ہوئے ہیں، اب اگر میری مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو میں اس آبدوز کو جہنم کا نمونہ بنا دوں گا۔''

عابد کے لہجے کی قطعیت کمن گرج نے کوچ جن سمیت اس کے دونوں ساتھیوں کو اچھی طرح یہ باور کرا دیا تھا کہ معاملہ ان کی سوچ سے بھی زیادہ سنگین تھا۔ یہی سبب تھا کہ اب ان کے بشروں سے ٹپکتی غیظ و نفرت، گہری تشویش میں بدل چکی تھی۔ اس دوران نائمہ نے بڑی پھرتی کے ساتھ ان کے ساتھی کا گرا ہوا پستول اچک لیا تھا۔

''تت۔ تم کیا چاہتے ہو؟'' بالآخر کوچ جن کو سنبھلتے ہوئے کہنا پڑا تو عابد زہرخند مسکراہٹ سے بولا۔

''گڈ! ایسا ہی چلنا چاہیے۔'' اس کا بے پروا انداز ان پر یہ نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے کافی تھا کہ انہیں واقعی اپنی جانوں کی پروا نہ تھی۔

''اسی وقت کیپٹن سے بات کرو اور اس سے کہو کہ آبدوز کو سمندر کی تہ میں لے جانے کا حکم صادر کرے اور ہمارے خلاف کسی بھی قسم کے کمانڈو ایکشن کا خیال تک اپنے دل میں نہ لائے۔ جسٹ، ڈو اٹ ناؤ۔''

عابد نے اس سے تحکمانہ کہا۔ کوچ جن نے فوراً اس کی تعمیل کی۔ انٹرکام پر اس نے کیپٹن پریمانن سے بات کی اور نہایت مختصر انداز میں اسے پہلے یہاں کی ''صورت حال'' اور پھر عابد کے حکم کے متعلق بتا دیا۔ کیپٹن پریمانن نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ نیز اس نے کوچ جن سے کہا کہ وہ خود عابد سے بات کرنا چاہتا ہے۔

کوچ جن نے اس کی بات عابد کے سامنے دہرا دی اور ساتھ ہی انٹرکام کا مائک اور اسپیکر بھی وائڈ کر دیا۔

''میں کیپٹن پریمانن، تم سے مخاطب ہوں۔ یقینی طور پر تمہارا تعلق فلسطینی حریت پسندوں سے ہو سکتا ہے۔ مگر یہاں اس قسم کی کسی سرفروشی کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہاری کسی قسم کی مہم جوئی، آبدوز میں گھسے بیٹھے تمہارے دوسرے ساتھیوں کے لیے بھی موت کا سبب بن جائے گی، بہتر یہی ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سمیت سرنڈر کر دو۔''

کیپٹن پریمانن کی آواز نخوت آمیز رعونت سے بھرپور تھی، ساتھ ہی اس کے لہجے سے غرور اور طاقت کا گھمنڈ بھی مترشح تھا۔ وہ یہی سمجھے ہوئے تھا کہ عابد کے اور ساتھی بھی اس آبدوز میں گھس آئے تھے اور مزید یہ کہ عابد کم از کم اپنے ساتھیوں کی موت کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

''کیپٹن پریمانن! کسی زعم اور بھول میں مت رہنا، اگر جنگ چاہتے ہو تو یہی سہی، ہم تیار ہیں، لیکن اس

جنگ کا نتیجہ صرف تمہاری بربادی ہی نکلے گا، ہم تو یوں بھی سر سے کفن باندھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ہمارے لیے پھر بھی یہ سودا گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا، مگر جنگ کرنے سے پہلے یہ یاد رکھنا، میں اور اس آبدوز میں موجود میرے ساتھی تمہارے اس چلتے پھرتے ایٹمی ری ایکٹر کے لیے بم ثابت ہو سکتے ہیں۔'' اپنے خیالی ساتھیوں کا اس نے بھی حوالہ جاری رکھنا ضروری سمجھا تھا، ظاہر ہے، پریمانن یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اس اسرائیل کی اس اہم ترین آبدوز میں داخل ہونا معمولی بات نہیں تھی اور نہ ہی ایسی مضبوط اور مربوط پلاننگ اکیلے انسان کے بس کی بات ہو سکتی تھی۔ اب یہ انہیں کیا پتا تھا کہ عابد اور نائمہ کس طرح نادانستگی اور حادثاتی طور پر اس میں داخل ہوئے تھے۔

آگوسٹا 291 کے کیپٹن پریمانن اور عابد شیکھری کے درمیان یہ ڈائیلاگ جاری تھے اور کوچ جن کے چہرے سے تشویش فزوں تر ہوتی دکھائی دے رہی تھی، اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک طرف کیپٹن پریمانن کی گفتگو سے خوف کھا رہا تھا اور دوسری طرف اسے عابد کے پختہ عزائم کا بھی اچھی طرح اندازہ ہو رہا تھا۔

''آفیسر کوچ جن! تم نے ان کی کسی گیدڑ بھبکی میں نہیں آنا ہے۔'' دفعتاً کیپٹن پریمانن کی دوبارہ آواز ابھری۔ ''تم جانتے ہو نا کہ یہ آبدوز ہمارے ملک و قوم کا کتنا قیمتی سرمایہ ہے۔ خبردار! چاہے تمہیں جان سے ہی کیوں نہ جانا پڑے، مگر اس کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا، میں ابھی کمانڈوز روانہ کرتا ہوں۔''

''کیپٹن! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' معاً کوچ جن تقریباً چلا کر بولا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ پریمانن سے کہنا چاہ رہا ہو کہ ''کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ یا تمہاری عقل گھاس چرنے گئی ہے۔''

''ان کے عزائم بہت خطرناک ہیں، والٹ میں بار بار silos کے پمپ چلانے کی ضرورت پڑتی ہے، ورنہ نائٹرک ایسڈ بننے کا خطرہ بڑھ جائے گا اور...''

''یو فول!'' کیپٹن پریمانن کی غصیلی آواز ابھری۔ ''اپنی کسی کمزوری کا اظہار مت کرو اور ان کی کوئی بات نہیں ماننی ہے تمہیں۔ اس عظیم آبدوز کو میں ان کے لیے چوہے دان بنا دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

کیپٹن پریمانن عابد کی سوچ سے بڑھ کے نہایت چالاک اور مکار ثابت ہوا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ عابد دامن بچا کے اپنا مشن پورا کرنے کا قائل تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹنے پائے، اس کی وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو، یہ اس کا اپنا نظریہ تھا۔

یہی سبب تھا کہ اندر سے وہ کچھ تشویش کا شکار بھی ہوا تھا، مگر اس کا اظہار کیے بغیر وہ زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ کوچ جن سے بولا۔

''تمہارا یہ سرپھرا کیپٹن، نہ صرف تم سب کو مروائے گا بلکہ اس آبدوز کو بھی ہمارے ہاتھوں بھسم کروا کے دم لے گا۔''

''دیکھو! مذاکرات ہوتے رہیں گے، میں ابھی نائب کپتان پیٹر نوت سے بات کرنے اور اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' کوچ جن نے عابد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت silos میں پمپ چلانے کی ازحد ضرورت ہے، ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔''

''پہلے نائب کیپٹن سے بات کرو، پھر اس کے بارے میں سوچیں گے۔'' عابد نے گمبھیر لہجے میں اس سے کہا۔

''تم سمجھتے کیوں نہیں ہو آخر۔ اگر پمپ...''

''شٹ اپ!'' عابد حلق کے بل دھاڑا۔ ''جسٹ، ڈو اٹ، واٹ آئی سے یو؟''

کوچ جن کی پیشانی عرق آلود ہونے لگی تھی۔ بولا۔ ''او کے۔ او کے۔ پھر کم از کم مجھے ایٹمی ری ایکٹر بند کرنے دو، تاکہ مذاکرات کے دوران دھیرے دھیرے خطرے کی طرف تو نہ بڑھ پائیں۔''

اس کی بات پر ایک بار پھر عابد اس سے کوئی درشت بات کرنے والا تھا کہ اچانک اس کے قریب، محتاط کھڑی نائمہ نے مداخلت کی، موجودہ صورتِ حال کو دھیرے دھیرے خطرے کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر، ایسے میں اس کا ذہن بھی اتار چڑھاؤ کا شکار تھا۔ وہ کوچ جن کی طرف دیکھتے ہوئے پرسوچ انداز میں اپنی بھویں سکیڑ کر اس سے بولی۔

''یہ بہتر رہے گا۔ مگر ایٹمی ری ایکٹر کا آن آف سسٹم کدھر ہے؟ ہم تمہیں باہر تو بالکل نہیں نکلنے دیں گے۔''

''ری ایکٹر کا ''والو'' نیچے ہے، جو ایک مخصوص آلے کی مدد سے کھلتا ہے۔'' وہ بولا۔ لخت بہ لخت کوچ جن کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی، شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک ویپن آفیسر تھا اور ''بارود'' کب اپنے لیے خطرناک ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ ایک ''اسکل پروفیشنل'' کے ماسوائے کوئی نہیں لگا سکتا اور وہ ایک ایسا ہی آدمی تھا۔

''وہ آلہ کدھر ہے؟ ممکن ہے مجھے تمہارے ساتھ جانا پڑے۔'' نائمہ بولی، عابد کو اپنی ساتھی کی بات پر کھٹک ہوگی

اس نے نائمہ سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر نائمہ نے ایک غیر محسوس اشارے سے اسے خاموش رہنے پہ مجبور کر دیا۔

''وہ آلہ میرے پاس ہی ہے یہاں۔'' کوچ جن عجلت میں بولا۔

''نکالو۔'' نائمہ بولی۔ کوچ جن پر بدحواسی طاری تھی، اس نے حرکت کی، مگر عابد اسے گن پوائنٹ پر لیے ہوئے تھا کہ کہیں وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کرے۔ وہ آلہ یعنی ''کریک'' ایک قیمہ بنانے والی مشین سے مشابہ تھا۔ جسے کوچ جن نے ایک فرشی کیبنٹ کا ڈھکن اوپر اٹھا کر باہر نکالا تھا۔ قریب اس کے ایک ہیمر بھی رکھا تھا، وہ بھی اس نے نکال لیا تھا۔ نائمہ نے آگے بڑھ کر یہ دونوں چیزیں اس کے ہاتھوں سے اچک لیں، کوچ جن عجیب سی حیرت کے ساتھ نائمہ کو تکنے لگا، جبکہ عابد کے چہرے سے معنی خیز مسکراہٹ مترشح تھی، وہ شاید نائمہ کی اس حرکت کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہی ہوا، نائمہ نے اسی ہیمر کی مدد سے ایٹمی ری ایکٹر کو بند کرنے والا ''کریک'' توڑ ڈالا۔ یہ دیکھ کر کوچ جن کی آنکھوں میں یکا یک خوف دہراس اتر آیا۔ اور وہ پاگلوں کی طرح چلا کر اس سے بولا۔ ''بے وقوف لڑکی! یہ تم نے کیا غضب کر دیا؟ کریک توڑ دیا، اف۔ اب ہم سب کو بھیانک موت سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

''ہم بھی یہی چاہتے تھے، تمہارے اس گھمنڈی کیپٹن پریمانن کو پتا چلنا چاہیے کہ ہم گیدڑ بھبکیاں دینے والوں میں سے نہیں ہیں۔'' عابد ایک جوش تلے لہجے میں کوچ جن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''بتادو اب اپنے کیپٹن کو کہ کیا اب بھی وہ ہماری بات نہیں مانے گا؟'' نائمہ نے بھی جوش سے تمتماتے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

کوچ جن کی ہی نہیں اس کے ساتھ کھڑے دو ساتھیوں کی بھی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف تکے جا رہے تھے۔

''دد... دیکھو! اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔'' کوچ جن ہکلایا۔ ''مم... میں اب بھی سب سنبھال سکتا ہوں۔ اگر... اگر تم... میرے ایک ساتھی کو silos کا پمپ چلانے کی اجازت...''

''تم محض وقت ہی ضائع کر رہے ہو کوچ!'' عابد نے اس کی بات کاٹی۔

ٹھیک اسی وقت کمرے میں تیز سیٹی کی آواز گونجی۔

''مائی گاڈ! سی ی... یہ... خطرے کا الارم ہے۔ تت۔ تم۔ پاگل ہو گئے ہو۔ مم۔ میں۔ ابھی بات کرتا ہوں۔'' کوچ جن لرزتی آواز میں بولا۔ اس کے بعد اس نے انٹرکام پر نائب کیپٹن پیٹر نوت سے بات کی اور فرفر اسے ساری صورت حال کے بارے میں بتا دیا، ساتھ ہی اسے کیپٹن پریمانن کی ہٹ دھرمی سے بھی آگاہ کر دیا۔

''سنو! ہم سب سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فنا ہو جائیں گے۔'' معاً وائنڈ اسپیکر پر نائب پیٹر نوت کی آواز ابھری۔ وہ عابد اور نائمہ سے مخاطب تھا۔

''ہمیں بات کرنے کا موقع تو دو، تمہارے جو بھی مطالبے ہیں ہم مان بھی سکتے ہیں۔ ڈائمنڈ آفر بھی ہو سکتی ہے، تم لوگ بس۔ پمپ چلتا رہنے دو۔''

''مسٹر نوت! بہتر یہی ہوگا کہ پہلے تم اپنے اس گھمنڈی کیپٹن پریمانن کو سمجھاؤ، جو ہمارے خلاف کمانڈو آپریشن کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔'' عابد نے کہا۔

پھر شاید نوت نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور تیزی سے بولا۔ ''میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔''

ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھلا۔ پانچ، چھ مسلح اسرائیلی وردی پوش کمانڈوز اندر در آئے۔ جبکہ دھماکے کی آواز سنتے ہی عابد بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نائمہ کو لے کر ایک آہنی ٹیبل کی آڑ میں چلا گیا تھا اور وہیں سے سنبھل کر اس نے اپنی گن کا رخ دروازے کی طرف موڑ لیا تھا۔ اور جیسے ہی اسے مسلح درانداز دکھائی دیے، عابد نے کسی بات کی پروا کیے بغیر ٹریگر دبا دیا۔ کوچ جن کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور دو پہلے اندر داخل ہونے والے اسرائیلی کمانڈو لقمۂ اجل بنے۔ کمرے میں خطرے کا الارم بجانے والی سیٹی بہ دستور سمع خراش آواز میں گونج رہی تھی۔ گولیاں چلنے کی وجہ سے کمرے میں بارود کی ناگوار سی بو پھیلنا شروع ہو گئی۔

اپنے دو ساتھیوں کا چشم زدن میں یہ انجام دیکھ کر باقیوں نے دائیں بائیں پناہ لینے کی کوشش چاہی تھی۔ عابد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسا کمانڈو ایکشن تھا؟ جبکہ وہ بھی سمجھے ہوئے تھا کہ مذاکرات کی آڑ میں ان پر چھپ کر وار کیا جائے گا، مگر شاید اپنی ''عظیم'' ایٹمی آبدوز کو ناقابل تسخیر سمجھنے والا گھمنڈی کیپٹن پریمانن اپنی اس ہزیمت کی پردہ پوشی کرنا چاہتا تھا، کیونکہ بالکل غیر متوقع طور پر عابد اور نائمہ کا آگوستا میں در آنا اس کے لیے کیا بلکہ آبدوز میں موجود

ہر اس یہودی کے لیے انتہائی سبکی کا ہی باعث تھا، جنہیں خود پہ ''عظیم قوم'' ہونے کا گھمنڈ سوار تھا کہ وہ اپنے برے بھلے کی تمیز بھی کھو چکے تھے اور تلملا کر انہوں نے ''ڈائریکٹ ایکشن'' پلان کر ڈالا تھا۔

عابد نے بھی خود کو پہلے ہی سے اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رکھا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ پہلے ہی ''ہلے'' میں دو کو ڈھیر کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا، جبکہ کوچ جن چیخ چیخ کر اپنے کمانڈوز کو ایسا حملہ کرنے سے روکنے کی کوشش کر رہا تھا، عابد اور نائمہ کے لیے تو یہ سب ''آر یا پار'' کے مترادف تھا، لہٰذا عابد نے اسی طرف اپنی گن کا رخ کیا جدھر اسرائیلی کمانڈوز آڑ لینے کی جستجو میں تھے، عابد کی گن نے ایک اور برسٹ اگلا۔ والٹ کی دیواروں سے ان گنت چنگاریاں پھوٹی تھیں۔ بدقسمتی سے نشانہ خطا گیا تھا، اس بار کوئی اسرائیلی اس کے چلائے ہوئے برسٹ کا شکار نہیں ہوا تھا۔ والٹ میں یکلخت دم بخود سی خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ایک دھڑکتا ہوا سناٹا تھا، جو کسی چھپے ہوئے طوفان کی طرف اشارہ دیتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

اسی وقت کمرے میں گھمنڈی کیپٹن پریمانن کی ہزیانی آواز ابھری۔ ''تم لوگ بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، اب بھی وقت ہے، سرنڈر کر دو۔ ورنہ بھیانک موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''کیپٹن!'' اسی لمحے کوچ جن کی جنون سے مغلوب آواز ابھری۔ ''یہ یہ تم نے بہت غلط کیا ہے۔ اس کا خمیازہ ہم سب کو بھگتنا پڑے گا۔ تم اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہے ہو۔ تمہیں نہیں معلوم ان لوگوں نے ایٹمی ری ایکٹر بند کرنے والا کریک توڑ ڈالا ہے۔''

''جنگی چالوں کو تم سے زیادہ میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کوچ!'' وائڈ اسپیکر پر پریمانن کی مغرور آواز ابھری تھی۔ ''اب تم اپنا کام شروع کر دو۔ میں دشمنوں کو اپنی جگہ محدود کر چکا ہوں۔''

اور تب ہی کوچ کا ایک ساتھی تیزی سے حرکت میں آیا، جبکہ عابد کو مکار پریمانن کی یہ چال سمجھنے میں چنداں دیر نہیں لگی تھی، اس نے نہایت پھرتی کے ساتھ مذکورہ آدمی کو اپنی گن سے نشانہ بنانا چاہا تھا کہ ایک طرف پوزیشن سنبھالے ہوئے کمانڈو نے بڑی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ اپنی گن سے تاک کر نشانہ لیتے ہوئے ''سنگل شاٹ'' کھیلا اور دوسرے ہی لمحے گن اس کے ہاتھوں سے نکلتی چلی گئی۔ اسی وقت نائمہ نے اپنے پستول سے والٹ کی طرف بڑھتے ہوئے اس آدمی کا نشانہ لینا چاہا مگر اسی وقت عابد کے ذہن طباع میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا، اس نے نائمہ کا پستول والا ہاتھ نہ صرف فوراً نیچے کر دیا بلکہ اس کے ہاتھ سے لے کر پستول خود پکڑ لیا۔ ادھر وہ آدمی silos کے پاس پہنچ چکا تھا اور پمپ چلانے کی تیاری کرنے لگا، تو عابد کو پورا یقین تھا کہ وہ اس ''سنگل شاٹ'' کھیلنے والے کو بڑی کامیابی کے ساتھ ''بلف'' کرے گا اور وہی ہوا، سنگل شاٹ والا کمانڈو یہی سمجھا تھا کہ اب ان کے پاس اسلحہ نہیں رہا، کیونکہ اگر ہوتا تو وہ ضرور اس پمپ چلانے والے آدمی کو نشانہ بنانے کی کوشش کرتے، جیسا کہ وہ دیکھ چکا تھا اور اس نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی تھی۔ یوں وہ عابد کی بروقت بیدار مغزی کی ٹرک میں آ گیا اور دھڑلے دار اپنی ہیوی گن سنبھالے اس کی طرف لپکا تو عابد، جو دھڑکتے دل کے ساتھ اسی موقع کا منتظر تھا، بڑے آرام سے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ وہ تیورا کر ان کے اوپر ہی آ رہا، اپنی مہم جوئی کے جوش تلے وہ ان کے خاصے قریب پہنچ گیا تھا۔

عابد اور نائمہ کے لیے سنگین ہوتی صورت حال کی اس کایا کلپ نے ایسی ''تگڈم'' پیدا کی کہ دوسرے ہی لمحے اس جہنم واصل اسرائیلی کی ہیوی مشین گن، عابد کے ہاتھوں میں آ چکی تھی، ورنہ محض ایک پستول سے ان لڑاکا کمانڈوز کا مقابلہ کرنا ان کے لیے مشکل ہی ثابت ہو سکتا تھا۔

پستول دوبارہ نائمہ کو تھما کر اس نے اسے مخصوص اشارہ کیا، نائمہ نے تاک کر اس آدمی کا نشانہ لیا ہی تھا کہ، دوسرے ہی لمحے silos کے قریب کھڑا وہ آدمی ایک لرزا دینے والی چیخ کے ساتھ فرش پر گرا۔ silos کے چیمبر سے نارنجی رنگ کی گیس، دھوئیں کی صورت میں خارج ہونا شروع ہو گئی تھی۔ سب کی پھٹی پھٹی آنکھیں اس آدمی پر جم گئیں۔ وہ فرش پہ گر کر بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کے منہ سے نیلے رنگ کے جھاگ بہنے لگے تھے۔

اسی وقت ویپن آفیسر کوچ جن کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ''او، مائی گاڈ! کیا نائٹرک ڈائی آکسائڈ بننے کا عمل شروع ہو گیا؟ اب کوئی نہیں بچے گا، سب کچھ برباد ہو جائے گا۔ ہم سب اس زہریلی نیورو گیس کا شکار ہونے والے ہیں۔ یہ عظیم آبدوز، اب ہم سب کی قبر بننے والی ہے۔ آہ! دشمنوں نے بڑا کاری وار کر ڈالا۔''

جاری ہے



حسین اتفاقات

ارم واحد بٹ

بہ ظاہر بعض لوگ اپنی تقدیر کو خود ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ درحقیقت وہ اپنی زندگی سدھارنے کے لیے کسی نہ کسی کے خلاف سازشوں کا تانا بانا بُن رہے ہوتے ہیں... بالکل ایسے ہی واقعات کسی کی زندگی میں بھی رونما ہوئے جنہیں اس نے حسین اتفاقات کا نام دے کر خود کو ہر الزام سے بخوبی بچالیا لیکن... تاڑنے والے بھی قیامت کی نگاہ رکھتے تھے، وہ خود بھی کسی قیامت سے کم نہ تھی اور اس کی گہری آنکھوں نے سطح آب سے تہ آب کا منظر واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔

دام فریب میں مبتلا کرنے والے ایک ساحر کی کارفرمائیاں

روتھ جب بھی گزشتہ تین سالوں پر نگاہ ڈالتی۔ تو اسی نتیجے پر پہنچتی کہ یقیناً میکس نے یہ سب کچھ بہت سوچ کر کیا تھا۔ شاید ان کی پہلی ملاقات سے بھی پہلے...... وہ دونوں اتفاقاً ایک دوسرے سے ملے تھے یا یوں کہا جائے کہ ٹکرائے تھے۔ کم از کم روتھ تو ایسا ہی سمجھتی تھی اور میکس کے ساتھ بھی انصاف کیا جائے تو اس روز وہ نہیں بلکہ ان کی کشتیاں آپس میں ٹکرائی تھیں۔

سی ارچن نامی کشتی آہستہ آہستہ قریبی ساحل پر لنگر

انداز ہونے جاری تھی۔ شام کا دھندلکا چھانے لگا تھا، جب دونوں کشتیوں کے اگلے حصے آپس میں ہلکے سے ٹکرائے۔ دونوں کے کپتان تیزی سے لپکے تاکہ دیکھ سکیں کہ نقصان زیادہ تو نہیں ہوا مگر چونکہ دونوں کشتیوں ہی کے اطراف میں بڑے بڑے ٹائر نما لائف بوائے لگے ہوئے تھے اس لیے دونوں ہی نقصان سے محفوظ رہی تھیں۔ اسکاٹش بیل نامی دوسری کشتی کے کپتان نے دوسرے کپتان کو مزاحیہ انداز میں سیلیوٹ کیا اور کشتی کے زیریں کیبن میں چلا گیا۔ میکس کشتی کے عرشے پر سامنے بیٹھ کر اطمینان سے کتاب میں مشغول ہو گیا۔ اس اثنا میں اسکاٹش بیل کا کپتان عرشے پر لوٹ آیا۔ اس نے وہی مزاحیہ سیلیوٹ دوبارہ کیا تو میکس نے کتاب نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''گڈ ایوننگ جناب! آج تو ہماری ٹکر ہو گئی۔'' دوسرے کپتان نے اپنا وھسکی کا گلاس ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔

''مگر شکر ہے کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

میکس اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ ''میرا نام میکس بینٹ ہے۔''

''اینگس ہینڈرسن......'' عمر رسیدہ کپتان نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ یہیں کے رہنے والے ہیں اینگس؟'' میکس نے رسماً پوچھا۔

''نہیں۔'' اینگس نے جواب دیا۔ ''میں اور میری بیوی جرسی میں رہتے ہیں مگر ہمارے جڑواں بیٹے یہاں جنوبی ساحلی پٹی پر واقع ایک اسکول میں پڑھتے ہیں۔ اس لیے ہم کشتی کے ذریعے ہر تین چار ماہ بعد یہاں آتے ہیں۔ بیٹوں کی اسکول کی ٹرم ختم ہوتی ہے تو ہم انہیں چھٹیوں میں گھمانے لے جاتے ہیں۔ اور تم؟ کیا تم برائٹن میں رہتے ہو؟''

''نہیں میں لندن میں رہتا ہوں مگر جب بھی ویک اینڈ پر وقت ملتا ہے تو یہاں چلا آتا ہوں، کشتی رانی کے لیے۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ اسی دوران میں ایک عورت کشتی کے زیریں کیبن سے برآمد ہوئی۔ اینگس مڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

''روتھ! یہ میکس بینٹ ہے۔ ہماری کشتیاں آپس میں ٹکرا گئی تھیں۔''

میکس نے مسکرا کر عورت کی جانب دیکھا۔ وہ اینگس کی بیوی کم اور بیٹی زیادہ لگتی تھی۔ دونوں کی عمروں میں کم از کم بیس برس کا فرق تھا۔ گو کہ وہ زیادہ حسین نہ تھی مگر پرکشش ضرور تھی۔ مختصر لباس میں چھریرا مگر سڈول جسم۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ روزانہ باقاعدگی سے ورزش کرتی ہوگی۔ اس نے میکس کو دیکھا اور شرمیلے انداز سے مسکرائی۔

اینگس بولا۔ ''کیا آپ ہمارے ساتھ ایک ڈرنک پینا پسند کریں گے؟''

''ضرور، شکریہ۔'' میکس یہ کہہ کر دوسری کشتی میں جو کہ کافی بڑی تھی، چھلانگ لگا کر کود گیا۔ آگے جھکتے ہوئے اس نے روتھ سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مسز ہینڈرسن۔''

''پلیز...... مجھے روتھ ہی کہلانا پسند ہے۔ کیا آپ برائٹن سے ہیں؟'' روتھ نے استفسار کیا۔

''نہیں۔'' میکس بولا۔ ''میں ابھی آپ کے شوہر سے یہی بات کر رہا تھا کہ میں یہاں بس کشتی رانی کے لیے کبھی کبھار آتا ہوں...... آپ جرسی میں کیا کام کرتے ہیں اینگس؟'' میکس اینگس کی جانب دوبارہ متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ وہاں پیدا تو نہیں ہوئے ہوں گے؟''

''نہیں ہم ایڈنبرا سے وہاں شفٹ ہو گئے تھے، میری ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً سات برس پہلے۔ اس سے پہلے ایک کمپنی میں منیجر تھا۔ اب تو بس جو تھوڑی بہت اپنی خاندانی جائداد بچی ہے، اسی کی دیکھ بھال کرتا ہوں تاکہ کچھ آمدن کا سلسلہ بنا رہے۔ کچھ کشتی رانی کر لیتا ہوں اور تھوڑا بہت گالف بھی کھیل لیتا ہوں اور تم؟''

''آپ ہی کی طرح مگر فرق صرف یہ ہے کہ میں جس جائداد کا خیال رکھتا ہوں، وہ میری نہیں دوسرے لوگوں کی ہوتی ہے۔ میں ایک ویسٹ اینڈ پراپرٹی ایجنٹ کا جونیئر پارٹنر ہوں۔'' میکس نے جواب دیا۔

''خوب۔ تو آج کل لندن میں پراپرٹی کی قیمتوں کا کیا حال ہے؟'' اینگس نے وھسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''ویسے تو بہت سے پراپرٹی ایجنٹوں کے لیے گزشتہ چند سال کافی برے گزرے کیونکہ کوئی جائداد فروخت کرنا نہیں چاہتا اور خریدنے کی سکت تو آج کل صرف غیر ملکیوں میں ہی رہ گئی ہے۔ جس کسی کی بھی لیز تجدید کے لیے آتی ہے تو وہ کرایہ کم کرنے کا تقاضا کرتا ہے اور باقی کرایہ دینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے۔''

اینگس نے قہقہہ لگایا۔ ''پھر تو تمہیں جرسی آجانا چاہیے۔ کم از کم تم اس بات سے تو بچ جاؤ گے......''

''نہیں اب کپڑے تبدیل کر کے تیار ہو جانا چاہیے۔ نہیں تو بچوں کو کانسرٹ پر لے جانے کے لیے دیر

ہو جائے گی۔'' روتھ نے اینگس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
اینگس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''سوری میکس...... آپ سے باتیں کرنے میں بہت مزہ آرہا تھا مگر روتھ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ شاید ہم پھر بھی دوبارہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔''
''میں اس کا انتظار کروں گا۔'' میکس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر قریب پڑی میز پر اپنا گلاس رکھا اور اپنی کشتی پر واپس چھلانگ لگا کر چلا گیا۔ روتھ اور اینگس اپنی کشتی کے زیریں کیبن کی جانب چلے گئے۔ ایک مرتبہ پھر میکس نے اپنا ناول اٹھایا اور بالآخر وہ صفحہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا جہاں سے اس نے پڑھنا چھوڑا تھا مگر جانے کیوں وہ کتاب میں چھپے الفاظ پر دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح روتھ عرشے پر آئی تو ہاتھ میں چائے کا کپ تھاما ہوا تھا۔ سی ارچن کو اپنے برابر لنگر انداز نہ پا کر اسے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ وہ دوبارہ نیچے جانے ہی والی تھی کہ اسے ایک جانی پہچانی کشتی ساحل کے پاس آتی دکھائی دی۔ وہ انہماک سے کشتی کے بادبانوں کو قریب آتے دیکھتی رہی کہ شاید میکس پھر اسی جگہ لنگر انداز ہو جہاں گزشتہ شب ہوا تھا۔
میکس نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا مگر اس نے میکس کو نظر انداز کرنے کا ناٹک کیا۔
لنگر انداز ہونے کے بعد میکس نے چلا کر پوچھا۔ ''اینگس کہاں ہے؟''
''بچوں کو لینے گئے ہیں۔ پھر انہیں فٹ بال میچ پر لے جائیں گے۔ مجھے شام تک ان کی واپسی کی امید نہیں ہے۔'' روتھ نے غیر ضروری تفصیلی پروگرام بتاتے ہوئے کہا۔
میکس نے کشتی کو گھاٹ پر باندھا اور اوپر دیکھ کر بولا۔ ''تو پھر آج آپ میرے ساتھ لنچ کیوں نہیں کر لیتیں؟ یہاں بہت ہی اچھا اطالوی ریستوران ہے جس کے بارے میں یہاں آنے والے بیشتر سیاح علم نہیں رکھتے۔''
روتھ نے کچھ دیر پس وپیش سے کام لیا اور اس کی پیشکش پر غور کیا اور آخر کار بولی۔ ''ہاں، کیوں نہیں۔''
جب روتھ تیار ہو کر سامنے آئی تو اس نے سیاہ رنگ کا مختصر لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ میک اپ بھی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔
میکس نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ''آج تو آپ قیامت ڈھا رہی ہیں۔'' روتھ ہولے سے مسکرا دی۔
وہ ساحل سے ہوتے ہوئے چہل قدمی کے انداز میں شہر کی جانب چل دیے۔ ذرا آگے جا کر وہ اطالوی ریستوران آ گیا۔ میکس نے آگے بڑھ کر روتھ کے لیے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہونے پر روتھ کو یہ دیکھ کر کافی مایوسی ہوئی کہ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔
''اوہو! ہمیں تو یہاں جگہ نہیں مل پائے گی۔'' وہ پژمردگی سے بولی۔
ہوٹل کا منیجر اسے دیکھتے ہی لپکا۔ ''آپ کی مخصوص ٹیبل مسٹر بینٹ۔''
''شکریہ ویلریو۔'' میکس بولا اور منیجر انہیں ہال کے ایک قدرے خاموش اور الگ تھلگ گوشے کی جانب لے گیا۔
بیٹھنے کے بعد میکس نے پوچھا۔ ''آپ کیا پینا پسند کریں گی روتھ۔ شیمپین؟''
''ہاں، ٹھیک ہے۔'' روتھ ایسے بولی جیسے یہ اس کے لیے روزمرہ کی بات ہو۔ درحقیقت ایسا شاذونادر ہی ہوتا تھا کہ وہ لنچ سے پہلے شیمپین پیے۔ ویسے بھی اینگس ایسی فضول خرچی کا قائل نہیں تھا۔ ماسوائے شاید اس کی سالگرہ کے دن۔
میکس نے مینیو کارڈ کھولا۔ ''یہاں کا کھانا بہت ہی لذیذ ہوتا ہے۔''
''بہت خوب۔''
''ساتھ میں کچھ سلاد ہو جائے۔'' میکس نے تجویز دی۔
''ٹھیک ہے۔'' روتھ بولی۔
میکس نے مینیو کارڈ بند کیا اور ٹیبل کے دوسری جانب بیٹھی روتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دونوں لڑکے آپ کے اپنے تو نہیں ہو سکتے۔ خاص طور پر اگر وہ اتنے بڑے ہیں کہ بورڈنگ اسکول میں پڑھتے ہیں۔''
''وہ کیوں نہیں؟'' روتھ اندازِ دلربائی سے بولی۔
''کیوں؟...... بھئی اینگس کی عمر دیکھ کر میں نے تو یہی اندازہ لگایا تھا کہ دونوں لڑکے اس کی کسی پہلی بیوی سے ہوں گے۔''
''نہیں۔'' روتھ قہقہہ لگا کر بولی۔ ''اینگس نے بہت دیر سے شادی کی اور مجھے بہت فخر محسوس ہوا تھا جب اس نے مجھے شادی کی پیشکش کی تھی۔''
میکس نے کوئی جواب نہ دیا۔
''اور آپ؟'' روتھ نے پوچھا۔
''میں تو چار مرتبہ شادی کر چکا ہوں۔'' میکس نے جواب دیا۔
روتھ بھونچکی رہ گئی۔ میکس قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''سچ کہوں تو ایک دفعہ بھی نہیں۔ شاید آج تک سچی لڑکی سے ملاقات ہی

نہیں ہوئی۔''

''مگر آپ تو ابھی جوان ہیں اور جس لڑکی کو چاہیں حاصل کر سکتے ہیں۔'' روتھ بولی۔

''میں عمر میں آپ سے تو بڑا ہوں۔'' میکس اپنی مردانگی جتاتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ جیسی جواں سال لڑکی کو جرسی کچھ بے رونق اور روکھا پھیکا نہیں لگتا؟'' ساتھ ہی اس نے ٹیبل سے آگے جھک کر سنہری بالوں کی ایک لٹ کو پیچھے کیا جو روتھ کے ماتھے پر آ گری تھی۔ روتھ شرما کر مسکرائی۔

''اس بے رونقی کے بھی کچھ فائدے ہیں۔'' روتھ اس انداز سے بولی جیسے دل سے اس بات پر یقین نہ رکھتی ہو۔

''مثلاً کیا فائدے؟'' میکس نے اصرار کیا۔

''ٹیکس کی شرح صرف بیس فیصد ہے۔''

''ارے اینگس کے جرسی میں رہنے کی یہ وجہ تو ہو سکتی ہے مگر آپ کی نہیں۔ خیر بہر حال میں تو انگلینڈ ہی میں رہنا پسند کرتا ہوں بھلے وہاں پر ٹیکس کی شرح چالیس فیصد ہو۔''

''جب سے اینگس ریٹائر ہوا ہے، ہمیں ایک تنگ بندھی آمدنی پر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم ایڈنبرا میں رہتے تو اس طرح کا طرز زندگی رکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔'' روتھ آہستہ سے بولی۔

''تو زندگی کی رنگینی کی حد برائٹن تک ہی ہے۔'' میکس مسکراتے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی مینجر نیو کی دو پلیٹیں اٹھائے نمودار ہوا اور ان کے سامنے چن دیں۔ ایک دوسرا ویٹر سلاد کی ڈش ٹیبل کے درمیان رکھ کر چلا گیا۔

''مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔'' روتھ نے سلسلۂ کلام دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''اینگس ہمیشہ سے ہی میرا بہت خیال رکھتا ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔''

''کسی چیز کی بھی نہیں؟'' میکس نے ٹیبل کے نیچے سے اپنا ہاتھ روتھ کے گھٹنے پر رکھتے ہوئے کہا۔

روتھ جانتی تھی کہ اسے میکس کا ہاتھ فوراً ہی ہٹا دینا چاہیے مگر روتھ نے ایسے لاتعلقی کا اظہار کیا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ روتھ نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے سوال کیا۔

''میں زمانے کی رفتار سے بہت پیچھے ہوں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ اب مجھے کونسی فلم دیکھنی چاہیے؟''

''ارے ہاں۔ ٹام اسٹاپرڈ کی نئی فلم اگلے ہی ماہ لگ رہی ہے۔'' میکس قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''اگر آپ ایک دو روز کے لیے فرار ہو سکیں تو ہم دونوں اسے اکٹھے جا کر دیکھ سکتے ہیں۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے میکس۔ اینگس چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہوں اور ویسے بھی ہم لندن تو کبھی کبھار ہی جاتے ہیں۔''

میکس نے اس کی خالی پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ نیو کی آپ کی توقعات پر پوری اتری۔''

روتھ نے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔

''تو پھر آپ کو یہاں کا کریم برولے بھی چکھنا چاہیے۔ مینجر ویلریو کی بیوی وہ بھی کمال کا بناتی ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ اس سفر میں میں جتنا کھا چکی ہوں اس کے لیے مجھے جم میں کچھ زیادہ ہی وقت لگانا پڑے گا مگر میں کافی کا ایک کپ پی سکتی ہوں۔'' روتھ بولی۔ جیسے ہی شیمپئن کا ایک اور گلاس اس کے سامنے آیا۔ اسے دیکھتے ہی روتھ کے ماتھے پر شکنیں نمایاں ہو گئیں۔

''چلو مان لیتے ہیں کہ آج آپ کا برتھ ڈے ہے۔'' میکس بولا اور اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بے باکی سے ٹیبل کے نیچے دوبارہ غائب ہو گیا۔

اصولاً روتھ کو اسی لمحے اٹھ کر ہوٹل سے باہر نکل جانا چاہیے تھا مگر اس کے برعکس روتھ نے اطمینان سے سوال کیا۔

''تو تم کتنے عرصے سے اسٹیٹ ایجنٹ کا کام کر رہے ہو؟''

''جب سے میں نے کالج چھوڑا۔ کمپنی کے سب سے نچلے درجے سے کام شروع کیا اور ابھی پچھلے سال ہی جونیئر پارٹنر بنا ہوں۔''

''مبارک ہو۔ تمہارا دفتر کہاں ہے؟''

''مے فیئر کے عین وسط میں۔ آپ کسی دن تشریف لائیے نا...... جب بھی لندن آنا ہو۔''

''میں لندن بہت کم جاتی ہوں۔'' روتھ آہستہ سے بولی۔

ایک ویٹر کو اپنی جانب آتا دیکھ کر میکس نے اپنا ہاتھ روتھ کی ٹانگ پر سے ہٹا لیا۔ جب ویٹر ان کے سامنے کافی کے دو کپ رکھ چکا تو میکس نے اسے بل لانے کے لیے کہا۔

''کیا آپ بہت جلدی میں ہیں؟'' روتھ نے سوال کیا۔

''جی ہاں، مجھے ابھی ابھی یاد آیا کہ میں نے سی ارچن پر پرانی شراب کی ایک بہت قیمتی بوتل چھپا رکھی ہے اور یہ اسے کھولنے کا بہترین موقع ہو سکتا ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے ٹیبل سے آگے جھک کر روتھ کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ جانتی ہیں کہ میں نے وہ بوتل کسی خاص دن یا کسی خاص مہمان کے لیے بچا کر رکھی ہے۔''

''میرے خیال میں یہ کوئی عقلمندی کی بات نہ ہوگی۔''

''تو کیا آپ ہمیشہ عقلمندی کی باتیں ہی کرتی ہیں؟''

میکس اس کا ہاتھ چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

"بات یہ ہے کہ مجھے واقعی اب اسکاٹش بیل پر واپس جانا چاہیے۔"

"تاکہ آپ مزید تین گھنٹے اینگس کا انتظار کرنے میں گزار دیں؟"

"نہیں، یہ بات نہیں ہے۔" روتھ اٹکتے اٹکتے بولی۔ "آپ کا خیال ہے کہ میں آپ کو گمراہ کر کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا؟"

"آپ کا ارادہ تو یہی لگتا ہے۔" روتھ اپنا ہاتھ میکس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے بولی۔

"ہاں مگر اس شراب کی بوتل کو چکھنے سے پہلے نہیں۔" میکس بولا۔ جیسے ہی ویٹر بل لے کر واپس آیا' اس نے بل دیکھا اور دس دس پاؤنڈ کے چار نوٹ طشتری پر رکھ دیے۔

اینگس نے ایک مرتبہ روتھ کو بتایا تھا کہ ریستوران میں جو لوگ نقد رقم سے بل ادا کرتے ہیں، انہیں یا تو کریڈٹ کارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی یا پھر وہ اپنی قلیل آمدنی کے سبب کریڈٹ کارڈ حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

میکس بل ادا کرنے کے بعد اٹھ گیا۔ واپسی پر تمام راستے وہ خاموش رہے، یہاں تک کہ وہ گھاٹ تک پہنچ گئے۔ روتھ کو لگا کہ اس نے ہی ارچن پر سے کسی کو کودتے دیکھا تھا مگر دوبارہ دیکھنے پر کوئی دکھائی نہ دیا۔ جب وہ کشتی کے قریب پہنچ گئے تو روتھ کا خیال تھا کہ وہ میکس کو خدا حافظ کہہ دے گی مگر وہ غیر ارادی طور پر اس کے ہمراہ زیریں کیبن میں داخل ہو رہی تھی۔

"میرا نہیں خیال تھا کہ یہ اتنا چھوٹا ہوگا۔" وہ آخری زینہ اترتے ہوئے بولی۔ پورا گول چکر کاٹنے کے بعد وہ میکس کی بانہوں میں تھی۔ اس نے میکس کو آہستہ سے پیچھے دھکیلا۔

"اکیلے آدمی کے لیے تو بہترین ہے۔" میکس نے اتنا ہی کہا اور شراب کی بوتل کھول کر دو گلاس تیار کرنے لگا۔ پھر ایک جام روتھ کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے اپنا دوسرا بازو اس کی کمر میں حمائل کر دیا اور دھیرے سے اسے اپنی طرف کھینچا۔

پھر میکس نے اسے جام پیش کیا۔ شراب نے دونوں کی وارفتگی کو اس حد تک بڑھا دیا کہ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا۔

"تم جانتے ہو کہ تم دوسرے مرد ہو جس کے ساتھ میں اس حد تک گئی ہوں۔" روتھ نے بعد میں آہستہ سے کہا۔

"گزشتہ بیس برس میں تمہاری زندگی میں کوئی دوسرا مرد نہیں آیا؟" میکس نے اپنے لیے شراب کا ایک اور جام بناتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" روتھ نے جواب دیا۔ "حالانکہ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ جیرالڈ پریسکوٹ جو ہمارے بیٹوں کے پرانے اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہے، وہ مجھے چاہتا ہے مگر وہ کبھی گال پر ہلکے سے بوسے سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔ بس چاہت بھری نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔"

"تو کیا تم بھی اسے چاہتی ہو؟"

"ہاں شاید میں بھی...... وہ ایک بہت ہی اچھا انسان ہے۔" روتھ نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا اعتراف کیا۔

"مگر وہ احمق ہے۔" میکس نے کہتے ہوئے ایک بار پھر اسے بانہوں میں بھر لیا۔

روتھ کی نظر اچانک اپنی گھڑی پر پڑی تو اس نے چونک کر کہا۔ "اوہ میرے خدایا! کیا اتنا وقت ہو گیا ہے؟ اینگس واپس آتا ہی ہوگا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں میری جان۔" میکس بولا۔ "ہمارے پاس اب بھی شراب کے ایک اور جام کا وقت ہے اور شاید محبت کے سمندر میں ایک اور ڈبکی لگانے کا بھی۔ اب تم جو بھی مناسب سمجھو۔"

"دونوں ہی تجاویز اچھی ہیں مگر میں یہ نہیں چاہتی کہ اس حالت میں اینگس ہمیں ایک ساتھ دیکھے۔"

"چلو پھر اسے کسی اور وقت کے لیے بچا رکھتے ہیں۔" میکس نے شراب کی بوتل میں کارک لگاتے ہوئے کہا۔

"یا پھر کسی اور لڑکی کے لیے۔" روتھ نے جلدی جلدی اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے کہا۔ میکس نے ایک بال پین اٹھایا اور بوتل پر لکھ دیا۔ "صرف روتھ کے ساتھ پینے کے لیے۔"

"کیا میں پھر کبھی تم سے مل سکوں گی؟" روتھ نے آہستہ سے پوچھا۔

"اب اس بات کا فیصلہ تو تم ہی کو کرنا ہے میری جان۔" میکس نے اسے چومتے ہوئے کہا۔ جیسے ہی اس نے روتھ کو چھوڑا تو وہ پلٹی اور تیز تیز قدموں سے کیبن کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کشتی کے عرشے پر آ گئی اور پھر اسی تیزی سے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اسکاٹش بیل تک واپس پہنچتے ہی وہ گزشتہ دو گھنٹوں کی یادوں کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی مگر اسے اس بات کا احساس ہوا کہ میکس کو بھلانا اس کے لیے اتنا آسان نہ ہوگا۔

اگلے دن جب وہ کشتی کے عرشے پر آئی تو سی ارچن کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔

''کیا کسی خاص چیز کو تلاش کر رہی ہو؟'' اینگس نے اوپر آتے ہی سوال کیا۔

وہ پلٹی اور مسکرا کر کہنے لگی۔ ''نہیں، بس میں تو جرسی واپس لوٹنے کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔''

لگ بھگ ایک ماہ بعد جب ایک دن روتھ نے فون اٹھایا تو لائن کی دوسری طرف میکس کو پایا۔ روتھ کی سانس تیز تیز چلنے لگی، بالکل اسی طرح جس طرح پہلی دفعہ میکس کے ساتھ ہم نشیں ہوئی تھی۔

''میں کل جرسی آرہا ہوں۔ ایک گاہک کے لیے ایک پراپرٹی دیکھنی ہے۔ کیا ہم کہیں مل سکتے ہیں؟''

''تم ہمارے ساتھ رات کا کھانا کیوں نہیں کھا لیتے؟'' روتھ نے اسے مدعو کرتے ہوئے کہا۔

''اور تم مجھے ہوٹل کے کمرے میں آکر کیوں نہیں مل لیتیں؟'' اس نے تجویز دیتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا خیال ہے کہ یہ ڈنر کا خیال رہنے دو۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ ڈنر پر ملنا ہی بہتر رہے گا۔ جرسی میں تو دیواروں کے ہی نہیں بلکہ کھڑکی دروازوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بارے میں کوئی اسکینڈل بنے۔''

''چلو بھئی اگر تم سے ملاقات کا یہی ایک طریقہ رہ گیا ہے تو پھر ٹھیک ہے، ڈنر ہی کر لیتے ہیں۔''

''آٹھ بجے؟''

''آٹھ بجے ہی مناسب رہے گا۔'' اس نے تائید کی اور فون رکھ دیا۔

روتھ نے فون بند ہونے کی آواز سنی تو اسے خیال آیا کہ اس نے میکس کو اپنے گھر کا راستہ تو بتایا ہی نہیں اور وہ اسے دوبارہ فون کر نہیں سکتی تھی کیونکہ نہ اس کے پاس اس کا فون نمبر تھا، نہ ہی ہوٹل کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔

جب روتھ نے اینگس کو ڈنر پر آنے والے مہمان کے بارے میں بتایا تو وہ خوش ہو کر بولا۔ ''اس کے آنے کا اس سے بہتر وقت نہیں ہو سکتا تھا۔ میں بھی میکس سے کچھ مشورہ لینا چاہتا ہوں۔''

اگلے روز روتھ صبح ہی سے شاپنگ میں مصروف ہوگئی۔ بہترین کوالٹی کا گوشت، تازہ سبزیاں اور ایک اچھی سی شراب کی بوتل جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ اگر اینگس کو پتا چلتا تو وہ اسے انتہائی درجے کی فضول خرچی سمجھتا۔ پھر دوپہر میں اس نے کھانے کی تیاری شروع کی۔ اپنے خانساماں کو اچھی طرح تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کس قسم کا کھانا چاہیے اور پھر شام کو اپنے کمرے میں کپڑوں کا انتخاب کرنے میں اسے کافی دیر لگ گئی۔ یہاں تک کہ وہ ابھی کپڑے پہن بھی نہ پائی تھی کہ آٹھ بج کر چند منٹ پر دروازے کی گھنٹی بجی۔

روتھ نے کمرے کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں کے اوپر سے ہی اپنے شوہر کو میکس کا استقبال کرتے سنا۔ اینگس کی آواز سے کتنا بڑھاپا جھلک رہا تھا جب اس نے دونوں مردوں کو باتیں کرتے سنا۔ اسے ابھی تک ادراک نہ تھا کہ اینگس میکس سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتا تھا اور وہ اس بارے میں زیادہ جوش و خروش کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اپنے کمرے میں واپس آکر بالآخر اس نے ایک ڈریس کا انتخاب کیا جس کے بارے میں اس کی ایک دوست نے کہا تھا کہ یہ بہت ہی بھڑکیلا ہے۔

دونوں روتھ کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر تعظیماً اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ میکس نے آگے بڑھ کر روتھ کو گال پر اسی طرح ہلکا سا بوسہ دیا جیسا کہ جیرالڈ پریسکوٹ ہمیشہ کرتا تھا۔

''میں میکس کو ایڈریان میں ہمارے بنگلے کے بارے میں بتا رہا تھا۔'' اینگس بولا اور پھر دوبارہ بیٹھتے ہی کہنے لگا۔ ''اور یہ بھی کہ ہم اسے بیچنا چاہتے ہیں کیونکہ عنقریب ہمارے دونوں بیٹے یونیورسٹی میں چلے جائیں گے اور ان کے تعلیمی اخراجات بھی بڑھ جائیں گے۔''

اینگس کی عجیب فطرت تھی۔ گھر آئے مہمان کو پانی کے گلاس کو بھی نہیں پوچھا اور فوراً کام کی بات شروع کر دی۔ روتھ نے ... میکس کے لیے جلدی سے شراب کا ایک جام تیار کیا۔

''میں نے میکس سے گزارش کی ہے کہ وہ موقع پاتے ہی ہمارے بنگلے کو جا کر دیکھ آئے۔ اس کی قیمت کا تخمینہ لگائے اور یہ بھی بتائے کہ اس کے خیال میں اسے بیچنے کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا۔''

''ہاں، یہ ایک مناسب خیال ہے۔'' روتھ نے میکس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی نظروں سے اینگس بھانپ نہ جائے کہ وہ اس مہمان کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتی ہے۔

''میں تو کل ہی فرانس جا سکتا ہوں۔'' میکس بولا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو...... کیونکہ میرا اس ویک اینڈ پر کوئی دوسرا پروگرام تو ہے نہیں۔ پھر میں پیر کے روز آپ کو

تمام معلومات فراہم کرسکوں گا۔''

''ارے، یہ تو بہت ہی شاندار بات ہوگئی۔'' اینگس خوش ہوتے ہوئے بولا...اور پھر کچھ توقف کے بعد وھسکی کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کہنے لگا۔''میرا خیال ہے روتھ کہ اگر تم بھی میکس کے ساتھ چلی جاؤ تو معاملات اور بھی تیزی سے طے پا جائیں گے۔''

''نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میکس اکیلا ہی یہ کام بخوبی کرسکتا ہے۔''

''ارے نہیں۔ یہ مشورہ اسی نے تو دیا ہے اور ویسے بھی تم اسے وہ جگہ اچھی طرح دکھا سکتی ہو۔''

''مگر میں یہاں پر کچھ مصروف ہوں۔ وہ دیکھیے نا......'' روتھ ابھی کوئی بہانہ سوچ ہی رہی تھی کہ اینگس اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''ہاں ہاں، تمہارا لیڈیز کلب اور ہیلتھ کلب اور نہ جانے کیا کیا۔ نہیں بھئی ان سب کو کچھ دن تمہارے بغیر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔''

روتھ کو اینگس کا اس طرح میکس کے سامنے اس کا مذاق اڑانا بہت بُرا لگا۔ وہ منہ بسور کر بولی۔''ٹھیک ہے اگر آپ کے خیال میں میرا ساتھ جانا ضروری ہے تو چلی جاتی ہوں۔'' اور اس بار اس نے میکس کی جانب دیکھا۔ میکس کا چہرہ سپاٹ اور کسی بھی قسم کے جذبات سے مکمل طور پر عاری تھا۔

☆☆☆

ایڈریان جانے کے پروگرام میں انہیں تین دن لگے مگر زیادہ یادگار تھیں وہ تین راتیں جو انہوں نے ساتھ گزاریں۔ جب تک وہ جرسی واپس آئے تو روتھ یہی دعا کررہی تھی کہ ان کی باتوں سے کہیں یہ عیاں نہ ہوجائے کہ دونوں کا افیئر چل رہا ہے۔ میکس نے اینگس کو ایک تفصیلی رپورٹ پیش کی اور بنگلے کی مالیت کے بارے میں بھی بتایا۔ بوڑھے اینگس نے میکس کے مشورے سے اتفاق کیا کہ گھر کو موسم گرما کی تعطیلات سے چند ہفتے قبل ہی فروخت کرنا مناسب رہے گا۔ دونوں نے اسی بات کو ہاتھ ملا کر پکا کیا اور میکس نے کہا کہ جیسے ہی کسی جانب سے اس بارے میں کوئی غور طلب آفر سامنے آئی تو وہ ان سے فوراً رابطہ کرے گا۔

روتھ اسے ائرپورٹ تک چھوڑنے گئی اور میکس کے کسٹم کاؤنٹر کے پاس لگے ہجوم میں گم ہونے سے پہلے بولی۔''کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اگلی بار جب تم مجھ سے بات کرو تو اس میں ایک ماہ سے کم عرصہ لگے؟''

میکس نے اگلے ہی دن اینگس کو فون کرکے بتایا کہ اس نے بنگلے کو پیرس کے دو بہت ہی مستند پراپرٹی ایجنٹوں کے حوالے کردیا ہے جن کے ساتھ وہ کئی سالوں سے کاروبار کررہا ہے۔ مزید برآں اس نے کہا۔''اس سے پہلے کہ آپ کچھ کہیں، میں نے ان ایجنٹوں کے ساتھ اپنی فیس بانٹنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ آپ پر کوئی اضافی بوجھ نہ پڑے۔''

''ارے، یہ تو تم نے میرے دل کی بات کردی۔'' اینگس نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور فون رکھ دیا۔ روتھ کو میکس کے ساتھ بات کرنے کا موقع ہی نہ مل پایا۔ اگلے چند روز تک فون کی گھنٹی بجتے ہی روتھ لپک کر اٹھاتی کہ اینگس کہیں پھر اسے میکس سے بات کرنے سے محروم نہ کردے مگر میکس نے تمام ہفتہ فون نہ کیا۔ بالآخر جب اس نے اگلے پیر کے روز فون کیا تو اینگس کمرے میں قریب ہی موجود تھا۔

''میں تو تمہارے قریب آنے کے لیے ترس رہا ہوں میری جان۔'' میکس نے فون اٹھاتے ہی کہا۔

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی میکس۔'' روتھ نے جواب دیا۔''مگر میں تمہاری بات اینگس سے کراتی ہوں تاکہ تم اسے بھی یہ خوش خبری دے سکو۔'' جیسے ہی اس نے فون اینگس کے ہاتھ میں تھمایا تو اسے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اب اگر میکس کے پاس اسے دینے کے لیے کوئی خبر ہی نہ ہوئی تو؟

''تو تمہی ہمارے لیے کیا خوش خبری ہے آپ کے پاس؟'' اینگس نے فون پکڑتے ہی پوچھا۔

''ہمیں آپ کے بنگلے کے لیے نو لاکھ فرانک کی آفر آئی ہے جو کہ تقریباً ایک لاکھ پاؤنڈز بنتے ہیں مگر میں ابھی اس سے مطمئن نہیں ہوں کیونکہ دو اور پارٹیوں نے بھی آپ کے بنگلے میں دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ فرانسیسی ایجنٹوں کا بھی یہی کہنا ہے کہ ہمیں دس لاکھ فرانک سے اوپر کی قیمت پر ہی سودا کرنا چاہیے۔''

''اگر تمہاری بھی یہی رائے ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اینگس بولا۔''اور اگر تم سودا طے کرلو تو میں وہاں آکر معاہدے کے کاغذات پر دستخط کردوں گا۔ ویسے بھی میکس، میں نے روتھ کو لندن لے جانے کا کافی عرصے سے وعدہ کررکھا ہے۔''

''بہت خوب، میرا بھی آپ دونوں سے ملنے کا بہت دل کررہا ہے۔'' میکس نے فون رکھنے سے پہلے کہا۔

پھر اس نے ہفتے کے آخر میں فون کیا اور گوکہ اس بار روتھ کو ایک آدھ جملہ کہنے کا موقع مل ہی گیا، اینگس کے فون پر آنے سے پہلے مگر وہ میکس کے جذبات کا گرمجوشی سے جواب نہ دے پائی۔

''ایک لاکھ سات ہزار چھ سو پاؤنڈز؟ ارے یہ تو میری توقعات سے بہت بہتر قیمت ہے۔ شاباش میکس! بس اب تم معاہدے کی کاغذی کارروائی سنبھالو اور بیعانہ لے کر بینک میں جمع کروا دو۔ میں پہلی ہی فلائٹ سے وہاں پہنچ جاؤں گا۔'' اینگس نے فون رکھا اور روتھ کی جانب متوجہ ہو کر بولا۔ ''ارے بھئی لگتا ہے کہ تم سے کیا ہوا لندن لے جانے کا وعدہ پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔''

☆☆☆

لندن میں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ..... چیک ان کرنے کے بعد روتھ اور اینگس میکس سے جنوبی اسٹریٹ پر واقع ایک اعلیٰ ریستوران میں ملے جس کے بارے میں اینگس کچھ نہیں جانتا تھا اور پھر جب اس نے مینیو کارڈ پر چھپی قیمتیں دیکھیں تو اسے فوراً ہی اس بات کا احساس ہوا کہ اگر چناؤ کا موقع اسے ملتا تو وہ کبھی اس جگہ کا انتخاب نہ کرتا مگر تمام عملہ بہت ہی اچھے اخلاق کا تھا اور بہ ظاہر میکس کو اچھی طرح جانتا بھی تھا۔

روتھ کو کھانا بہت ہی بیزار کن لگا کیونکہ اینگس تو بس بنگلے کے سودے ہی کے بارے میں باتیں کرتا رہا اور پھر جب میکس نے اسے اس بارے میں مکمل طور پر مطمئن کر دیا تو وہ اس کے ساتھ اسکاٹ لینڈ میں واقع اپنی دیگر جائداد کے بارے میں صلاح مشورہ کرتا رہا۔

''ان پراپرٹیز سے بھی مجھے کچھ خاص آمدن نہیں ہو رہی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر تم ان پر بھی ایک نظر ڈال کر مجھے ان کے بارے میں بھی اپنا ماہرانہ مشورہ دے سکو کہ اب ان کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''ہاں ہاں ضرور..... کیوں نہیں۔'' میکس نے کہا۔

روتھ نے اکتاہٹ کے ساتھ کھانے کی پلیٹ سے نظر اٹھا کر اپنے شوہر کی جانب دیکھا۔ ''کیا آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ کیونکہ مجھے آپ کا رنگ بہت ہی سفید ہوتا نظر آ رہا ہے۔''

''مجھے اپنی دائیں جانب کچھ درد سا محسوس ہو رہا ہے۔ آج ویسے بھی کچھ زیادہ ہی لمبا دن تھا اور ویسے بھی مجھے ان مہنگے ہوٹلوں میں کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ایک رات کی پرسکون نیند اس کا بہترین علاج ثابت ہو گی۔'' اینگس نے رک رک کر جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ہوٹل واپس جانا چاہیے۔'' روتھ نے ایک وفاشعار بیوی کی طرح مشورہ دیا۔

''میں بھی روتھ سے اتفاق کرتا ہوں۔ بس ابھی بل چکا کر دربان سے آپ کے لیے ٹیکسی کا انتظام کرنے کا کہتا ہوں۔'' میکس نے فوراً روتھ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

اینگس لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا اور روتھ کی بانہوں کے سہارے ریستوران سے باہر آیا۔ جب میکس باہر ان سے سڑک کے کنارے ملا تو اس نے کہا۔ ''گڈ نائٹ اینگس ...... مجھے امید ہے کہ صبح تک آپ کی طبیعت بہتر ہو جائے گی۔'' یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے مسکراتے ہوئے ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا۔

ہوٹل لوٹنے کے بعد جب تک روتھ نے اینگس کو بستر پہ لٹایا تو اس کی طبیعت کچھ خاص بہتر نہ ہوئی تھی اگرچہ اسے معلوم تھا کہ اینگس کبھی اس اضافی خرچے کی تائید نہیں کرے گا مگر پھر بھی روتھ نے ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ایک گھنٹے کے اندر ڈاکٹر ان کے کمرے میں موجود تھا۔ ڈاکٹر نے اینگس کا چیک اپ کیا اور روتھ کو یہ پوچھ کر محوحیرت کر دیا کہ اسے اینگس کے رات کے کھانے کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ روتھ یاد کرنے لگی کہ اینگس نے اس رات کیا کیا کھانے کا انتخاب کیا تھا مگر اسے تو بس یہی یاد تھا کہ اینگس نے سب کچھ میکس کی تجاویز کے مطابق ہی آرڈر کیا تھا۔ ڈاکٹر نے ہدایت کی کہ صبح ہوتے ہی اینگس کو کسی اسپیشلسٹ کو ضرور دکھایا جائے۔

''کیا ضرورت ہے؟'' اینگس نے کمزور سی آواز میں احتجاج کیا۔ ''مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے اور اس کا علاج تو ہمارا جرسی والا فیملی ڈاکٹر بھی کر سکتا ہے۔ ہم صبح ہوتے ہی پہلی فلائٹ پکڑ کر جرسی واپس چلے جائیں گے۔'' گوکہ روتھ ڈاکٹر کی تجویز سے مکمل اتفاق کرتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ اپنے شوہر کے آگے اس کی ایک نہ چل پائے گی۔ آخرکار جب اینگس سو گیا تو اس نے میکس کو ہوٹل کی لابی سے فون کیا تاکہ اسے آگاہ کر سکے کہ وہ صبح ہوتے ہی جرسی واپس لوٹ جائیں گے۔ وہ یہ سن کر تھوڑا سا پریشان ہوا اور اپنی طرف سے دوبارہ پیشکش کی کہ اگر وہ کسی بھی طرح ان کی مدد کر سکے تو اسے خوشی ہو گی۔

صبح جب وہ دونوں جرسی واپسی کے لیے ہوائی جہاز میں بیٹھے تو فضائی میزبان نے اینگس کی حالت دیکھ کر اسے ہوائی سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ''ہمیں انہیں جلد از جلد جرسی لے کر جانا ہے تاکہ ان کا فیملی ڈاکٹر ان کا علاج کر سکے۔'' روتھ گڑگڑائی۔ اس کی مسلسل کوشش کے بعد ہی انہیں ہوائی جہاز پر سفر کرنے کی اجازت ملی۔

روتھ نے چلنے سے پہلے ہی ایک گاڑی کے لیے فون کر دیا تھا جو انہیں ائرپورٹ سے سیدھا گھر لے گئی۔ یہ بھی ایک اضافی خرچہ تھا جس پر اینگس کو تحفظات ہوتے مگر جب تک ہوائی جہاز جرسی میں اترا، اس وقت تک اینگس کسی بھی قسم کی رائے دینے کی حالت میں نہ تھا۔

گھر پہنچتے ہی روتھ نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر نے ویسے ہی اینگس کا معائنہ کیا جیسا کہ لندن کے ڈاکٹر نے کیا تھا اور روتھ سے یہی سوال دہرایا کہ اینگس نے گزشتہ شب کھانے میں کیا کھایا تھا؟ بالآخر ڈاکٹر نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اینگس کو جلد از جلد کسی اسپیشلسٹ ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔ دوپہر میں اینگس کو بذریعہ ایمبولینس کالج اسپتال منتقل کر دیا گیا اور جب وہاں پر اسپیشلسٹ ڈاکٹر نے اس کا مکمل معائنہ کر لیا تو روتھ کو برابر والے کمرے میں بلا کر کہا۔ ”مجھے خدشہ ہے مسز ہینڈرسن کہ خبر زیادہ اچھی نہیں ہے۔ آپ کے شوہر کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ شاید زیادہ بھاگ دوڑ اور اس کے بعد کچھ نامناسب غذا کی وجہ سے۔ اور پھر آپ نے انہیں اسپتال لانے میں بھی بہت دیر کر دی۔ اینگس کی حالت اور ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے میرا آپ کو یہی مشورہ ہوگا کہ آپ اپنے بچوں کو اطلاع دے دیجیے تاکہ وہ اپنے والد سے آخری مرتبہ مل سکیں۔“

اس شب جب روتھ واپس گھر آئی تو اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس سے رابطہ کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز کو اس نے فوراً پہچان لیا۔

”میکس!“ وہ بے اختیار بولی۔ ”تم نہیں جانتے کہ مجھے تمہاری آواز سن کر کتنی تقویت ملی ہے۔ اسپیشلسٹ نے اینگس کا چیک اپ کیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اینگس کے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے اور مجھے اپنے بیٹوں کو گھر بلا لینا چاہیے۔“ پھر کچھ توقف کے بعد بولی۔ ”مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ میں یہ بات ان لڑکوں سے کیسے کر پاؤں گی۔ تم نہیں جانتے کہ وہ اپنے باپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔“

”یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں کل ہی ان کے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو فون پر تمام احوال سے آگاہ کر دوں گا اور پھر ان کو اسکول سے لے کر اپنے ساتھ ہی ہوائی جہاز سے جرسی لے آؤں گا۔“ میکس بولا۔

”اوہ میکس! تم کتنے اچھے ہو۔“ روتھ تشکر سے لبریز ہو کر بولی۔

”ایسے حالات میں کم از کم میں اتنا تو کر ہی سکتا

کنز نبیل

☆ جو کسی مسلمان کو ایسی جگہ ذلیل کرے گا جہاں اس کی عزت کی جاتی ہے تو اللہ اسے ایسی جگہ ذلیل کرے گا جہاں اسے اللہ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔

☆ زبان کا وزن بہت ہلکا ہوتا ہے مگر بہت کم لوگ اسے سنبھال پاتے ہیں۔

☆ عورت کے لیے شرم سے بڑھ کر کوئی زیور اور چادر سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔

☆ حسد اور گھمنڈ جب آدمی کے اندر داخل ہوتے ہیں تو وہ عقل کو باہر کر دیتے ہیں۔

☆ تمہارے نفس کی تربیت کے لیے اتنا کافی ہے کہ تم ان چیزوں سے دوری اختیار کرو جو تمہیں دوسروں میں بری لگتی ہیں۔

☆ تقویٰ کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ بندہ اللہ کی چھوٹی سے چھوٹی نافرمانی سے بھی بچنے کی کوشش کرے کیونکہ جو بندہ چھوٹے گناہوں کو معمولی سمجھتا ہے، وہ کبھی بڑے گناہوں سے نہیں بچ سکتا۔

☆ تم کسی بھی انسان کو برا مت سمجھو، شاید وہ ایسا نہ ہو جس طرح تم سمجھتے ہو حقیقی علم تو اللہ کے پاس ہے اور تم تو لاعلم ہو۔

☆ ایمان والی اصلی عورت کا زیور سونا چاندی نہیں بلکہ حیا اور پردہ ہے۔

☆ کبھی کسی ایسے شخص پر ظلم نہ کرو جس کے پاس فریاد کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہ ہو۔

☆ جو تکلیف تم خود برداشت نہیں کر سکتے، وہ کسی دوسرے کو بھی نہ دو۔

☆ دو چہرے انسان کو کبھی نہیں بھولتے، ایک مشکل میں ساتھ دینے والا اور دوسرا مشکل میں ساتھ چھوڑنے والا۔

☆ وقت اور سمجھ ایک ساتھ خوش قسمت لوگوں کو ملتے ہیں کیونکہ اکثر وقت پر سمجھ نہیں ہوتی اور سمجھ آنے تک وقت نہیں رہتا۔

☆ افضل انسان وہ ہے جو اپنی اصلاح میں لگا رہے۔

☆ عزت کمانا دولت کمانے سے زیادہ مشکل ہے اور عزت گنوانا دولت گنوانے سے زیادہ آسان ہے۔

☆ توبہ کرنے والے کی آنکھ کا ایک آنسو دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

☆ خدا پر بھروسے کا ہنر سیکھ لو۔ لوگ جتنے بھی سچے ہوں بدل ضرور جاتے ہیں۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریروی، اورنگی ٹاؤن، کراچی

ہوں۔'' میکس بولا۔ ''اور اب تم بھی کچھ آرام کرنے کی کوشش کرو۔ آواز سے ہی بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔ میں دوبارہ فون کروں گا جیسے ہی یہ پتا چلا کہ ہم کونسی فلائٹ سے جرسی آپائیں گے۔''

روتھ دوبارہ اسپتال چلی گئی اور ساری رات ایک وفاشعار بیوی کی طرح اپنے شوہر کے سرہانے گزاری۔ اینگس نے صرف ایک ہی شخص سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور وہ تھا اس کا خاندانی وکیل مسٹر کریڈک۔ روتھ نے مسٹر کریڈک کو اگلے ہی دن بلالیا اور خود میکس اور اپنے بیٹوں کو لینے ائرپورٹ چلی گئی۔

میکس کسٹمز ہال سے باہر آیا تو دونوں لڑکے اس کے دائیں اور بائیں جانب تھے۔ روتھ کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ دونوں بیٹے بہت ہی سنبھلے ہوئے تھے۔ میکس ان کو اسپتال لے گیا۔ روتھ کو یہ جان کر کافی مایوسی ہوئی کہ وہ اگلے ہی دن لندن واپس جارہا تھا مگر جاتے ہوئے اس نے روتھ کو سمجھایا کہ اس وقت اسے زیادہ سے زیادہ وقت اپنے خاندان کے ساتھ گزارنا چاہیے۔

اینگس جمعے کے روز اسپتال میں پرسکون حالت میں دم توڑ گیا۔ روتھ اور دونوں بیٹے اس وقت اس کے ساتھ ہی تھے۔

میکس جنازے میں شمولیت کے لیے آیا اور اگلے ہی دن دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ روتھ جب اسے ہاتھ ہلا کر الوداع کررہی تھی تو اس کے ذہن میں ایک ہی سوال تھا۔ ''کیا وہ بھی پھر میکس سے مل پائے گی؟''

میکس نے اگلے ہی دن اسے فون کر کے خیریت دریافت کی۔ ''بالکل تنہا ہوں اور کچھ احساس جرم بھی ہے کہ مجھے تمہاری کمی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔'' روتھ آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''تم دوبارہ کب جرسی آؤ گے میکس؟''

''ابھی کچھ دن تک تو نہیں آسکتا اور مت بھولو کہ تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ جرسی میں کھڑکیوں اور دروازوں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''مگر اب میں کیا کروں؟ تنہائی مجھے کاٹنے کو آرہی ہے۔ دونوں بیٹے اسکول واپس لوٹ گئے ہیں اور تم لندن میں پھنسے ہو۔''

''تم لندن کیوں نہیں آجاتیں؟ کچھ آب و ہوا بھی بدل جائے گی اور یہاں کوئی تمہیں پہچاننے والا بھی نہیں۔ ہم یہاں آزادانہ رہ سکتے ہیں۔''

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے کچھ وقت دو پھر میں تمہیں فون کر کے بتاتی ہوں۔''

پھر اگلے ہی ہفتے روتھ ہیتھرو ائرپورٹ لندن کے لیے روانہ ہوگئی۔ وہاں میکس اس کا منتظر تھا۔ روتھ کو اس کا اخلاص اور اخلاق بہت ہی اچھا لگا۔ خاص طور پر جب وہ بیٹھے بیٹھے یکدم گم صم ہوجاتی تھی اور پیار محبت سے اجتناب کرتی تو میکس اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھتا پھر جب چند روز بعد وہ اسے واپس ائرپورٹ چھوڑنے آیا تو وہ اس سے لپٹ گئی اور کہنے لگی۔ ''دیکھو تو سہی مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں نے تو ابھی تک تمہارا فلیٹ اور دفتر بھی نہیں دیکھا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہارا ہوٹل میں قیام کرنا ہی بہتر تھا۔ میرے گھر اور دفتر کو تم اگلی دفعہ آکر بھی دیکھ سکتی ہو۔'' میکس بولا۔ یہ سن کر روتھ مسکرائی۔ شاید اینگس کی وفات کے بعد پہلی مرتبہ ائرپورٹ پر خدا حافظ کہنے سے پہلے میکس نے روتھ کو بانہوں میں سمیٹ کر کہا۔

''میں جانتا ہوں میری جان کہ اس وقت تم ایک بہت ہی مشکل وقت سے گزر رہی ہو مگر میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ شاید آنے والے دنوں میں تم مجھے اینگس کی جگہ لینے کے قابل سمجھوگی۔''

☆☆☆

جرسی واپس آنے کے کئی دن بعد تک روتھ میکس کے الفاظ یاد کر کے دہراتی رہی۔ جیسے وہ کسی بہت ہی دلفریب نغمے کے بول ہوں جنہیں وہ دل ودماغ سے نکال ہی نہ پارہی ہو۔

پھر تقریباً ایک ہفتے بعد اینگس کے وکیل مسٹر کریڈک کا فون آیا۔ انہوں نے روتھ کو اپنے آفس آنے کی دعوت دی تاکہ وہ اسے اینگس کی وصیت اور اس کے مضمرات سے آگاہ کرسکیں۔ روتھ نے اگلے ہی دن ان سے ملنے کا فیصلہ کیا۔

روتھ کا خیال تھا کہ جس طرح وہ اور اینگس ایک آرام دہ زندگی گزار رہے تھے، اسی طرح وہ اینگس کے گزر جانے کے بعد بھی ایک مناسب طرز زندگی رکھ سکے گی کیونکہ اینگس کوئی فضول خرچ انسان تو تھا نہیں کہ مستقبل کی فکر نہ کرتا اور معاملات کو ایسے ہی چھوڑ کر چلا جاتا اور پھر اسے یہ بھی یاد تھا کہ اسپتال میں اینگس نے مسٹر کریڈک سے ملنے پر کس قدر اصرار کیا تھا۔

روتھ نے کبھی اینگس کے کاروباری معاملات میں دخل اندازی نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے ان میں کچھ خاص دلچسپی تھی۔ اینگس اگرچہ رقم کے معاملے میں نہایت زیرک اور کائیاں تھا مگر اس نے بھی روتھ کی کسی فرمائش کو رد بھی نہ کیا تھا اور ویسے بھی میکس نے حال ہی میں تو اینگس کے اکاؤنٹ میں ایک لاکھ پاؤنڈز کا چیک جمع کروایا تھا۔ سو اگلے ہی دن وہ مسٹر کریڈک کے دفتر جا پہنچی، اس یقین کے ساتھ کہ اس کے آنجہانی شوہر نے اس کی گزر بسر کے لیے کچھ نہ کچھ مناسب انتظام ضرور کیا ہوگا۔

وہ مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی دفتر پہنچ گئی تھی مگر اس کے باوجود استقبالیہ پر موجود سیکریٹری نے اسے انتظار کرائے بغیر سیدھا کمپنی کے سینئر پارٹنر کے کمرے تک پہنچا دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی روتھ نے دیکھا کہ ایک بڑی بورڈ روم ٹیبل کے گرد تین صاحبان بیٹھے تھے۔ اسے آتا دیکھ کر وہ فوراً ہی اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مسٹر کریڈک نے اپنے دیگر پارٹنرز سے اس کا تعارف کرایا۔ روتھ نے سوچا کہ شاید اینگس کی وفات کی خبر سن کر سب اس سے تعزیت کی غرض سے آئے ہیں مگر وہ دوبارہ اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور اپنے سامنے پڑی ہوئی موٹی موٹی فائلوں کو دیکھنے لگے۔ پہلی مرتبہ روتھ کا ماتھا ٹھنکا۔ اینگس کی جائداد کے معاملات میں کوئی رکھنے والی بات تو نہ تھی؟

ٹیبل کے ایک سرے پر بیٹھے سینئر پارٹنر نے سامنے رکھا دستاویزات کا ایک بڑا سا بنڈل کھولا اور ایک بڑی سی دستاویز نکالی۔ پھر اپنے آنجہانی کلائنٹ کی بیوہ کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”سب سے پہلے تو میں اپنی اور اپنی فرم کی طرف سے مسٹر ہینڈرسن کی اچانک موت پر اظہارِ افسوس کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی شکریہ۔“ روتھ نے سر جھکا کر کہا۔

”ہم نے آپ کو آج صبح اس مقصد کے لیے تکلیف دی ہے تاکہ آپ کو آپ کے شوہر جواب اس جہانِ فانی سے کوچ کر چکے ہیں، ان کی وصیت کی تفصیلات سے آگاہ کر سکیں۔ اس کے بعد آپ ہم سے جو بھی سوال پوچھنا چاہیں پوچھ سکتی ہیں۔“

روتھ سن سی ہو گئی اور کانپنے لگی۔ آخر اینگس نے یہ بات اس سے کیوں چھپائی تھی کہ جائداد کے معاملات میں کچھ گڑبڑ ہے؟

وکیل نے وصیت کی پیش بندی کے بعد ترکے کی تفصیل کچھ یوں بیان کی۔ ”میں اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد اپنی بیوی روتھ کے نام کرتا ہوں، ماسوائے درج ذیل کے۔

(1) دو سو پاؤنڈز فی کس اپنے دونوں بیٹوں کے نام جسے میں چاہوں گا کہ وہ میری یاد میں کسی نیک کام میں صرف کریں۔

(2) پانچ سو پاؤنڈز اسکاٹش رائل اکیڈمی کے نام جس سے انہیں ایک اچھی سی پینٹنگ خریدنی ہے جو کہ لازمی طور پر ایک اسکاٹش پینٹر کے ہاتھ کی ہی بنی ہونی چاہیے۔

(3) ایک ہزار پاؤنڈز میرے پرانے جارج واٹسن کالج کے نام اور مزید دو ہزار پاؤنڈز ایڈنبرا یونیورسٹی کے نام۔ وکیل نے مزید کچھ اور چھوٹی چھوٹی رقوم کا ذکر کیا جنہیں اینگس نے مختلف لوگوں کے نام مختص کیا تھا اور آخر میں پانچ سو پاؤنڈز کاٹیج اسپتال کے نام تھے جہاں پر آخری ایام میں اینگس کی خوب اچھی طرح سے دیکھ بھال کی گئی تھی۔

سینئر وکیل نے روتھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کے پاس کوئی سوالات ہیں مسز ہینڈرسن جن کے جواب ہم دے سکیں؟ یا آپ بھی اپنے آنجہانی شوہر کی طرح اپنے تمام قانونی معاملات کی دیکھ بھال ہم سے ہی کروانا چاہیں گی؟“

”سچ کہوں تو مسٹر کریڈک...... اینگس نے کبھی اپنے کاروباری معاملات کے بارے میں مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ سو میں نہیں جانتی کہ اس ضمن میں کیا قانونی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ بس جب تک ہمارے لیے اتنا سرمایہ موجود ہو کہ جس سے میرے بیٹوں کا اور میرا گزارہ اسی طرح آرام سے ہوتا رہے جیسا کہ اینگس کی زندگی میں ہوتا تھا تو مجھے آپ کے قانونی معاملات سنبھالنے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

مسٹر کریڈک کی بغل میں بیٹھے پارٹنر نے کہا۔ ”مجھے مسٹر ہینڈرسن کا قانونی مشیر ہونے کا شرف حاصل رہا ہے جب سے وہ اس جزیرے پر تشریف لائے تھے، تقریباً سات سال قبل۔ مسز ہینڈرسن! اگر آپ اس سے متعلق کوئی سوال پوچھنا چاہیں تو مجھے آپ کو تمام صورتِ حال بتانے میں خوشی ہوگی۔“

”اوہ، یہ تو آپ کی بڑی مہربانی ہے مگر مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ مجھے آپ سے کیا سوال کرنا چاہیے ماسوائے اس

کے کہ میں جاننا چاہوں گی کہ میرے شوہر کے اثاثوں کی کل مالیت کیا ہوگی؟''

''یہ تو بہت ہی آسانی سے بتایا جاسکتا ہے۔'' مسٹر کریڈک بولے۔ ''کیونکہ انہوں نے نقد رقم تو کچھ خاص نہیں چھوڑی مگر دیگر جائداد اور اثاثوں کا اندازہ لگانا میری پیشہ ورانہ ذمے داریوں میں شامل ہے۔'' پھر اپنے سامنے رکھے فائلوں کے ڈھیر سے ایک فائل نکال کر کھولتے ہوئے دوبارہ سلسلۂ کلام شروع کیا۔ ''میرے محتاط اندازے کے مطابق تمام اثاثہ جات کی مالیت تقریباً ایک کروڑ اسی لاکھ سے دو کروڑ کے درمیان ہونی چاہیے۔''

''فرانک؟'' روتھ نے بے یقینی کے عالم میں پوچھا۔

''نہیں میڈم...... پاؤنڈز۔'' مسٹر کریڈک نے بڑے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

کافی غور وخوض کے بعد روتھ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اس خوش قسمتی سے ہاتھ لگی خطیر دولت کا کسی سے بھی ذکر نہیں کرے گی۔ اپنے بیٹوں سے بھی نہیں۔ اگلے ویک اینڈ جب وہ لندن گئی تو اس نے میکس کو وصیت کے بارے میں بھی بتایا۔

''تو کیا کچھ حیران کن انکشافات بھی ہوئے؟'' میکس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، کچھ خاص نہیں۔ اینگس نے ہمارے بیٹوں کے نام چند سو پاؤنڈز چھوڑے ہیں اور تمہارے توسط سے ملے وہ ایک لاکھ پاؤنڈز ہیں جو کہ اس ایڈریان والے بنگلے کو فروخت کرکے ملے تھے۔ بس دال دلیا چلتا رہے گا۔ ویسے بھی میں کوئی بہت زیادہ فضول خرچ عورت نہیں ہوں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنا کام کاج تو جاری رکھنا پڑے گا۔ اگر تم اب بھی مجھ سے شادی کے خواہش مند ہو تو......''

''پہلے سے بھی زیادہ میری جان۔ ویسے بھی میں اینگس کے چھوڑے ہوئے مال پر عیش کرنے کے خیال پر ہی لعنت بھیجتا ہوں۔ اور ہاں میرے پاس تمہارے لیے ایک خوش خبری بھی ہے۔'' میکس بولا۔ ''میری کمپنی نے اگلے سال جرسی میں اپنا برانچ آفس کھولنے کی ذمے داری مجھے سونپی ہے۔ میں نے ان سے یہ کام کرنے کی ایک ہی شرط رکھی ہے۔''

''اور وہ شرط کیا ہے؟'' روتھ نے بے صبری سے پوچھا۔

''وہ یہ کہ اگر وہاں کی ایک مقامی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہوجائے۔''

روتھ وارفتگی کے ساتھ اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ اسے وہ شخص مل گیا ہے جس کے ساتھ وہ اپنی بقیہ تمام زندگی بسر کرنا چاہے گی۔

☆☆☆

میکس اور روتھ کی شادی چیلسی کے رجسٹرار کے دفتر میں تین ماہ بعد انجام پائی جس میں صرف روتھ کے دونوں بیٹے بطور گواہان کے موجود تھے اور وہ بھی کچھ کھنچے کھنچے سے ہی تھے۔ ''وہ کبھی ہمارے والد کی جگہ نہ لے پائے گا۔'' بین نے اپنی ماں سے جذباتی انداز میں کہا تھا جبکہ نکولس نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''فکر نہ کرو۔'' میکس نے انہیں ائرپورٹ لے جاتے ہوئے کہا۔ ''وقت کے ساتھ تمہارے تمام خدشات دور ہوجائیں گے۔''

جب وہ ہیتھرو ائرپورٹ سے ہنی مون پر روانہ ہوئے تو روتھ نے اس بات پر قدرے مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ ان کی شادی میں میکس کے کسی دوست یا ساتھی نے شرکت نہ کی تھی۔

''دراصل اینگس کی وفات کے اتنے کم عرصے کے بعد ہماری شادی سے طرح طرح کے شکوک وشبہات جنم لے سکتے ہیں اور یہ میں کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا۔'' میکس نے اسے مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ عقل مندی کا تقاضا یہی ہوگا کہ میں کچھ عرصے کے بعد ہی تمہیں لندن میں اپنے عزیز واقارب سے متعارف کراؤں۔'' یہ کہتے ہوئے میکس نے محبت کے ساتھ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ روتھ کے تمام خدشات میکس کی باتیں سن کر دور ہوگئے اور وہ مکمل طور پر پرسکون ہوگئی۔

اٹلی کے شہر وینس میں جہاز کے اترتے ہی وہ موٹر بوٹ کے ذریعے سینٹ مارک اسکوائر کے قریب ایک ہوٹل میں پہنچ گئے۔ وہاں ہر چیز بڑی نفاست کے ساتھ آراستہ تھی۔ روتھ کو یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ اس کا نیا شوہر اسے گھنٹوں ملبوسات اور دیگر فیشن کی اشیا کی دکانوں میں شاپنگ کرانے سے بالکل نہیں گھبراتا تھا۔ اس میں ایسے ملبوسات بھی شامل تھے جو روتھ کے نزدیک خاصے بیش قیمت تھے۔ پورا ہفتہ گنڈولا نامی ناؤ نما کشتیوں میں مکمل آرام وسکون کے ساتھ کئی کئی گھنٹے سیر کرنے میں گزارے جس کے بیچ میکس ایک لمحے کو بھی روتھ سے جدا نہ ہوا۔

جمعے کے روز میکس نے ٹیکسی کرائے پر لی اور اپنی نئی نویلی دلہن کو جنوبی اٹلی کے شہر فلورنس لے گیا جہاں دونوں

نے وہاں کے مشہور تاریخی مقامات کی سیر کی۔ شام کو خوب پاستا کھاتے اور مارکیٹ اسکوائر کے بیچوں بیچ رقص کرنے والے سیاحوں میں شامل ہوجاتے۔ کبھی کبھی تو وہ جب ہوٹل واپس آتے تو صبح کی سپیدی نمایاں ہورہی ہوتی۔ تیسرے ہفتے وہ روم روانہ ہوگئے جہاں پر ہوٹل کے بیڈروم، اوپیرا ہاؤس اور تاریخی ویٹیکن سٹی میں ان کا بیشتر وقت گزرا غرضیکہ تین ہفتے پلک جھپکنے میں بیت گئے۔

وہ اپنے بیٹوں کو باقاعدگی سے خط لکھتی۔ رات کو سونے سے پہلے دن کا تمام احوال ان کو خط کی صورت میں گوش گزار کرتی۔ خاص طور پر یہ کہ اس کا وقت کتنا اچھا گزر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ میکس کی تعریفوں کے پل باندھتی تاکہ دونوں بیٹے اسے اپنے باپ کی حیثیت میں قبول کرلیں مگر اسے اس بات کا احساس بھی تھا کہ ایسا ہونے میں کافی وقت درکار ہوگا۔

جب روتھ اور میکس جرسی واپس لوٹے تو میکس کا انداز ویسا ہی گرم جوش اور والہانہ تھا۔ روتھ کے لیے اب فکر کی بات بس ایک ہی تھی کہ میکس کو ابھی تک اپنی کمپنی کا ذیلی دفتر کھولنے کے لیے کوئی مناسب جگہ نہ مل پائی تھی۔ وہ روزانہ تقریباً صبح دس بجے گھر سے نکلتا مگر زیادہ وقت شہر کے بجائے گالف کلب ہی میں گزارتا۔

"بھئی تعلقات بنانے پڑتے ہیں۔" وہ ہمیشہ یہی وجہ بیان کرتا۔ "کیونکہ ایک بار برانچ آفس کھل جائے گا تو یہی تعلقات کام آئیں گے۔"

"مگر ایسا ہوگا کب؟" روتھ نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"بس اب زیادہ دیر نہیں ہے۔" وہ تسلی دیتا۔ "تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ میرے کاروبار میں سب سے اہم چیز مناسب جگہ کا انتخاب ہی ہوتا ہے اور اچھی جگہ کے لیے اگر تھوڑا انتظار بھی کرنا پڑ جائے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہوتا۔"

مگر جیسے جیسے ہفتے گزرتے گئے تو روتھ کو تشویش لاحق ہوتی گئی۔ جب بھی وہ اس موضوع پر کوئی بات شروع کرتی تو وہ اسے یہ کہہ کر چپ کرادیتا کہ وہ چخ چخ کرنے والی بیوی بنتی جارہی ہے۔ نتیجتاً وہ کم از کم ایک ماہ تک اس بات کا دوبارہ تذکرہ نہ کرتی۔

جب ان کی شادی کو چھ ماہ گزر گئے تو روتھ نے تجویز دی کہ کیوں نہ وہ ایک ویک اینڈ لندن میں گزار آئیں۔ "اس طرح مجھے تمہارے کچھ دوستوں سے بھی ملنے کا موقع مل جائے گا۔ تھیٹر وغیرہ بھی دیکھیں گے اور تم اپنی کمپنی کو اپنی کارکردگی کی رپورٹ بھی دے دینا۔" مگر ہر دفعہ میکس کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر اسے ٹال دیتا۔ البتہ یہ وعدہ اس نے ضرور کیا کہ اپنی شادی کی پہلی سالگرہ وہ وینس واپس جاکر ہی منائیں گے۔

روتھ نے سوچا تھا کہ دو ہفتوں کی چھٹیاں ان کی حسین یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کافی ہوں گی اور شاید میکس کو بھی ایسی کوئی تحریک مل جائے کہ جرسی واپس لوٹنے پر وہ اپنے آفس کے لیے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کر ہی ڈالے مگر حالات کچھ یوں بنے کہ ان چھٹیوں میں اور ہنی مون میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ پہلے تو جب وہ جہاز سے وینس اترے تو وہاں پر موسلا دھار بارش ہورہی تھی اور وہ ایک لمبی قطار میں کھڑے ٹیکسی کا انتظار کرتے رہے کیونکہ چلنے سے پہلے ایسا کوئی بندوبست نہ کیا تھا۔ جب ہوٹل پہنچے تو روتھ پر انکشاف ہوا کہ میکس نے ہوٹل میں بکنگ ہی نہیں کرائی تھی۔ یہ سوچ کر کہ روتھ نے اپنے تئیں ایسا کرلیا ہوگا۔ بلاوجہ بے چارے منیجر پر میکس نے گرج برس کر اپنا غصہ اتارا اور پھر تیز تیز قدموں سے ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ پھر وہ تیز بارش میں اپنے سامان سمیت ایک گھنٹا بھیگتے پھرے اور آخرکار بڑی مشکل سے انہیں ایک چھوٹے سے معمولی ہوٹل میں جگہ ملی۔ وہ بھی شراب کے بار کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرا جس میں دو الگ الگ بیڈ لگے ہوئے تھے۔

شام کو شراب پیتے ہوئے میکس کو یاد آیا کہ وہ تو اپنا پرس اور کریڈٹ کارڈ جرسی ہی میں بھول آیا ہے۔ اس نے امید ظاہر کی کہ جرسی واپسی تک سفر کے تمام اخراجات روتھ کو اٹھانے پڑے تو وہ برا نہیں منائے گی۔ ویسے بھی اب تو تقریباً تمام بلز اور دیگر اخراجات وہ خود ہی برداشت کرتی تھی۔ نیز اس نے سوچا کہ شاید اس وقت اس بات پر کوئی بحث کرنا مناسب نہ ہوگا۔ پھر فلورنس میں ناشتے کے وقت روتھ نے جھجکتے ہوئے اس بات کا ذکر کیا کہ اسے امید ہے کہ جرسی پہنچتے ہی میکس کو اس کے آفس کے لیے کوئی موزوں جگہ مل جائے گی اور پھر معصومیت سے پوچھا کہ کیا میکس کے دفتر والے اس تاخیر پر اسے کچھ کہتے نہیں؟ میکس یکدم غصے میں آگیا اور چیختا چلاتا ہوا ناشتے کے بغیر ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ روتھ کی روز روز کی چخ چخ سے تنگ آچکا ہے پھر اس دن تمام وقت میکس نے باہر گزارا اور روتھ کو شکل نہ دکھائی۔

روم میں بھی تقریباً سارا وقت بارش ہوتی رہی اور میکس کے تیور بھی بگڑے رہے۔ کبھی کبھی تو وہ صبح کو باہر نکل

جاتا اور جب واپس لوٹتا تو روتھ سو چکی ہوتی۔

جب جہاز نے جرسی کے لیے اڑان بھری تو روتھ نے سکھ کا سانس لیا۔ گھر واپس لوٹنے کے بعد روتھ میکس سے بڑی نپی تلی بات کرتی اور کوشش کرتی کہ ہر طرح سے اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ خاص طور پر اس کے کام کی سست رفتاری کا بالکل کوئی تذکرہ نہ کرے۔ مگر اس کی لاکھ کوشش کے باوجود میکس یا تو منہ بسورے بیٹھا رہتا یا پھر بلاوجہ غصے میں بپھر جاتا۔ ہر گزرتے ماہ کے ساتھ ان کے درمیان حائل خلیج بڑھتی گئی اور کچھ عرصے بعد تو روتھ نے پوچھنا ہی چھوڑ دیا کہ میکس کے برانچ آفس کا کیا بنا؟ اسے کافی عرصے سے یہ احساس ہو چلا تھا کہ میکس کے دفتر کھولنے کا تمام ارادہ ہی چوپٹ ہو چکا تھا اور کبھی تو یہ خیال بھی اس کے دل میں آتا کہ آیا ایسا کوئی کام میکس کے ذمے تھا بھی یا نہیں؟

پھر ایک دن ناشتے کے دوران میکس نے اچانک ہی یہ اعلان کیا کہ اس کی کمپنی نے جرسی میں برانچ آفس کھولنے کا منصوبہ ہی ترک کر دیا ہے اور اسے خط کے ذریعے مطلع کر دیا ہے کہ اگر وہ کمپنی میں پارٹنر رہنا چاہتا ہے تو اسے لندن واپس آکر اپنی جگہ سنبھالنی پڑے گی۔

''اور اگر تم انکار کر دو تو؟'' روتھ نے پوچھا۔ ''کیا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے؟''

''نہیں، انہوں نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے کہ دوسری صورت میں مجھے پارٹنر شپ سے مستعفی ہونا پڑے گا۔''

''مجھے تو لندن منتقل ہونے میں کوئی دقت نہیں ہے۔'' روتھ نے صلاح دی۔ اس امید میں کہ شاید اسی طرح ان کی ازدواجی مشکلات کا کوئی حل نکل سکے۔

''نہیں۔ میرا نہیں خیال کہ اس کی کوئی ضرورت ہوگی۔'' میکس نے اس انداز میں کہا جیسے وہ پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ مشکل کا حل کیسے نکالنا ہے۔

''میرے خیال میں بہتر رہے گا کہ اگر میں ہفتے کے دوران لندن میں رہوں اور ویک اینڈ پر تمہارے پاس جرسی آجایا کروں۔'' میکس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ روتھ کے نزدیک یہ کوئی بہتر حل نہیں تھا مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس بارے میں میکس سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میکس اگلے ہی روز لندن روانہ ہو گیا۔

روتھ تو بھول چکی تھی کہ آخری مرتبہ کب انہوں نے کوئی پیار محبت بھری بات کی تھی۔ جب میکس شادی کی دوسری سالگرہ کے لیے جرسی نہ آیا تو روتھ نے دکھی دل کے ساتھ جیرالڈ پریسکوٹ کی طرف سے ڈنر کی دعوت کو قبول کر لیا۔

بچوں کا پرانا ہیڈ ماسٹر ہمیشہ کی طرح نرم خو اور خوش مزاج تھا اور جب وہ تنہا تھے تب بھی اس نے بس روتھ کے گال پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ روتھ نے اپنے تیزی سے بگڑتے ازدواجی مسائل کے متعلق اس سے رائے لینے کا سوچا۔ جیرالڈ نے روتھ کی بات کو بڑی توجہ سے سنا اور کئی مرتبہ دھیرے سے سر کو ہلایا۔ جب روتھ نے ٹیبل کی دوسری جانب سے اپنے پرانے دوست کی جانب دیکھا تو پہلی دفعہ اس کے ذہن میں طلاق کا خیال آیا مگر اس نے فوراً ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

میکس جب اگلے ہفتے گھر لوٹا تو روتھ نے خاص طور پر انتظام کیا تھا۔ صبح جا کر شاپنگ کی تاکہ میکس کے دل پسند پکوان کے لیے گوشت، تازہ سبزیاں اور دیگر اشیاء خرید سکے اور ساتھ ہی ایک قیمتی شراب کی بوتل بھی۔ اپنے پہننے کے لیے اس نے وہ لباس منتخب کیا جو میکس نے پہلی دفعہ وینس میں اس کے لیے پسند کیا تھا۔ پھر خود گاڑی ڈرائیو کر کے اسے ائرپورٹ لینے چلی گئی۔ وہ اپنی معمول کی فلائٹ پر نہ آیا جب دو گھنٹے بعد میکس لاؤنج سے باہر آیا تو یہی کہا کہ ہیتھرو پر دیر ہو گئی تھی۔ اس نے روتھ سے اتنی دیر انتظار کروانے کے لیے معذرت کرنے کی تکلیف بھی نہ کی۔

پھر جب وہ گھر پہنچے اور کھانا کھانے بیٹھے تو اس نے کھانے، شراب اور روتھ کے لباس، کسی پر بھی کسی قسم کے تعریفی کلمات ادا کرنے کی زحمت نہ کی۔ جب روتھ کھانے کی چیزیں سمیٹ کر اور دیگر کاموں سے فارغ ہو کر اوپر آئی تو بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ میکس گہری نیند سو چکا تھا۔

ہفتے کا سارا دن میکس نے گالف کلب میں گزارا اور اتوار کو دوپہر کی فلائٹ سے واپس لندن چلا گیا۔ ائرپورٹ پر روانگی سے قبل اس کے الفاظ یہی تھے کہ وہ نہیں جانتا کہ پھر کب واپسی ہوگی۔ روتھ کو دوبارہ طلاق کا خیال آیا۔

☆☆☆

جیسے جیسے ہفتے گزرتے رہے، لندن سے بس کوئی اِکّا دُکّا فون کال ہی آتی یا پھر کبھی کبھار کسی ویک اینڈ پر میکس کا آنا ہوتا۔ بس خانہ پری کے لیے۔ روتھ نے جیرالڈ پریسکوٹ کے ساتھ زیادہ وقت بتانا شروع کر دیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے درمیان معاملات بھی دور تک چلے گئے۔

''کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟'' اگلے روز جب وہ سو کر اٹھے تو روتھ نے جیرالڈ کو کپڑے پہنتے دیکھ کر سوال کیا۔

''مگر تم تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہو۔'' جیرالڈ نے

نہایت دھیمے لہجے میں اسے یاد دلایا۔
''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہماری شادی بس اب نام ہی کی حد تک رہ گئی ہے اور یہ صورتِ حال کافی عرصے سے ہے۔ دراصل میں میکس کے حسن و جمال اور سحر انگیز شخصیت سے بہت جلد متاثر ہو گئی تھی اور بالکل ایک اسکول گرل کی طرح اس پر لٹو ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں نے دوسری شادی میں جلد بازی کرنے کے موضوع پر ڈھیر سارے ناول اور کتابیں پڑھ رکھی ہیں۔''
''ارے لڑکی مجھے موقع ملے تو میں تو کل ہی تم سے شادی کر ڈالوں۔'' جیرالڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم تو جانتی ہو کہ میں تو پہلی نظر میں ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔''
''اچھا...... تو چلو میں بھی تمہاری شادی کی پیشکش کو قبول کرتی ہوں۔'' روتھ نے ہنس کر اپنے عاشق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب جب بھی دوبارہ میکس جرسی آیا تو میں اس سے طلاق کے بارے میں ضرور بات کروں گی۔''
مگر میکس کو جرسی آنے میں ایک مہینا لگا اور اگرچہ اس دن بھی اس نے رات دیر گئے کی فلائٹ سے آنا ہی مناسب سمجھا مگر گھر میں داخل ہوتے ہی اس نے روتھ کو اپنا منتظر پایا۔ جب اس نے روتھ کا بوسہ لینے کی کوشش کی تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور پھر بڑے نپے تلے انداز میں بولی۔ ''مجھے تم سے طلاق چاہیے۔''
میکس ایک لفظ کہے بغیر اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم تک آیا اور ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ گم صم بیٹھا رہا اور روتھ اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ بالآخر اس نے سوال کیا۔ ''کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے؟''
''ہاں!'' روتھ نے سرد مہری سے جواب دیا۔
''کیا میں اسے جانتا ہوں؟''
''ہاں۔''
''جیرالڈ؟'' اس نے روتھ کی طرف گھورتے ہوئے پوچھا۔
''ہاں۔''
ایک مرتبہ پھر میکس سوچوں میں گم ہو گیا۔
''چلو میں تمہارے لیے راستہ آسان کیے دیتی ہوں۔'' روتھ نے کہا۔ ''تم مجھے جیرالڈ سے ناجائز تعلقات رکھنے کے سبب بدچلنی کی بنا پر طلاق دے سکتے ہو اور میں اس پر عدالت میں کوئی پس و پیش نہ کروں گی۔''
میکس کا جواب سن کر روتھ کو کافی حیرانی ہوئی۔ وہ بولا۔ ''مجھے اس بارے میں سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے اور شاید بہتر ہوگا اگر ہم اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے بیٹوں کے کرسمس کی چھٹیوں پر گھر آنے کا انتظار کر لیں۔''
نہ چاہتے ہوئے بھی روتھ مان تو گئی مگر اسے اس بات پر تعجب بھی ہوا کہ میکس نے اس کے بیٹوں کا ذکر کیا کیونکہ اسے نہیں یاد تھا کہ آخری مرتبہ کب میکس نے ایسا کیا تھا۔
میکس نے وہ رات گیسٹ روم میں گزاری اور اگلے ہی دن صبح کو لندن لوٹ گیا۔ اپنے دو بڑے بڑے سوٹ کیسوں کے ہمراہ۔ پھر اس کے بعد کئی ہفتوں تک اس کا جرسی آنا نہ ہوا جس دوران روتھ اور جیرالڈ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق پروگرام بناتے رہے۔

غلط فہمی

ایک عورت نے اپنی سہیلی کی بہادری سے متاثر ہو کر کہا۔ ''تم نے واقعی بہادری دکھائی کہ ایک چور پر ایسے پل پڑیں۔''
سہیلی نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ کب پتا تھا کہ یہ چور ہے۔ میں تو سمجھی تھی کہ میرا شوہر دیر سے گھر آیا ہے۔''
انتخاب۔ آمنہ ریاض، ملتان

پہلا آدمی دوسرے آدمی سے۔ ''تم شادی سے پہلے کیا کرتے تھے۔''
دوسرا آدمی روتے ہوئے۔ ''جو میرا دل کرتا تھا۔''

☆☆☆

سردار بیٹے کی برات لے کر گیا تو دلہن کا باپ بولا۔ ''آپ نے تو کہا تھا کہ صرف پچاس بندے ہوں گے۔ آپ کے ساتھ تو دو سو بندے ہیں۔''
سردار۔ ''بندے تے پچاس ای نیں، باقی سارے تے چول نیں۔''
مرسلہ۔ اسد عباس، چک نمبر 41، شمالی سرگودھا

استاد۔ ''کل تم نے چھٹی کیوں کی؟''
اسٹوڈنٹ۔ ''سر گھر میں مہمان آئے تھے۔''
استاد۔ ''oh i see''
اسٹوڈنٹ۔ ''او آئی ہوندی تے میں اج وی نہیں سی آنا۔''
مرسلہ۔ اسد عباس، چک نمبر 41، شمالی سرگودھا

جب روتھ کے دونوں بیٹے کرسمس کی چھٹیوں میں گھر آئے تو یہ سن کر کہ ان کی ماں اپنے نئے شوہر سے طلاق لے رہی ہے، نہ تو کوئی حیرانی ہوئی نہ ہی کوئی تشویش۔ میکس نے تو کرسمس پر گھر آنے کا تکلف ہی نہ کیا مگر روتھ کے بیٹوں کے واپس یونیورسٹی لوٹ جانے کے اگلے ہی دن وہ گھر آ گیا۔ وہ بذریعہ ٹیکسی گھر پہنچا اور صرف ایک گھنٹا وہاں ٹھہرا۔ ''میں طلاق کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے روتھ سے کہا۔ ''اور میں نے سوچا ہے کہ لندن پہنچتے ہی اس بارے میں قانونی کارروائی شروع کر دوں گا۔'' روتھ نے صرف سر ہلا کر اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔

''اگر تم چاہتی ہو کہ سب کچھ جلد از جلد اور سہولت سے طے پا جائے تو میرا مشورہ یہ ہوگا کہ تم بھی لندن ہی کے کسی وکیل کی خدمات حاصل کر لو۔ اس طرح مجھے بار بار جرسی کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے جس سے صرف دیر ہی لگے گی۔''

روتھ کو اس کی اس تجویز پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ میکس کی راہ میں کوئی دشواری حائل کیے بغیر اس رشتے سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ میکس کے لندن جانے کے چند روز بعد ہی روتھ کو طلاق کے کاغذات لندن کے ایک وکیل کی جانب سے موصول ہوئے۔ روتھ نے اس وکیل کے بارے میں کچھ نہ سن رکھا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایتھنس کے ایک پرانے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ساتھ میں یہ بھی تاکید کی کہ وہ اس قصے کو جلد از جلد ختم کرنا چاہتی ہے۔

جب اس سلسلے میں کورٹ کی جانب سے آخری ڈگری وصول ہوئی تو جیرالڈ نے تجویز دی کہ اس بات کا تو جشن منانا چاہیے، کہیں اچھی سی چھٹیاں گزار کر۔ روتھ نے تجویز کو کھلے دل سے سراہا مگر جانے کے لیے بس ایک ہی شرط رکھی اور وہ یہ کہ کہیں بھی جائیں گے مگر اٹلی کے آس پاس بھی نہیں پھٹکیں گے۔

''تو کیوں نہ بذریعہ کشتی یونانی جزائر کی سیر کی جائے؟'' جیرالڈ نے تجویز دی۔ ''اس طرح اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں رہے گا کہ ہمیں میرے کسی طالب علم یا اس کے والدین کا سامنا کرنا پڑ جائے۔'' اگلے ہی روز وہ ایتھنز کے لیے روانہ ہو گئے۔

جب وہ اسکائروس کی بندرگاہ پر پہنچے تو روتھ نے کہا۔ ''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی شادی کی تیسری سالگرہ کسی دوسرے آدمی کے ساتھ گزاروں گی۔''

جیرالڈ نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''اب میکس کو بھولنے کی کوشش کرو۔ وہ ایک قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔''

''ہاں تقریباً۔'' روتھ آہستہ سے بولی۔ ''میں نے سوچا تھا کہ طلاق سے متعلق تمام امور بخیر و خوبی طے پا جاتے تو اس کے بعد ہی جرسی سے کہیں باہر جاتی۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ آخر اب اتنی مزید دیر کس وجہ سے ہو رہی ہے؟'' جیرالڈ نے پوچھا۔

''خدا ہی بہتر جانتا ہے۔'' روتھ نے جواب دیا۔ ''مگر جو بھی وجہ ہوگی، اس کا علم میکس ہی کو ہوگا۔'' پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ میں نے آج تک میکس کا مے فیئر کا دفتر دیکھا تک نہیں اور نہ ہی اس کے کسی دوست اقارب سے ملی۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب میرے تخیل ہی کا حصہ تھا۔''

''ہاں یا پھر میکس کے تخیل کا!'' جیرالڈ نے اس کی کمر کے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''مگر اب میکس کے بارے میں مزید باتیں کر کے وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ یونانیوں کے بارے میں کچھ بات کرتے ہیں۔'' اگلے تین ہفتے انہوں نے یونانی جزائر کے اطراف میں کشتی رانی کرنے میں گزارے۔

تفریح کے یہ شب و روز بہت ہی لطیف تھے کیونکہ جیرالڈ کشتی رانی میں بے حد ماہر تھا۔ روتھ کو تو حیرت ہوتی کہ کیسے وہ طوفانی لہروں کے بیچ بھی ہنستا مسکراتا رہتا ہے۔

جب وہ جرسی واپس پہنچے تو جیرالڈ روتھ کو گھر چھوڑنے آیا۔ روتھ نے جب دروازہ کھولا تو ڈاک کے ایک انبار نے اس کا استقبال کیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور سوچا کہ اس سب کو تو شام تک انتظار کرنا ہی پڑے گا۔

روتھ نے وہ رات کروٹیں بدل کر گزاری۔ آخرکار نیند کے چند پل اس کے حصے میں آ ہی گئے۔ بیدار ہونے پر اس نے سوچا کہ چائے کا ایک کپ بنایا جائے۔ ساتھ ہی اس نے خطوط کے ڈھیر کو دیکھنا شروع کیا۔ پھر ایک موٹے سے پیکٹ پر اس کی نظر جم گئی جس پر فوری اور پرائیوٹ لکھا تھا اور پوسٹ مارک لندن کا تھا۔ روتھ نے بے صبری سے اسے کھولا اور ایک دو دستاویز نکالیں جسے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''ایک حتمی طلاق قرار پاتی ہے درج ذیل دو فریقین کے مابین۔ (1 مسٹر میکس ڈونالڈ بینٹ...... اور (2 مسز روتھ ایتھل بینٹ'' چلو یہ قصہ تو اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوا۔'' روتھ نے بہ آوازِ بلند کہا اور جیرالڈ کو

فون کیا تا کہ اسے بھی یہ خوش خبری سنا سکے۔

''مایوس کن۔'' جیرالڈ نے کہا۔

''مایوس کن؟ کیوں؟'' روتھ نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں میری جان کیونکہ تم کو تو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ میری عزت وتکریم میں کس قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ جب سے میرے اسکول کے طالب علموں کو اس بات کا پتا چلا ہے کہ میں ایک شادی شدہ خاتون کے ساتھ چھٹیاں گزار کر آیا ہوں۔''

روتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''جیرالڈ! تمیز کرو اور اب تم ایک شریف اور عزت دار شادی شدہ آدمی بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''ارے میں تو اور انکار کر ہی نہیں سکتا۔'' اس نے کہا۔ ''مگر اب مجھے جانا ہوگا کیونکہ گناہ کی زندگی گزارنا ایک بات ہے اور اسکول کی اسمبلی میں صبح کی عبادت میں شریک ہونا دوسری۔''

روتھ باتھ روم گئی اور وزن کی مشین پر کھڑی ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے کانٹے کی سوئی جہاں جا کر رکی، وہ مقام دیکھ کر اس نے ایک دکھ بھری آہ بھری اور فیصلہ کیا کہ اس دن وہ کم از کم ایک گھنٹا جم میں گزارے گی۔ جیسے ہی وہ نہانے کے لیے جانے لگی تو فون کی گھنٹی بجی۔ وہ تولیا لپیٹ کر باہر آئی اور سوچنے لگی کہ یہ یقیناً جیرالڈ ہی ہوگا۔

''گڈ مارننگ مسز بینٹ!'' دوسری طرف سے ایک نہایت مہذب آواز آئی۔ وہ سوچنے لگی کہ وہ اس نام سے کس قدر نفرت کرنے لگی تھی۔ ''میں کریڈک بول رہا ہوں میڈم۔ میں گزشتہ تین ہفتوں سے آپ سے رابطہ کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہوں۔''

''اوہو مجھے یہ سن کر افسوس ہوا۔'' روتھ بولی۔ ''مگر میں یونانی جزائر پر تعطیلات گزار کر گزشتہ شب ہی واپس لوٹی ہوں۔''

''اوہ میں سمجھا، چلیے اب تو ہم مل سکتے ہیں...... کسی مناسب وقت پر؟'' اس نے روتھ کی سیر وتفریح میں کوئی دلچسپی ظاہر نہ کرتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، کیوں نہیں مسٹر کریڈک۔ میں آپ کے دفتر بارہ بجے تک پہنچ سکتی ہوں۔'' روتھ نے کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو۔''

''آپ جس وقت بھی تشریف لانا چاہیں ہمارے لیے مناسب ہے۔'' مسٹر کریڈک نے رسمی خوش مزاجی کے ساتھ کہا۔

روتھ نے اس روز جم میں خوب ورزش کی، اس مقصد کے ساتھ کہ یونان میں بڑھا ہوا وزن جلد از جلد کم کر سکے کیونکہ معزز شادی شدہ عورت وہ ہو نہ ہو مگر سلم اسمارٹ ضرور دکھنا چاہتی تھی۔ جب وہ ورزش سے فارغ ہوئی تو گھڑی کی سوئیاں بارہ کے قریب تھیں۔ اس نے بھاگم بھاگ لاکر روم سے کپڑے نکالے اور غسل کے بعد کپڑے تبدیل کر کے جلدی جلدی تیار ہوئی مگر پھر بھی جب وہ مسٹر کریڈک کے دفتر پہنچی تو بارہ پینتیس ہو چکے تھے۔ استقبالیہ پر موجود لڑکی ایک مرتبہ پھر اسے سینئر پارٹنر کے دفتر کی جانب لے گئی۔ جیسے ہی وہ دفتر میں داخل ہوئی تو مسٹر کریڈک کو بے صبری سے کمرے کا گشت کرتے پایا۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنا انتظار کرایا۔'' روتھ نے شرمندگی سے کہا۔ اسے دیکھ کر دونوں پارٹنر تعظیماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس مرتبہ مسٹر کریڈک نے اسے چائے کا پوچھے بغیر ہی ہاتھ کے اشارے سے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔ ساتھ ہی مسٹر کریڈک اور دوسرے پارٹنر بھی بیٹھ گئے اور پاس پڑی فائلوں کے ڈھیر سے ایک کاغذ نکالا۔

''مسز بینٹ! ہمیں آپ کے شوہر کے وکیل کی طرف سے یہ قانونی نوٹس موصول ہوا ہے جس میں انہوں نے مکمل تصفیے کا تقاضا کیا ہے۔ آپ کی طلاق ہو جانے کے بعد۔''

''ہم نے تو کبھی کسی تصفیے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔'' روتھ نے بے یقینی کی حالت میں جواب دیا۔ ''یہ تو کبھی معاہدے کا حصہ ہی نہیں تھا۔''

''وہ تو خیر ہوگا۔'' مسٹر کریڈک نے کاغذات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر بدقسمتی سے آپ نے طلاق کی وجہ اپنے ناجائز تعلقات کو بنایا کسی مسٹر جیرالڈ کے ساتھ......'' پھر نام کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''جیرالڈ پریسکوٹ کے ساتھ۔ جب آپ کے شوہر اپنے کام کے سلسلے میں لندن گئے ہوئے تھے۔''

''یہ تو صحیح ہے مگر ہم نے ایسا صرف اس لیے کیا تھا تا کہ طلاق سے متعلق معاملات تیزی سے نمٹ سکیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم دونوں ہی جلد از جلد طلاق حاصل کرنا چاہتے تھے۔''

''مجھے یقین ہے مسز بینٹ کہ ایسا ہی معاملہ ہوگا۔'' اسے اس نام سے شدید نفرت ہو چکی تھی۔

''مگر مسز بینٹ کی شرائط مان کر آپ نے انہیں اس کیس میں ایک بے قصور فریق بنا دیا ہے۔''

''مگر اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' روتھ نے پوچھا۔ ''کیونکہ آج صبح ہی مجھے اپنے لندن کے وکیل سے اس بات کا تصدیقی خط موصول ہو گیا ہے جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ ہماری طلاق مکمل طور پر اختتام پذیر ہو چکی ہے۔''

مسٹر کریڈک کے پارٹنر جوان کے پہلو میں بیٹھے تھے، روتھ کی جانب متوجہ ہوئے۔ ''کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ یہ مسٹر بینٹ ہی کی تجویز تھی کہ آپ طلاق کے معاملات کے لیے لندن کے ہی کسی وکیل کا انتخاب کریں؟''

''اوہ تو یہ معاملہ ہے۔'' روتھ نے سوچا۔ ''یہ وکیل صرف اس لیے پیچ و تاب کھا رہے ہیں کیونکہ میں نے ان کی خدمات حاصل نہیں کیں۔''

''جی ہاں۔'' اس نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ ''دیکھیے ہم نے ایسا صرف معاملات کو آسان بنانے کے لیے کیا تھا کیونکہ میکس اس وقت لندن میں مقیم تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے اس کیس کے سلسلے میں بار بار جرسی آنا جانا پڑے۔''

''بجا ارشاد فرمایا آپ نے۔ ایسا کرنے سے مسٹر بینٹ کے لیے تو بہت ہی آسانی ہو گئی۔'' سینئر پارٹنر نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کیا آپ کے شوہر نے بھی مالی تصفیے کے بارے میں کوئی بات کی؟''

''کبھی نہیں۔'' روتھ نے قدرے کرخت لہجے میں جواب دیا۔ ''اسے تو میری مالی حیثیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں تھا۔''

''مگر میرے اندازے کے مطابق تو......'' مسٹر کریڈک کے ساتھی وکیل نے جرح کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر بینٹ کو کافی اچھی طرح سے آپ کی مالی حیثیت اور آپ کے اثاثہ جات کی مالیت کا اندازہ تھا۔''

''مگر یہ ناممکن ہے۔'' روتھ نے اصرار کیا۔ ''میں نے تو اپنی دولت اور اثاثہ جات کے بارے میں کبھی اس سے ذکر ہی نہیں کیا۔''

''کچھ بھی ہو مگر انہوں نے آپ کے اوپر ایک دعویٰ دائر کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھلے آپ نے کبھی ان سے کچھ نہ کہا ہو مگر انہوں نے آپ کے آنجہانی شوہر کے اثاثوں کی مالیت کا بہت صحیح اندازہ لگایا ہے۔''

''تو آپ اسے لکھ بھیجیں کہ میں اسے اس میں سے ایک پائی بھی نہیں دینے والی کیونکہ یہ ہمارے معاہدے کا حصہ تھا ہی نہیں۔''

''میں مانتا ہوں کہ آپ صحیح فرما رہی ہیں مسز بینٹ مگر ساتھ ہی مجھے ڈر ہے کیونکہ طلاق میں قصوروار فریق آپ تھیں اس لیے اب ہمارے پاس دفاع کے لیے کوئی بھی طریقہ نہیں بچا۔''

''کک...... کیا مطلب؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' روتھ پر بجلی سی گر پڑی۔

''دیکھیے، جرسی میں تو اس کے متعلق قانون بہت ہی واضح ہے اور اگر آپ نے ہم سے پہلے رابطہ کر لیا ہوتا تو ہم آپ کو بہت بہتر طریقے سے مشورہ دے سکتے تھے۔'' مسٹر کریڈک نے کہا۔

''کک...... کیسا قانون؟'' روتھ نے پھر ہکلاتے ہوئے کہا۔

''جرسی کے قانون کے مطابق جب اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ طلاق کے معاملے میں ایک فریق مکمل طور پر بے قصور ہے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو وہ فریق اپنے آپ ہی دوسرے فریق کی جائداد اور اثاثوں میں ایک تہائی حصے کا حق دار ہو جاتا ہے۔''

یہ سنتے ہی روتھ تھر تھر کانپنے لگی۔ ''اور کیا اس سے کوئی استثنا نہیں مل سکتا؟'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ایک صورت میں استثنا مل تو سکتا ہے۔'' مسٹر کریڈک بولے۔ روتھ نے امید بھری نظروں سے ان کی جانب دیکھا۔

''اگر آپ کی شادی کی مدت تین سال سے کم ہو تو پھر یہ قانون لاگو نہیں ہوتا مگر مسز بینٹ آپ کی ازدواجی زندگی کی مدت تین سال اور آٹھ دن تھی۔'' پھر انہوں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے مسز بینٹ کہ مسٹر بینٹ کو نہ صرف آپ کی جائداد کی مالیت کے بارے میں آگاہی حاصل تھی بلکہ ان کو جرسی کے طلاق سے متعلق قوانین کے بارے میں بھی اچھی طرح علم تھا۔''

تین ماہ بعد جب دونوں اطراف کے وکیلوں نے روتھ کے تمام اثاثہ جات کی مالیت کے متعلق اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا تو میکس ڈونالڈ بینٹ کے نام ایک چیک جاری کیا گیا جس کی کل مالیت باسٹھ لاکھ ستر ہزار پاؤنڈز تھی۔ یہ اس کیس کے حتمی اور مکمل تصفیے کی رقم تھی۔

جب بھی روتھ گزرے ہوئے تین سالوں پر نگاہ ڈالتی تو اسی نتیجے پر پہنچتی کہ یقیناً میکس نے سب کچھ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ مکمل تفصیل کے ساتھ۔ ہاں، شاید ان کی پہلی ملاقات سے بھی پہلے......

انتہائی سادہ فطرت انسانوں میں چھپی کج روی کی دلخراش روداد

فرزندِ دروغ

ملک صفدر حیات

زن، زر اور زمین کے بعد اگر کسی جذبے کی بدولت حادثات جنم لیتے ہیں تو وہ حسد ہے... اور اگر یہ جذبہ رقیب کے دل میں جگہ بنالے تو دو میں سے کسی ایک کی زندگی کے لالے پڑ جاتے ہیں... وہ بھی اسی آگ میں جلتا رہا اور بالآخر اپنی ذات سے وابستہ باقی تمام رشتوں کو بھی جلا ڈالا... انسان کی سوچ کا یہ کرشمہ ہے، جو کرنے کی ٹھان لے اسے کر گزرتا ہے یہ اور بات کہ وہ مثبت اور منفی میں سے کس سمت کا انتخاب کرے۔ اگرچہ منفی اقدام کے اثرات سے بچنے کے لیے وہ بہت عقل لڑاتا ہے لیکن لہو اپنے قاتل کا پتا خود ڈھونڈ لیتا ہے۔

مطلع ابر آلود تھا۔ فضا میں ٹھنڈ رچی بسی تھی۔ وقفے وقفے سے آسمان پر بجلی بھی چمک اٹھتی تھی جیسے زمینی صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔ آسمان کی رونی شکل کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ اب تب میں وہ اپنے ضبط کے سارے بند کھول دے گا۔ اس ٹھنڈے موسم میں، میں تھانے میں بیٹھا امور تھانے داری نمٹا رہا تھا۔

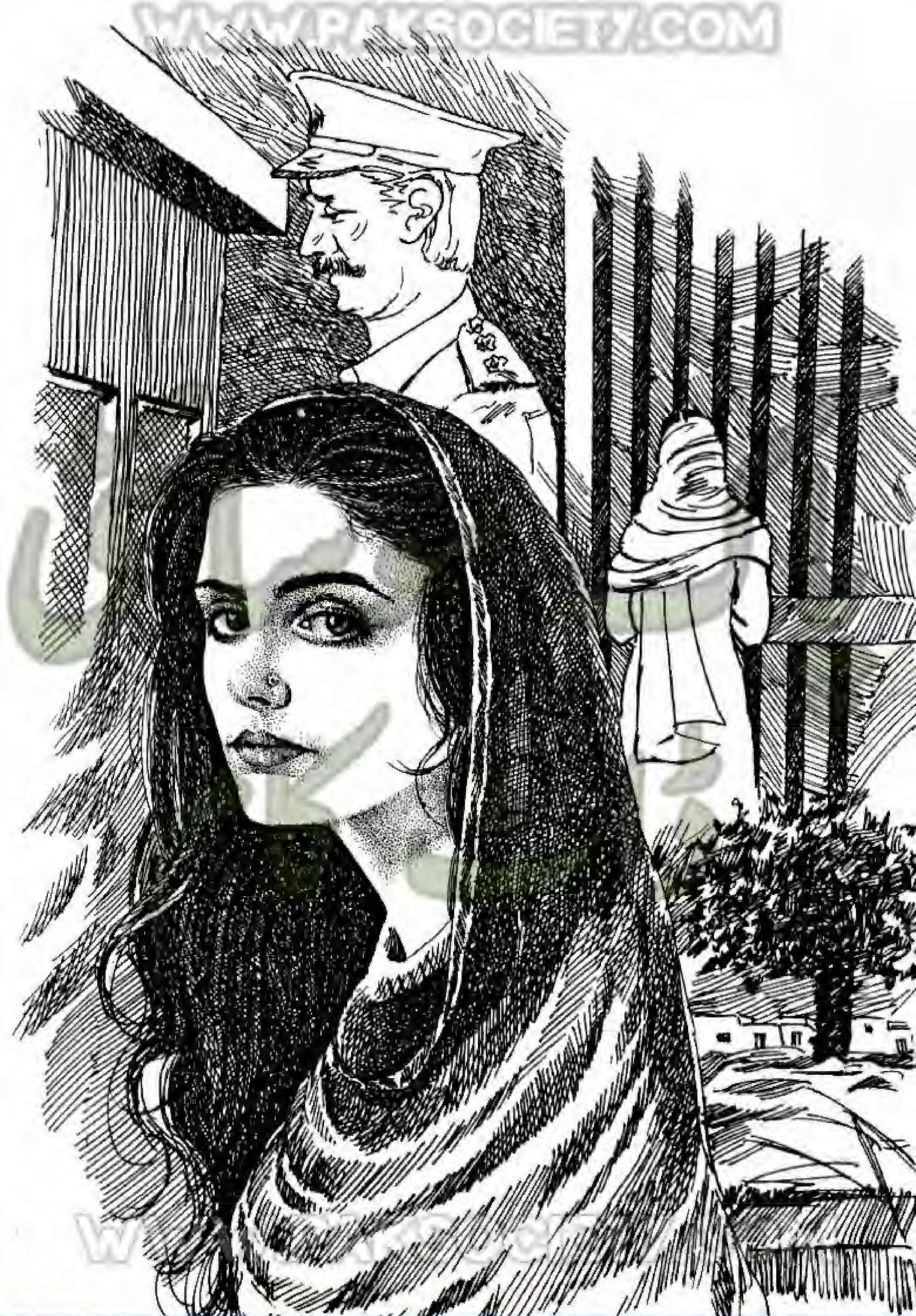
ان دنوں میری تعیناتی ضلع جھنگ کے ایک دور دراز قصبے میں تھی۔ مذکورہ قصبہ ریلوے لائن اور پکی سڑک کے درمیان واقع تھا اور اس کا باقاعدہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن بھی تھا جہاں پسنجر ٹرینیں دس پندرہ منٹ کے لیے رکا کرتی تھیں۔ وہ ماہ دسمبر کا آخری عشرہ تھا اور جیسا کہ میں نے بتایا، موسم کی خنکی اور یخ بستگی اپنے عروج پر تھی۔ ایسے میں اگر بارش شروع ہو جاتی تو خون کو رگوں میں جمنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

شام سے تھوڑی دیر پہلے، میں تھانے سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دو افراد میرے پاس آئے۔ ان میں ایک دراز قامت اور دوسرا پستہ قد تھا۔ دراز قامت دبلا پتلا جبکہ پستہ قد گٹھے ہوئے مائل بہ فربہی بدن کا مالک تھا۔ اس نے ہلکی سی ڈاڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ دونوں کے چہروں سے پریشانی مترشح تھی۔ میں نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے کہا اور باری باری ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ہاں بھئی...... کیا معاملہ ہے؟“

دراز قامت دبلے پتلے شخص نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ”جناب! میرا نام رحمت علی ہے۔ میں اپنی بیٹی کے لیے بہت پریشان ہوں۔“

”کیوں......“ میں نے رحمت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا ہوا ہے تمہاری بیٹی کو؟“

”تھانے دار جی! آسیہ گم ہو گئی ہے۔“ وہ فریادی لہجے میں بولا۔ ”میں نے پورا محلہ چھان مارا ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔“



میں جس قصبے میں تعینات تھا، مغل پورہ وہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں نے رحمت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تو تم مغل پورہ کے رہنے والے ہو؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' رحمت علی کے ساتھی نے جواب دیا۔ ''میں رحمت کا چھوٹا بھائی کرامت علی ہوں جی۔ ہم سب آسیہ کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ کچھ پتا نہیں چل رہا، وہ کہاں غائب ہوگئی ہے۔ ہم نے مغل پورہ اور اس کے اردگرد کا سارا علاقہ اچھی طرح دیکھ لیا ہے مگر اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ اب تھک ہار کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔''

''یہی تو سب سے بڑی خرابی ہے کہ لوگ تھکنے کے بعد تھانے اور پولیس کا رخ کرتے ہیں۔'' میں نے یکے بعد دیگرے دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ مسئلے کی ابتدا ہی میں ہم سے رجوع کرلیں تو ان کی جیت کے امکانات زیادہ روشن ہوجاتے ہیں خیر......'' میں نے لحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''آپ لوگوں کو کب پتا چلا کہ آسیہ غائب ہوچکی ہے؟''

''وہ جی آج دوپہر میں۔'' رحمت علی نے گلوگیر آواز میں بتایا۔

''کیا وہ گھر کے اندر سے غائب ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں جناب!'' رحمت علی دوٹوک انداز میں بولا۔ ''وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑے چھپڑ (جوہڑ) کی طرف گئی تھی۔ یہ لوگ مٹی نکالنے اکثر چھپڑ کی جانب جاتی رہتی ہیں۔ سب واپس آگئیں مگر آسیہ......'' بولتے بولتے رحمت علی کی آواز بھرا گئی اور وہ کندھے پر موجود رومال کی مدد سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگا۔

میں نے روئے سخن گمشدہ آسیہ کے چچا کرامت علی کی طرف پھیرتے ہوئے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ''آسیہ کی عمر کیا ہوگی؟''

''یہی کوئی بیس اکیس سال جناب۔'' اس نے بتایا۔

''کیا اس کی شادی ہوچکی ہے؟''

ننانوے فیصد امکان اس بات کا تھا کہ کرامت علی میرے سوال کا جواب نفی میں دے گا کیونکہ اگر آسیہ شادی شدہ ہوتی تو ان لوگوں کے ساتھ اس کا شوہر بھی موجود ہوتا۔ کرامت علی نے میرے اندازے کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ ''نہیں جناب! آسیہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی البتہ...... اس کی منگنی ہوچکی ہے۔ اگلے سال اس کی شادی کا ارادہ تھا۔''

''میں نے کرامت کے بیٹے لیاقت سے آسیہ کا رشتہ طے کیا تھا۔'' رحمت علی نے بتایا۔ ''کرامت ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اگلے سال ان کی شادی کا پروگرام تھا مگر اس سے پہلے ہی آسیہ کہیں گم ہوگئی ہے۔''

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر باری باری دونوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

''آسیہ اپنی جن سہیلیوں کے ہمراہ چھپڑ سے مٹی نکالنے گئی تھی کیا آپ لوگوں نے ان سے بھی پوچھ گچھ کی ہے؟''

''جی ہاں...... سب سے پوچھا ہے۔'' رحمت علی نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن ان سب کا کہنا یہی ہے کہ آسیہ چھپڑ کی طرف سے واپس آگئی تھی۔ کسی کو بھی اس کی گمشدگی کے بارے میں کچھ خبر نہیں۔''

''کسی کو کچھ خبر نہیں۔'' میں نے رحمت علی کے الفاظ دہرائے پھر سوال کیا۔ ''کیا آسیہ کی وہ سہیلیاں بھی مغل پورہ ہی میں رہتی ہیں؟''

''جی ہاں...... سب کے گھر آس پاس ہی ہیں۔''

''سب لڑکیاں گھر واپس آگئیں مگر آسیہ نہیں پہنچی۔'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''کہاں جاسکتی ہے وہ......!''

''تھانے دار جی!'' رحمت علی نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''آپ کسی بھی طرح میری آسیہ کو ڈھونڈ نکالیں جی۔ صغریٰ نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آسیہ کو زمین کھا گئی یا آسمان نے نگل لیا ہے......''

صغریٰ بی بی، رحمت علی کی بیوی اور آسیہ کی ماں تھی۔ آسیہ سے چھوٹے رحمت کے دو بیٹے تھے جن کے نام اور عمریں علی الترتیب کچھ یوں تھیں۔ توصیف بارہ سال اور احمد آٹھ سال۔ یہ معلومات بعد میں رحمت علی کی زبانی ہی مجھ تک پہنچی تھیں۔ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

''رحمت علی! مجھے تمہاری بیٹی کی گمشدگی کا سخت افسوس ہے اور میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ میں بہت جلد آسیہ کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے جی۔'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''لیکن تمہاری بیٹی کی بازیابی کے سلسلے میں مجھے تمہارے تعاون کی سخت ضرورت ہوگی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں سرکار۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''آپ حکم تو کریں۔''

''کیا آسیہ کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ بھی تھی؟''

''نہیں جی...... بالکل نہیں......!''

''اور تمہاری......؟''

''تھانے دار جی! بھائی صاحب بہت ہی امن پسند اور حلیم طبع انسان ہیں۔'' کرامت علی نے کہا۔ ''ان کی کسی سے بھی تلخ کلامی نہیں ہوئی تو دشمنی کیسے ہو سکتی ہے۔ گاؤں کے سب لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔''

میں آئندہ دس منٹ تک گھما پھرا کر مختلف زاویوں سے سوال کرتا رہا مگر آسیہ کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ بالآخر میں نے ان سے کہا۔

''تم دونوں گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے پاس آتا ہوں۔ مجھے وہاں کچھ ضروری کام ہے۔''

''کس قسم کا کام جناب؟'' چھوٹے بھائی کرامت علی نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''تم لوگ میرے پاس آسیہ کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئے ہو نا......'' میں نے باری باری ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اب میرا جو کام ہوگا، وہ آسیہ کی تلاش اور بازیابی کے سلسلے ہی میں ہوگا۔''

دونوں کے چہروں پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں نے مزید کہا۔ ''میں دراصل ان لڑکیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں جو آسیہ کے ساتھ مٹی نکالنے چھپڑ کی طرف گئی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں، ان میں سے کوئی آسیہ کے حوالے سے ضرور جانتی ہوگی۔''

''آپ کوشش کر کے دیکھ لیں جی۔'' رحمت علی نے مایوسی بھرے انداز میں کہا۔ ''ہمیں تو انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔''

''آسیہ کے ساتھ آج کتنی سہیلیاں چھپڑ پر گئی تھیں؟''

''تین جناب!'' کرامت علی نے جواب دیا۔

''عائشہ، رضوانہ اور خالدہ۔''

''ہوں......!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ان میں سے کون کون شادی شدہ ہے؟''

''کوئی بھی نہیں تھانے دار صاحب۔'' اس نے بتایا۔

''وہ تینوں کنواری ہیں۔''

''ٹھیک ہے......'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور ان تین لڑکیوں کو بھی بلا لو۔ میں کچھ دیر میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

ان دونوں بھائیوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

میں نے حوالدار دلاور خان کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔

''دلاور خان! ہم پندرہ بیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کے بعد تھانے سے نکلیں گے۔ تم ضروری تیاری کر لو۔''

''جانا کہاں ہے ملک صاحب؟'' دلاور خان نے اپنی کنگ سائز مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''مغل پورہ!'' میں نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی یہ دونوں بھائی جو آئے تھے نا، انہی کے گھر جانا ہے۔''

''اچھا اچھا......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ان میں سے کسی کی لڑکی گم ہو گئی ہے نا......''

''ہاں...... اسی سلسلے میں تفتیش کرنے جانا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ملک صاحب! آپ موسم دیکھ رہے ہیں نا......؟''

''ہاں دیکھ رہا ہوں۔'' میں نے گھور کر حوالدار کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟''

اس سے پہلے کہ حوالدار دلاور خان میرے سوال کا جواب دیتا، قصبے کی مسجد میں اذانِ مغرب کی صدا بلند ہوئی۔ میں نے حوالدار کو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں نے رحمت علی اور کرامت علی کو تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر تھانے سے رخصت کر دیا تھا۔ میں چاہتا تو ان کے ساتھ بھی مغل پورہ جا سکتا تھا لیکن میں محض مغرب کی نماز کی خاطر رک گیا تھا۔ آسیہ کی گمشدگی والا معاملہ ایسا ہنگامی نوعیت کا نہیں تھا کہ گھنٹے، آدھے گھنٹے کی تاخیر سے کوئی خاص فرق پڑ جاتا۔ اگر میں بھی ان کے ساتھ ہی نکل کھڑا ہوتا تو مغرب کی نماز راستے ہی میں ہو جاتی۔

☆☆☆

جب ہمارا تانگا مغل پورہ میں داخل ہوا تو برفانی رات کا سیاہ ریشمی اندھیرا ہر شے کو اپنی آغوش میں سمیٹ چکا تھا۔ ماحول میں ایک عجیب سا سوگوار سناٹا تھا تاہم اس کے ساتھ ہی آسمان کے تیور بھی خاصے خطرناک نظر آتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ بارش کسی بھی لمحے شروع ہو سکتی ہے۔

کرامت علی اور رحمت علی کے گھر ایک دوسرے کے ساتھ، پہلو بہ پہلو جڑے ہوئے تھے۔ مغل پورہ کی آبادی پانچ سو سے چھ سو کے درمیان رہی ہوگی۔ ہم نے تانگا گلی

کے داخلی سرے پر کھڑا کیا اور رحمت علی کے دروازے تک پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم گھر کی بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔

رحمت علی کی گاؤں کے اندر ہی کریانے کی دکان تھی جہاں بیٹھ کر وہ دن بھر مختلف نوعیت کے سودے بیچا کرتا تھا جبکہ اس کا چھوٹا بھائی کرامت علی کوچوان تھا۔ اس کا اپنا تانگا گھوڑا تھا۔ وہ عموماً ریلوے اسٹیشن سے سواریاں اٹھا کر مغل پورہ اور آس پاس کے دیگر گاؤں دیہات تک پہنچایا کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں کا رزق روزگار ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ آسیہ کی گمشدگی نے ان کا آرام وسکون غارت کر دیا۔

میں نے دونوں بھائیوں کو ایک مرتبہ پھر تسلی تشفی دی۔ خاص طور پر آسیہ کی ماں صغریٰ بی بی کو میں نے یقین دلایا کہ میں بہت جلد اس کی بیٹی کو تلاش کر کے اس کے پاس پہنچا دوں گا۔ میری ہمدردی بھری باتوں نے بڑی حد تک صغریٰ بی بی کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

میری فرمائش پر یکے بعد دیگرے ان تین لڑکیوں کو رحمت علی کے گھر میں بلایا گیا جو آج دن میں گمشدہ آسیہ کے ساتھ چھپڑ سے مٹی نکالنے گئی تھیں۔ ان میں عائشہ، رضوانہ اور خالدہ شامل تھیں۔ میں نے ان سے باری باری سوالات کیے۔

عائشہ بھاری تن وتوش کی مالک ایک موٹی تازی لڑکی تھی۔ وہ اپنے چہرے مہرے اور جسامت سے پچیس سال کی نظر آتی تھی تاہم بعد از اں اس کی عمر بیس معلوم ہوئی۔ عائشہ خاصی گھبرائی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ شاید یہ اس بات کا اثر تھا کہ وہ ان لمحات میں ایک نہیں بلکہ دو باوردی پولیس والوں کے سامنے حاضر کی گئی تھی۔ حوالدار اگرچہ بیٹھک کے ایک کونے میں چپ چاپ بیٹھا تھا تاہم پولیس کی اپنی ایک دہشت ہوتی ہے۔

''عائشہ! تم میری بیٹی کی طرح ہو اس لیے مجھ سے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''آرام سے مجھے بتاؤ کہ آج دن میں چھپڑ پر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟''

''واقعہ......'' وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ''وہاں تو کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا تھانے دار جی۔''

''واقعہ پیش آیا تھا یا نہیں، یہ زیادہ اہم نہیں ہے۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ آسیہ کہاں گم ہو گئی ہے ہے؟''

''مم...... مجھے...... آسیہ کے بارے میں کچھ پتا نہیں جناب۔'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں نہیں جانتی، وہ کہاں چلی گئی ہے۔''

''تم آسیہ کی سہیلی ہو نا؟''

''جی......!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے پوچھا۔ ''اگر تم آسیہ کی سچی سہیلی ہو تو تمہیں اس کے گم ہونے کا دکھ بھی ہوا ہوگا......؟''

''جی بہت زیادہ دکھ ہوا ہے مجھے......'' وہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

''اور تم یہی چاہتی ہو نا کہ...... آسیہ جلد از جلد مل جائے؟'' میں نے مخصوص انداز میں پوچھنے کا عمل جاری رکھا۔

''جی...... میں یہی چاہتی ہوں۔'' اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

''اگر واقعی تم آسیہ کی واپسی کی خواہش مند ہو تو اس کی تلاش کے لیے مجھ سے بھرپور تعاون کرو۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم چاروں سہیلیاں آج دن میں چھپڑ سے مٹی نکالنے گئی تھیں۔ تین واپس آ گئیں اور ایک...... یعنی آسیہ ابھی تک غائب ہے جب وہ تم لوگوں کے ساتھ گئی تھی تو ساتھ ہی واپس کیوں نہیں آئی؟''

''تھانے دار جی......!'' عائشہ نے میری جانب دیکھتے ہوئے بڑی سادگی سے بتایا۔ ''آسیہ ہمارے ساتھ تو نہیں گئی تھی۔''

''ساتھ نہیں گئی تھی......!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''عائشہ! اس بات سے تمہارا مطلب کیا ہے؟''

اس وقت ہمارے علاوہ بیٹھک میں رحمت علی اور کرامت علی بھی موجود تھے۔ عائشہ کی بات نے ان دونوں کو بھی چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ دیدے پھاڑ کر عائشہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عائشہ نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جناب! میں اور رضوانہ ایک ساتھ چھپڑ کی طرف گئی تھیں۔ آسیہ، خالدہ کے ساتھ بعد میں وہاں پہنچی تھی۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، آسیہ اور خالدہ بعد میں چھپڑ پر پہنچی تھیں لیکن تم لوگ وہاں سے واپس تو ایک ساتھ ہی آئی ہو گی نا......؟''

''نہیں جی......!'' ہٹی کٹی عائشہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں اور رضوانہ پہلے چھپڑ سے گھر کی طرف چل پڑی تھیں۔ خالدہ نے کہا تھا کہ وہ اور آسیہ بعد میں آئی ہیں تو بعد ہی میں واپس جائیں گی۔''

''یعنی...... تم اور رضوانہ ان دونوں کو چھپڑ پر چھوڑ کر واپس آ گئی تھیں؟''

"جی تھانے دار صاحب......!" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"اس کے بعد آسیہ اور خالدہ کے ساتھ وہاں چھپڑ پر کیا حالات پیش آئے اس کی تمہیں کوئی خبر نہیں؟" میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

"جی...... یہی حقیقت ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ویسے تمہارے خیال میں......" میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے سوال کیا۔ "آسیہ کہاں جا سکتی ہے؟"

"میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی۔" وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ "آپ خالدہ سے پوچھیں۔ وہ زیادہ بہتر بتا سکتی ہے۔"

"خالدہ سے تو میں بڑی تفصیل کے ساتھ پوچھوں گا لیکن ایک بات اچھی طرح تم بھی اپنے ذہن میں بٹھا لو عائشہ......!" میں نے لمحاتی توقف کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی مجھے جو کچھ بتایا ہے اگر بعد میں، اس میں سے کوئی بات غلط نکلی تو یاد رکھنا، میں تمہارے سلسلے میں کوئی نرمی نہیں برتوں گا۔"

"تھانے دار جی......" وہ معتدل لہجے میں بولی۔ "میں نے جو کچھ کہا وہ سولہ آنے سچ ہے اس لیے مجھے کسی قسم کا کوئی ڈر خوف نہیں۔ آپ جس طرح بھی چاہیں، میری باتوں کی تصدیق کر سکتے ہیں۔"

دو چار ضمنی سوالات کے بعد میں نے عائشہ کو فارغ کر دیا۔ دو منٹ کے بعد عائشہ کی جگہ رضوانہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ رضوانہ کی عمر بائیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ وہ سانولے رنگ کی ایک دبلی پتلی لڑکی تھی۔ اپنی بات چیت میں مجھے وہ کھسکی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کریک سے پہلے تو عائشہ کے بیان کی تصدیق کی پھر مزید استفسار کیا لیکن پندرہ بیس منٹ کی سوالاتی جمناسٹک کے بعد ایک بھی ایسی بات یا نکتہ سامنے نہ آ سکا جو کسی بھی زاویے سے آسیہ کی تلاش میں، کسی بھی طرح ممد و معاون ثابت ہو سکتا۔ اس کا بیان، عائشہ کے بیان کا پرتو تھا۔ میں نے اسے فارغ کرنے کے بعد خالدہ کو بلا لیا لیکن پتا چلا کہ خالدہ فوری طور پر میرے پاس نہیں آ سکے گی۔

"کیوں کرامت علی......!" میں نے اطلاع دینے والے سے پوچھا۔ "خالدہ کے یہاں آنے میں کون سی دشواری ہے؟"

"اسے بہت تیز بخار چڑھا ہوا ہے جناب۔" کرامت علی نے بتایا۔ "اور وہ اس وقت سو رہی ہے۔ اس کی ماں بتول کو میں بلا لایا ہوں۔ وہ اندر صغریٰ کے پاس بیٹھی ہے۔ آپ کا حکم ہو تو میں بتول کو یہاں لے آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، لے آؤ۔" میں نے پرسوچ انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد بتول نامی وہ عورت میرے سامنے موجود تھی۔ اس سے گفتگو کے بعد پتا چلا کہ بتول ایک بیوہ عورت تھی۔ اس کے شوہر قادر بخش کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ بتول کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ بڑی بیٹی عابدہ شادی شدہ تھی اور سرگودھا کے کسی گاؤں میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بتول یہاں مغل پورہ میں خالدہ کے ساتھ زندگی گزار رہی تھی۔ قادر بخش ایک چھوٹا زمیندار تھا اور اپنے پیچھے دس ایکڑ زمین چھوڑ گیا تھا۔ بتول خود تو کاشت کاری نہیں کرتی تھی تاہم اس نے یہ قطعہ اراضی ایک مزارع کو دے رکھا تھا۔ زمین کی فصل اور فصل کی آمدنی سے ان ماں بیٹی کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی۔

میں نے آسیہ کی گمشدگی کے حوالے سے بتول سے بھی کئی سوالات کیے لیکن اس کی طرف سے کوئی تسلی بخش جواب نہ آیا تو میں نے پوچھا۔

"خالدہ کو کب سے بخار ہے؟"

"آج شام سے جی۔" اس نے بتایا۔

"دن میں تو وہ ٹھیک ٹھاک تھی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ دن میں چھپڑ سے مٹی نکالنے کے لیے گئی تھی؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "شام سے تھوڑی دیر پہلے ہی اچانک پھونک کر اسے تاپ (بخار) چڑھا ہے اور اس وقت تو وہ بے ہوش پڑی ہے۔ اسے اپنی کوئی سدھ بدھ ہی نہیں۔"

"تم نے اسے کسی کو دکھایا نہیں؟" میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"دکھایا ہے جی۔" وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "حکیم جی کو گھر پر بلا کر لائی تھی میں۔ انہوں نے چیک کرنے کے بعد دوائی دی ہے اور کہا ہے، صبح تک بخار اتر جائے گا۔"

"حکیم جی نے اسے بخار کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی؟"

"جی...... وہ کہتے ہیں، خالدہ کو ٹھنڈ لگ گئی ہے۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "آج کل کی اولاد کسی کی سنتی بھی تو نہیں۔ کئی بار کہا ہے، گرم کپڑے پہن کر رکھا کرو مگر اس شدید

(شیدائین) کو کچھ زیادہ ہی گری لگتی ہے۔ ہم پر بھی جوانی آئی تھی مگر مجال ہے کہ ہم نے کبھی اپنے بڑوں کی بات رد کی ہو......''

ہر دور کے بڑوں کو اپنے چھوٹوں سے یہ شکایت رہی ہے...... اور یہ شکایت رہے گی کہ وہ ان کی بات نہیں سنتے۔ بتول بھی اپنی بیٹی خالدہ کے حوالے سے اسی بات کا رونا رو رہی تھی۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہہ دیا۔

''میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں بتول بی بی۔ آج کل کے بچوں کو اپنے بڑوں کا ذرا بھی احساس نہیں۔ اللہ ان کو ہدایت دے۔''

''آمین......!'' وہ چھت کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے مزید چند سوالات کے بعد بتول کو جانے کی اجازت دیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم گھر جا کر اپنی بیٹی کا خیال رکھو۔ میں کل کسی وقت آکر اس کا بیان لے لوں گا۔''

وہ مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گیا کہ خالدہ، گمشدہ آسیہ کی پڑوسن تھی یعنی رحمت علی کے گھر کی مشرقی دیوار کے ساتھ اس کے چھوٹے بھائی کرامت علی کا گھر جڑا ہوا تھا اور مغربی دیوار کے ساتھ بتول بی بی کا گھر واقع تھا۔ رحمت علی ان دونوں کا مشترکہ پڑوسی تھا۔

''کرامت علی!'' بتول بی بی کے جانے کے بعد میں نے آسیہ کے چچا کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا بیٹا لیاقت کہیں نظر نہیں آرہا۔ اگلے سال آسیہ کی اس سے شادی ہونے والی تھی۔ اس موقع پر اسے تو یہیں ہونا چاہیے تھا......؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں جناب۔'' کرامت علی اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیاقت اگر مغل پورہ میں ہوتا تو کسی بھی صورت وہ اس معاملے سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔''

''تو کیا وہ مغل پورہ سے باہر کہیں گیا ہوا ہے؟'' میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔

''جی...... وہ آج صبح ہی لاہور گیا ہے۔'' کرامت علی نے بتایا۔ ''وہاں کرشن نگر میں اس کی خالہ رہتی ہے۔ وہ اسی سے ملنے گیا ہے۔''

''ہوں......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر دریافت کیا۔ ''اس کی واپسی کب ہوگی؟''

''دو دن کا کہہ کر گیا ہے جناب۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اب دیکھیں، دو دن ہی لگاتا ہے یا تین چار......!''

''لیاقت علی کی خالہ کا نام کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔ ''اور لاہور کے محلہ کرشن نگر میں وہ کس جگہ رہتی ہے؟''

''میری بڑی سالی یعنی لیاقت کی خالہ کا نام تو بشریٰ ہے جی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''بشریٰ کا گھر والا اجمل حسین وہاں کرشن نگر میں دودھ دہی کی دکان چلاتا ہے اور کافی مشہور ہے۔ آپ کسی سے بھی پوچھیں گے تو وہ اجمل دودھ فروش کی دکان یا گھر کی نشاندہی کر دے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک کاغذ پر یہ معلومات درج کرتے ہوئے کہا۔

کرامت علی نے استفسار کیا۔ ''کیا آپ لاہور جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو یہ بھی کرنا پڑے گا۔'' میں نے ذو معنی انداز میں کہا۔

''ضرورت محسوس ہوئی...... کا کیا مطلب ہے جناب!'' وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ ''کیا آپ میرے بیٹے پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں......؟''

''کرامت علی! پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے چلتی ہے۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ہم ہر متعلقہ شخص کو بلاتفریق شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو پھر کہیں جا کر اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اور جہاں تک تمہارے دوسرے سوال کا تعلق ہے تو......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تمہارا بیٹا حسبِ پروگرام دو دن کے بعد واپس آجاتا ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ میں اس سے ادھر ہی پوچھ تاچھ کروں گا ورنہ دوسری صورت میں مجھے اس کا بیان لینے کے لیے کرشن نگر لاہور جانا پڑے گا۔''

میں پندرہ بیس منٹ مزید وہاں رکا پھر رخصت کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں بھائیوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ابھی تک ایسا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگ سکا جس کو تھام کر میں آسیہ کی تلاش کا کام شروع کر سکوں لیکن مجھے یقین ہے کہ صبح تک ایسی کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔ میں کل دن میں کسی وقت خالدہ کا بیان لینے یہاں آؤں گا۔ آپ لوگ بھی اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھیں اور پریشان ہونے کے بجائے اپنے دماغ کو قابو میں رکھتے ہوئے یہ پتا لگانے کی کوشش کریں کہ آسیہ آخر جا کہاں سکتی ہے...... مجھے امید ہے، انشاءاللہ! میں بہت جلد آسیہ کو ڈھونڈ نکالوں گا۔''

انہوں نے میری تاکید اور ہدایات پر عمل کرنے کا

یقین دلایا اور میں حوالدار دلاور خان کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر تھانے کی سمت روانہ ہوگیا۔

فضا اور ماحول میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے اب بھی بجلی چمک اٹھتی تھی جو رات کی تاریکی میں خاصا خوف ناک تاثر پیدا کرتی تھی۔ گھرے بادلوں کی براجمانی کے باعث آسمان پر ستاروں کا نام ونشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بقول کسے، ان لمحات میں آسمان تہی دست وتہی داماں ہوکر رہ گیا تھا۔

ہم مغل پورہ اور تھانے کے وسط میں تھے کہ مجھے تھانے میں حوالدار کی کہی ہوئی ایک بات یاد آگئی۔ وہ فرنٹ سیٹ پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں عقبی نشست پر براجمان تھا۔ میں نے گردن موڑ کر حوالدار سے پوچھا۔

”دلاور خان! تم نے ادھر تھانے میں مجھ سے کیا کہا تھا؟“

”کیا ملک صاحب؟“ وہ چونک کر الٹا مجھی سے سوال کر بیٹھا۔

”جب میں نے مغل پورہ جانے کے حوالے سے تمہیں تیاری کرنے کو کہا تھا تو تم نے مجھ سے کچھ کہا تھا۔“ میں نے یاد دہانی کرانے والے انداز میں کہا۔ ”اور تمہارے جواب دینے سے پہلے ہی اذانِ مغرب ہونے لگی تھی...... کچھ یاد آیا ذہن میں......؟“

”جی ملک صاحب!“ وہ سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا تھا...... آپ موسم دیکھ رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔ تم نے یہی کہا تھا۔“ میں نے تصدیق کرنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”دلاور خان! تمہیں میرے ساتھ کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”دو تین سال تو ہو ہی گئے ہیں ملک صاحب۔“ اس نے جواب دیا۔

”ان دو تین سال میں......“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کب کب اور کہاں کہاں مجھے فرائض کی تکمیل کے دوران میں موسم کا خیال کرتے ہوئے دیکھا ہے؟“

”جی...... ملک...... صاحب......!“ وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ ”م...... میرا مطلب ہے...... آپ ان چیزوں کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔“

ادھر حوالدار کی بات ختم ہوئی ادھر آسمان کے ضبط کے بند کھل گئے۔ پہلے ہلکی بوندا باندی اور پھر باقاعدہ بارش شروع ہوگئی۔ تھانے پہنچتے پہنچتے ہم پوری طرح بھیگ چکے تھے۔ اگر بارش سیدھی یعنی آسمان سے زمین کی طرف ہوتی تو ہماری کافی بچت ہوسکتی تھی لیکن شمال سے جنوب کی سمت چلنے والی ہوا نے چھاجوں مینہ ہمارے اوپر ”اچھال“ دیا تھا۔ جب ہم تانگے سے نکل کر تھانے کی عمارت میں داخل ہوئے تو ہم پر باقاعدہ کپکپی طاری ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح قدرے صاف اور خشک تھی۔ آسمان پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے بادلوں کی ٹکڑیاں تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹھنڈی ٹھار برفیلی ہوا کا دباؤ انہیں آسمان پر ایک طرف سے دوسری جانب اڑائے لیے جارہا تھا۔ رات بھر کبھی ہلکی اور کبھی تیز بارش کا سلسلہ جاری رہا تھا اور اذانِ فجر کے ساتھ کہیں جاکر بارش رکی تھی۔ اس بارش نے موسم کی شدت میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔

میں نے صبح ضروری امور سے یکے بعد دیگرے نمٹنے کے بعد ناشتا کیا اور وردی پہن کر تھانے کی طرف جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔

”اس وقت کون ہوسکتا ہے؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

جب تک میں اپنے کوارٹر کا صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچا، اس دوران میں دستک ایک بار اور ابھر چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو وہاں اپنے ہی تھانے کے ایک باوردی کانسٹیبل کو کھڑے پایا۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

”اقبال...... کیا بات ہے؟“

”وہ جی...... ملک صاحب......“ اقبال نے سنسنی خیز لہجے میں بتایا۔ ”وہ گمشدہ...... آسیہ کا سراغ مل گیا ہے جناب!“

”کیا مطلب؟“ اقبال کے انکشاف نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ”آسیہ کا سراغ کہاں سے ملا ہے؟“

”آپ تھانے آجائیں جناب اور پرویز سے خود ہی ساری تفصیل پوچھ لیں۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”اسی نے آسیہ کو ادھر جنگل میں دیکھا ہے۔“

”ٹھیک ہے......“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”تم چلو، میں ابھی پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“

کانسٹیبل مجھے سیلوٹ کر کے واپس چلا گیا تو میں سوچنے لگا، یہ پرویز نامی شخص کون ہوسکتا ہے اور صبح ہی صبح وہ جنگل میں کیا کر رہا تھا۔ جس جھپڑ میں سے گمشدہ آسیہ کل دوپہر میں مٹی نکالنے گئی تھی وہ مغل پورہ کے جنوب میں نہر کے کنارے واقع تھا اور اس کے قریب ہی سے ریلوے

لائن بھی گزرتی تھی۔ مذکورہ ریلوے لائن نہر کے اوپر سے گزر کر جھنگ شہر کی طرف جاتی تھی۔ ایک طرح سے وہ بڑا چھپڑ ریلوے لائن اور نہر کے ملاپ سے بننے والے کونے میں واقع تھا۔ نہر کی دوسری جانب جنوب میں ایک گھنا جنگل دور تک پھیلا ہوا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر پرویز نامی اس شخص کو اندر بلالیا۔ جب میں برآمدے سے گزر کر کمرے کی طرف آرہا تھا تو میں نے اسے ایک بینچ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ پرویز گھنگرالے بالوں والا ایک گورا چٹا شخص تھا۔ عمر چالیس اور پینتالیس کے درمیان رہی ہوگی۔ چہرے مہرے سے وہ ایک عام سا دیہاتی نظر آتا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ میرے سامنے میز کی دوسری جانب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے پرویز کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم نے آسیہ کو کہاں دیکھا ہے......؟“

”جنگل میں جناب......“ اس نے گھبراہٹ آمیز لہجے میں جواب دیا۔ ”ادھر درختوں میں اس کی لاش پڑی ہوئی ہے۔“

پرویز کے چہرے کے تاثرات نے مجھے باور کرادیا تھا کہ وہ آسیہ کے حوالے سے کوئی خوشگوار خبر نہیں لایا ہوگا۔ آسیہ کی ”لاش“ کا ذکر کر کے اس نے میرے اندازے کی تصدیق کردی تھی۔

”کیا تم نے اس کی لاش کو چھو کر دیکھا ہے؟“ میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ”میرا مطلب ہے، تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ مرچکی ہے...... اور یہ بھی بتاؤ کہ تم نے آسیہ کو پہچانا کیسے؟ کیا تم اسے پہلے سے جانتے تھے؟“

”تھانے دار صاحب! میں بھی موضع مغل پورہ ہی کا رہنے والا ہوں۔“ اس نے سنبھلتے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”اس لیے آسیہ کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ مجھے بھی پتا ہے، وہ کل دوپہر سے گم ہے۔ پورا مغل پورہ آسیہ کی گمشدگی سے واقف ہے۔ وہ میرے ذہن میں بھی تھی لہٰذا جب میں نے کسی لڑکی کو گھنے درختوں میں بے ترتیب پڑے دیکھا تو میرے قدم بے اختیار اسی جانب اٹھ گئے اور قریب جانے پر مجھے پتا چلا کہ......“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”...... کہ وہ آسیہ ہے۔ جس آسیہ کو پورا مغل پورہ کل دوپہر سے ڈھونڈ رہا تھا وہ ادھر جنگل میں بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے چھونے کی کوشش نہیں کی۔ کافی دیر تک

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا رہا اور مجھے یقین ہوگیا کہ اسے زندوں میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ زندہ نہیں، میں جنگل سے واپس آگیا...... اور سیدھا آپ کے پاس پہنچ گیا ہوں۔“

”ہوں......“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر پوچھا۔ ”تم صبح ہی صبح جنگل کی طرف کیا لینے گئے تھے؟“

”جناب! میں ایک غریب لکڑہارا ہوں۔“ اس نے عاجزانہ لہجے میں بتایا۔ ”یہی میرا روزگار ہے۔ میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہوں اور انہیں مختلف لوگوں کے ہاتھ فروخت کردیتا ہوں جس سے چار پیسے مجھے مل جاتے ہیں جن سے میرا گھر چلتا ہے۔ بیوی بچوں والا ہوں سرکار...... اتنی محنت بھی نہ کروں تو ان کو کھلاؤں گا کہاں سے......“

”تم جو بھی کرتے ہو، بہت اچھا کرتے ہو۔“ میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کون سی بات مائی باپ......؟“ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

”مغل پورہ گاؤں نہر اور تھانے کے بیچ میں پڑتا ہے۔“ میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم اتنی بڑی اطلاع کو لے کر سیدھے تھانے پہنچ گئے۔ کیا تمہارے ذہن میں یہ بات نہیں آئی کہ پہلے تمہیں آسیہ کے گھر والوں کو اس واقعے کی اطلاع دینا چاہیے......؟“

”یہ خیال میرے دماغ میں آیا تھا جی۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں ریلوے لائن کے کنارے چلتے ہوئے تھانے پہنچ گیا۔ میں نے یہی سوچا تھا جناب کہ آپ کو اطلاع دینے کے بعد میں مغل پورہ جاکر سب کو آسیہ کے بارے میں بتاؤں گا۔“ لمحاتی توقف کرکے اس نے اجازت طلب انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔

”تھانے دار جی...... میں جاؤں......؟“

”تم نہیں جاسکتے پرویز......!“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”ج...... جی......“ وہ خوفزدہ انداز میں مجھے تکنے لگا۔ ”م...... میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب؟“

”مغل پورہ والوں کو آسیہ کی موت کی اطلاع کیسے پہنچے گی اس کی تم بالکل فکر نہ کرو۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرے تھانے کا عملہ یہ کام بہ آسانی کرلے گا۔ تم میرے ساتھ جائے وقوعہ پر چلو گے۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ وہ اپنی گردن کو اثباتی جنبش

دیتے ہوئے بولا۔ ''جو آپ کا حکم تھانے دار صاحب......''

آیندہ پندرہ منٹ میں، میں نے جنگل کی جانب جانے کی تیاری کر لی اور ٹھیک دس بجے ہم تھانے سے روانہ ہو گئے۔ میرا تھانہ جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، ریلوے کے کنارے واقع تھا جو ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہی تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا قصباتی ریلوے اسٹیشن تھا۔ یہ ریلوے اسٹیشن زیادہ مصروف نہیں تھا۔ ہم تانگے پر سوار ہو کر، ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کچے میں سفر کرتے ہوئے نہر کے پل تک پہنچ گئے۔ پھر پرویز کی راہ نمائی میں ہمیں جائے وقوعہ تک رسائی حاصل کرنے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ایک بات کا اوپر میں ذکر کرنا بھول گیا کہ تھانے سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے اس واقعے کی اطلاع مغل پورہ تک پہنچانے کا بندوبست کر دیا تھا۔

آسیہ کی بے یارو مددگار لاش گھنے درختوں کے جھنڈ میں گیلی زمین پر پڑی تھی۔ اس کے جسم پر اگرچہ گرم لباس موجود تھا تاہم ان لمحات میں وہ لباس خاصا بے ترتیب ہو رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بدنصیب زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ میرے اسی محتاط اندازے کے مطابق آسیہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اس کی موت کو بھی اچھا خاصا وقت گزر چکا تھا۔ کل دن میں کسی وقت یا پھر شام میں اس کی زندگی کا چراغ گل کیا گیا تھا۔ میں اکڑوں بیٹھ کر آسیہ کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔

اس نوعیت کے واقعات میں عموماً لڑکی کو برباد کرنے کے بعد موت کے منہ میں دھکیلا جاتا ہے لیکن آسیہ کی لاش کے عمیق جائزے کے بعد یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس پر کسی بھی طرز کا مجرمانہ حملہ نہیں کیا گیا تھا۔ یہ میری فوری اور ماہرانہ رائے تھی جس کی تصدیق یا تردید پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی سے ہو سکتی تھی۔

میں نے آسیہ کی لاش کو خشک جگہ پر منتقل کرنے کے بعد ایک چادر سے ڈھانپ دیا اور گھوم پھر کر گرد و نواح کا جائزہ لینے لگا۔ میں تھانے سے اپنے ساتھ حوالدار دلاور خان اور کانسٹیبل رشید کو بھی تانگے میں بٹھا لایا تھا۔ انہیں بھی میں نے مختلف کام سونپ دیے۔ وہ الگ الگ سمت میں روانہ ہو گئے۔

وہ جنگل خاصا گھنا تھا۔ جب میں جائے وقوعہ کا گہری نظر سے جائزہ لے رہا تھا تو میرے ذہن میں مختلف سوالات بھی چکرا رہے تھے مثلاً یہ کہ آسیہ اس گھنے جنگل میں کیا لینے آئی تھی؟ وہ خود آئی تھی یا کسی نے اسے یہاں بلایا تھا؟ کیا وہ کسی سے ملنے جنگل میں پہنچی تھی؟ وہ تو دوپہر میں چھپڑ سے مٹی نکالنے ادھر آئی تھی پھر جنگل کا رخ کس مقصد سے کیا؟ کہیں وہ کسی سازش کا شکار تو نہیں ہو گئی......

ہر سوال کے اختتام پر میری سماعت میں ایک ہی نام گونج اٹھتا تھا اور وہ نام تھا...... خالدہ!...... آسیہ کی گہری سہیلی اور بتول کی بیٹی خالدہ...... جسے کل شام تیز بخار نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ آسیہ اسی خالدہ کے ہمراہ مغل پورہ سے مٹی والے چھپڑ تک آئی تھی اور پھر اطلاعات کے مطابق وہ اپنے گھر نہیں پہنچ سکی تھی۔ خالدہ ہی بتا سکتی تھی کہ وہ جنگل میں کیا کرنے آئی تھی......؟

میں انہی گمبھیر خیالات کے ساتھ جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھا کہ حوالدار تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس پہنچا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش پائی جاتی تھی۔

''کیا ہوا دلاور خان؟'' میں نے اس کی حالت کے پیشِ نظر سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو......؟''

وہ ایک کڑا میری جانب بڑھاتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولا۔ ''یہ دیکھیں ملک صاحب......!''

میں نے اس کے ہاتھوں سے وہ کڑا لے کر گھما پھرا کر دیکھا پھر اس سے دریافت کیا۔ ''یہ ایک چیتل کا کڑا ہے، کلائی پر پہنا جانے والا۔ تم اس سے کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ یہ کس کا ہے؟''

مذکورہ چیتل کا کڑا مردانہ کلائی میں پہنا جانے والا ایک مخصوص کڑا تھا جس پر بڑی مہارت سے چتر کاری کی گئی تھی جیسا کہ چیتل کے نوادراتی زیورات پر عموماً دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اپنی شکل میں گول ضرور تھا مگر اس کے دونوں سرے ایک دوسرے سے آدھے انچ کے فاصلے پر تھے یعنی اسے اپنی مرضی سے دبا کر اور کھینچ کر قدرے چھوٹا بڑا کیا جا سکتا تھا۔ دونوں سروں پر کچھ کے سائز کی گولائیاں بنی ہوئی تھیں۔ آپ کی نظر سے یقیناً اس ساخت کے کڑے گزرے ہوں گے چاہے وہ چیتل کے ہوں یا نہ ہوں......

حوالدار نے میرے سوالات کے جواب میں بتایا۔ ''جناب! میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ کڑا کس کا ہے...... یہ مجھے اس درخت کے پاس زمین پر پڑا ملا ہے۔'' بات ختم کرتے ہی اس نے ایک نزدیکی درخت کی سمت اشارہ کر دیا۔

مذکورہ درخت اس مقام سے لگ بھگ دس گز کی دوری پر واقع تھا جہاں آسیہ کی لاش پڑی ملی تھی۔ میں جائے

وقوعہ کا نقشہ تیار کرنے میں لگ گیا تھا اور حوالدار و کانسٹیبل کو میں نے گرد و نواح کا جائزہ لینے پر مامور کر دیا تھا۔ بالآخر حوالدار دلاور خان ایک کام کی چیز ڈھونڈنے میں کامیاب رہا تھا۔ میں نے وہ کڑا گھنگرالے بالوں والے پرویز کی طرف بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔

''اس کڑے کو پہچانتے ہو......؟''

چند لحات کے غور و فکر کے بعد اس نے جواب دیا۔

''جناب! یہ کڑا دیکھا ہوا تو لگ رہا ہے لیکن یہ یاد نہیں آ رہا کہ میں نے اسے کہاں اور کس کے پاس دیکھا ہے۔''

''تم مغل پورہ کے رہنے والے ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یقیناً تم نے اس کڑے کو مغل پورہ ہی کے کسی شخص کی کلائی میں دیکھا ہوگا؟''

''جی...... جی ہاں۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یاد نہیں آ رہا...... کس بندے کے ہاتھ میں دیکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنے ذہن کو مصروف رکھو اور یاد کرنے کی کوشش کرتے رہو کہ یہ کڑا تم نے کہاں اور کس کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔'' میں نے پرویز سے کہا پھر حوالدار کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''دلاور خان...... موقع کا کام مکمل ہو چکا۔ اگلا مرحلہ آسیہ کی لاش کو سرکاری اسپتال پہنچانے کا ہے اور یہ کام تم کرو گے۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''لیکن ابھی تک آسیہ کے گھر والوں میں سے کوئی یہاں نہیں پہنچا۔ ان کی موجودگی میں اگر لاش اٹھائی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔''

ادھر دلاور خان کی بات پوری ہوئی ادھر رحمت علی، کرامت علی چند افراد کے ساتھ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ ان کے چہروں اور آنکھوں سے گہری پریشانی اور اضطراب جھلک رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا اور آسیہ کی لاش کے اوپر سے چادر ہٹا دی۔

رحمت علی نے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بیٹی کی لاش کو دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب...... کس ظالم نے میری بچی کی جان لی ہے؟''

''مجھے بھی بڑی شدت سے اسی ظالم اور سفاک شخص کی تلاش ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں اس شیطان کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

کرامت علی نے چونک کر میری جانب دیکھا اور اضطراری انداز میں بولا۔ ''جناب...... میں محسوس کر رہا ہوں، آپ نے قاتل کے حوالے سے کوئی اہم سراغ پا لیا ہے......؟''

''تم بالکل ٹھیک محسوس کر رہے ہو کرامت علی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے آپ لوگوں کے پرخلوص تعاون کی ضرورت ہے۔''

''ہم تعاون کیوں نہیں کریں گے تھانے دار صاحب۔'' رحمت علی نے غم سے بوجھل آواز میں کہا۔ ''میری جوان جہان بیٹی کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ میں تو یہی چاہوں گا، وہ نامراد جلد از جلد قانون کی گرفت میں آ جائے جو آسیہ کی موت کا ذمے دار ہے۔''

''آپ کسی سراغ وغیرہ کا ذکر کرنے والے تھے......''

کرامت علی نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

اس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا جہاں بادلوں کی ٹکڑیوں نے ایک بار پھر متحد ہونا شروع کر دیا تھا۔ گھنے جنگل میں تو ویسے ہی مناسب روشنی کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ اوپر سے بادل گھر آنے کے سبب اندھیرا سا چھاتا محسوس ہونے لگا تھا۔ اگر ہم یہیں کھڑے کچہری کرتے رہتے تو کسی بھی وقت تیز بارش ہمیں اپنا اسیر بنا سکتی تھی۔ موجودہ غیر یقینی صورتِ حال کے پیشِ نظر میں نے کرامت علی سے کہا۔

''اب ساری اہم باتیں رحمت علی کے گھر میں بیٹھ کر ہوں گی، مجھے آج ویسے بھی بتول کی بیٹی خالدہ کا بیان لینے مغل پورہ تو جانا ہی تھا۔''

میری اس تجویز پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور اگلے چند لحات میں ہم جنگل سے نکل کر مغل پورہ کی سمت روانہ ہو چکے تھے۔ رحمت علی، کرامت علی اور دیگر افراد مغل پورہ سے پیدل ہی چل کر جنگل تک پہنچے تھے کیونکہ یہ زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ میں نے آسیہ کی لاش کو تانگے میں رکھوا کر حوالدار دلاور خان کی نگرانی میں سرکاری اسپتال کی طرف روانہ کر دیا تھا اور خود ان لوگوں کے ساتھ مغل پورہ کی طرف چل پڑا تھا۔ کانسٹیبل رشید بھی میرے ہمراہ تھا۔

راستے میں، میں نے آسیہ کے باپ رحمت علی سے پوچھا۔ ''تمہاری پڑوسن کا کیا حال ہے......؟''

''جی......!'' وہ بوکھلا گیا۔ ''میں سمجھا نہیں سرکار......؟''

''میں بتول کی بیٹی خالدہ کی بات کر رہا ہوں۔'' میں

نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کا بخار اترا یا نہیں؟''

اس نے اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بتایا۔ ''جی، اتر گیا ہے۔''

''مطلب یہ کہ وہ اب ہوش میں ہے۔'' میں نے استفساریہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اور اس سے بات ہو سکتی ہے......؟''

رحمت علی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆☆☆

کرامت علی کا خیال تھا کہ میں مغل پورہ پہنچتے ہی کوئی سنسنی خیز انکشاف کروں گا لیکن میں واپسی کے سفر کے دوران میں اپنا ایک مخصوص ذہن بنا چکا تھا چنانچہ جب میں نے پہلے خالدہ کا انٹرویو لینے کا ارادہ ظاہر کیا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

''آپ تو بھائی صاحب کے گھر میں بیٹھ کر کوئی اہم انکشاف کرنے والے تھے۔''

''تو میں نے ایسا کرنے سے کب انکار کیا ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''خالدہ کا بیان اس سنسنی خیز انکشاف سے زیادہ اہم ہے میری نظر میں۔ آسیہ آخری بار اسی خالدہ کے ساتھ زندہ دیکھی گئی تھی۔ مٹی والے چھپڑ سے لوٹ کر وہ گھر واپس نہیں آئی۔ وہ جنگل میں کیسے پہنچی اس راز سے صرف خالدہ ہی پردہ اٹھا سکتی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں آسیہ کا تفصیلی بیان لینے کے بعد رحمت علی کے پاس ہی آؤں گا۔ آپ لوگ اطمینان رکھیں۔ آج شام سے پہلے آسیہ کے قاتل کا پتا چل جائے گا۔''

میری بات ان دونوں بھائیوں کے ذہن میں بیٹھ گئی لہٰذا انہوں نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میں بتول کے گھر میں داخل ہو گیا۔

وہ دو کمروں اور ایک بیٹھک پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس مکان کا رقبہ ساڑھے چار یا پانچ مرلے رہا ہوگا۔ کراچی کے رہائشی اسے ''ایک سو بیس گز'' تصور کر لیں۔ بتول نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے کانسٹیبل کو بیٹھک میں چھوڑا اور خود بتول کے ہمراہ اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں مقتول آسیہ کی سہیلی خالدہ موجود تھی۔

خالدہ کی عمر کم و بیش بیس سال رہی ہوگی۔ وہ گندمی رنگت کی مالک ایک ہشاش بشاش اور تیز طرار لڑکی تھی۔ تاہم حالیہ بخار نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ لحاف اوڑھے ایک چارپائی پر لیٹی تھی۔ میری آمد پر وہ سرہانے کے سہارے دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ بتول نے خالدہ والی چارپائی کے نزدیک ہی میرے لیے ایک کرسی ڈال دی اور کہا۔

''تھانے دار جی! آپ خالدہ سے بات چیت کریں۔ میں آپ کے لیے گرم دودھ لے کر آتی ہوں۔''

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں بتول۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خاصا تگڑا ناشتا کر رکھا ہے۔''

اس نے شاید میری بات سنی نہیں یا پھر سن کر نظرانداز کر دی تھی۔ میں نے بتول کو ذہن سے جھٹکا اور خالدہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

''خالدہ بیٹی! اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہوں جی۔'' وہ نقاہت بھری آواز میں بولی۔

''تمہیں آسیہ کے بارے میں تو پتا چل چکا ہوگا......؟''

''جی......!'' اس نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

''آسیہ تمہاری گہری اور پیاری سہیلی تھی خالدہ۔'' میں نے تفتیش کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میری طرح تمہاری بھی یہی شدید خواہش ہوگی کہ آسیہ کا قاتل جلد از جلد قانون کی گرفت میں آ جائے......؟''

اس نے ایک بار پھر مختصر جوابی سے کام لیا۔

''جی......!''

''وہ کل دن میں تمہارے ساتھ چھپڑ سے مٹی نکالنے گئی تھی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں استفسار کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو واپس آ گئیں مگر آسیہ گھر نہیں لوٹی...... کل دوپہر ہی سے اس کی تلاش جاری تھی اور آج صبح نہر کے اس پار یہ تلاش اختتام کو پہنچی ہے...... آسیہ کی لاش کی دریافت کے ساتھ!'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اب تم مجھے بتاؤ گی کہ آسیہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے؟''

''م...... میں کچھ نہیں...... جانتی......!'' وہ نحیف سی آواز میں منمنائی۔

''اس طرح بات نہیں بنے گی خالدہ!'' میں نے بہلانے پھسلانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں پوری سچائی اور بہادری کے ساتھ سب کچھ بتانا ہوگا۔''

"میں کچھ...... جانتی ہی نہیں تو...... بتاؤں کیا جی۔"
وہ قدرے بیزاری سے بولی۔
میں خالدہ سے سوال و جواب کے دوران میں مسلسل اس کی آنکھوں اور چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اس کی زبان کھلوانے کے لیے دوسرے زاویے سے سوالات شروع کردیے۔
"کل دن میں تم اور آسیہ ایک ساتھ جوہڑ کی طرف گئی تھیں نا؟"
اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔
"اور وہاں چھپڑ (جوہڑ) پر عائشہ اور رضوانہ سے بھی تم لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ "وہ بھی مٹی نکالنے چھپڑ پر پہنچی ہوئی تھیں......؟"
"جی...... جی ہاں۔" اس نے گردن کو اثباتی جنبش دی۔
"عائشہ اور رضوانہ تم دونوں سے پہلے چھپڑ سے واپس آگئی تھیں۔" میں نے کہا۔ "تم اور آسیہ ایک ساتھ واپس آئی تھیں......؟"
"جی...... جی ہاں......!" اس نے جواب دیا۔
"پھر تم تو صحیح سلامت گھر پہنچ گئیں......" میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ "اور آسیہ غائب ہوگئی، کیوں؟...... کیا وہ تمہارے ساتھ گھر نہیں آئی تھی۔ تم دونوں ایک دوسرے کی پڑوسنیں ہو۔ کیا وہ تمہارے ساتھ ہی اپنے گھر کے دروازے تک نہیں آئی تھی؟"
"نن...... نہیں جی......!" خالدہ نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
اسی لمحے بتول ایک ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے کے اندر دودھ سے بھرے ہوئے گلاس اور ایک پلیٹ میں ابلے ہوئے انڈے دکھائی دے رہے تھے جن کو چھری کی مدد سے دولخت کرکے ان کے اوپر کالی مرچ اور نمک چھڑکا گیا تھا۔ بتول نے مذکورہ ٹرے کو ایک پستہ قامت تپائی پر رکھا پھر تپائی سمیت وہ ٹرے میرے سامنے پہنچ گئی۔ بتول نے کہا۔
"تھانے دار جی...... ایک گلاس آپ کے لیے ہے اور دوسرا اس پاگل خالدہ کے لیے۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ آپ دبکا ماریں گے تو یہ چپ چاپ ناشتا کرلے گی۔ میری تو یہ سنتی ہی نہیں ہے۔"
"تم فکر نہ کرو بتول......" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں بتول کو واپس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"خالدہ بہت اچھی بچی ہے۔ یہ میری بات نہیں ٹالے گی۔"
بتول میرا اشارہ سمجھ کر واپس چلی گئی اور میں دوبارہ خالدہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میں نے نرمی بھرے لہجے میں کہا۔
"باتوں کے ساتھ ساتھ کھانا پینا بھی جاری رہنا چاہیے۔ تم اپنے عمل سے بتول پر یہ ثابت کردو گی کہ تم نے میری بات ٹالی نہیں۔ میں صرف یہاں کا تھانہ انچارج ہی نہیں ہوں، تمہارا اور تمہاری دوست آسیہ کا سچا خیرخواہ بھی ہوں۔ تم مجھ پر آنکھیں بند کرکے بھروسا کرسکتی ہو۔"
اس کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ میں نے اس کے ایک ہاتھ میں دودھ کا گلاس اور دوسرے میں انڈے کا پیس تھما دیا۔ اس نے میری اس کوشش کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے درمیان ایک بار پھر گفتگو ہونے لگی۔ بتول کی آمد سے قبل خالدہ نے ایک سنسنی خیز انکشاف کیا تھا۔ میں نے بات چیت کا سلسلہ وہیں سے جوڑتے ہوئے کہا۔
"تو تمہارا بیان یہ ہے کہ کل دوپہر میں آسیہ تمہارے ساتھ اپنے گھر کے دروازے تک نہیں آئی تھی؟"
"جی...... یہی سچ ہے۔"
"لیکن چھپڑ سے واپسی پر تو وہ تمہارے ساتھ ہی تھی۔" میں نے الجھن زدہ انداز میں سوال کیا۔ "پھر وہ کہاں چلی گئی تھی؟"
"ہم دونوں چھپڑ سے ایک ساتھ ہی واپس ہوئی تھیں۔" وہ رک رک کر بتانے لگی۔ "لیکن گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے وہ پیپل کے درخت کے پاس اچانک رک گئی تھی جیسے اسے کوئی خاص بات یاد آگئی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"کیا بات ہے آسیہ! تم چلتے چلتے ٹھہر کیوں گئیں۔ کیا ہوا......؟"
ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا تھا۔
"خالدہ! تم گھر جاؤ۔ میں تھوڑی دیر کے بعد آتی ہوں۔"
"تھوڑی دیر کے بعد...... کیا مطلب!" میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ "تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو......؟"
"میں واپس چھپڑ کی طرف جاؤں گی۔" وہ ادھر ادھر نگاہیں گھماتے ہوئے بولی۔ "میں تھوڑی دیر کے بعد واپس آؤں گی۔ تم جاؤ گھر......"
مجھے اس کی بات سے الجھن محسوس ہوئی تو میں نے پوچھا۔ "چھپڑ پر دوبارہ جانے کا کیا مقصد ہے۔ تمہارا وہاں کیا رہ گیا ہے؟"

"دل......!" اس نے سنسنی خیز لہجے میں جواب دیا۔

"دل!" میں نے اس کے جواب کو دہرایا اور کہا۔ "تمہارا مطلب ہے......؟"

"ہاں، ہاں...... وہی۔" وہ میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔ "سمجھا کرو نا......"

"اور میں "سمجھ" کر واپس آگئی تھی۔" خالدہ نے اپنے بیان کے اختتام میں بتایا۔ "مجھے کچھ پتا نہیں کہ آسیہ چھپڑ سے کب واپس آئی تھی یا نہیں آئی تھی۔ پھر مجھے شام سے پہلے ہی تیز بخار چڑھ گیا۔ رات میں اماں نے بتایا تھا کہ آسیہ کہیں گم ہوگئی ہے اور اب پتا چلا ہے کہ وہ...... کہ وہ......!" بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی۔

میں نے دودھ والا خالی گلاس خالدہ کے ہاتھ سے لے کر ٹرے میں رکھ دیا۔ اس گفتگو کے دوران میں، میں نے اسے انڈے کے تین چار پیس بھی کھلا دیے تھے۔ میں ان دونوں نعمتوں سے پہلے ہی نمٹ چکا تھا۔ بات چیت کے اس موڑ پر آکر آسیہ کی موت نے خالدہ کو رنجیدہ کر دیا تھا۔ آسیہ اس کی گہری سہیلی تھی۔ اپنی عزیز از جان سہیلی کی ابدی جدائی پر خالدہ کو اسی طرح دکھی اور ملول ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں آسانی سے خالدہ کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اس نے روارَوی میں مجھے ایک ایسا نکتہ سمجھا دیا تھا جو مجھے آسیہ کے قاتل تک پہنچا سکتا تھا۔

"خالدہ بیٹی! میں تمہارے جذبات اور احساسات کو سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے شفقت بھری آواز میں اسے پکارا۔ "آسیہ کی ناگہانی موت کا مجھے بھی اتنا ہی صدمہ ہے جتنا کہ تمہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ اس کا قاتل جلد از جلد جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائے اور یہ تمہارے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔"

"میرے تعاون کے بغیر......؟" اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ہاں...... مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم میرا ساتھ دو تو میں شام سے پہلے آسیہ کے قاتل کو گرفتار کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے تھانے دار صاحب؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"آسیہ دوبارہ چھپڑ کی طرف کیوں گئی تھی، یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے خالدہ۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس نے اپنے "دل" کے چھپڑ پر رہ جانے کی بات کی تھی۔ یہ کیا ماجرا ہے......؟"

وہ جزبز ہو کر مجھے تکنے لگی۔ میں نے تنبیہ کرنے والے انداز میں کہا۔

"دیکھو خالدہ! میں نے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں جھک نہیں ماری۔ تمہاری باتوں سے میں نے اتنا تو اندازہ لگا ہی لیا ہے کہ آسیہ کسی مرد سے ملنے دوبارہ چھپڑ کی طرف گئی تھی۔ اگر تم اپنی زبان سے اس مرد کا نام بتا دو گی تو مجھے خوشی ہوگی ورنہ اگر میں نے اپنی تفتیش کے دوران میں اس بندے کا سراغ لگا لیا اور بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم اس شخص کو اچھی طرح جانتی تھیں تو پھر میں تمام تر نرمی کو فراموش کر کے تمہارے لیے جلاد بھی بن سکتا ہوں۔"

میرے سنسناتے ہوئے الفاظ کا خالدہ پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور خوف زدہ سی آواز میں بولی۔ "جی...... آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"وہ کس سے ملنے دوبارہ جوہڑ کی طرف گئی تھی......!" میں نے اپنے الفاظ میں تیزی لاتے ہوئے استفسار کیا۔ "اپنے منگیتر لیاقت علی سے......؟"

"نن...... نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میرا کڑا استفسار جاری رہا۔ "پھر......؟"

"لیاقت تو آسیہ کا منگیتر تھا جی اور اگلے سال ان کی شادی بھی ہونے والی تھی۔" وہ جواب میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "لیاقت تو اس کا پڑوسی بھی تھا۔ اس سے ملاقات کرنے کے لیے چھپڑ کی طرف جانے کی کیا ضرورت تھی پھر......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بتانے لگی۔

"پھر جی...... لیاقت تو کل صبح ہی گاؤں سے لاہور روانہ ہو گیا تھا......"

"یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں خالدہ!" میں نے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ "آسیہ کل دوپہر میں تمہیں اکیلے واپس بھیج کر کس بندے سے ملنے دوبارہ چھپڑ کی طرف گئی تھی؟"

"قد...... قدیر...... سے جی۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

"قدیر...... یہ کون ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ "اور آسیہ سے اس کا کیا تعلق ہے......؟"

"قدیر بھی مغل پورہ ہی میں رہتا ہے جی۔" خالدہ نے قدرے سراسیمہ انداز میں جواب دیا۔ "اس کے باپ خادم حسین کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں تاج بی بی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہے اور......" وہ بولتے بولتے لمحے بھر کو تھمی، ایک گہری سانس خارج کی پھر بتایا۔

"آسیہ، قدیر کو پسند کرتی تھی۔"

"قدیر کو پسند کرتی تھی۔" خالدہ کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "اس کی منگنی کرامت علی کے بیٹے لیاقت علی سے ہوئی تھی، اگلے سال ان کی شادی بھی ہونے والی تھی اور...... وہ قدیر کو پسند کرتی تھی؟"

"جی تھانے دار صاحب! یہی سچائی ہے۔" وہ بڑی رسان سے بولی۔ "آسیہ اور قدیر ایک دوسرے سے شدید محبت کرتے تھے۔ آسیہ کے باپ نے زبردستی اس کی منگنی لیاقت سے کردی تھی اور اگلے سال ان کی شادی کا بھی پروگرام تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ لیاقت، آسیہ کو بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کا دل تو قدیر ہی میں اٹکا ہوا تھا اور وہ دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی رہتے تھے۔"

"اوہ......!" میں نے ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "تو مغل پورہ میں یہ کہانی چل رہی تھی۔"

"تھانے دار صاحب! میں جتنا جانتی تھی اور جو سچ تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔"

"خالدہ! میں نے تمہیں پہلے ہی کہا ہے تو تمہاری بات کا بھی یقین کروں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ، قدیر کرتا کیا ہے؟"

"وہ کھیت مزدور ہے جی۔" اس نے جواب دیا۔

"تم قدیر کو شکل سے تو اچھی طرح پہچانتی ہو نا......؟"

"جی...... جی ہاں......"

"اور اس کی چیزوں کو......؟" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں سمجھی نہیں تھانے دار صاحب؟" اس کی آنکھوں میں الجھن تیرنے لگی۔

"میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔" میں نے اپنا دایاں ہاتھ پتلون کی جیب کے اندر ڈالتے ہوئے کہا۔ "جائے وقوعہ سے مجھے ایک بہت ہی خاص چیز ملی ہے۔ تم دیکھ کر بتاؤ گی کہ اس چیز کا تعلق قدیر سے ہو سکتا ہے یا نہیں......"

وہ تجسس بھرے انداز میں مجھے تکنے لگی۔

اگلے ہی لمحے میں نے اپنی جیب میں سے پیتل کا وہ کڑا باہر نکال لیا جو جائے وقوعہ کے نزدیک، ایک درخت کے نیچے حوالدار دلاور خان کو پڑا ہوا ملا تھا۔

منقش کڑے پر نگاہ پڑتے ہی خالدہ چونک اٹھی اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ "یہ...... یہ آپ کو...... کہاں سے ملا......؟"

"آسیہ کی لاش کے پاس سے۔" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری آنکھوں سے جھلکنے والی بے قراری اس امر کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ تم پیتل کے اس کڑے کو اچھی طرح پہچانتی ہو۔"

"جی...... جی تھانے دار صاحب۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"یہ کڑا کس کا ہے......؟" میں نے پوچھا۔

"قدیر کا......!"

وقوعہ کی دوپہر مقتول آسیہ قدیر سے ملنے چھپڑ کی طرف گئی تھی۔ چھپڑ اور جنگل کے بیچ صرف ایک نہر رواں دواں تھی۔ اگر وہ خالدہ کو چھپڑ کی طرف جانے کا بتا کر جنگل کے اندر پہنچ گئی تھی تو بھی اس سے یہی اندازہ قائم کیا جا سکتا تھا کہ وہ قدیر ہی سے ملنے جنگل میں گئی تھی یا قدیر اسے اپنے ساتھ جنگل کے اندر لے گیا تھا۔ قدیر کی کلائی کا وہ مخصوص کڑا جنگل سے ہمیں ملا تھا جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ قدیر گزشتہ روز جنگل میں گیا تھا۔ کڑیاں ایک ایک کر کے آپس میں مل رہی تھیں اور یہ بہت جلد ایک مربوط زنجیر کی شکل اختیار کرنے والی تھیں۔ بس، ایک بات مجھے بری طرح کھٹک رہی تھی۔

اور...... وہ بات یہ تھی کہ خالدہ کے بیان کے مطابق آسیہ اور قدیر ایک دوسرے کی چاہت میں گردن گردن تک دھنسے ہوئے تھے۔ اس قسم کے عشقیہ پس منظر میں قدیر کا آسیہ کا قاتل ہونا سمجھ سے بالاتر نظر آتا تھا...... مگر پولیس کی تفتیش کی گاڑی تو اس اصول پر کام کرتی ہے کہ...... اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں......!

خالدہ سے میں اور کوئی کام کی بات نہیں اگلوا سکتا تھا لہٰذا میں اس کے گھر سے نکل کر آسیہ کے گھر میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

آسیہ کی رازدار سہیلی خالدہ سے ہونے والی ملاقات اس قدر بھرپور اور معلومات افزا تھی کہ مجھے آگے کسی مرحلے پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں نے آسیہ کے باپ رحمت علی اور اس کے چھوٹے بھائی کرامت علی کو ایک کمرے میں بٹھا کر تازہ ترین حالات کی سنگینی سے آگاہ کر دیا۔ میں نے جنگل سے ملنے والا پیتل کا کڑا بھی باری باری انہیں دکھایا۔ ان دونوں کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا۔ میری بات کے اختتام پر رحمت علی نے غصیلے انداز میں کہا۔

"یہ قدیر...... الو کا پٹھا مجھے شکل ہی سے آوارہ اور بدمعاش لگتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کی درخواست کو رد کر دیا تھا۔"

"درخواست کو رد کر دیا تھا۔" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا......؟"

"وہ لفنگا ایک روز گاؤں سے باہر مجھ سے ملا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس نے پہلے تو مجھے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ آسیہ سے سچی محبت کرتا ہے۔ وہ آسیہ کا بہت خیال رکھے گا لہٰذا میں اسے اپنی فرزندی میں لے لوں۔"

"پھر تم نے اس کی درخواست رد کر دی۔" میں نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ "تم نے اسے اپنی فرزندی میں لینے سے صاف انکار کر دیا ہوگا...... ہیں نا......؟"

"جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ مجھے تو اس کی منحوس شکل ہی سے نفرت تھی۔ جنگلیوں کی طرح اس نے سر کے بال بڑھا رکھے ہیں اور غنڈوں کے مانند قمیص کے بٹن کھولے، چوڑا ہو کر پورے گاؤں میں گھومتا پھرتا ہے......" وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ شیطان کی اولاد قدیر ہاتھ دھو کر میری بیٹی کے پیچھے پڑ گیا ہے اور کسی بھی صورت اس کی جان نہیں چھوڑے گا تو میں نے فوری طور پر آسیہ کی منگنی کرامت کے بیٹے لیاقت کے ساتھ کر دی۔"

"لیکن بھائی صاحب......!" کرامت علی، اپنے بڑے بھائی رحمت علی کے خاموش ہوتے ہی بول اٹھا۔ "یہ قدیر والا معاملہ آپ نے ہمیں تو نہیں بتایا تھا......"

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ کرامت علی کے استفسار میں شکوہ بھرا ہوا تھا۔ رحمت نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

"یہ کوئی خاص بات نہیں تھی اس لیے میں نے تم سے یا تمہاری بیوی شہناز سے اس کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔"

"رحمت بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" کرامت کی شکایت فزوں تر ہو گئی۔ "آپ اتنے خاص اور اہم بلکہ نازک معاملے کو کوئی اہمیت ہی نہیں دے رہے۔ مجھے آپ کی بات سن کر سخت افسوس ہوا ہے۔"

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کرامت علی کے چہرے پر نمودار ہونے والے ناگواری کے تاثرات میں گہرائی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ رحمت نے نہایت ہی سرسری انداز میں کہا۔

"افسوس کیسا کرامت علی۔ میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کر دی ہے......؟"

"یہ زیادتی نہیں تو اور کیا ہے......" کمرے کے باہر سے نسوانی آواز ابھری۔ "اپنی بیٹی کے عیب کو چھپا کر ہمارے بیٹے کے گلے باندھنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اللہ کا شکر ہے، ہم بچ گئے۔"

"تم چپ رہو شہناز......" کرامت نے تیز لہجے میں کہا۔ "میں بات کر رہا ہوں نا......!"

"تمہاری گھر والی کو تمہاری بات بے وزن لگ رہی ہے کرامت۔" رحمت علی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اسی لیے اس نے باہر سے لقمہ دینا ضروری سمجھا ہے۔ تم اسے بھی اندر ہی کچہری میں بلا لو۔"

"رحمت بھائی! سچی بات سب کو کڑوی لگتی ہے۔" کرامت کی بیوی شہناز نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر ہمیں پتا ہوتا کہ آسیہ نے کہیں اور ٹانکا فٹ کر رکھا ہے تو ہم اس رشتے کے لیے ہامی ہی نہ بھرتے۔ خدا کا غضب ہے......" اس نے لمحاتی توقف کیا پھر تیکھے لہجے میں بولی۔ "بے حیا کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور اگلے سال شادی بھی ہونے والی ہے...... وہ اب بھی اپنے یار سے جنگل میں چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتی پھرتی تھی۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو شہناز......" ایک اور زنانہ آواز ابھری۔ "کچھ تو شرم کرو۔ ابھی تو میری بیٹی کی لاش ملی ہے...... اور تم نے الٹی سیدھی بکواس شروع کر دی۔"

یہ یقیناً مقتول آسیہ کی ماں صغراں (صغریٰ بی بی) تھی۔ شہناز کی جلی کٹی باتوں نے اس کو سلگا کر رکھ دیا تھا۔

"شرم میں کیوں کروں، تم کرو آسیہ کی اماں......" شہناز تڑخ کر بولی۔ "میں نے جو کچھ بھی کہا ہے، اس میں ایک بھی بات غلط نہیں۔ مجھ پر یقین نہیں ہے تو جا کر تھانے دار صاحب سے پوچھ لو......"

اب یہ معاملہ خطرناک حدود میں داخل ہوتے جا رہا تھا۔ رحمت علی اور کرامت علی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر تناؤ تو دکھائی دیتا تھا تا ہم دشمنی والی کوئی بات نہیں تھی جبکہ ان کی بیویاں لڑنے مرنے پر تیار نظر آتی تھیں۔

میں نے رحمت علی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"رحمت! تم دونوں اپنی بیویوں کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ میں چلتا ہوں۔ اب میرا یہاں پر کوئی کام نہیں ہے۔"

"آپ کہاں جائیں گے؟" کرامت علی نے پوچھا۔

"قدیر کے پاس۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا۔ "میں اسے اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں گا۔ اس سے تفتیش ادھر تھانے ہی میں ہوگی۔"

"اگر آپ کہیں تو میں اپنا تانگا نکالتا ہوں۔" وہ پیشکش کرنے والے انداز میں بولا۔ "آپ کا تانگا تو آسیہ کی لاش لے کر اسپتال گیا ہے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں کسی نہ کسی طرح اپنی واپسی کا بندوبست خود کرلوں گا۔ تمہارا یہاں رہنا بہت ضروری ہے اور سنو تم دونوں......" میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ اب آپس میں لڑائی جھگڑا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارا اور تمہاری بیویوں کا فساد آسیہ کو زندہ نہیں کرسکتا بلکہ اگر تم لوگوں نے الزام تراشی کے اس فتنہ پرور سلسلے کو بند نہ کیا تو بھائی، بھائی کا دشمن بن جائے گا۔ حالات اور عقل مندی کا تقاضا یہی ہے کہ آپس کے اختلافات کو فی الحال فراموش کرکے آگے کی سوچو......"

وہ دونوں خاموش نظروں سے کبھی مجھے اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ پتا نہیں، میری بات ٹھیک طرح سے ان کی سمجھ میں بیٹھ بھی سکی تھی یا نہیں اور میں نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ فی الحال ان دونوں بھائیوں کا معاملہ میری نظر میں زیادہ اہم نہیں تھا۔ مجھے پہلی فرصت میں قدیر احمد کو چھاپنا تھا لہٰذا میں کانسٹیبل رشید کو ساتھ لے کر اس کے گھر کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

وہ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت تھا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے سامنے میز کی دوسری جانب قدیر احمد کھڑا تھا۔ قدیر کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ سانولی رنگت کا مالک ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس نے سر کے بال زلفوں کی صورت بڑھا رکھے تھے۔ میں نے قدیر کو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے گرفتار کیا تھا اور اپنے ساتھ تھانے لے آیا تھا۔ اسے میری زبانی ہی پتا چلا تھا کہ آسیہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ اس کی گمشدگی ہی سے آگاہ تھا۔ حوالدار دلاور خان آسیہ کی لاش کو ضلعی اسپتال پہنچا کر واپس آگیا تھا اور اس وقت وہ قدیر کے عقب میں مستعد کھڑا تھا جیسے وہ میرے اشارے کا منتظر ہو۔ ادھر میں نے اشارہ کیا اور ادھر اس نے قدیر کی دھلائی شروع کردی۔

میرا تفتیش کا اپنا ایک مخصوص طریقہ کار ہے۔ میں اولین یہی کوشش کرتا ہوں کہ گھی سیدھی انگلی ہی سے نکل آئے۔ اگر مجھے اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوپاتی تو پھر میں دوسرے تفتیشی طریقوں کے بارے میں سوچتا ہوں یعنی اس صورت میں گھی نکالنے کے لیے انگلی کو ٹیڑھا کرنا مجھ پر لازم ہوجاتا ہے۔ میں نے گرفتاری کے وقت قدیر کو کچھ نہیں بتایا تھا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ وہ راستے بھر مجھ سے یہی سوال کرتا آیا تھا مگر میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ تھانے پہنچ کر بھی جب اس کی زبان پر یہ سوال برقرار رہا تو میں نے پوچھا۔

"کیا تم واقعی نہیں جانتے کہ میں نے تمہیں کس سلسلے میں گرفتار کیا ہے......؟"

"اگر مجھے پتا ہوتا تو میں آپ سے پوچھتا ہی کیوں جناب......" وہ عاجزی سے بولا۔ "میں تو آسیہ کی گمشدگی کی وجہ سے پہلے ہی بہت پریشان تھا۔ اوپر سے آپ نے اس کی موت کی خبر بھی سنادی اور گرفتار کرکے زبردستی مجھے تھانے بھی لے آئے۔ اتنا تو بتادیں کہ آخر میرا قصور کیا ہے......؟"

"اگر تم اتنے ہی معصوم اور بھولے بھالے ہو تو مجھے بتاؤ......تم آسیہ کی گمشدگی سے پریشان کیوں تھے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ "تمہارا اس سے کیا رشتہ تھا......؟"

"میرا آسیہ سے محبت کا رشتہ تھا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔"

"جو لوگ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں وہ آپس میں ایک دوسرے کے سچے خیر خواہ بھی ہوا کرتے ہیں قدیر!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہاری طرح خودغرض اور سفاک نہیں؟"

"جناب......!" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے کون سی خودغرضی اور سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے؟"

"تم جس کو چاہنے کے دعوے دار ہو اس کے خون میں ہاتھ رنگنا تمہاری خودغرضی وسفاکی نہیں تو اور کیا ہے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری کھوکھلی چاہت اور محبت کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے قدیر!"

"جناب! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ "میں تو آسیہ کو معمولی سی گزند پہنچانے کا بھی تصور

نہیں کرسکتا اور آپ اس کے قتل کی بات کر رہے ہیں......؟"

"کیا یہ بات درست ہے کہ تم چوری چھپے آسیہ سے ملاقاتیں کیا کرتے تھے؟" میں نے ایک دوسرے زاویے سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔

"جی ہاں، یہ درست ہے۔" اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"جبکہ تمہیں اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ آسیہ کی منگنی ہوچکی تھی۔" میں نے کھا جانے والی نظر سے قدیر کو گھورا۔ "اور اگلے سال اس کی لیاقت کے ساتھ شادی بھی ہونے والی تھی......؟"

"جی ہاں۔ میں آسیہ کی منگنی کے بارے میں بھی جانتا تھا۔"

"اس کے باوجود بھی تم اس سے ملاقاتوں سے باز نہیں آتے تھے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "جبکہ تمہیں اچھی طرح یہ بات معلوم تھی کہ تمہاری یہ حرکت اس کے رشتے والے معاملے کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتی تھی......؟"

"تھانے دار صاحب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ بات میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بڑی گہری محبت کرتے تھے اور میں نے آسیہ کے باپ چاچا رحمت علی سے رشتے کی بات بھی کی تھی مگر اس نے مجھے بری طرح جھڑک دیا تھا اور پھر......" وہ لمحے بھر کو سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"اور پھر اس واقعے کے چند ہی روز بعد رحمت علی نے آسیہ کی اپنے بھائی کے بیٹے لیاقت سے منگنی کردی تھی۔"

"آسیہ اور لیاقت کی منگنی ہوگئی مگر تم پھر بھی چھپ چھپ کر آسیہ سے ملتے رہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ تم کتنا گھناؤنا کام کر رہے ہو......؟"

"میں مانتا ہوں کہ آسیہ کی منگنی ہوجانے کے بعد مجھے اس سے ہر قسم کا ناتا توڑ دینا چاہیے تھا۔" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔ "میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا...... بلکہ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مجبور تھے۔ آسیہ کسی بھی قیمت پر لیاقت سے شادی کرنے کو تیار نہیں تھی مگر وہ اپنے باپ کے زبردستی کے فیصلے کے سامنے کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ ہم جب بھی ملتے، وہ یہی رونا روتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ میں کوئی ایسی راہ نکالوں کہ ہماری شادی ہوجائے۔"

"تو کیا تم ایسی راہ نکالنے میں کامیاب رہے تھے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اگر کامیاب ہوجاتا تو پھر بات ہی کیا تھی جناب!" وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے استفسار کیا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے مقصد میں ناکام رہے تھے؟"

"جی ہاں......" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "مجھے اس گمبھیر مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آیا تھا حالانکہ ایک موقع پر آسیہ نے یہاں تک کہا تھا کہ ہم خاموشی سے بھاگ کر کسی دوسرے شہر میں چلے جاتے ہیں اور وہاں جا کر شادی کرلیتے ہیں لیکن......!"

وہ بات ادھوری چھوڑ کر خاموش ہوا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ جناب...... آپ اسے میری شرافت سمجھیں یا بزدلی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں آسیہ کے ساتھ بھاگنے کی ہمت نہ کرسکا......!"

"یہ تمہاری بزدلی تھی یا شرافت اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "مگر میں اتنا جانتا ہوں کہ ہر طرف سے مایوس ہوجانے کے بعد تم نے ایک سنگین قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور......"

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ "سنگین قدم......؟"

"ہاں...... سنگین قدم!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟"

"میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" میں نے ٹھوس الفاظ میں کہا۔ "جب تمہیں یقین ہوگیا کہ آسیہ کسی طرح تمہاری نہیں ہوسکتی تو تم نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔"

"یہ جھوٹ ہے......" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھ پر الزام ہے۔"

"او ئے الزام کی اولاد......" حوالدار نے اس کی کمر پر ایک لات رسید کرتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا۔ "تم ملک صاحب کو جھوٹا کہہ رہے ہو...... تمہیں شرم نہیں آتی......؟"

دلاور خان آپوں آپ ہی جلال میں آگیا تھا حالانکہ میں نے اسے کسی قسم کی جارحانہ کارروائی کا اشارہ نہیں کیا تھا۔

حوالدار کی لات کھانے کے بعد قدیر توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کا دماغی توازن تو میرے تیکھے اور نکیلے سوالات نے درہم برہم کر رکھا تھا، حوالدار کے زوردار حملے نے اس کے جسمانی توازن کا بھی تختہ کردیا۔ وہ لڑکھڑایا اور منہ کے بل اس کا بدن میز کی طرف جھکا۔ اگلے ہی لمحے اس کا سر میز

کی چوبی سطح سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ بھی خارج ہوئی۔

دلاور خان کسی عقاب کے مانند اس پر جھپٹ پڑا پھر بجلی کی سی تیزی سے اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر قدیر کو سیدھا کھڑا کر دیا اور گرج دار آواز میں بولا۔

''بندے دا پتر بن کر الف کی طرح سیدھا کھڑا ہو جا اور...... ملک صاحب جو بھی پوچھیں اس کا سچا اور کھرا جواب دے ورنہ......!''

حوالدار دلاور خان نے دھمکی آمیز انداز میں جملہ نامکمل چھوڑا تو قدیر منت ریز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے گھگیایا۔

''تھانے دار صاحب! یہ زیادتی ہے...... میرے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔''

''اوئے ظلم وزیادتی کے گھوڑے......!'' حوالدار نے اسے دہکا مارا۔ ''تم نے ابھی تک ظلم اور زیادتی کے الفاظ سن رکھے ہوں گے۔ اگر میں نے تمہیں ان کی عملی جھلک دکھا دی تو دن میں تارے اور رات میں سورج تمہاری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے گا۔''

میز کی سخت سطح سے قدیر کا سر ٹکرانے سے ایک بھیانک نتیجہ برآمد ہوا تھا اور وہ یہ کہ وہ چہرے کے رخ میز کی طرف آیا تھا اور اس خوف ناک ٹکراؤ میں اس کے ہونٹ شدید زخمی ہو گئے تھے۔ گھائل ہونٹوں سے باقاعدہ خون بھی رس رہا تھا۔ وہ ہاتھ کی پشت سے خون صاف کرتے ہوئے مجھ سے ملتمس ہوا۔ اس کی آواز سے فدویانہ پن جھلکتا تھا۔

''تھانے دار صاحب! آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں اپنی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لیے بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں......''

''دیکھو قدیر! تھانے اور کچہری میں قسمیں اٹھانے سے بات نہیں بنا کرتی۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں کہ حوالدار دلاور خان کتنا جابر پولیس والا ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آنے سے پہلے یہ قساب ہوا کرتا تھا۔ قساب کا مطلب سمجھتے ہو نا......؟''

''جی......'' وہ منمنایا۔ ''قسائی......!''

''ہاں قسائی!'' میں نے اپنی آواز میں زور بھرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک منٹ میں جانور کو الٹا ٹانگ کر اس کی کھال کھینچ لیا کرتا تھا اور اب......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور اسے خوف زدہ کرنے کی خاطر کہا۔ ''اب یہ انسانوں کے ساتھ بھی وہی

جانوروں والا سلوک کرنے کا عادی ہو گیا ہے۔ جو مجرم شرافت سے زبان نہیں کھولتا، اس کی کھال کھینچنے میں کسی حیل و حجت سے کام نہیں لیتا۔ ابھی تو اس نے تمہیں اپنے اسٹائل کا ایک معمولی سا نمونہ دکھایا ہے اور تمہارے ہونٹ خون اگلنے لگے ہیں۔ اگر میں نے تمہیں مکمل طور پر دلاور خان کے حوالے کر دیا تو تم خود ہی تصور کر لو کہ یہ تمہارا کیا حشر کرے گا۔"

"تھانے دار صاحب! آپ خدا کے واسطے میری بات کا یقین کر لیں۔" وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں نہ تو کوئی مجرم ہوں اور نہ ہی آسیہ کو پیش آنے والے حالات میں میرا ہاتھ ہے۔ میں تو پچھلے ایک ہفتے سے اس سے ملا بھی نہیں تھا۔"

میں "مارنے" سے "ڈرانے" کی حکمت عملی کا قائل ہوں اور میں نے قدیر کو خوف زدہ کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن اس کے آخری الفاظ مجھے ہضم نہیں ہوئے تھے۔ میں نے وارننگ دینے والے انداز میں اس پر واضح کر دیا۔

"قدیر! میں تمہیں سچ بولنے اور اپنی صفائی پیش کرنے کا آخری موقع دے رہا ہوں اس لیے اب میرے سوالات کے جوابات بہت سوچ سمجھ کر دینا۔ تمہاری ایک ذرا سی غلطی تمہیں سید حامد دلاور خان کی تحویل یعنی تفتیش کے جہنم میں پہنچا سکتی ہے۔"

وہ سراسیمہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "جی پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"تمہارا دعویٰ ہے کہ تم پچھلے ایک ہفتے میں آسیہ سے نہیں ملے ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرے پاس پکی اطلاع ہے کہ تم کل دوپہر کو چھپڑ پر آسیہ سے ملے تھے۔ پھر تم اسے اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے اور وہاں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا تھا تھانے دار صاحب......!" وہ بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کس نے میرے بارے میں ایسی غلط سلط باتیں بتائی ہیں؟"

"خالدہ نے...... آسیہ کی سب سے رازدار سہیلی خالدہ نے۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ "اس کے علاوہ میرے پاس تمہارے جرم کی ایک واقعاتی شہادت بھی موجود ہے۔"

"خالدہ نے آپ کو کیا بتایا ہے......؟" وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور وہ واقعاتی شہادت کیا ہے......؟"

"اگر تم اتنے ہی بھولے بادشاہ ہو تو سنو۔" میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "کل دوپہر میں آسیہ اور خالدہ ایک ساتھ مٹی نکالنے چھپڑ پر پہنچی تھیں۔ جب ان کی واپسی کا وقت آیا تو آسیہ یہ کہہ کر وہیں رک گئی کہ آج اس کی تم سے ملاقات طے ہے اور......!"

"مگر میں نے تو آسیہ کو ایسی کوئی اطلاع نہیں بھجوائی تھی۔" میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بے ساختہ بول اٹھا۔

"تو اس کا مطلب ہے، تم ملاقات کے حوالے سے مقتولہ کو کوئی اطلاع وغیرہ بھی بھجوایا کرتے تھے؟" موقع ہاتھ لگتے ہی میں نے کاری وار کر دیا۔

"جی ہاں......!" اس نے بڑے تحمل سے اثبات میں گردن ہلائی۔ "جب ہماری ملاقاتیں راز نہیں رہیں تو میں یہ بتانے میں کوئی حرج محسوس نہیں کرتا کہ ہم دونوں کو جب ملنا ہوتا تھا تو ہم گوشی کے ذریعے ایک دوسرے کو پیغام بھجوایا کرتے تھے۔"

"یہ گوشی کون ہے؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"گوشی کا اصل نام تو نصیر ہے جناب۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کی عمر لگ بھگ آٹھ سال رہی ہوگی۔ یہ بچہ مغل پورہ ہی میں رہتا ہے۔ میں گاہے بہ گاہے گوشی کو چیز کے لیے پیسے دے دیا کرتا تھا جس کے بدلے میں وہ بڑی رازداری کے ساتھ ہمارے درمیان پیغام رسانی کا فرض انجام دیتا تھا۔"

"تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کل کی ملاقات کے لیے تم نے آسیہ کو یا آسیہ نے تمہیں کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا؟" میں نے کڑے لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں جناب...... بالکل نہیں۔" اس نے نفی میں جواب دیا۔

"ایک بات ذہن میں رکھنا قدیر!" میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ "میں آنکھیں بند کر کے تمہاری بات پر یقین نہیں کروں گا بلکہ گوشی کو تھانے بلا کر اس سے تمہارے بیان کی تصدیق بھی کروں گا۔"

"جی ضرور...... آپ کے ایسا کرنے سے میری بے گناہی ثابت ہو جائے گی۔" وہ پراعتماد لہجے میں بولا۔ "مجھے پکا یقین ہے کہ گوشی صاف انکار کر دے گا کہ میں نے

یا آسیہ نے کل کی ملاقات کے حوالے سے اس سے کوئی بات کی تھی۔"

"ہوں......!" میں گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر قدیر سے پوچھا۔ "تم مجھے گوشی کے گھر کے بارے میں بتاؤ۔ میں ابھی اسے تھانے بلانا چاہتا ہوں۔"

قدیر نے نہایت ہی سادہ الفاظ میں مجھے گوشی کے گھر کی لوکیشن اور محلِ وقوع بتادیا۔ میں نے دلاور خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم اس بچے کو فی الفور یہاں بلوانے کے لیے کسی اہلکار کو مغل پورہ کی طرف روانہ کردو۔"

"او کے ملک صاحب!" یہ کہتے ہوئے دلاور خان میرے کمرے سے نکل گیا۔

قدیر نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی۔ دلاور خان کے رخصت ہوتے ہی اس نے سکھ کی سانس لی تھی اگر قدیر سچا تھا اور آسیہ کی موت میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا تو پھر آسیہ کا قاتل کون ہوسکتا تھا......؟

اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے میں نے قدیر کو ذرا مختلف زاویے سے گھسنا شروع کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"قدیر! تو تم اس بات پر ثابت قدمی سے ڈٹے ہوئے ہو کہ نہ تو تم کل آسیہ سے ملنے چھپڑ کی طرف گئے تھے اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ جنگل کے اندر لے گئے تھے؟"

"بالکل جناب، حقیقت یہی ہے۔" وہ زور دے کر بولا۔ "ابھی گوشی یہاں آکر اس بات کی تصدیق کردے گا۔"

"گوشی کو یہاں پہنچنے میں ابھی تھوڑا وقت لگے گا۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جب تک میں ایک اور اہم امر کی تصدیق کرلیتا ہوں......"

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے بڑی رسان سے کہا۔ "قدیر! مغل پورہ کے نصف درجن افراد نے مجھے بتایا ہے کہ تم اپنی کلائی میں پیتل کا ایک منقش کڑا پہنے رہتے ہو لیکن اس وقت مجھے تمہاری دونوں کلائیاں خالی نظر آرہی ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کڑا کہاں گیا؟"

"وہ جناب......!" وہ مایوسی اور افسوس سے لبریز آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "وہ کڑا چند روز پہلے کہیں گم ہوگیا ہے۔ مجھے اس کی گمشدگی کا سخت دکھ ہے تھانے دار صاحب۔"

"کلائی میں پہنے پہنے کڑا کیسے گم ہوسکتا ہے قدیر۔" میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ "اپنی بات کی وضاحت تو کرو......؟"

"وہ کڑا کلائی میں سے گم نہیں ہوا تھانے دار صاحب!"

"پھر...... پھر کہاں سے گم ہوا تھا؟" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"چند روز قبل میں ٹیوب ویل پر نہا رہا تھا تو میں نے وہ کڑا اپنی کلائی سے اتار کر کپڑے کے ساتھ رکھ دیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نہاتے وقت کڑے کو ہمیشہ اتار لیا کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ نہاتے وقت یہ میری کلائی سے نکل کر ٹیوب ویل کے پانی میں بہہ کر کافی آگے نکل گیا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے تلاش کیا تھا۔ پھر میں بہت احتیاط کرنے لگا تھا۔ صابن لگے ہاتھوں سے اس کے پھسل کر کلائی سے نکل جانے کا امکان بہرحال موجود رہتا ہے۔ اسی خوف سے میں کڑا اتار کر اپنے لباس کے ساتھ رکھ لیا کرتا تھا مگر......" اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک رنجیدہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"مگر چند روز پہلے جب میں ٹیوب ویل پر نہانے کے بعد اپنے کپڑوں کی طرف آیا تو کڑا وہاں سے غائب تھا اور...... آج تک غائب ہے۔"

"تم مجھے کوئی نئی کہانی سنانے کی کوشش تو نہیں کررہے قدیر۔" میں نے شک بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "یاد رکھو، اگر تم نے اپنے کسی جھوٹ کی مدد سے مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کی تو میں تمہارا وہ حشر نشر کروں گا کہ دنیا تمہارا تماشا دیکھنے کے لیے جوق در جوق مغل پورہ پہنچے گی۔"

"میں نے آپ کو جو بھی بتایا وہ سو فیصد سچ ہے تھانے دار صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اگر بعد میں میرا کہا ہوا ایک لفظ بھی غلط نکلے تو میں سخت سے سخت سزا پانے کو تیار ہوں...... میں تو ابھی تک اس کڑے کی گمشدگی پر پریشان ہوں اور ہر ممکنہ جگہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

ان لمحات میں قدیر مجھے ایک سچا اور کھرا شخص نظر آیا۔ مجرموں سے نمٹتے ہوئے میری عمر بیت گئی تھی۔ کوئی کچا مجرم ہو یا پکا عادی مجرم...... میں اس کے انداز ہی سے پہچان جاتا تھا۔

"قدیر!" میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "تمہیں اس پیتل کے منقش کڑے کے لیے مزید غمزدہ یا

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''
''ج ج...... جی...... کیا مطلب؟'' وہ حیرت سے منہ کھول کر مجھے تکنے لگا۔
''مطلب یہ کہ...... میں نے تمہارا گمشدہ کڑا ڈھونڈ نکالا ہے۔'' میں نے یہ کہتے ہوئے مذکورہ کڑا اپنی میز کی دراز میں سے نکال کر اس کی سمت بڑھا دیا۔
کڑے پر نگاہ پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھٹ گئیں اور اس کے حلق سے ایک ناقابلِ یقین سی آواز خارج ہوئی۔
''یہ...... یہ...... آپ کو...... کہاں سے ملا ہے......؟''
''جنگل میں سے!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ ادھر آسیہ کی لاش کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔''
''اس کا تو یہ مطلب ہوا تھانے دار صاحب......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''جس شخص نے بھی میرا یہ کڑا چرایا تھا وہی آسیہ کا قاتل بھی ہے۔''
''تمہارا اندازہ درست نظر آتا ہے قدیر!'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ شخص تمہارا دشمن بھی ہے۔ اس نے منصوبہ بندی کے ساتھ آسیہ کو اس طرح قتل کیا کہ اس کے قتل کا شک سیدھا سیدھا تم پر جائے۔''
''اس دنیا میں میرا تو صرف ایک ہی دشمن ہے تھانے دار صاحب!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔
''کون ہے وہ؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''لیاقت علی...... آسیہ کا منگیتر۔'' اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''آسیہ اکثر مجھے بتاتی رہتی تھی کہ لیاقت مجھ سے شدید نفرت کرتا ہے اور اسے بھی میرے خلاف اکسانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔''
ادھر قدیر کی بات ختم ہوئی ادھر حوالدار دلاور خان نے میرے کمرے میں آکر اطلاع دی۔
''ملک صاحب! نصیر عرف گوشی تھانے پہنچ گیا ہے۔''

☆☆☆

گوشی آٹھ سال کا ایک گول مٹول بچہ تھا لیکن اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات میں ایک خاص قسم کی عیاری اور چالاکی دکھائی دیتی تھی۔ تھانے میں آنے کا اسے پہلی بار اتفاق ہوا تھا لہٰذا اس کی ساری ہوشیاری اور تیزی وطراری کافور ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے پوچھ گچھ سے پہلے اسے حوالات میں بند قیدیوں کا بھی نظارہ کرایا اور اس پر واضح کر دیا کہ اگر اس نے ذرا سی غلط بیانی کی تو میں اسے بھی انہی قیدیوں کے ساتھ حوالات میں بند کر دوں گا۔
وہ میری خطرناک باتیں سن کر سہم گیا اور اس نے مجھ سے پکا وعدہ کیا کہ وہ ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولے گا۔
میں نے گوشی کو بلایا تو قدیر کے بیان کی تصدیق کے لیے تھا لیکن جب میں نے اس سے طریقے سلیقے سے پوچھ گچھ کی تو اس نے ایسے ایسے انکشافات کیے کہ آسیہ کے قتل کا معما چٹکی بجاتے میں حل ہو گیا۔
گوشی کی تصدیق نے قدیر کو بے گناہ اور لیاقت کو گناہ گار ثابت کر دیا تھا۔ لیاقت نے زیادہ پیسوں کا لالچ دے کر گوشی سے اپنا کام نکلوایا تھا۔ لیاقت کو کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ گوشی آسیہ اور قدیر کے درمیان ایک ڈاکیے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نے گوشی کی مدد ہی سے قدیر کا کڑا چوری کرایا تھا اور چند روز بعد گوشی ہی کے ذریعے اس نے آسیہ تک یہ پیغام بھجوایا تھا کہ قدیر وقوعہ کی دوپہر جنگل میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ آسیہ چونکہ گوشی پر پورا بھروسا کرتی تھی۔ وہ اس کی طرف سے دھوکے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی لہٰذا وہ قدیر سے ملنے جنگل میں پہنچ گئی جہاں لیاقت علی چھپ کر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بعد جنگل کے اندر آسیہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا اسے سمجھنے کے لیے کسی خاص قسم کی عقل کی قطعاً ضرورت نہیں۔
بعدازاں جب میں نے لیاقت علی کو لاہور سے گرفتار کر کے اس سے کڑی تفتیش کی تو اس نے زبان کھولنے میں کسی پس وپیش سے کام نہیں لیا۔ وہ اپنی مخالفت میں چلنے والی ہوا کو محسوس کر چکا تھا لہٰذا اس نے عافیت اسی میں جانی کہ اپنے جرم کا اعتراف کر لے۔
میں نے آخر میں اس فرزند دروغ سے ایک سادہ سا سوال کیا۔ ''تم نے یہ سب کیوں کیا؟''
''میں آسیہ کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''مگر وہ کسی بھی طور قدیر کو اپنے دل ودماغ سے نکالنے کے لیے تیار نہیں تھی اور میں کسی زندہ لاش سے کیوں کر شادی کر سکتا تھا؟''
''اس لیے تم نے فریب کا ایک جال بچھا کر آسیہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری......؟''
اس نے میری بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے گردن جھکا دی۔ یہ جھکی ہوئی گردن اس کی پشیمانی اور اقبالِ جرم کی روشن دلیل تھی۔

(تحریر: حسام بٹ)

گھاؤ

ڈاکٹر شیر شاہ سید

انسان عہدِ قدیم کا ہو یا عہدِ جدید کا... غربت اور امارت کا فرق نمایاں رہتا ہے... ایک ہی ملک میں ترقی یافتہ علاقے جن سہولتوں کے حقدار ہوتے ہیں، پسماندگی کے شکار لوگ ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے... یاسیت کے حصار میں قید اس کی زندگی بھی آسائشوں سے دور تھی لیکن جب قدرت مہربان ہوجائے تو علاج چل کر خود مریض کے پاس پہنچتا ہے... اس کی زندگی نے بھی یاسیت کا چولا اتار پھینکا تھا۔

ایک گھائل روح کے غموں کا مداوا..... قدرت کی مہربانیوں کا قصہ



یہ سیدھا سادہ اسقاطِ حمل کا کیس نہیں تھا۔

نواب شاہ کے سول اسپتال میں اسقاطِ حمل کے ساتھ بہت سارے مریض آتے ہیں۔ اسقاطِ حمل ایک عام بات ہے۔ لاکھوں کروڑوں عورتوں کو تو پتا بھی نہیں چلتا کہ ان کا حمل ضائع ہوگیا ہے۔ قدرت کا نظام ہی اس قسم کا ہے کہ ہونے والے بچے میں اگر ایسی خرابی ہو جس کے ساتھ زندہ رہنا ممکن ہی نہ ہو تو حمل خودبخود ضائع ہوجاتا ہے۔ اس حمل کو ضائع کرنے کے لیے، اس بچے کو گرانے کے لیے کسی دائی، نرس، مڈوائف یا ڈاکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ قدرت کے اپنے اصول ہیں، اپنا نظام۔ وہ اس بحث میں پڑتی ہی

نہیں ہے، کوکھ کے اندر حیات کب انگڑائی لیتی ہے۔

مگر اس اسقاطِ حمل کا مسئلہ اتنا سیدھا سادہ نہیں تھا۔

وہ نواب شاہ کے قریبی شہر دولت پور کے آس پاس کے ایک گاؤں سے لائی گئی تھی۔ دیکھتے ہی ایسا لگا جیسے وہ مر جائے گی۔ اکھڑی اکھڑی سانسیں، تمتماتا ہوا سرخ چہرہ، ہونٹوں پر پپڑی سی جمی ہوئی۔ غنودگی کی سی کیفیت میں وہ آہستہ آہستہ اپنی زبان میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔

”میں مرجاؤں گی، ہائے میں مرجاؤں گی۔ میرے بچوں کا کیا ہوگا۔ مجھے بچالو، بچالو مجھے۔ مجھ سے گناہ ہوگیا۔“

اسے فوری طور پر داخل کرلیا گیا تھا، اس کے ساتھ صحیح بات بتانے والا کوئی بھی نہیں تھا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ ہاری شوہر نے صرف یہی بتایا کہ گزشتہ چار پانچ دنوں سے اس کی طبیعت خراب ہے۔ قاضی احمد شہر کی ایک دائی کے پاس یہ گئی تھی پھر جب واپس آئی تو اس کے پیٹ میں درد تھا۔ دولت پور کے میڈیکل اسٹور سے اس نے اسے درد کی دوا لاکر دی مگر درد تو ختم نہیں ہوا بلکہ اسے الٹیاں شروع ہوگئیں، پھر بخار آگیا۔ حکیم کو بھی دکھایا اور مسجد سے پانی بھی لاکر پلایا مگر طبیعت صحیح ہونے کے بجائے خراب سے خراب تر ہوتی چلی جارہی ہے۔ دولت پور میں موجود لیڈی ہیلتھ ورکر دیکھنے آئی تو اس نے اسے فوراً نواب شاہ کے سول اسپتال لے جانے کے لیے کہا۔ گاؤں سے اسے بیل گاڑی پر ڈال کر دولت پور اور پھر دولت پور سے ایک گاڑی والے کو منہ مانگے پیسے دیے تو اس نے نواب شاہ پہنچادیا تھا۔

اس کی حالت خطرناک حد تک خراب تھی۔

اس کا شوہر غلام علی لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ چہرے پر داڑھی اگی ہوئی، چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر سیاہ گھنی پلکیں، نمایاں ستواں ناک، چوڑی پیشانی اور چہرے کے خطوط جیسے کسی نے چھیل چھیل کر بنائے ہوں۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت آدمی تھا مجھے ہالی وڈ کی ایک فلم میں نمایاں کردار ادا کرنے والا چارلٹن ہیسٹن یاد آگیا تھا۔ کھردرے موٹے موٹے سے ہاتھ اور مضبوط شانے بتارہے تھے کہ اس نے زندگی میں محنت کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اس کے پاس کوئی تعلیم نہیں تھی۔ وہ صدیوں پرانے سندھی کسانوں ہاریوں کا تسلسل تھا جنھوں نے زمینوں کی چھاتی کو کوٹ کوٹ کر، دریا سے پانی نچوڑ کر اپنی جوانی کو اپنے مالکوں کی بھینٹ چڑھا کر ان کے لیے غلہ اگایا۔ ان کے گھروں حویلیوں، محلوں کو سجایا۔ ان کے لیے جنگیں لڑی تھیں اور ان کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی جانوں کا نذرانہ دیا تھا۔ موہنجودڑو سے بھی سالوں سال قبل اور موہنجودڑو کے بعد بھی، گوتم بدھ کے پیروکاروں کے زمانے میں بھی اور محمد بن قاسم کے قتل ہونے کے بعد بھی، مغلوں، کلھوڑوں، تالپوروں، سومروں کے وقت میں بھی اور انگریزوں کی حکمرانی کے زمانے میں بھی، پاکستان بننے کے بعد بھی اور ون یونٹ کے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ اپنے سرداروں، پیروں، وڈیروں، جاگیرداروں، زمینداروں اور سیدوں کی زمینوں کو آباد کریں، ان کی خدمت کے لیے اپنی نسل میں اضافہ کریں اور وقت سے بہت پہلے ملیریا، ٹائیفائڈ، کالرا، پلیگ، چیچک یا اسی قسم کے کسی مرض میں مبتلا ہوکر مرجائیں۔

کہتے ہیں کہ اب چیچک ختم ہوگئی ہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں نے اس کا خاتمہ کردیا ہے۔ چیچک ختم ہوگئی تو کیا ہوا، موجودہ نسلوں کا خاتمہ کرنے کے لیے کالا یرقان ہے۔ دنیا شاید کبھی نہیں بدلے گی۔

اسے ایک سو چار بخار تھا، اس کی نبض بہت ہلکی تھی اور ایک منٹ میں ایک سو چالیس پچاس دفعہ چل رہی تھی، بلڈ پریشر بہت ہی کم تھا، اوپر کا ستر اور نیچے کا چالیس۔ وہ ایک منٹ میں اٹھائیس تیس دفعہ سانسیں لے رہی تھی۔ اس کا ہیموگلوبن سات تھا۔ جانے وہ زندہ کیسے تھی۔ گاؤں دیہات کی یہ مزدور ہاری عورتیں مرنے میں دیر بھی بہت لگاتی ہیں۔

اسے فوری طور پر ڈرپ لگائی گئی تاکہ بخار اور سانس سے ضائع ہونے والا پانی فوری طور پر جسم میں پہنچایا جاسکے۔ ناک پر آکسیجن کی نلکی لگادی گئی تاکہ سانس لینے میں آسانی ہو۔ دو بہت ہی طاقت ور قسم کی اینٹی بائیوٹک شروع کی گئی تاکہ جسم میں جو انفیکشن پھیل گیا ہے اس کے خلاف یہ دوا کام شروع کردے۔ تھوڑا سا خون نکال کر بھیج دیا گیا تاکہ کم از کم دو بوتلیں خون کا انتظام ہوجائے۔ اگر آپریشن کی ضرورت پڑ جائے گی تو اس کے لیے خون کا ہونا ضروری تھا، مریضہ کا ہیموگلوبن بہت کم تھا۔

جب اندرونی معائنہ کیا گیا تو صورت حال بہت خوف ناک تھی۔ مریضہ کی بچہ دانی میں سوراخ تھا اور اس سوراخ کے ذریعے سے آنتیں باہر نکل رہی تھیں جن میں کئی جگہ پر چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن سے فضلہ رس رس کر نکل رہا تھا۔ پیشاب کی تھیلی کے نچلے حصے پر کالا سا نشان تھا جس کے چاروں طرف جمع ہوا خون تھا۔

مریضہ تقریباً بے ہوش تھی اور کچھ بھی بتانے کے قابل نہیں تھی مگر اندازہ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی کہ وہ اپنا بچہ ضائع کرانے کے لیے کسی کے پاس گئی تھی جہاں پر اس کے ساتھ یہ سب کچھ ہوا ہوگا۔

غریب لوگوں کے لیے بچہ ضائع کرانا بھی ایک مسئلہ ہے۔ امیر لڑکیاں اور عورتیں جائز اور ناجائز بچہ ضائع کرانے کے لیے شہر کی قابل ترین گائناکالوجسٹ کے پاس چلی جاتی ہیں، مناسب فیس دے کر یہ کام نہایت احتیاط اور مہارت کے ساتھ کرالیا جاتا ہے۔ وزیروں، سفیروں، بڑے بڑے سرکاری افسروں اور حکمرانوں کے خاندان کی عورتیں یہی کام سرکار کے خرچے پر انگلینڈ یورپ اور امریکا کے اسپتال میں کرا کر آجاتی ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا ان سے..... مسئلہ تو غریب لڑکیوں کا ہے۔ ان کا ہے جو دیہاتوں میں ہیں اور شہر کی کچی آبادیوں میں رہتی ہیں۔

وہ غریب لڑکیاں جنہیں زبردستی جنسی ہوس کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جو حاملہ ہوجاتی ہیں، وہ کہاں جائیں۔ وہ غریب بچیاں جنہیں مرد بے وقوف بنا کر اور ان کی نادانی کا فائدہ اٹھا کر حاملہ کردیتے ہیں، وہ کس کے پاس شکایت کریں، مدد کے لیے جائیں۔ یہ عورت جو پہلے ہی سات بچوں کی ماں ہے اور اب حاملہ نہیں ہونا چاہتی ہے مگر حمل سے ہے تو اپنا حمل ضائع کرانے کے لیے کس کے پاس جائے؟

سماج کے پاس اس قسم کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا بلکہ اس قسم کے سوالوں کے بارے میں سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ سماج تو دہشت گردی کے خلاف جنگ کر رہا ہے، سماج تو اسلامی نظام کے لیے جدوجہد کررہا ہے، سماج تو جمہوریت کی جنگ لڑ رہا ہے، سماج تو کشمیر کی آزادی کے لیے تیاری کررہا ہے، سماج وہ سب کچھ کررہا ہے جو سماج کے لیے اہم ہے۔ یہ نازک اندام، غریب بے کس مجبور لڑکیاں، عورتیں، سماج کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ جن لڑکیوں کی عزت لوٹی جاتی ہے اس کی شکایت پر پولیس والے بھی اس کی اور اس کے خاندان والوں کی عزت لوٹتے ہیں۔ کنواری ماؤں کو سماج، کاری اور غیرت کے نام پر قتل کردیتا ہے اور رانی جیسی عورتیں دائیوں کے ہاتھوں ادھ مری ہونے کے بعد سرکاری اسپتالوں میں پہنچ جاتی ہیں جہاں انہیں خیرات کے نام پر دوائیں دی جاتی ہیں، رحم کے نام پر خون ملتا ہے، امداد کے طور پر بستر ملتا ہے اور ڈاکٹروں، نرسوں کے رحم وکرم پر ان کی زندگی ہوتی ہے۔

رانی کے لیے بھی کچھ دوائیں اسپتال سے ملی تھیں،

نواب شاہ کی لڑکیوں کے میڈیکل کالج کی طالبات نے اسے اپنا خون دیا اور وارڈ میں لیڈی ڈاکٹروں نے خیرات زکوٰۃ کی مد میں جو رقم جمع کی تھی، اس سے اس کے لیے قیمتی اینٹی بائیوٹک خریدی اور آپریشن کے لیے کچھ سامان حاصل کیا گیا تھا۔

اس کا آپریشن کرنا پڑ گیا۔ پیٹ کھول کر تقریباً سڑی ہوئی بچہ دانی کو نکال دیا گیا اور چھوٹی آنت میں کئی سوراخ تھے۔ ان سوراخ زدہ آنتوں کے حصوں کو نکال کر بقیہ آنتوں کو جوڑ دیا گیا۔ اسے چھ بوتلیں خون کی لگائی گئیں۔ آپریشن چھ گھنٹے تک ہوتا رہا۔ وہ زندگی اور موت کی سرحد کے درمیان جھولا جھولتی رہی۔

پتا نہیں وہ کیسے بچ گئی۔ عام طور پر ایسے مریض بچتے نہیں ہیں۔ شاید اس کے اندر کی ہمت تھی، جینے کی لگن، زندہ رہنے کی خواہش، یہ شدید احساس کہ اگر وہ مرگئی تو گھر پر رہ جانے والے چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا۔ جسمانی زخموں کو اس نے شکست دے دی تھی۔ مجروح زخمی روح کے زخموں کو کون گنتا ہے، کس کے پاس وقت ہے جو غریب کے درد کو محسوس کرے۔

آپریشن کے دس دن کے بعد یکایک اس کا بستر گیلا ہونا شروع ہوگیا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ پیشاب کی تھیلی میں لگے ہوئے کالے نشان جن پر خون جما ہوا تھا، وہ گل کر جھڑ گئے ہیں اور اسے فسٹیولا بھی ہوگیا ہے، پیشاب کی تھیلی میں سوراخ جہاں سے پیشاب مسلسل بہتا رہتا ہے۔

جب دائیاں شہر کی کچی آبادیوں اور چھوٹے شہروں میں، قصبوں میں چوری چھپے اپنے زنگ زدہ اوزاروں سے بچہ گراتی ہیں تو وہ نہ صرف یہ کہ بچہ دانی میں بھی سوراخ کردیتی ہیں بلکہ پیشاب کی تھیلی بھی محفوظ نہیں رہتی ہے۔ رانی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ زندگی کے گھاؤ کتنے گہرے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ رانی کو دیکھ کر لگایا جاسکتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ اس کے مزید بچے نہ ہوں مگر ہمارے نظام نے اسے تقریباً مار دیا تھا۔ اس کی بچہ دانی نکال لی گئی، اس کی آنتوں کو کاٹنا پڑا اور اس کی پیشاب کی تھیلی میں سوراخ ہوگیا۔ اس کے جسم سے چلتے پھرتے پیشاب کی بدبو آنے لگی۔

تین ہفتوں کے بعد اسے گھر بھیج دیا گیا، اس مشورے کے بعد کہ وہ آٹھ ہفتوں کے بعد دوبارہ آئے تو پھر اس کے پیشاب کی تھیلی کے سوراخ کو ایک آپریشن سے بند کردیا جائے گا۔

وہ آٹھ ہفتوں میں نہیں چار مہینے کے بعد آئی، اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ۔ وہ پندرہ سولہ سال کا جوان ہوتا ہوا لڑکا تھا۔ میرے پوچھنے پر پتا چلا کہ جب اس کے آنے کا وقت ہوا تو فصلیں کٹنے کو تیار تھیں اور ہاریوں کے سارے خاندان اس وقت مصروف ہوجاتے ہیں۔ کیا صحت مند کیا بیمار، کیا چھوٹے کیا بڑے، کیا مرد کیا عورت، ہر ایک کو کام کرنا ہوتا ہے۔ پیٹ کھانا مانگتا ہے، روٹی اور قرض دینے والے قرض واپس مانگتے ہیں جو فصل کے بعد ہی دیا جاسکتا ہے۔ فسٹیولا ہے تو کیا ہوا، پیشاب بہہ رہا ہے تو بہتا رہے۔ فصل کٹنی ضروری ہے۔

اس نے بھی خود ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ فصل کے بعد آپریشن کرانے جائے گی۔ ویسے ہی بیماری سے قرض چڑھ چکا ہے اسے کون اتارتا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اندازہ بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کس طرح سے اس نے کام کیا ہوگا۔

فسٹیولا کا آپریشن آسان تھا۔ آپریشن کے بعد اسے چودہ دن اسپتال میں رہنا پڑا۔ چودھویں دن جب پیشاب کی نلکی نکالی گئی تو پیشاب کی تھیلی میں ہونے والا سوراخ بند ہوچکا تھا۔ وہ واپس اپنے گاؤں جانے کے لیے تیار تھی۔

دوپہر دو بجے جب میں اسپتال سے باہر نکلا تو وہ اپنے بیٹے کے ساتھ وارڈ کے باہر میرا انتظار کررہی تھی۔ وہ اور اس کا بیٹا دونوں میرے سامنے کھڑے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں سو سو روپے کے پانچ مڑے تڑے نوٹ تھے جو وہ مجھے دینا چاہ رہی تھی۔

”تو نے میری جان بچائی ہے، مجھے زندہ کردیا ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے سندھی میں کہا۔ اس کے بیٹے نے کہا کہ ماں نے فصل پر کام کرکے یہ روپے تمہارے لیے بچائے ہیں۔ بڑا احسان ہے تمہارا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے وہ اخلاقاً نہیں بلکہ اس کے دل میں بھی یہی ہے۔

میں وہ نوٹ کیسے لے سکتا تھا، ایک غریب کسان کی لٹی ہوئی بیوی سے۔ جو میں نے کیا اس کی تو سرکار مجھے تنخواہ دیتی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا۔ بڑی مشکلوں سے ان دونوں نے روپے واپس لیے تھے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ پیسے وہ اپنے آپ پر خرچ کرے، اپنے خاندان پر خرچ کرے۔

اس نے میرا ہاتھ چوما اور اس کا بیٹا میرے گلے لگ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور میرا دل رو رہا تھا۔

جانے کب ان غیرت مند غریبوں کے سروں سے بےحس حکمرانوں کا سایہ چھٹے گا۔ میں سوچتا ہی رہ گیا۔



بندوبست

تنویر ریاض

دنیا میں سب سے زیادہ گہرا رشتہ شاید غرض کا ہوتا ہے، غرض کی بنیاد پر چاہے جان پہچان اور کوئی تعلق ہو یا نہ ہو بس ایک دوسرے کی ضرورتوں کے محتاج دو انجان لوگ بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں... یہاں بھی اسی غرض کی بدولت انتہائی دشمنی بھی بہت پیاری دوستی میں ڈھل گئی تھی۔

کمزور لمحات میں سہاروں کے متلاشی ایک جوڑے کی جسارت

درختوں کے جھنڈ سے ایک تاریک سایہ برآمد ہوا۔ فضا میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چاندنی نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور اس کی روشنی میں سب کچھ بہت صاف اور واضح نظر آرہا تھا۔ اس نے چاروں طرف احتیاط سے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ سخت سردی کی وجہ سے اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری تھی لیکن اس کی منزل ابھی دور تھی جہاں پہنچ کر وہ اپنے کانپتے جسم کو تھوڑی بہت حرارت پہنچا سکتی تھی۔ جنگل کے بیچ کھلے میدان میں پہنچ کر وہ ایک درخت کے پیچھے رک گئی۔ کہیں کوئی حرکت نہیں دکھائی دی۔ آسمان کی طرف اٹھتی ہوئی ٹہنیاں ٹھنڈی اور

ساکت تھیں اور دھوئیں کی کوئی لکیر آسمان کی طرف جاتی نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس عالم میں تو وہ بوڑھا ٹھٹھر کر رہ گیا ہوگا۔ وہ دیر تک کچن کی کھڑکی کو دیکھتی رہی لیکن اسے وہاں کوئی حرکت نہیں دکھائی دی۔ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں شیڈ کی طرف بڑھی اور لکڑیوں کے ڈھیر پر پڑی بوری کھینچ لی۔

سردی کی شدت سے بوڑھے کی نیند اچاٹ ہوگئی تھی۔ اس نے جو کمبل اوڑھ رکھا تھا وہ اس کڑکڑاتی سردی کا مقابلہ کرنے کے لیے ناکافی تھا۔ اسے اپنے پورے بدن میں شدید اینٹھن محسوس ہوئی۔ وہ زور زور سے کراہنے اور کھانسنے لگا۔ پھر گہری گہری سانسیں لیتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کی نگاہیں وال کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔ شاید اسے صبح ہونے کا انتظار تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور نحیف آواز میں بولا۔ ''ہیلکی!''

ایک بلی چوہے کے عقب سے نمودار ہوئی۔ اس نے تیزی سے کودتے ہوئے باورچی خانے کے دو چکر لگائے اور بوڑھے کے سینے پر دراز ہوگئی۔ اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''تم روز بروز موٹی ہوتی جا رہی ہو۔''

بلی کے جسم سے پھوٹتی حرارت بوڑھے کے جسم کو گرمی پہنچا رہی تھی جس کی وجہ سے اسے اپنے سینے کے درد میں افاقہ محسوس ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ یونہی دم سادھے لیٹا رہا۔ پھر اسے رفع حاجت کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس کا اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے بستر چھوڑنے کے لیے ہمت کر ہی لی۔ پھر اچانک لکڑی کے باکس سے ایک سرسراتی ہوئی آواز آئی جسے سنتے ہی بلی نے چھلانگ ماری اور چوہے کے تعاقب میں دوڑ لگا دی۔ اس دوران بوڑھا بے حس و حرکت بستر پر پڑا چوہے بلی کے کھیل سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

یہ تماشا زیادہ دیر جاری نہ رہ سکا۔ بوڑھے کی ضرورت نے اسے بستر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ فارغ ہونے کے بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور باہر کے منظر پر نظریں جما دیں۔ گہری کہر نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا اور چاند ستاروں کی روشنی میں برف کے چھوٹے موٹے ذرّے چمک رہے تھے۔

ابھی وہ اس نظارے سے پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ سردی کی لہر ایک بار پھر اس کے پھیپھڑوں میں گھس گئی اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ اس نے منظر کی خوب صورتی سے مزید لطف اندوز ہونے کا ارادہ ملتوی کیا اور گھر کی جانب واپس ہولیا۔ اس نے پورچ میں لگا ہوا بلب اور کچن کی لائٹ جلائی تو روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس نے نل کھول کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور چولہا جلانے کے لیے ماچس تلاش کرنے لگا۔ سردی کی وجہ سے اس کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو رہا تھا۔ اس نے ٹارچ اور ٹوکری اٹھائی اور شیڈ کی جانب بڑھنے لگا جہاں لکڑیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے دروازے کی کنڈی ہٹائی تو اسے یوں محسوس ہوا کہ کچھ دیر پہلے اس شیڈ میں کوئی موجود تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں لکڑیوں کے ڈھیر کا جائزہ لیا جنہیں اس نے بڑی احتیاط سے کاٹ کر ترتیب سے رکھا تھا۔ یہ لکڑیاں چولہا جلانے میں استعمال ہوتی تھیں اور ان کا سائز اسٹار رکھا گیا تھا کہ وہ بہ آسانی باورچی خانے کے چولہے میں فٹ ہوسکیں۔ اس نے مختلف اقسام کی لکڑیوں کے ڈھیر بنا رکھے تھے۔ جب ٹارچ کی روشنی صنوبر کے ڈھیر پر گئی تو وہ چونک پڑا۔ وہ تیزی سے ڈھیر کی جانب لپکا اور ہاتھوں سے لکڑیوں کو ٹٹولنے لگا۔ اس کی نظر سے کوئی چیز اوجھل ہوسکتی تھی لیکن ہاتھ دھوکا نہیں کھا سکتے تھے۔ اسے لمحوں میں اندازہ ہوگیا کہ لکڑیوں کے کچھ ٹکڑے غائب ہیں۔ غصے اور بے بسی کی وجہ سے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے اور وہ بری طرح کراہنے لگا۔ اس نے درد کی شدت پر قابو پانے کے لیے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس نے کتنی محنت سے گزشتہ موسم بہار میں صنوبر کے درخت کاٹ کر یہ لکڑیاں جمع کی تھیں۔ یہ وہی جانتا تھا کہ اس درخت کے تنے کو جنگل سے گھسیٹ کر لانے میں اسے کتنی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بہار کا سارا موسم اسی کام کی نذر ہوگیا لیکن اس کی ساری محنت رائگاں چلی گئی۔ کسی بدبخت کو اس ذخیرے کا علم ہوگیا تھا اور وہ یہاں سے لکڑیاں چرا رہا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر وہیں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

☆☆☆

''میں زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہروں گی۔'' اینکا نے پیار سے اپنی دادی کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

دادی نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا دی۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا کہ اس موقع پر اینکا کہیں جائے لیکن وہ اس کی ضدی طبیعت سے واقف تھی۔ اس لیے اسے سمجھانا یا روکنے کی کوشش کرنا فضول تھا۔ اینکا نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکایا اور پلاسٹک کی ٹوکری اٹھا کر چل دی۔ باہر نکل کر اس نے آسمان پر سردیوں کے جھکتے ہوئے سورج کی طرف دیکھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ جھیل کا پانی جم چکا تھا اور اگر سردی کی شدت یونہی برقرار رہتی تو وہ کرسمس کے بعد آئس اسکیٹنگ کے لیے جاسکتی تھی۔ فی الوقت وہ ایک اور

اہم کام کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ بوڑھا گستاوو پگڈنڈی کے دوسرے سرے پر آرا مشین سے متصل ایک کاٹیج میں رہتا تھا اور وہ ہر سال کرسمس کے موقع پر اس سے ملنے جاتی تھی۔

وہ جنگل کے ساتھ والی پگڈنڈی پر تیز تیز قدم بڑھاتی چلی جارہی تھی۔ یہ راستہ اس کا جانا پہچانا تھا اور وہ یہیں پل کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی ساری زندگی اسی علاقے میں گزری تھی۔ البتہ گزشتہ دو ماہ سے وہ اسٹاک ہوم کے ایک اخبار کے لیے کام کر رہی تھی اور مصروفیت کے سبب لگ رہا تھا کہ شاید کچھ عرصے تک وہ گھر نہ آسکے گی لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اپنا کام وقت پر مکمل کرنے میں کامیاب ہوگئی اور اسے اپنی دادی کے ساتھ کرسمس گزارنے کا موقع مل گیا۔

دور سے وہ جگہ ایک چھوٹے سے ہیرے کے مانند جگمگاتی محسوس ہو رہی تھی لیکن جیسے جیسے انیکا اس سے قریب ہوتی گئی، زوال کے آثار بھی نمایاں ہوتے گئے۔ باغ اب جھاڑ جھنکاڑ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بیرونی دیواروں کی حالت بھی شکستہ تھی۔ لگتا تھا کہ ان پر عرصے سے رنگ و روغن نہیں ہوا تھا۔ انیکا نے گہری سانس لیتے ہوئے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے دوبارہ دستک دیتے ہوئے زور سے آواز لگائی۔ ''انکل گستاوو!''

ایک سیاہ بلی درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہوئی اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ انیکا نے جھک کر اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''ہیلو بلیکی! کیا تمہارے ڈیڈی گھر پر نہیں ہیں؟''

اس نے دروازے کا ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوگئی۔ روشنی سے اندھیرے میں آنے کے سبب اس کی آنکھیں چندھیانے لگی تھیں۔ اس نے دیکھا کہ ایک ڈبل بیرل شاٹ گن کا رخ اس کی جانب تھا۔ وہ خوفزدہ ہوگئی اور چلاتے ہوئے بولی۔

''انکل! یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

بوڑھے نے گن نیچے کر لی اور الجھے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ اس کا لباس میلا اور شیو بڑھی ہوئی تھی۔ انیکا تین فٹ کے فاصلے سے بھی اس کے جسم سے پھوٹتی ہوئی بدبو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور آنکھیں بوجھل معلوم ہو رہی تھیں۔

''گستاوو! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟'' انیکا کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور وہ واقعی خوفزدہ ہوگئی تھی۔

''ہاں! انیکا!'' بوڑھے نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' اب اس کے لہجے میں خوف کی جگہ غصہ نمایاں ہوگیا تھا۔ ''تم یہاں شاٹ گن لیے کیوں کھڑے ہو؟''

بوڑھا مڑا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔ انیکا بھی اس کے پیچھے تھی ..... وہ جگہ نسبتاً گرم تھی۔ گستاوو میز کے ساتھ رکھی ایک لکڑی کی کرسی پر بیٹھ گیا اور گن اس نے اپنے گھٹنوں پر رکھ لی۔ انیکا نے بھی اپنا سامان نیچے فرش پر رکھ دیا۔ پھر وہ اس کے پاس گئی اور آہستہ سے گن اٹھالی۔ بوڑھے نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ انیکا نے گن کھول کر دیکھی اس میں کارتوس نہیں تھے۔ انیکا نے وہ گن بستر کے نیچے دھکیل دی۔

''اب بتاؤ۔'' وہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

بوڑھے نے یہ سنتے ہی رونا شروع کر دیا۔ اس کے کندھے جھک گئے اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

انیکا نے اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ''انکل! بتاؤ تو سہی۔ کیا ہوا ہے؟''

''چور.....'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہاں، وہ لکڑی چور رہی ہے۔''

''کیا کوئی تمہاری لکڑیاں چرا رہا ہے؟'' انیکا نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انیکا کو اس پر ترس آنے لگا۔ گستاوو نے کئی برس اس جنگل میں کام کیا تھا اور اپنی ساری زندگی اسی چھوٹی سی جھونپڑی میں گزار دی تھی۔ اب اس کا گزارہ معمولی سی پنشن پر ہو رہا تھا۔ اسے حکومت کی طرف سے اجازت تھی کہ وہ ہوا سے گرنے والے درخت اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ گستاوو نے اپنی زندگی انہی درختوں کے نام کر دی تھی۔ اس کے شیڈ میں ایسے کئی درخت موجود تھے جن سے اس کی یادیں وابستہ تھیں۔

''کیا میں تمہارے شیڈ پر ایک نظر ڈال سکتی ہوں؟'' انیکا نے پوچھا۔

وہ بے دلی سے اٹھا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ''یہ سلسلہ تین ہفتے سے چل رہا ہے۔ مجھے اس کا علم اسی وقت ہوگیا تھا۔'' اس نے شیڈ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

شیڈ کے اندر لکڑی کے ڈھیر چھت تک لگے ہوئے تھے۔ انیکا کے لیے یہ محض جلانے کی لکڑی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ شیڈ کے باہر بہت سے قدموں کے نشانات تھے جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس راستے پر انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کی بھی آمد و رفت رہتی ہے۔ اس نے ایک بار پھر بوڑھے کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''تم نے کبھی کسی کار یا

موٹر بائیک کی آواز سنی یا اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا؟''

بوڑھے نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظر کمزور ہو چکی تھی لیکن سماعت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اینکا نے ایک مرتبہ پھر غور سے زمین کا جائزہ لیا اور بولی۔ ''مجھے یہاں کسی گاڑی یا موٹر بائیک کے نشان نظر نہیں آرہے۔ اس کا مطلب ہے کہ چور پیدل چل کر آتا ہے اور کوئی بھی شخص لکڑی سمیت دو سو گز سے زیادہ کا فاصلہ نہیں طے کر سکتا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چور کا تعلق ہیڈ برگا سے ہے۔''

اینکا کا جملہ ختم ہوتے ہی دونوں کی نظریں اس پگڈنڈی پر جم گئیں جو ہیڈ برگا نامی گاؤں کی طرف جارہی تھی۔

☆☆☆

اینکا اپنے ساتھ بہت سا سامان لے کر آئی تھی۔ اس نے وہ سب بوڑھے گستاوو کے حوالے کیا اور اسے کرسمس کی مبارکباد دے کر وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اب اس کا رخ ہیڈ برگا کی جانب تھا۔ چند منٹ بعد ہی وہ گاؤں میں داخل ہو چکی تھی۔ وہاں زیادہ تر مکانات لکڑی سے بنے ہوئے تھے جنہیں کرسمس کی مناسبت سے سجایا گیا تھا۔ وہ اس گاؤں کے بہت سے لوگوں کو جانتی تھی اور تقریباً سب کے ساتھ ہی اس کے ذاتی تعلقات تھے۔ اس گاؤں کے سب سے بڑے گھر میں انکل کارلسن رہتے تھے۔ اس کے برابر والے مکان میں آستا اور فوک اپنے بیٹے پیٹر کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ پیٹر اس سے دو سال بڑا تھا۔ اس سے کافی فاصلے پر گرین ہاؤس تھا جس میں پادری پیٹرسن اور اس کی بیوی ایلسا رہتی تھی۔ اینکا کو وہ پادری بھی اچھا نہیں لگتا شاید اس لیے کہ اس نے اینکا کی ماں کو طلاق ہونے کے بعد اس پر تنقید کی تھی۔ گاؤں کے آخری کنارے پر واقع فارم میں کیرن اور اینڈرس اپنے تین بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ اینکا اور کیرن ایک ہی کلاس میں پڑھتی تھیں۔ کچھ فاصلے پر انجیلا جانسن کا کاٹیج تھا جو اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا۔ اس وقت وہاں اندھیرا اور گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اینکا نے ایک نظر اس پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔ کونے والا مکان ایلیکس کا تھا جس کے پانچ بچے تھے۔ جب بھی اینکا کے پاس فرصت ہوتی تو وہ ان کے بچوں کے ساتھ وقت گزارتی تھی۔ انہی لوگوں میں سے کوئی گستاوو کے شیڈ سے لکڑیاں چوری کر رہا تھا۔ اینکا نے فیصلہ کرلیا کہ وہ چور کا پتا چلا کر ہی دم لے گی۔ اس فیصلے کے بعد وہ مطمئن ہوگئی اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔ اسے احساس تھا کہ بہت دیر ہوگئی ہے۔ دادی انتظار کر رہی ہوں گی۔

☆☆☆

فلوڈا میں کرسمس کی دعائیہ تقریب صبح چھ بجے شروع ہوگئی تھی۔ اینکا اور اس کی دادی بیس منٹ قبل ہی وہاں پہنچ گئی تھیں۔ گاؤں کے بھی لوگ وہاں موجود تھے۔ اینکا نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور عقیدت واحترام سے دعائیہ نظم سننے لگی پھر اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب دعا ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دادی کا ہاتھ تھام کر باہر آگئی۔ سردی بہت زیادہ تھی اور برف باری کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی۔ اس نے دادی کو کار میں بٹھایا اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ گران ہیڈ کے پاس سے گزر رہی تھی اور ہیڈ برگا کا گاؤں اس کی بائیں جانب تھا، تبھی اینکا کی نظر ایک سائے پر گئی اور وہ چونکتے ہوئے دادی سے بولی۔ ''تم نے کچھ دیکھا؟''

''کیا؟'' دادی نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''جنگل کے کنارے پر کوئی کھڑا ہے۔''

''مجھے تو صاف نظر نہیں آرہا۔ ممکن ہے کہ کوئی ہرن ہو۔''

''اس نے ٹوپی پہن رکھی ہے۔'' اینکا نے الجھتے ہوئے کہا۔

دادی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے خیال میں یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ دن نکل آیا تھا اور لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ اگر کوئی شخص جنگل کے کنارے پر کھڑا ہوا تھا تو اس میں حیران ہونے والی کیا بات تھی۔ گھر پہنچنے کے بعد اینکا نے دادی کو اس کے کمرے میں پہنچایا اور بولی۔ ''میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جارہی ہوں۔''

''اس وقت۔ خیریت تو ہے؟ ایسا کیا ضروری کام یاد آگیا؟'' دادی نے پوچھا۔

''میں گستاوو کو دیکھنے جارہی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ سے ٹارچ نکالی اور روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

اینکا کو یقین تھا کہ چور کا تعلق ہیڈ برگا سے ہی ہے چنانچہ اس نے بھی گستاوو کے کاٹیج تک جانے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو گاؤں کے پاس سے گزرتا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ہی اس کے شبے کی تصدیق ہوگئی۔ برف پر قدموں کے نشان بڑے واضح تھے جو سیدھے گستاوو کے شیڈ تک جارہے تھے۔ اس نے ان نشانات کا تعاقب کیا اور شیڈ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد قدموں کے نشان ختم ہوگئے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ چور اب بھی شیڈ کے اندر ہی ہے۔ اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اگر وہ پیٹر یا اینڈرس جیسا طاقت ور مرد ہوا تو وہ اس کا مقابلہ کیسے کر پائے گی۔ اس نے سر کو جھٹک کر

اپنا خوف دور کرنا چاہا اور دبے قدموں شیڈ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگئی۔ وہاں سیاہ لباس پہنے ایک دراز قد شخص موجود تھا۔ آہٹ سن کر وہ پلٹا۔ انیکا نے فوراً ہی ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ڈالی اور چونکتے ہوئے بولی۔ ''تم؟''

وہ انجیلا جانسن تھی۔ اس نے روشنی سے بچنے کے لیے اپنا بازو اوپر اٹھایا اور چلائی۔ ''اسے بجھا دو۔''

انیکا اس کا مطالبہ نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھی اور بولی۔ ''تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' اس کی آواز میں غصے کی وجہ سے ارتعاش پیدا ہوگیا تھا۔ ''تمہیں اس بوڑھے کے یہاں چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آتی جس سے ضعیفی کے سبب چلا بھی نہیں جاتا۔ تمہیں احساس ہے کہ اس نے کتنی محنت سے یہ لکڑیاں جمع کی ہوں گی؟''

وہ ایک قدم آگے بڑھی اور دوسرے ہی لمحے اس کے پیٹ پر ایک ضرب لگی۔ ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری۔ وہ بھی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور لڑکھڑاتی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر پر جا گری۔ انجیلا تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی اور باہر نکلنا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ہی گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ انجیلا چلاتے ہوئے پیچھے کی طرف ہٹی اور بولی۔ ''وہ پاگل بوڑھا ہم پر گولیاں برسا رہا ہے۔''

دوسری گولی دروازے پر لگی اور اس کی لکڑی کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ انیکا ایک بار پھر چلائی اور چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتی ہوئی لکڑی کے ڈھیر کے درمیان دبک کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح سمیٹ لیا تھا کہ جسم کا کوئی حصہ باہر نہ رہے۔ خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ اس دوران انجیلا بھی رینگتی ہوئی اس کے پاس آگئی۔ انیکا کو اس کے کراہنے اور سسکیاں لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ انجیلا تکلیف میں ہے۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا تم زخمی ہو؟''

''ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ اندھیرے میں اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس سے بات کرنا ہوگی۔'' انیکا نے کہا۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹولتی ہوئی دروازے تک پہنچی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر بہ آوازِ بلند بولی۔ ''گستاوو! یہ میں ہوں انیکا۔ میں نے تمہارے چور کو پکڑ لیا ہے۔ کیا ہم آپس میں بات کرسکتے ہیں؟''

باہر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے چند لمحے توقف کیا پھر پہلے سے بھی اونچی آواز میں بولی۔ ''گستاوو! میں انیکا بول رہی ہوں۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟ میں باہر آرہی ہوں۔''

اس بار بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ پہلے کی طرح خاموشی چھائی رہی۔

''خدا کے واسطے کچھ کرو۔ اگر یہ خون اسی طرح بہتا رہا تو میں مر جاؤں گی۔'' انجیلا کراہتے ہوئے بولی۔

انیکا نے گہرا سانس لیتے ہوئے دروازہ پورا کھول دیا۔ فوراً ہی گولیاں برسنے لگیں اور لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فضا میں رقص کرنے لگے۔ انیکا پیچھے کی جانب لڑھکی اور انجیلا پر جا گری۔

''اندھی ہوگئی ہے موٹی۔'' انجیلا اس کے بوجھ تلے کراہتی ہوئی بولی۔

''اپنی زبان بند رکھ، بے وقوف عورت۔'' انیکا چلاتے ہوئے بولی۔

انجیلا نے آہستہ سے اسے اپنے اوپر سے ہٹایا اور منہ بسورتے ہوئے بولی۔ ''تم نے مجھے بے وقوف کہا جبکہ لوگ نہ جانے کیسے کیسے ناموں سے پکارتے ہیں۔ کیا تم نے بھی سوچا کہ ایسی باتیں سن کر مجھ پر کیا گزرتی ہوگی؟''

''تم اسی کی مستحق ہو۔'' انیکا غصے سے بولی۔ ''تم... بے وقوف ہی نہیں بلکہ آوارہ بھی ہو۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ تم نے میرے بوائے فرینڈ کو بھی چھیننے کی کوشش کی تھی۔''

''میں سیون سے محبت کرتی تھی اور وہ بھی مجھے چاہتا تھا۔ اب تک ہماری منگنی ہوچکی ہوتی اگر تم بیچ میں نہ آجاتیں۔''

''اس بازی میں کسی کی بھی جیت ہوسکتی ہے۔'' انیکا فاتحانہ انداز میں بولی۔

انجیلا نے رونا شروع کردیا۔ سردی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میرے چہرے سے خون بہہ رہا ہے۔''

اسی لمحے انیکا کا ہاتھ اپنی ٹارچ پر جا پڑا۔ اس نے سوئچ آن کرکے دیکھا۔ وہ ابھی تک کام کررہی تھی۔ اس نے انجیلا کے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی اور غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں گولی نہیں لگی بلکہ لکڑی کی ایک بڑی پھانس تمہاری آنکھ کے نیچے گھس گئی ہے۔ میں ابھی نکالے دیتی ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے بڑی مہارت سے پھانس کا نکلا ہوا سرا پکڑا اور بڑی صفائی سے اسے نکال لیا۔ انجیلا بولی۔ ''کہیں زخم بڑھ نہ جائے۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہو۔''

''ہاں۔ بشرطیکہ وہ بوڑھا خبطی ہم دونوں کو گولی کا نشانہ نہ بنادے۔''

انیکا نے اندھیرے میں ٹٹول کر ایک بڑی لکڑی تلاش کی تاکہ اس کی مدد سے دروازہ کھول سکے۔ فوراً ہی ایک اور فائر ہوا۔ انیکا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور بولی۔ ''لگتا ہے کہ ہمیں کچھ دیر یہیں بیٹھنا پڑے گا۔''

سردیوں کا سورج سست روی سے نمودار ہوا اور اس کی روشنی دھیرے دھیرے شیڈ میں پہنچنے لگی۔

انیکا اور انجیلا لکڑی کے ڈھیر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ انیکا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس سے پوچھا۔ ''تم نے یہ حرکت کیوں کی؟ میرا مطلب ہے کہ اس بوڑھے کی لکڑیاں کیوں چراتی رہیں؟''

''میں سردی سے بچنا چاہ رہی تھی۔'' انجیلا نے اپنا منہ دوسری جانب پھیرتے ہوئے کہا۔

''اس کا حل تم نے یہ نکالا کہ اس بوڑھے آدمی کی لکڑیاں چرانا شروع کردیں۔''

''تم کبھی نہیں سمجھ سکوگی۔'' انجیلا نے افسردگی سے کہا۔ ''کیونکہ زندگی میں تمہیں کبھی مشکلات سے واسطہ نہیں پڑا۔''

انیکا زور زور سے ہنسنے لگی۔ اس کے قہقہوں کی آواز باہر تک جارہی تھی۔

''تم قہقہے لگاسکتی ہو۔'' انجیلا نے کہا۔ ''کیونکہ تمہارے پاس اچھی ملازمت ہے اور اسٹاک ہوم جانے کے مواقع بھی ہیں۔''

''تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔'' انیکا نرمی سے بولی۔ ''تمہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ ان باتوں کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔''

''میرے گھر کی بجلی اور ٹیلی فون دونوں ہی کٹ گئے ہیں۔ سوشل سیکیورٹی سے بھی مجھے کچھ نہیں مل رہا۔ میں پیسے پیسے کے لیے محتاج ہوگئی ہوں۔''

''تمہیں کوئی ملازمت کرلینی چاہیے لیکن لگتا ہے کہ تم نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔'' انیکا نے تلخی سے کہا۔

''زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارے خیال میں یہاں اس گاؤں میں مجھے کون سی ملازمت مل سکتی ہے؟''

''یہاں نہیں تو کسی اور جگہ تو ملازمت مل سکتی ہے۔ اس کے لیے تمہیں یہ گاؤں چھوڑنا ہوگا۔''

''پھر میں کہاں رہوں گی؟ میرا گھر تو یہاں ہے۔''

''اسے بیچ دو۔'' انیکا نے مشورہ دیا۔

''اس پرانی جھونپڑی کا مجھے کیا ملے گا۔'' وہ مایوسی سے بولی۔

''ٹھیک ہے پھر اسی طرح روتے دھوتے زندگی گزارتی رہو۔ لگتا ہے تمہیں ناکامیوں سے پیار ہوگیا ہے۔''

انجیلا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ اب اس سے انیکا کی جلی کٹی باتیں برداشت نہیں ہورہی تھیں۔ وہ جھلا کر اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی تھی کہ دو فائر اور ہوئے۔

''مردود بوڑھے۔'' وہ زور سے چلائی۔

گستاو نے اپنی گن دوبارہ لوڈ کی اور مزید دو فائر کردیے۔

''کیا تم نے کبھی کوئی ملازمت نہیں کی؟'' انیکا حیران ہوتے ہوئے بولی۔

انجیلا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔ ''ہاں ایک مرتبہ جاب کی تھی۔ مجھے ہوم کیئر سروس میں کام مل گیا تھا لیکن تین سال پہلے چھانٹی ہوئی تو نکال دی گئی۔''

''تم اپنی تعلیمی قابلیت بڑھانے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ کوئی ڈگری ... یا ڈپلوما لے لوگی تو اچھی ملازمت مل سکتی ہے۔''

''اس کے لیے مجھے کار کی ضرورت ہوگی جو میں افورڈ نہیں کرسکتی۔''

ابھی اس نے کار کا نام ہی لیا تھا کہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہ چونکتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا خیال ہے یہ گاڑی اسی طرف آرہی ہے؟''

انیکا نے چند سیکنڈ تک غور سے اس آواز کو سنا پھر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، وہ تقریباً یہاں پہنچ چکی ہے۔''

وہ دونوں شیڈ کے تختوں کے بیچ بنی ہوئی جھری سے جھانک کر دیکھنے لگیں۔ نیلے اور سفید رنگ کی سرکاری گاڑی آہستہ آہستہ نزدیک آرہی تھی۔

''یہ تو پولیس کار ہے۔'' انیکا سانس کھینچتے ہوئے بولی۔

وہ گاڑی کاٹیج کے پاس آکر رک گئی اور اس میں سے یونیفارم میں ملبوس ایک مرد اور ایک عورت نمودار ہوئے۔

''میں انہیں جانتی ہوں۔'' انیکا آہستہ سے بولی۔ ''ان کے نام ہینسن اور پیٹرسن ہیں۔ میں ان کے ساتھ ایک اسٹوری کے سلسلے میں کام کرچکی ہوں۔''

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے مکان کے قریب آئے۔ انیکا نے سنا۔ عورت کہہ رہی تھی۔ ''میری کرسمس...... یہاں کیا ہورہا ہے؟''

جواب میں گستاوو کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ انیکا تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی اور باہر آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ مرد پولیس آفیسر نے گستاوو سے بندوق لے کر اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ انجیلا جانسن بھی اس کے پیچھے چلاتی ہوئی باہر آ گئی۔

"یہ بوڑھا پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے ہمیں مارنے کی کوشش کی تھی۔"

پولیس والوں نے شیڈ کی جانب دیکھا جیسے صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ان کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گستاوو نے اپنی شاٹ گن چھیننے کی کوشش کی اور چیختے ہوئے بولا۔ "یہ دونوں چور ہیں، میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔"

پولیس والوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور دھکیلتے ہوئے پولیس کار تک لے گئے۔ گستاوو نے پوری قوت سے مزاحمت کی لیکن پولیس کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اس کے پیچھے پیچھے انجیلا بھی اسے برا بھلا کہتی ہوئی چل رہی تھی۔ سخت سردی کی وجہ سے انیکا کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ اسے لگا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گی چنانچہ وہ کچن میں آ گئی۔ اس نے چولہے میں آگ جلائی اور ایک کرسی گھسیٹ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ اس کے جوڑ کھلنے لگے اور اس نے چولہے میں مزید لکڑیاں ڈال دیں۔

خاتون پولیس آفیسر ہینسن بھی وہیں آ گئی اور دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ سب کیا ہے؟ یہاں کیا ہو رہا تھا؟"

"وہ انجیلا جانسن کافی دنوں سے لکڑیاں چرا رہی تھی۔ آج گستاوو کو پتا چل گیا تو اس نے شیڈ پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔"

"ہمیں گاؤں والوں نے فون کر کے بتایا تھا کہ یہاں جنگل میں بہت زیادہ فائرنگ ہو رہی ہے۔" ہینسن نے کہا اور آگے کی طرف جھک کر غور سے انیکا کو دیکھنے لگی پھر بولی۔ "کیا تم سمجھتی ہو کہ گستاوو کا ارادہ تمہیں مارنے کا تھا؟"

"یقیناً نہیں۔" انیکا نے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے دروازہ کھول کر اندر آتا اور ہم دونوں کو گولی مار دیتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ صرف ہمیں ڈرانا چاہ رہا تھا۔"

"مگر انجیلا جانسن تو اس پر قتل اور دہشت پھیلانے کی کوشش کا الزام لگا رہی ہے؟"

"ابھی وہ خود دہشت زدہ ہے۔ تھوڑی دیر میں پرسکون ہو جائے گی۔"

پولیس آفیسر نے تنقیدی نظروں سے اس جگہ کا جائزہ لیا اور بولی۔ "کتنی گندی جگہ ہے، وہ یہاں کس طرح رہتا ہے۔"

انیکا نے بوڑھے کی وکالت کی اور بولی۔ "وہ خود تو بڑا صفائی پسند ہے لیکن اپنی ضعیفی کے سبب سارے کام نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ چوروں نے اس کے شیڈ کا راستہ دیکھ لیا ہے۔"

"میں سوشل سروس کو فون کرتی ہوں۔ اس بوڑھے کو مدد کی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی اور اس کے جاتے ہی انجیلا اندر چلی آئی۔ وہ بھی سردی سے کانپ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو بولی۔ "میرا خیال ہے کہ اس بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

انیکا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد انجیلا بولی۔ "کچھ بھی ہو۔ ہم پر فائرنگ کرنے کے الزام میں اسے سزا تو ملنی چاہیے۔ میرا تو خیال ہے کہ اس کی بقیہ عمر جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گی۔"

"ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔" انیکا غصے سے بولی۔ "گستاوو میرے لیے دادا کے برابر ہے اور میں اس سے بہت محبت کرتی ہوں۔"

انجیلا کھسیانی ہو گئی لیکن کچھ بولی نہیں۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے۔" انیکا طنز کرتے ہوئے بولی۔

"میں یہ لکڑیاں اپنے لیے نہیں چراتی تھی۔ دراصل کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے۔ پہلے میں اپنے آتش دان کو گرم رکھنے کے لیے بازار سے لکڑیاں خریدتی تھی لیکن پھر یہ میرے بس سے باہر ہو گیا اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔"

انیکا نے اسے نفرت سے دیکھا اور بولی۔ "لکڑیاں چرانے کے لیے تمہیں اسی بوڑھے کا گھر ملا تھا؟ کاش تم جان سکتیں کہ اس غریب نے کتنی محنت و مشقت سے یہ لکڑیاں جمع کی تھیں۔ تم یہ شوق کسی دوسری جگہ سے بھی پورا کر سکتی تھیں۔"

"میرا خیال تھا کہ بوڑھے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ویسے بھی اس کی نظر کمزور ہے۔ فوری طور پر اس کی توجہ اس جانب نہیں جائے گی۔ یہ جگہ میرے گھر سے قریب

ہے۔ اس لیے میں نے لکڑیاں چرانے کے لیے اس کا انتخاب کیا۔"

انیکا کو رہ رہ کر اس عورت پر غصہ آرہا تھا جو چرائی ہوئی لکڑیوں سے اپنا گھر گرم کر کے محبوب کے پاس بیٹھ کر اظہارِ محبت کیا کرتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے کوئی سخت جواب دیتی، کسی کے بھاری قدموں کی آواز آئی۔ ایک بھاری بھر کم عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں خاتون پولیس آفیسر بھی نظر آرہی تھی۔ اس عورت پر نظر پڑتے ہی انجیلا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "ماریا!"

"انجیلا!" وہ عورت اسے دیکھ کر حیران ہوتے ہوئے بولی۔ "انجیلا! تم...... کیسی ہو؟ بہت دنوں بعد تمہیں دیکھا ہے۔"

"ماریا ایک ہوم کیئر سروس چلاتی ہے۔" انجیلا نے انیکا کو بتایا۔

"جانتی ہوں۔ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔" انیکا اس عورت سے مصافحہ کرتے ہوئے بولی۔

ماریا بولی۔ "وہ پرانی بات ہے۔ اب میں سوشل سروس سے وابستہ ہوں۔" اس نے تنقیدی انداز میں کچن کا جائزہ لیا اور بولی۔ "میں حیران ہوں کہ کوئی شخص اس گندگی میں کیسے رہ سکتا ہے؟"

"اس کا نام گستاوو ہے۔" انیکا احتجاج کرتے ہوئے بولی۔

"جانتی ہوں۔" ماریا نے کہا۔ "میں نہیں جانتی تھی کہ کچھ لوگ اب بھی ایسی حالت میں رہ رہے ہیں۔"

اس نے جھک کر دیکھا۔ وہاں ایک مرا ہوا چوہا پڑا ہوا تھا۔ اس نے ناک سکیڑی اور بولی۔ "ہمیں اس جگہ کو انسانوں کے رہنے کے قابل بنانا ہوگا۔"

انیکا کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، بالآخر اس سے برداشت نہ ہوسکا اور وہ پھٹ پڑی۔ "ایک منٹ! کیا تم لوگوں نے گستاوو سے بات کرلی ہے؟ اس نے ساری زندگی یہیں گزاری ہے۔ اس عمر میں اسے یہاں سے ہٹانا ٹھیک نہ ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ یہیں رہتے ہوئے اس کی وقتاً فوقتاً مدد کی جائے۔"

ماریا بولی۔ "اسے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اچھی زندگی گزارنے کا حق ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے تھوڑی بہت مدد ہی کافی ہے۔"

ماریا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اس ماحول کو کسی طرح بھی قابلِ قبول قرار نہیں دیا جاسکتا۔"

"ہم اس کی تھوڑی سی مدد کر کے اس جگہ کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اگر کوئی مقامی عورت دن میں ایک مرتبہ آکر اس گھر کی صفائی اور دوسرے کام کردے تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ ہمیں کسی ایسی عورت کو تلاش کرنا ہوگا جو قریب ہی رہتی ہو اور اسے اس کام کا تجربہ بھی ہو۔"

اس کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ دوسرا پولیس آفیسر پیٹرسن بوڑھے گستاوو کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی انجیلا چلائی۔ "اس منحوس کو میری نظروں سے دور کردو۔"

گستاوو نے جب انجیلا کو اپنے کچن میں کھڑا دیکھا تو دروازے میں جم کر رہ گیا اور بولا۔ "اس لکڑی چور کو میرے گھر سے باہر نکالو۔ میں ایسے لوگوں کا وجود برداشت نہیں کرسکتا۔"

"چپ ہوجاؤ۔" انیکا چلائی۔ "چپ ہوجاؤ اور ٹھنڈے دماغ سے سوچو کہ تم کیا کررہے ہو۔"

تھوڑی دیر کے لیے کچن میں خاموشی چھا گئی۔ اب سب کی نظریں انیکا پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے بوڑھے گستاوو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آج کرسمس کا دن ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم خدا پر یقین رکھتے ہو یا نہیں لیکن آج کے دن کی رعایت سے اگر تم تھوڑی سی سمجھ بوجھ اور برداشت کا مظاہرہ کرو تو اس مسئلے کا حل نکالا جاسکتا ہے۔ ورنہ تم دونوں ہی مصیبت میں گرفتار ہوجاؤ گے۔"

"تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟" انجیلا بولی۔

"تمہیں ملازمت کی ضرورت ہے اور تمہارے پاس ہوم کیئر سروس کا تجربہ بھی ہے۔ تمہارا گھر بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تم سوشل سروس والوں کی شرائط پر پوری اترتی ہو۔ گستاوو کی مدد کے لیے تم سے زیادہ مناسب اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ میرے خیال میں تم دونوں ہی ایک دوسرے کا مسئلہ حل کرسکتے ہو۔"

ماریا اور دونوں پولیس آفیسرز نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ماریا بولی۔ "اگر تم دونوں کو کوئی اعتراض نہیں تو میری طرف سے انجیلا آج اور ابھی سے اپنی ڈیوٹی سنبھال سکتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تینوں وہاں سے چل دیے۔ انیکا نے باری باری انجیلا اور گستاوو کو دیکھا اور بولی۔ "میرا خیال ہے کہ تم دونوں کو اس بندوبست پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے کچن کا دروازہ بند کیا اور خود بھی باہر چلی آئی۔



محفلِ شعروسخن

* ایم عمران قاسم ...... سیال کلر سیداں

دل فقیری پہ اُتر آئے تو
الجھ پڑتا ہے بادشاہوں سے

* وزیر محمد خان ...... ہل ہزارہ

بے اعتبار وقت پہ جھنجلا کے رو پڑے
کھو کر کبھی اسے تو کبھی پا کے رو پڑے
خوشیاں ہمارے ساتھ کہاں مستقل رہیں
باہر کبھی ہنسے کبھی گھر آ کے رو پڑے

* مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ ...... خانیوال

تیری کہانی ساری دنیا
میرا خلاصہ بس اک تو



* درِ شہوار پیرزادہ ...... بہاولپور

بھر آئیں نہ آنکھیں تو اک بات کہوں
اب تم سے بچھڑنے کا امکان بہت ہے

* عتیق الرحمٰن ...... فیصل آباد

اے کاش تجھے ایسا زخم جدائی دوں
جب ٹیس کوئی چبھے میں تجھ کو دکھائی دوں

* طالب حسین طلحہٰ ...... نیوسینٹرل جیل ملتان

طوفاں سے جو ڈر جائے وہ سمندر نہیں ہوتا
حالات سے جو گھبرائے وہ قلندر نہیں ہوتا
ہوتا ہے کوئی ایک ہی قسمت کا دھنی بھی
ہر کوئی مقدر کا سکندر نہیں ہوتا

* عبدالجبار رومی انصاری ...... لاہور

تُو بڑا آدمی سونے کے پیالے تیرے
کچے برتن کی مگر اپنی کھنک ہوتی ہے

* محمد حنیف گبول ...... نیوسینٹرل جیل ملتان

وقت ہی بتائے گا کہ میں زندہ ہوں ابھی
کب مرتا ہے زندہ رہے جو کردار کے ساتھ
آ دیکھ میرے دوست میں ہارا تو نہیں
میرا سر بھی تو پڑا ہے میری دستار کے ساتھ

* رمضان پاشا ...... گلشن اقبال، کراچی

زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے تمہیں مجھ سے دشمنی ہو جائے

* ناصر علی صدیقی ...... عباسیہ ٹاؤن، رحیم یار خان

میں آج اگر زد پہ ہوں خوش گماں نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

* شمیم رضا ...... میر پور خاص

وہ مسکرائیں تو ہنس ہنس پڑیں کئی موسم
وہ گنگنائے تو باد صبا ٹھہر جائے
وہ ہونٹ ہونٹوں پہ رکھ دے دم آخر
مجھے گمان ہے کہ آتی قضا ٹھہر جائے

* مہرین ناز ...... حیدر آباد

عنوان زندگی پر بس اتنا ہی لکھ پائی ہوں
بہت کمزور رشتے تھے، بہت مضبوط لوگوں سے

❁ اعجاز احمد راحیل، ماہی......حیدرآباد
ابھی نئی وادیوں، نئے منظروں میں رہ لو مگر میری جاں
یہ سارے اک اک کر کے جب تم کو چھوڑ جائیں تو لوٹ آنا
مری وہ باتیں تو جن پر بے اختیار ہنستا تھا کھلکھلا کر
بچھڑنے والے مری وہ باتیں کبھی رلائیں تو لوٹ آنا

❁ محمد شہباز اکرم توئی......پاک پتن شریف
ہمارے پاس رہے یا کنارہ کر جائے
اداسیوں کا کوئی تو چارہ کر جائے
دلنشین پی تو لیا ہے خوشی سے زہر فراق
خدا کرے اب طبیعت گوارا کر جائے

❁ زاہد چودھری......چھور کینٹ
اب توجہ کا تقاضا ہی غلط ہے ان سے
دل کی قیمت تو فقط ایک نظر ہوتی ہے
یوں دھڑکتا ہے کسی وقت عدم دل میرا
جیسے ان کو میری حالت کی خبر ہوتی ہے

❁ رعنا رضوی......مانچسٹر، یو کے
تیرا خلوص پرکھنے کا وقت ہی نہ ملا
کہ میں اسیر تیری نفرتوں کے جال میں تھا

❁ محمد امجد ریاض......چیچہ وطنی، اقبال نگر
رسوا کرے گی یہ جو نمی چشم تر میں ہے
پی جاؤ اشک، بات ابھی گھر کی گھر میں ہے

❁ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
لاکھ مسمار کیے جائیں زمانے والے
آہی جاتے ہیں نیا شہر بسانے والے
اس کی زد پر وہ کبھی خود بھی تو آسکتے ہیں
یہ کہاں جانتے ہیں آگ لگانے والے

❁ محمد رشید سیال......روہڑی، ضلع سکھر
میں اور اس کو بھولوں ناصر کیسی بات کرتے ہو
صورت تو پھر صورت ہے وہ نام بھی پیارا لگتا ہے

❁ ریاض بٹ......حسن ابدال
جب کوئی شخص کہیں ذکرِ وفا کرتا ہے
دل کو اے دوست، تکلیف بڑی ہوتی ہے

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
نذر کرتا رہا میں پھول سے جذبات اُسے
جس نے پتھر کے کھلونوں سے مجھے بہلایا

❁ شوکت علی......لاہور
اس کے بعد اور ابھی سخت مقام آئے گا
حوصلہ یوں نہ گنوا یہ ترے کام آئے گا
اتنا مایوس نہ ہو گردشِ افلاک سے تو
صبح نکلا جو ستارہ سرِشام آئے گا

❁ این اے میمن......چوہڑ جمالی، سجاول
بدل گیا ہے سبھی کچھ اس ایک ساعت میں
ذرا سی دیر ہمیں ہوگئی تھی عجلت میں
محبت اپنے لیے جن کو منتخب کر لے
وہ لوگ مر کے بھی مرتے نہیں محبت میں

❁ عبدالرحمٰن......میرب
میں جنہیں کھینچتا رہتا ہوں یونہی کاغذ پر
ان لکیروں سے بھی چہرہ ابھر آتا ہے کوئی
آگ کی طرح بھڑکتی چلی جاتی ہے جو پیاس
ابر کی طرح برستا چلا جاتا ہے کوئی

❁ زرمین نیازی......راولپنڈی
کیسا بھید چھپا ہے آخر اس کے من کے اندر!
وحشت ہے سوچوں میں میری بھید یہ کیسے کھولوں
ہوجائے معلوم اگر اس ہار میں جیت ملے گی
جیون بھر میں زہر غموں کا اپنی ذات میں گھولوں

❁ منور علی......گلشن حدید، کراچی
نظر جھکا کے وہ اپنی ادا یہ شرمائے
خدا کرے کہ یہ منظر یہیں ٹھہر جائے

❁ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
برا ہو عشق کا جس نے ہمیں برباد کر ڈالا
کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانہ

❁ مدحت......کراچی
تیرے وجود کی خوشبو بسی ہے سانسوں میں
یہ اور بات ہے کہ نظروں سے دور رہتے ہو

❁ مرزا طاہر الدین بیگ......میرپور خاص
تیرے کوچے میں تیری دید کی خاطر جاناں
ہم کسی اور سے ملنے کے بہانے آئے

❁ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
ضبط کرتا ہوں تو گھٹتا ہے قفس میں میرا دم
آہ کرتا ہوں تو صیاد خفا ہوتا ہے

❁ احمد حسن عرضی خان......قبولہ بائی پاس
میں تو سائل تھا صدا دے کر گزرنا تھا مجھے
تو نے کیوں شام تلک بند دریچہ نہ کیا

❁ ظہور احمد فاتح......نامعلوم
میں روزِ ازل سے ہی پیاسا ہوں محبت کا
فاتح ذرا چاہت کی آغوش کشا کردو

❁ محمد سلطان......فیصل آباد
اور کوئی نہ ملا مونس و ہمدرد مجھے
اپنا ہمراز وہی قلبِ حزین ہے کہ جو تھا

❁ جبران احمد ملک......گلشن اقبال، کراچی
اس نے ہر چند کہ جلوہ نہ دکھایا ہرگز
اپنا دلدار وہی پردہ نشیں ہے کہ جو تھا

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
یونہی تو پلکوں پہ یاقوت نہیں آویزاں
کچھ تو ہے جو میرے سینے میں پگھلتا ہوگا

❁ علی رضا......کمالیہ شوگر ملز
آنکھیں برس پڑیں گی پل میں
چہرہ بہہ جائے گا جل میں

❁ اسد عباس......سرگودھا
اوس گرداب سے جب نکلو گے
پھنس جاؤ گے اس دلدل میں

❁ احمد خان توحیدی......پاکستان اسٹیل، کراچی
یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

❁ قیصر علی گل، ساحل وٹو......سینٹرل جیل ساہیوال
سوچ جاتی ہی نہیں تجھ سے آگے
تو میری آخری سرحد ہو جیسے

❁ محمد جاوید......تحصیل علی پور
میرے محبوب کے آرام میں خلل پڑتا ہے
کلیوں سے کہو دھیرے سے چٹکا کریں

❁ سکندر لودھی......ملتان
خوش فہمی ہماری تھی کہ اپنا انہیں سمجھا
ہم سے جو یہ کہتے تھے سمجھدار بہت ہو

❁ شعیب خان......راولپنڈی
ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے

❁ محمد طلحہٰ......کراچی
کیا پھر کوئی مظلوم یہاں مارا گیا ہے
زنداں میں ہنگامۂ ماتم ہے یہ کیسا

❁ محمد یونس چودھری......سلطان پورہ، لاہور
ضرورت توڑ دیتی ہے غرور بے نیازی کو
نہ ہوتی کوئی مجبوری تو ہر بندہ خدا ہوتا

❁ نبیل احمد......میانوالی
مری سوچوں میں کیوں تالاب کی صورت وہ ٹھہرے ہیں
ان آنکھوں سے بھی دریا بن کے بہہ جاتے تو اچھا تھا

❁ شازیہ کمال......کراچی
خوابوں کی راہ گزر میں، جذبوں کے امتحاں میں
ہم جی رہے ہیں لوگو! اک شہر بدگماں میں

❁ لبنیٰ علیم......نارتھ کراچی
تعبیر ڈوب جائے اشکِ رواں میں جس کی
آنکھوں میں اپنی ایسے ہم خواب کیوں سجائیں

❁ محمد حذیفہ......ناظم آباد، کراچی
سنو اے دلربا ساتھی مجھے اک کام کرنا ہے
سفر یہ زندگانی کا تمہارے نام کرنا ہے

❁ محمد زریان سلطان......اردو بازار، کراچی
نازاں ہے کس عیاری پر او جابر انسان
پورب پچھم فتح کیے، نہ فتح کیے اذہان

❁ مونا رضوان......کورنگی، کراچی
دل ہنس کر ہر دکھ سہہ لے گا، ہے شرط تمہارا ساتھ ملے
تم دشت بنو یا شہر بنو یا پاؤں کا چھالا بن جاؤ

کوپن برائے شمارہ مئی 2015	محفلِ شعر و سخن نام : ___________ پتا : ___________

کونز نے اپنے سر کو اتنی تیزی سے حرکت دی جیسے کسی نے اسے تھپڑ مار دیا ہو۔ اس کے چاروں طرف لوگوں کا... جم غفیر تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جانب دیکھنے لگا جہاں سے وہ آواز آئی تھی۔ اس وقت وہ اپنی موجودہ زندگی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جانتا تھا کہ فیصلے کا وقت قریب آگیا ہے لیکن اس سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ بچار کرنا چاہ رہا تھا۔ ماضی میں وہ ایک غلطی کر چکا تھا جس کی کسک آج بھی اسے بے چین کیے دیتی تھی لیکن اس آواز نے

بزدل

قمر عباس

وعدہ کرنا آسان تو ہے مگر... اس کا نبھانا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ وہ جو یک جان دو قالب تھے، ایک دوسرے کے بغیر چل نہیں پاتے تھے اچانک منزلوں کے تعین میں ان سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ ایسے اختلاف میں کیسے کوئی ایک ہی در پر دستک دے سکتا تھا۔ لہٰذا جب سفر کی سمت بدلی تو زندگی کا رخ بھی پہلے جیسا نہ رہا۔

تعیشات کے عادی اور خواہشوں کے ایک غلام کا عبرت اثر ماجرا



اس کی سوچوں کا سلسلہ منقطع کردیا جسے سن کر وہ بے چین ہوگیا تھا۔ اس کے بالکل قریب ہی کسی قہقہے کی گونج سنائی دی تھی۔

ائرپورٹ کا شاندار اور معروف لاؤنج مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد چھٹیاں گزارنے والے.... کاروباری لوگوں کی تھی۔ ان میں سے کچھ تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے اور چند ایک کرسیوں پر بیٹھے جہاز کی روانگی کا انتظار کررہے تھے۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص اپنے سیل فون پر تیز تیز آواز میں باتیں کررہا تھا جیسے سخت غصے میں ہو۔ اسی اثنا میں کسی جہاز کی آمد ہوئی اور اس کے مسافر بھی باہر آنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاؤنج میں ہجوم بڑھ گیا۔ آنے والے مسافروں کو ائرپورٹ سے باہر جانے کی جلدی تھی۔ اس چیخ و پکار میں وہ قہقہہ کہیں دب کر رہ گیا جس نے کونر کی سوچوں کو درہم برہم کردیا تھا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے علاوہ شاید کسی اور نے اس قہقہے پر توجہ نہیں دی اور اسے بھی اس بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی اس خواہش پر قابو پایا کہ کرسی پر کھڑے ہوکر دیکھنے کی کوشش کرے کہ قہقہے کی آواز کہاں سے آئی تھی کیونکہ ائرپورٹ سیکیورٹی والے ایسی کوئی حرکت بالکل برداشت نہ کرتے۔

کچھ دیر بعد مجمع چھٹنا شروع ہوگیا۔ زیادہ تر مسافر اس زمین دوز ٹرین کی طرف بڑھ گئے جس کے ذریعے وہ گمشدہ سامان کے کاؤنٹر تک جاسکتے تھے۔ وہ شخص ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ اب اس نے فون بند کرکے لیپ ٹاپ کھول لیا تھا۔ کونر بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ کئی منٹ گزر گئے لیکن وہ آواز دوبارہ نہیں سنائی دی۔ کونر سوچنے لگا کہ شاید یہ اس کا وہم تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور معروف راہداری کے پار کافی شاپ کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک ہی قہقہے کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ اس بار اس میں خوشی اور حیرت کا تاثر نمایاں تھا۔ کونر کے اردگرد کی بھیڑ چھٹ چکی تھی اور وہ بہ آسانی دور تک دیکھ سکتا تھا۔ اس کی نظریں فوراً ہی اس جانب گئیں جہاں سے قہقہے کی آواز آئی تھی اور یوں لگا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو اور اس کے قدموں کے نیچے سے زمین کھسکتی جارہی ہو۔ اس کا سانس گلے میں اٹک کر رہ گیا۔ اس نے بہ مشکل تمام اپنی حالت پر قابو پایا اور اپنی نظریں اس دبلی پتلی نازک نقش و نگار والی عورت پر جمادیں جو ایک مرد پر جھکی ہوئی تھی اور وہ قریبی بار کے اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس مرد کی پشت کونر کی طرف تھی اس لیے وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ عورت اس مرد کے کان میں کچھ سرگوشیاں کررہی ہو۔ اس نے مضبوطی سے مرد کی قمیص کی آستین پکڑ رکھی تھی۔

وہ شخص بھی دبلا پتلا تھا اور اس کے بال کونر کی طرح گہرے سیاہ رنگ کے تھے۔ وہ تھوڑا سا آگے کی طرف جھکا اور پھر گھوم کر برابر والے اسٹول پر بیٹھے ہوئے اپنے ساتھی سے کچھ کہنے لگا۔ اس نے جانے ایسی کیا بات کہہ دی تھی کہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ کونر کا تجسس بڑھ گیا۔ اس نے تھوڑا سا آگے بڑھ کر ان کی باتیں سننے کی کوشش کی لیکن لوگوں کی آوازوں کے شور کی وجہ سے اسے کچھ سنائی نہ دیا۔ سیاہ بالوں والے شخص نے اس عورت سے کچھ دل لگی کرنے کے بعد بارٹینڈر کو ڈرنک کا آرڈر دے دیا۔

لوگوں کی بھیڑ میں مزید کمی واقع ہوگئی تھی۔ اس عورت نے پلٹ کر کونر کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کی براؤن آنکھوں میں چمک ابھری جیسے وہ اسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ کونر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسل کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ عورت جینیفر تھی اور اسی کے قہقہے کچھ دیر پہلے فضا میں گونج رہے تھے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ جینیفر تو تیرہ سال پہلے مرچکی تھی۔

☆☆☆

وہ پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ شاید پہلی نظر کی محبت اسی کو کہتے ہیں۔ کونر کی جونیئر کلاسیں شروع ہوچکی تھیں جبکہ وہ سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کونر اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اس کا بیشتر وقت جینیفر کے ساتھ ہی گزرنے لگا۔ وہ دونوں گھنٹوں لائبریری میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ جینیفر کی آنکھوں میں جادو تھا۔ وہ جب بولتی تو اس کی آواز کونر کی سماعت میں رس گھولنے لگتی۔ وہ قہقہہ لگاتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے فضا میں جلترنگ بج اٹھے ہوں۔ اب اسے جینیفر کے سوا کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ اس کی بھوک پیاس سب ختم ہوچکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے ہر وقت جینیفر کا مسکراتا چہرہ گھومتا رہتا تھا۔

کلاسیں چھوڑنے کی وجہ سے اس کے نمبر کم آئے۔ یہ صورتِ حال اس کے والدین کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ فون کرتے تو کونر فون نہیں اٹھاتا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں بھی وہ گھر نہیں گیا بلکہ اس نے ایک عارضی ملازمت کرلی تاکہ وہ اور جینیفر مل کر اپنا گھر سیٹ کرسکیں۔ انہوں نے چھوٹا سا

ایک اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا جس کے اطراف کے فلیٹوں میں طالب علموں، عارضی قیام کرنے والوں اور... بے روزگاروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اس اپارٹمنٹ میں ایک ہی کھڑکی تھی جس سے سورج کی روشنی کم اور پڑوسیوں کے شور وغل اور قہقہوں کی آوازیں زیادہ آیا کرتی تھیں۔

کوثر کو اس ماحول سے وحشت ہونے لگی۔ وہ اس کا عادی نہیں تھا۔ جب باہر سے آنے والی آوازوں کا شور سن کر وہ بیزار ہونے لگتا تو جینیفر اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتی۔ اس کی کوشش ہوتی کہ کوثر کا دھیان بٹا سکے۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی سب کچھ بھلا کر اس کی حشر سامانیوں میں کھو جاتا اور جینیفر کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل جاتی۔

اگلا سال کوثر کے لیے اور بھی برا ثابت ہوا۔ اب وہ صرف وہی کلاسیں لیتا جو بہت ضروری ہوتیں اور بعض اوقات انہیں بھی چھوڑ دیتا۔ اس کے نمبر خطرناک حد تک کم ہو رہے تھے جس پر ڈین کو اسے وارننگ جاری کرنا پڑی۔ اس کی ایک نقل اس کے والدین کو بھی بھیجی گئی جسے دیکھ کر اس کا باپ چراغ پا ہو گیا اور اس نے کوثر کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اپنی پڑھائی پر توجہ نہیں دی اور جینی سے چھٹکارا حاصل نہ کیا تو وہ اسے پیسے بھیجنا بند کر دے گا۔ کوثر پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ کسی صورت بھی جینی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ادھر جینی کو بھی پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کوثر کو بتایا کہ وہ موسم بہار کے سیشن میں داخلہ نہیں لے رہی۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں اور وہ جو چاہتی ہے اسے مل جاتا ہے۔ اس لیے وہ پڑھائی میں وقت ضائع کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔

اس کے باپ نے بھی محض ڈرانے کے لیے ہی دھمکی دی تھی جب فیس دینے کا وقت آیا تو اس نے خاموشی سے کوثر کو پیسے بھیج دیے۔ اس کا باپ سمجھ رہا تھا کہ یہ آخری سیمسٹر ہے ممکن ہے کہ کوثر سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے... گریجویشن مکمل کر لے لیکن جینی کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ وہ کوثر پر ناراض ہوئی اور الزام لگایا کہ اس میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس نے کوثر کو چیلنج کیا کہ اگر اس میں ہمت ہے تو وہ اپنے والدین اور اسکول دونوں کو چھوڑ دے جیسا کہ وہ کئی ماہ پہلے کر چکی ہے۔ پہلی بار کوثر کو معلوم ہوا کہ اسی وجہ سے جینی نے اپنے والدین سے بھی بات چیت بند کر رکھی ہے۔

سیمسٹر کے آغاز میں ہی کوثر کو مسلسل غیر حاضر رہنے کی بنا پر ایک کلاس سے باہر نکال دیا گیا۔ وہ ایک اختیاری مضمون تھا جس کی تیاری موسم گرما میں بھی کی جاسکتی تھی لیکن وہ یہ بھول گیا کہ اس مضمون کو پہلے مرحلے میں پاس کرنے کے لیے منتخب کر چکا ہے اور اس کے بغیر وہ دوسرے مضامین کا امتحان نہیں دے سکتا چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ فائنل امتحان ہونے تک اسے جینی سے الگ رہنا ہوگا ورنہ وہ قیامت تک بھی گریجویشن نہیں کر سکتا۔

ایک رات جب جینی کیمپس اسنیک بار میں اپنی ڈیوٹی پر تھی، کوثر نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اس چھوٹے سے ڈربا نما اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔ وہ رات اس نے اپنے پرانے دوست کے پاس گزاری جو اس کے آبائی قصبے میں رہتا تھا۔ والدین اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اسے سمجھایا کہ بہتر مستقبل کی خاطر وہ جینی سے دور ہو جائے۔ کوثر کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اسے احساس ہونے لگا تھا کہ جینی کے ساتھ رہ کر اسے تکلیف اور پریشانی کے سوا کچھ نہیں ملا اور وہ اپنے ماں باپ کے گھر ملنے والے عیش و آرام سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے جینی سے فیصلہ کن بات کرنے کے لیے اس ڈربا نما اپارٹمنٹ سے متصل میدان کو منتخب کیا جو چاروں طرف سے فلیٹوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اور ان کی موجودگی میں جینی کے لیے کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا ممکن نہ تھا۔

اس نے رک رک کر بڑے دردانگیز انداز میں جینی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ تعلق ان دونوں میں سے کسی کے لیے بھی سودمند نہیں ہے۔ یہ سنتے ہی جینی بری طرح بپھر گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اس کی تقریر ختم ہوتی، جینی کا دایاں ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور کوثر کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔ جینی نے اسے بزدل ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ وہ اپنے تمتماتے ہوئے چہرے اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ وہاں سے چل دی۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی کہ اب ان کے درمیان کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے نہیں کہ یہ فیصلہ کوثر نے کیا تھا بلکہ خود اسے بھی احساس ہو گیا ہے کہ وہ ایسے شخص سے محبت نہیں کر سکتی جسے اپنے بازوؤں پر بھروسا نہ ہو۔ کوثر کو امید نہیں تھی کہ معاملہ اتنی آسانی سے نمٹ جائے گا لیکن وہ غلط سوچ رہا تھا۔ یہ معاملہ اتنی جلدی کیسے ختم ہو سکتا تھا۔

دوسرے دن وہ کلاس ختم کر کے باہر آیا تو جینی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور اس نے روتے ہوئے اپنی نازک بانہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ اس نے گزشتہ روز کے رویے پر معافی مانگی اور گھر چلنے پر اصرار

کرنے لگی لیکن کوثر نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے جینی کو سمجھایا کہ انہیں سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ وقت چاہیے شاید اس کے بعد انہیں کوئی بہتر فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔

جینی نے اس کے سینے پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی تو مجھے مار ڈالو۔''

کوثر نے اسے ہلکے سے دھکا دیا تو وہ گھاس پر جا گری۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کالج میں اس کا تماشا بنے اور بات اس کے گھر والوں تک پہنچ جائے چنانچہ وہ اسے اسی حال میں چھوڑ کر وہاں سے چل دیا۔ جینی کی چیخیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں لیکن اس نے اپنے کان بند کر لیے۔

اگلے دو ہفتوں تک اس نے جینی کو دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا۔ ان دونوں کے درمیان سیاہ رات جیسی خاموشی حائل ہو چکی تھی۔ ایسی خاموشی جو کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ یہ خاموشی اس وقت ختم ہوئی جب اسے کیمپس پولیس کی جانب سے ایک فون کال موصول ہوئی۔ دوسری جانب سے کوئی کہہ رہا تھا۔ ''کیا تم مس جینیفر آرمسٹرانگ کے ساتھ ایک ہی اپارٹمنٹ میں رہتے ہو؟''

کوثر کے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ کہیں جینی نے اس کے خلاف کوئی جھوٹی رپورٹ تو درج نہیں کروا دی۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''پہلے رہتا تھا لیکن اب نہیں۔ ہمارے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔''

''لیکن کرائے نامے میں تو ابھی تک تمہارا نام موجود ہے۔'' آفیسر نے اسے کریدنے کی کوشش کی۔

اب کوثر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جب وہ اس اپارٹمنٹ کو چھوڑ چکا تھا تو اسے یہ اطلاع متعلقہ لوگوں کو دے دینی چاہیے تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے حواس قابو میں کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ''بات کیا ہے؟''

''وہ کسی فون کا جواب نہیں دے رہی اور نہ ہی دروازہ کھول رہی ہے۔ اس کے والدین نے پولیس کو فون کیا ہے کہ اسے چیک کریں۔ ہم صرف ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ کیا تم انہیں اپارٹمنٹ کے اندر جانے کی اجازت دیتے ہو؟''

خطرے کی گھنٹیاں جو کئی ماہ سے کوثر کے دماغ میں بج رہی تھیں، اب ایک سائرن کی شکل میں گونجنے لگیں۔ اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

وہ منظر کوثر کی یادداشت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بستر پر خون پھیلا ہوا تھا اور جینی ایک شو پیس کی طرح اس کے وسط میں لیٹی ہوئی تھی۔ کوثر کو اپنے تعلق کے اس بھیانک انجام کی توقع نہیں تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جینی کے بے حس و حرکت جسم کو دیکھتا رہا۔ ایک پولیس والے نے اسے دھکیل کر ایک طرف کیا اور خود معاملے کی نوعیت جاننے کے لیے اندر چلا گیا۔

وہ جینی کے والدین کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے ان کے ہمراہ اسپتال نہیں گیا۔ بعد میں جب اس نے فون کر کے جینی کی خیریت معلوم کرنا چاہی تو ڈیوٹی پر موجود نرس نے خالص پیشہ ورانہ اور روکھے انداز میں اسے بتایا کہ وہ ایک غیر متعلقہ شخص کو جینی کی صحت کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دے سکتی۔

دوسرے روز کیمپس میں یہ افواہ پھیل گئی کہ جینی کی موت واقع ہو چکی ہے اور والدین اس کی لاش اوہائیو لے گئے ہیں۔ یہ سن کر وہ خوفزدہ ہو گیا کیونکہ جینی لہولہان حالت میں اس اپارٹمنٹ میں پائی گئی تھی جو اس نے کرائے پر لیا تھا۔ اس لیے پولیس اس سے بھی پوچھ گچھ کرتی اور عین ممکن تھا کہ اس کے والدین جینی کی موت کا ذمے دار اسے ٹھہراتے لہٰذا اس نے جینی کی تدفین میں شرکت کرنے یا اس کے والدین سے تعزیت کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ شاید یہ اس کے دل کا چور تھا جو اسے سامنے آنے سے روک رہا تھا۔ اسے جینی کی موت کا افسوس ضرور ہوا تھا لیکن یہ ایک وقتی کیفیت تھی۔ بہت جلد وہ پہلے کی طرح اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا اور اسے یاد بھی نہیں رہا کہ اس کی زندگی میں جینی نام کی کوئی لڑکی آئی تھی۔

☆☆☆

کوثر لوگوں کو ہجوم میں سے راستہ بناتا ہوا بار کے دروازے تک پہنچ گیا لیکن جینی کہیں نظر نہیں آئی۔ وہ جن دو آدمیوں سے باتیں کر رہی تھی، ان میں سے ایک نے کوثر پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ کوثر اس سے جینی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ کسی نے اس کی آستین کو پکڑ رکھا ہے پھر اس کی سماعت سے ایک گھبرائی ہوئی آواز ٹکرائی۔ ''کوثر!''

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ جینی تھی جس نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ کوثر نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ لاؤنج میں بہت کم لوگ رہ گئے تھے۔ البتہ ان میں سے کئی ایک ان کے گرد کھڑے ہو کر کسی نئے تماشے کے شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ جینی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے

تھے لیکن بظاہر اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ پہلے کی طرح اب بھی اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے البتہ آنکھوں کے نیچے گہری سیاہ لکیریں نمایاں ہوگئی تھیں۔ یہ جینی ہی تھی، اتنے عرصے بعد اسے اپنے سامنے دیکھ کر کوزر بھی جذباتی ہوگیا۔

"کوزر!" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا۔ "یہ تم ہی ہو نا؟ میں تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کرسکتی۔"

کوزر نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "جینی!"

وہ دونوں آدمی بھی مڑ کر انہیں دیکھنے لگے جن سے کچھ دیر پہلے وہ بار میں باتیں کررہی تھی۔ ان میں سے گہرے سیاہ بالوں والا بناوٹی انداز میں مسکرایا پھر اپنے ساتھی سے کچھ کہنے لگا۔ وہ دونوں قہقہہ لگانے لگے اور انہوں نے ایک بار پھر مڑ کر ان کی جانب دیکھا۔ کوزر کن انکھیوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ اپنے لیے کوئی نئی پریشانی پیدا کرنا نہیں چاہ رہا تھا اور اس کی نگاہوں کا مرکز صرف جینی تھی۔

ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے وہ خالی کرسیوں کی تلاش میں گیٹ کی طرف بڑھے تاکہ سکون سے بیٹھ کر بات کرسکیں۔ کوزر جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں تبدیلی ضروری ہے۔ اسے یہ موقع دوبارہ نہیں ملے گا۔ اب وہ جینی کو نہیں کھونا چاہتا تھا جو معجزانہ طور پر اسے مل گئی تھی۔ اس کی ازدواجی زندگی کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی اور وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے ہمیشہ یہ شبہ ہی رہا کہ وہ اپنی بیوی سے سچی محبت کرتا ہے لیکن اب اس کے دل یا دماغ میں کوئی شک باقی نہیں رہ گیا تھا۔ وہ جینی سے محبت کرتا تھا اور اس سے ملنے کے بعد اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ہی جینی سے محبت کرتا آرہا ہے۔

"کوزر!" وہ چہچہاتے ہوئے بولی۔ "مجھے بے حد خوشی ہورہی ہے کہ تم بالآخر مل ہی گئے۔"

"جینی! مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہی ہو۔ اتنا عرصہ میں تمہارے بارے میں ہی سوچتا رہا۔" اس سفید جھوٹ پر اسے کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ جینی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتایا گیا تھا کہ تم مرچکی ہو۔"

جینی مسکراتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ گو کہ میں نے خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہی۔" وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

"میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔ جہاں جہاں میں جاسکتی تھی، وہاں تمہیں ہی ڈھونڈتی رہی۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں جینی۔" وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس میرا فون نمبر تھا۔ تم مجھے فون کرسکتی تھیں۔"

یہ سنتے ہی جینی کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور وہ نظریں چراتے ہوئے بولی۔ "اوہ، مجھے اس کا خیال ہی نہیں رہا۔ شاید تمہارا نمبر مجھ سے گم ہوگیا تھا۔ میں اپنے طور پر ہی تمہیں ڈھونڈتی رہی۔"

کوزر نے بات بناتے ہوئے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم مل گئی ہو اور ہم ایک بار پھر اکٹھے ہوگئے ہیں۔ اب ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے۔"

اسے خیال آیا کہ وہ کچھ زیادہ بول گیا ہے۔ ممکن ہے کہ جینی کی شادی ہوگئی ہو۔ اس نے دیکھا کہ جینی نے شادی کی انگوٹھی نہیں پہنی ہوئی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "کیا تمہاری زندگی میں کوئی اور بھی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی اہم شخص......"

"صرف تم۔" وہ اداسی سے بولی۔ "میری زندگی میں تمہارے علاوہ کوئی اور نہیں۔"

کوزر کا سینہ خوشی اور فخر سے پھول گیا۔

اس کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب ائرپورٹ کے لاؤڈ اسپیکر پر یہ اعلان ہوا کہ اس کی پرواز روانگی کے لیے تیار ہے لہٰذا تمام مسافر بورڈنگ کارڈ حاصل کرلیں۔

"جہنم میں جاؤ۔" اس نے ہنکارا بھرا پھر وہ اچانک ہی کھڑا ہوگیا۔ اس نے اب بھی جینی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا میرا جہاز روانگی کے لیے تیار ہے۔ تم مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اگلی پرواز میں جگہ مل جائے۔ اس طرح ہمیں مستقبل کا پروگرام طے کرنے کے لیے کچھ وقت مل جائے گا۔"

جینی نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور خوفزدہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ جیسے ڈر رہی ہو کہ کہیں وہ دونوں دوبارہ نہ بچھڑ جائیں۔ وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تم فکر مت کرو۔ میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔ بس یہیں رک کر میرا انتظار کرنا۔"

یہ کہہ کر اس نے جینی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جیسے ہی وہ آگے کی جانب بڑھا تو اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی انہی دونوں آدمیوں سے باتیں کررہا تھا جو کچھ دیر پہلے جینی سے فلرٹ کررہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کوزر کی جانب

اشارہ کیا۔ اتنی دیر میں گیٹ پر کھڑا دربان اسے اندر جانے کا راستہ دے چکا تھا۔ کوزر نے پلٹ کر جینی کی طرف دیکھا اور بہ آوازِ بلند بولا۔ ''وہیں رہنا، میں ابھی واپس آرہا ہوں۔''

ٹکٹ تبدیل کروانے میں اسے توقع سے زیادہ دیر لگ گئی۔ اس دوران وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہا لیکن وہ اس جگہ سے کافی دور تھا جہاں جینی کو چھوڑ کر آیا تھا اور درمیان میں کئی لوگوں کے آجانے سے وہ اسے نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ ٹکٹ تبدیل ہوگئے تو وہ تیزی سے پلٹا جہاں جینی کو چھوڑ کر گیا تھا لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔ کوزر کو جیسے سکتہ ہوگیا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ کیا واقعی جینی اسے ملی تھی یا یہ اس کا وہم تھا؟ کیا اسے اس ملاقات کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھلا دینا چاہیے؟ اس نے ایک گہری سانس لے کر ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور سوچنے لگا کہ اسے فضول واہموں کو دل میں جگہ دینے کے بجائے اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔ ممکن ہے کہ جینی اس ہجوم میں کہیں گم ہوگئی ہو۔

اچانک ہی جینی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ اسی کا نام لے کر پکار رہی تھی۔ لاؤڈ اسپیکر پر ہونے والے اعلانات، لوگوں کے قدموں کی آواز اور مسافروں کی آوازوں کے شور کے باوجود جینی کی آواز اس تک پہنچ گئی۔ اس نے اس جانب مڑ کر دیکھا، جینی اسے نظر آگئی۔ وہ فوراً ہی اس کی جانب لپکا۔ اس ہجوم میں دوڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ جینی کسی دوسری جانب نہ چلی جائے لہٰذا چلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ جینی کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اس نے کسی اور شخص کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ اسے دیکھتے ہی وہ خوشی سے چلائی۔ ''کوزر!''

اس کی آواز سن کر وہ رک گیا اور بولا۔ ''جینی! سب کچھ ٹھیک ہے نا؟''

دبلے پتلے سیاہ بالوں والے شخص نے کوزر کو دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم اس عورت کو جانتے ہو؟''

اس نے جینی کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''شاید اسے کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے، حالانکہ میں وہ نہیں ہوں جو یہ سمجھ رہی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اچانک ہی پلٹا اور تیزی سے ہجوم میں گم ہوگیا۔

جینی اب ہلکے ہلکے سسکیاں لے رہی تھی۔ کوزر نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جینی نے پلٹ کر اسے دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات ایک دم ہی بدل گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو غائب ہوگئے اور چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ وہ چڑیا کی طرح چہچہاتے ہوئے بولی۔ ''کوزر!'' اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بار بار اس کا نام دہرا رہی تھی، اس نے جینی کے دونوں کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے اور بولا۔ ''میں نے تمہیں اسی جگہ رکنے کے لیے کہا تھا پھر وہاں سے کیوں چلی آئیں؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، اچانک ہی وہ بوڑھا آدمی سامنے آگیا جو کچھ دیر پہلے ان دونوں آدمیوں سے باتیں کررہا تھا۔ اس بوڑھے کو دیکھتے ہی جینی کا چہرہ پیلا پڑ گیا اور چند منٹ پہلے جو رونق نظر آرہی تھی، وہ غائب ہوگئی۔ وہ تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے بھی اس کے برابر والی نشست سنبھال لی اور اس کے ہاتھوں کو پیار سے تھپتھپانے لگا۔

کوزر حیرت سے اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ شخص کون ہے اور جینی کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے کیوں پیش آرہا ہے۔ اس نے خشک لہجے میں کہا۔ ''معاف کرنا۔''

بوڑھے آدمی نے کوزر کو غور سے دیکھا۔ اسے شاید کوزر کی مداخلت پسند نہیں آئی تھی۔ اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ''کیا بات ہے؟''

''کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟''

''ہاں، یہ میری بیٹی ہے۔'' بوڑھے کے چہرے پر مختلف نوعیت کے تاثرات نمودار ہوئے جن میں جذبات، غصہ، افسوس اور تھکن سب کچھ گڈمڈ ہورہا تھا۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ اس نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا؟''

کوزر نے غیر یقینی انداز میں سر ہلایا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی جینی کے باپ سے اس کا سامنا ہوجائے گا۔ ان دونوں کی شکلوں میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ اس لیے اسے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ بوڑھا اس کا باپ ہے لیکن جینی اسے دیکھ کر سہم کیوں گئی تھی؟ اس کا چہرہ پیلا کیوں پڑ گیا تھا؟ کہیں وہ اپنے باپ سے چھٹکارا حاصل کرنا تو نہیں چاہ رہی۔ اس نے ایک بار پھر غیر یقینی انداز میں بوڑھے کی طرف دیکھا۔

''یہ کچھ دیر پہلے مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''جب سے اس کی ماں مری ہے، میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ اتنے بڑے ہجوم میں اسے تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔ اسی لیے مجھے

اس کو ڈھونڈنے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اگر اس نے تمہیں پریشان کیا ہو تو معذرت چاہتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی اور اپنی پشت کرسی سے ٹکا دی۔

''تم کہیں جا رہے ہو؟'' کونر نے پوچھا۔ یہ ایک احمقانہ سوال تھا۔ ظاہر ہے کہ بوڑھا اپنی بیٹی کو لے کر ائرپورٹ گھومنے تو نہیں آیا ہوگا لیکن کونر ان کی منزلِ مقصود کے بارے میں جاننا چاہ رہا تھا۔

''کنساس......'' بوڑھے نے جواب دیا۔ ''وہاں اس کا بھائی رہتا ہے۔ وہ اس کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور اس کی مستقل نگرانی نہیں کر سکتا۔''

''اچھا۔'' کونر نے کہا۔ بوڑھے سے باتیں کرنے کے بعد یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ وہ اسے نہیں پہچان سکا ہے۔ ویسے وہ کبھی جینی کے باپ سے نہیں ملا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے جینی کے پاس کونر کی کوئی تصویر دیکھی ہو لیکن اس وقت وہ اس کے ساتھ بالکل اجنبیوں کی طرح پیش آ رہا تھا۔ اس نے جینی کے زرد اور ستے ہوئے چہرے کی جانب دیکھا اور بوڑھے کو کریدنے کی خاطر بولا۔ ''کونر کون ہے جسے یہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

بوڑھے کے چہرے پر سختی آ گئی اور وہ تیز آواز میں بولا۔ ''اسی نے اسے اس حال کو پہنچایا۔ یہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ یہی مسئلہ ہے کہ جس سیاہ بالوں والے اور کونر کی عمر سے ملتی جلتی شخصیت کو دیکھ لیتی ہے، اسے ہی کونر سمجھ لیتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اس وقت تمہیں بھی کونر ہی سمجھ رہی ہے۔''

کونر کے سینے میں ایک پھانس سی چبھ گئی اور وہ تاسف آمیز انداز میں بولا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کونر کون ہے اور تمہاری بیٹی سے اس کا کیا تعلق ہے؟''

بوڑھے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور جینی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''یہ کالج میں اس کے ساتھ پڑھا کرتی تھی۔ اس نے میری بیٹی کو محبت کا جھانسا دیا اور یہ اس کے جال میں پھنس گئی۔ اس نے کالج جانا چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ اپارٹمنٹ میں رہنے لگی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ جوان لڑکیوں کو ورغلانا کتنا آسان ہوتا ہے اور وہ پیار میں پاگل ہو کر اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہیں۔ اپنا دل، جسم اور دولت سب کچھ۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''وہ لڑکا اپنے والدین کے دباؤ میں آ کر اسے چھوڑ کر چلا گیا اور پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لی۔ یہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور اس نے جذبات میں آ کر اپنی کلائیاں کاٹ ڈالیں۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ آج کے دور میں ایسا ممکن ہے لیکن ہم کیتھولک ہیں اور ہماری لڑکیاں صرف ایک بار کسی مرد سے محبت کرتی ہیں۔''

کونر نے تائید میں سر ہلایا جیسے وہ اس کی کہی ہوئی ہر بات سے متفق ہو۔

''پولیس والے اور ڈاکٹر اس کی جان بچانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن نہ جانے جینی کو کس کی بددعا لگ گئی کہ اس نے دوبارہ کسی مرد کا نام نہیں لیا اور آج تک اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

''جینی کے پاس اس کا فون نمبر یا ایڈریس نہیں تھا؟''

''نہیں۔ وہ لڑکا اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا، شاید اسی لیے اس نے جینی کو اپنا پتا اور فون نمبر نہیں دیا۔ وہ تو اسے اسپتال دیکھنے بھی نہیں آیا۔''

کونر کو یقین ہو گیا کہ بوڑھے کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کیونکہ وہ جینی کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا لیکن اسپتال والوں نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ کسی غیر متعلقہ شخص کو مریضہ کی صحت کے بارے میں معلومات فراہم نہیں کر سکتے تھے۔

بوڑھے نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر اچانک ہی وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ ''اگر میرے بس میں ہوتا تو اس لڑکے کو جان سے مار دیتا۔ اس نے میری بیٹی کی زندگی برباد کر دی۔ ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔''

''ہاں۔'' کونر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اسی سلوک کا مستحق تھا۔''

''پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ایک عارضی کیفیت ہے۔'' بوڑھے نے کہا۔ ''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اسے بھول جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ اس کی جدائی میں نیم پاگل ہو چکی ہے اور اس کی نظریں ہر وقت کونر کو ڈھونڈتی رہتی ہیں اور یہ اس سے مشابہت رکھنے والے ہر شخص کو کونر سمجھنے لگتی ہے۔''

جینی کے باپ نے گھڑی پر نظر ڈالی اور اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جینی کو بھی ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا اور بولا۔ ''بورڈنگ میں بیس منٹ رہ گئے ہیں اور ہمارا گیٹ بھی ٹرمینل کی دوسری طرف ہے۔ جینی کی وجہ سے تمہیں جو زحمت ہوئی اس کے لیے تم سے معذرت چاہتا ہوں۔''

کونر انہیں راستہ دینے کے لیے پیچھے ہٹ گیا۔ جب جینی اس کے سامنے آئی تو وہ فرش پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ''امید ہے کہ تمہارا سفر اچھا گزرے گا۔''

جینی کے قدم زمین پر گڑ گئے۔ اس نے بے چین ہو کر کونز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک فریاد تھی جیسے کہہ رہی ہو، مجھے روک لو۔ اس نے باپ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کونز کی طرف بڑھی لیکن بوڑھے نے لپک کر اسے دوبارہ پکڑ لیا اور اپنی جانب کھینچتے ہوئے بولا۔ ''چلو، ہمیں دیر ہو رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جینی کو ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔ کونز بے بسی سے جینی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جو اپنے باپ کے بازوؤں میں جھول رہی تھی اور دائیں بائیں نظریں گھما کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اب یہ تلاش کبھی ختم نہیں ہوگی۔

کونز کا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کر جینی کا راستہ روک لے اور اس کے باپ کو بتا دے کہ وہ ہی کونز ہے جس کی وجہ سے اس کی بیٹی کی زندگی تباہ ہوئی اور وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھی۔ اس لیے ہر سیاہ بالوں والے شخص کو اپنا محبوب سمجھ کر اس کی جانب لپکتی ہے لیکن اب وہ اپنی غلطی کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہے۔ جینی جیسی بھی ہے، اسے قبول ہے۔ ایک بار اسے یقین آجائے کہ وہی اس کا کونز ہے تو اس کی ذہنی کیفیت اعتدال پر آجائے گی لیکن یہاں بھی اس کی فطری بزدلی آڑے آگئی۔ وہ کوئی ایسا جذباتی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا جس میں اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو۔ چند منٹ پہلے جینی کے باپ نے اس کے بارے میں جن عزائم کا اظہار کیا تھا، انہیں سننے کے بعد تو اس بات کی بالکل بھی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس کے سامنے ظاہر کر دے۔ جینی کا باپ اس کے خون کا پیاسا تھا اور کونز ایک نیم پاگل اور جذباتی لڑکی کے لیے اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

جینی کے چہرے پر امید و یاس کی پرچھائیاں دیکھ کر اسے اپنی بیوی اور بیٹیاں یاد آنے لگیں جو اس کے لیے اجنبی بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ جب بھی کسی کاروباری دورے سے واپس آتا تو اس کے سرد رویے اور بے رخی کو محسوس کر کے ان کے چہرے بجھ جاتے۔ شاید یہ اس کے ماضی کی چبھن تھی جس نے کبھی اسے اپنی بیوی اور بچوں سے قریب نہیں ہونے دیا۔ جینی سے بچھڑنے کی خلش اسے ہمیشہ تڑپاتی رہی۔ کاش وہ بزدل نہ ہوتا۔ اس میں اپنے باپ کی دھمکیوں کا سامنا کرنے کی ہمت ہوتی۔ وہ عیش و عشرت کی زندگی کو لات مار کر اپنی محبت کو حاصل کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ غلطی اس کی تھی لیکن سزا جینی کو ملی اور اب بھی کچھ وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کر رہا تھا جن کا کوئی قصور نہیں تھا۔

الجھن

بیٹا باپ سے۔ ''ڈیڈی! آپ کہاں پیدا ہوئے تھے؟''

باپ۔ ''نیویارک میں۔''

بیٹا۔ ''اور ممی کہاں پیدا ہوئی تھیں؟''

باپ۔ ''واشنگٹن میں۔''

بیٹا۔ ''اور میں کہاں پیدا ہوا تھا؟''

باپ۔ ''ہوائی میں۔''

بیٹا حیرانی سے۔ ''تو ہم تینوں ایک جگہ کیسے اکٹھے ہو گئے؟''

مرسلہ۔ عزیر ناصر، کراچی

زحمت

جنازے کے ساتھ دو نہایت معمر افراد قبرستان پہنچے۔ تدفین سے فارغ ہو کر ایک صاحب نے دوسرے سے پوچھا۔ ''خیر سے عمر عزیز کیا ہوگی؟''

''یہی کوئی ننانوے سال۔''

''کیا خیال ہے کہ گھر جانے کی زحمت کی جائے یا نہیں؟'' دوسرے صاحب بولے۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ ملتان روڈ لاہور

کونز نے ایک نگاہ اپنے ٹکٹ اور پاس پر ڈالی۔ ابھی اس کی فلائٹ میں چھ گھنٹے باقی تھے۔ جس کی خاطر اس نے ٹکٹ تبدیل کروایا تھا، وہ جا چکی تھی۔ اب وہ ان چھ گھنٹوں میں کیا کرے؟ اس نے گھر واپس جانے اور ان لوگوں کے درمیان وقت گزارنے کے بارے میں سوچا جو اس سے محبت کرتے تھے۔ وہ جینی کو تو کھو چکا تھا لیکن انہیں کھونا نہیں چاہتا تھا۔

ایک بار پھر اس کے کانوں میں وہی قہقہہ گونجا جس نے اس کا صبر و قرار چھین لیا تھا لیکن یہ اس کا وہم تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھنے کے بجائے اپنے قدم لاؤنج کے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھا دیے جہاں سے اسے گھر جانے کے لیے ٹیکسی مل سکتی تھی۔ جب وہ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا تو اس کے کانوں میں ایک ہلکی سی سرگوشی ابھری۔ ''بزدل......!'' اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور سامنے کھڑی ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔



محی الدین نواب

سترھویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک بہروپ کی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، چاہتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دور جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر داور چاچی ماتی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جوکہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے یمین گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جوکہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جوکہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جوکہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کرکے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا، محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل وجان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بطور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یہ بات پارٹی کے لیڈر تک پہنچ گئی نتیجتاً چانڈیو استعفا دے کر چلا آیا۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچا لایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ، بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مقدمے کو معلوم نہیں کب تک چلنا تھا لیکن محبوب نیک نیتی سے ان کا مددگار تھا اور حتیٰ کہ ماروی محبوب کے احسانات سے بچنے کے لیے جان بوجھ کر غائب ہوگئی۔ اس خبر کے بعد وہ دلبرداشتہ ہوکر خود مراد کی جگہ جیل میں قید ہوگیا جبکہ دوسری جانب ماروی کی تلاش کا لالچ دے کر مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے وہ ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگتی ہے جس کے باعث اس کی یادداشت چلی جاتی ہے۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوجاتا ہے۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کرلے جاتے ہیں۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مرجاتا ہے۔ ماروی کا علاج ہوتا ہے مگر ماروی محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانتی۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آجاتی ہے۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا تاہم مراد نے اسے اپنی پارسائی کا یقین دلایا اور کہا کہ وہ اس دلدل سے نکل آئے گا۔ رابعہ خاتون نے مراد کے بچے کو ماروی کے ہاں پہنچادیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET آفیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر نمی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ مراد نے اس کی بھی سرجری کرواکے اسے اپنا چہرہ دے دیا۔ اب یوں عبداللہ مراد بن گیا تھا۔ دشمن مراد کو یوں دیکھ کر چکرا گئے۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ اب اس کے پاس نہ اپنا چہرہ تھا اور نہ پرانی یادداشت۔ اس کی یادداشت تھوڑی دیر کے لیے آتی تھی تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر نمی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتادیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ لندن ایئرپورٹ پر میکی پر حملہ ہوا اور اس کا ایک بیٹا مارا گیا۔ مارنے والے نے اپنا نام مراد بتایا۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ ادھر مراد اور عبداللہ پاکستان پہنچ گئے اور عبداللہ کو مراد ثابت کرنے کے لیے ڈراما پلے ہونے لگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

کیا خوب تماشا تھا۔ تماشا کرنے والوں نے دیکھنے والوں کو بھی قائل کر دیا تھا کہ وہ بونا ہی مراد ہے۔

ننھا شہزاد ماروی کے بازوؤں میں تھا۔ وہ اسے کبڈی کی گود میں دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ تمہارا بیٹا ہے۔ تم ہی اس کے باپ ہو۔''

کبڈی، شہزاد کو سینے سے لگائے رونے لگا۔ ماروی دوڑتی ہوئی آ کر متی سے لپٹ گئی۔ ''ہائے چاچی! یہ مراد کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا ہے چاچی! اسے پہلے کی طرح بنا دو، بولو چاچی! کیا یہ پہلے جیسا نہیں ہو سکے گا؟''

متی نے اسے تھپک کر کہا۔ ''بیٹی! صبر کرو، تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔''

ننھا شہزاد اس ماتمی ماحول میں رو رہا تھا۔ وہ کھیلنے کے موڈ میں تھا۔ چاچا اسے کبڈی کی گود سے لے کر کھلونوں والے کمرے میں لے گیا۔ سمیرا، محبوب اور معروف بڑے دکھ سے ماروی کو روتے اور بولتے دیکھ رہے تھے۔

وہ بول رہی تھی۔ ''تم جانتی ہو چاچی! میں اس کے انتظار میں کیسے ایک دن ایک ایک لمحہ گزار رہی تھی۔ یہ تقدیر کا کیسا مذاق ہے۔''

وہ چاچی سے الگ ہو کر سمیرا سے آ کر لپٹ گئی۔ ''ہائے سمیرا۔۔۔! میرے مراد کے لیے کچھ کرو۔ تم نے بہت پڑھا لکھا ہے۔ اسے پہلے کی طرح بنا دو۔''

پھر وہ محبوب کی طرف گھوم کر بولی۔ ''محبوب! آپ نے ہم پر دن رات احسانات کیے ہیں۔ یہ آخری احسان اور کر دیں۔ یورپ اور امریکا کے بڑے ڈاکٹر قد بڑھانے کی دوائیں دے سکتے ہیں۔ ابھی ان سے بات کریں، ابھی مراد کو ان کے پاس لے جائیں۔''

کبڈی نے سختی سے کہا۔ ''ماروی! چپ ہو جاؤ، تم ایسے رو رہی ہو جیسے میں مر چکا ہوں۔'' وہ تن کر بولا۔ ''میں زندہ ہوں، یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ میرا کوئی علاج نہیں ہے۔ میں علاج کے لیے ہی لندن گیا تھا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے مجھے مایوس کیا ہے۔ جس جادوگر نے مجھ پر یہ ظلم کیا ہے، وہ مر چکا ہے۔ دوسرے جادوگر اس کا توڑ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔'' وہ ماروی کی طرف گھوم کر بولا۔ ''میں نے صبر کر لیا ہے۔ تمہیں بھی صبر کرنا ہوگا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ جیسا بھی ہوں، زندہ سلامت تمہارے پاس آ گیا ہوں۔''

وہ محبوب کو دیکھ کر بولا۔ ''سائیں! یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ نہ میں مجرم رہا ہوں، نہ گناہ گار۔ یہ لیں، میں آپ کے سامنے آ گیا ہوں۔ مجھے دیکھ کر کوئی نہیں کہے گا کہ میں وہی گن چلانے والا ایک مفرور مجرم ہوں۔''

وہ تمام افراد کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں سچ مچ مجرموں کی دنیا سے نکل آیا ہوں۔ جن دشمنوں نے مجھے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کیا تھا اب وہ مجھے مراد علی منگی تسلیم نہیں کر رہے ہیں۔ میں جرائم کی دنیا سے چپ چاپ نکل آیا ہوں۔ اب آپ مجھے کیا کہیں گے؟''

محبوب نے کہا۔ ''تم پر قیامت گزر گئی۔ اب اس بحث کو جانے دو کہ تم مجرم اور گناہ گار ہو یا نہیں؟''

ماروی نے سمیرا سے الگ ہو کر محبوب سے کہا۔ ''پھر بھی آپ اپنی زبان سے تسلیم کریں کہ یہ نہ گن اٹھانے کے قابل ہے اور نہ ہی اب مجرم رہا ہے۔''

اس نے کبڈی کو دیکھ کر کہا۔ ''بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ جرائم کی دلدل سے نکل آیا ہے۔''

''آپ یہ بھی تسلیم کریں کہ مرینہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ اب یہ گناہ گار نہیں ہے۔''

محبوب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ماروی! ہم دونوں تمہارے طلب گار ہیں۔ تم نے خود ہی کہا تھا کہ ہم میں سے جو پارسا ہوگا، تم اسی کی منکوحہ بنو گی۔''

وہ بڑے فخر سے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''یہ سب جانتے ہیں کہ میں بے داغ ہوں۔ مراد دو بار داغ دار ہو چکا ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔ ہم سب اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ مراد کے گناہوں کو درگزر کر سکتے ہیں لیکن۔۔۔''

وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ ''لیکن تمہیں منکوحہ بنانے کے سوال پر میں ہی پارسا کہلاؤں گا۔''

ماروی نے کہا۔ ''ابھی آپ نکاح کی بات نہ کریں۔ مراد پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ میں ایسے میں شادی کی خوشیاں نہیں مناؤں گی۔''

وہ یکلخت اچھل پڑا۔ چیختے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میں۔۔۔ ایک ایک لمحہ گن گن کر گزار رہا ہوں۔ اب نکاح کو پانچ دن رہ گئے ہیں تو تم وعدے سے مکر رہی ہو؟''

اس نے التجا کی۔ ''پلیز میرے حالات کو سمجھیں۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔ مراد کے ساتھ جو ہو چکا ہے، اس کا افسوس ہم سب کو ہے اور تمام عمر رہے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کھانا پینا، ہنسنا بولنا اور خوشیاں منانا چھوڑ دیں۔ جو لوگ حادثاتی بات بات پر روتے ہیں، وہ بھی خوشی کے وقت خوشیاں مناتے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''اگر آپ کو مراد سے دلی ہمدردی ہے تو آپ مجھ سے شادی کے لیے جلدی نہیں کریں گے۔''

''شادی کے معنی ہیں خوشی۔ نئی مسرتیں۔ چلو ہم دو تاریخ کو کسی طرح کی خوشی نہیں منائیں گے۔ صرف نکاح پڑھوالیں گے۔ میں تمہیں اپنے نام کرلوں گا تو مجھے اطمینان رہے گا۔''

''آپ سمجھتے کیوں نہیں' مراد ایک بہت بڑا صدمہ اٹھا رہا ہے' یہ مجھے آپ کی دلہن بنتے دیکھے گا تو اسے دوسرا بڑا صدمہ پہنچے گا۔''

''یہ جذباتی باتیں ہیں۔ صدمہ آج بھی پہنچے گا اور ایک ماہ یا ایک برس کے بعد بھی پہنچے گا۔''

وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ماروی...! دو تاریخ اٹل ہے۔ میں کوئی دوسری بات نہیں سنوں گا۔''

وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے دل میں کیا ہے؟ ابھی سب کے سامنے کہہ دو۔ قبول نہ کرنے کے لیے باتیں بنارہی ہو؟''

''آپ میرے متعلق جو بھی رائے قائم کریں۔ فی الحال مراد کو ایسی حالت میں دیکھ کر میرا دل رو رہا ہے۔''

معروف تجلی نے کہا۔ ''محبوب! ہماری آنکھوں کے سامنے مراد ہے۔ یہ بونا ہو گیا ہے۔ ماروی کو اس سے محبت ہے' ہمدردی ہے لیکن اب عشق نہیں ہوگا اور نہ ہی یہ تم سے منہ پھیر کر بونے سے شادی کر کے تماشا بنے گی۔''

ماروی نے کہا۔ ''پلیز معروف صاحب! آپ اسے بونا نہ کہیں' مجھے تکلیف ہورہی ہے۔''

''ٹھیک ہے ہم میں سے کوئی یہ لفظ استعمال نہیں کرے گا۔ تم ابھی محبوب کو ٹالنے والی باتیں نہ کرو۔''

اس نے کبڈی سے کہا۔ ''اور مراد! تم بھی کہو' کیا موجودہ حالت میں تم ماروی سے شادی کرنا چاہو گے؟''

کبڈی نے کہا۔ ''میں ماروی کے لیے ہی جرائم کی دلدل سے نکل کر آیا ہوں۔ میں قد آور نہیں رہا۔ کوئی بات نہیں' ماروی بچپن سے میری تھی' میری ہی رہے گی۔''

معروف نے پوچھا۔ ''کیا اس سے شادی کرو گے؟ خود تماشا بن گئے ہو' اسے بھی تماشا بناؤ گے؟''

محبوب نے کہا۔ ''اور کیسے شادی کرو گے؟ ماروی کے اپنے فیصلے کے مطابق تم پارسا نہیں رہے' تمہارے منہ پر دو بار گناہ کی کالک لگ چکی ہے۔''

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ جو داغ لگ چکا تھا' وہ دھلنے والا نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں محبوب... بے داغ تھا۔

اس نے ماروی سے کہا۔ ''جو داغ لگ چکا ہے اور جو کبھی مٹنے والا نہیں ہے' اسے تم نے مٹانے کے لیے دو تاریخ تک مہلت لی تھی۔ پانچ دنوں کے بعد یہ مہلت ختم ہوجائے گی۔''

وہ ماروی کے رو برو ہو کر بولا۔ ''کیا تمہارا دین ایمان یہ نہیں کہتا کہ مہلت ختم ہوتے ہی اپنے وعدے کے مطابق میرے نکاح میں آنا چاہیے؟''

وہ باتیں بنا کر دو تاریخ کے وعدے کو ٹالنا چاہتی تھی لیکن اب بات نہیں بن رہی تھی۔ اس نے سہارا حاصل کرنے کے لیے چور نظروں سے اپنے مراد کو دیکھا۔ ان لمحات میں دل کہہ رہا تھا کہ دلدار کے پاس جائے اور اس سے لپٹ کر رونا شروع کردے۔ وہ مجبور تھا۔ ابھی اس کا ایمان علی بن کر رہنا ضروری تھا۔ وہ قانونی گرفت میں نہیں آرہا تھا۔ اسے سہولتیں حاصل ہورہی تھیں۔ فی الحال اتنی خوش نصیبی بہت تھی کہ اپنی ماروی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ آئندہ کب تک اسی بہروپ میں اس کے قریب رہنے والا تھا۔ اسے جس حال میں بھی ہو' ماروی کو حاصل کرنے کے لیے وہاں رہنا ہی تھا۔

آدمی سوچتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے۔ وہ بڑی پلاننگ کے ساتھ دو تاریخ سے پہلے آیا تھا لیکن شادی کو روکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ یہ ثابت نہیں کرسکتا تھا کہ وہ پانچوں وقت کا نمازی دین دار اور دیانت دار ہوگیا ہے اور اپنے ایمان کی پختگی کے باعث گناہوں سے دامن بچاتا آرہا ہے۔ اس کے پاس اپنی دیانت داری کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔

محبوب نے کہا۔ ''ماروی! تم چپ ہو۔ تمہارا سر جھکا ہوا ہے۔ تمہارے دل میں چور ہے۔ آج اس چور کو باہر نکالو۔ پوری سچائی سے کہو کہ مجھ سے نکاح منظور نہیں ہے۔ تم میرے احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہو۔ بہت مجبور ہو کر کہتی ہو کہ میرے نکاح میں آؤ گی۔

''ماروی...! میرا عشق میری دیوانگی کوئی کھیل تماشا نہیں ہے اور اب میں تمہیں اپنے جذبات سے کھیلنے نہیں دوں گا۔

''آج اعتراف کرو کہ تم مجھے ٹالتی آرہی ہو اور تمہارا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''یہ سچ ہے کہ آپ کے احسانات نے میرے دل میں جگہ بنالی ہے۔ میں آپ کو بہت چاہتی ہوں۔ آپ کی بہت عزت کرتی ہوں لیکن کیا کروں؟ وہ

محبت بھی نہیں دے سکوں گی جو مراد کے لیے ہے۔ آپ مجھے سر سے پاؤں تک جیت لیں گے لیکن دل تو مرتے دم تک مراد کا ہی نام لیتا رہے گا۔ میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ اب آپ ہی سوچیں' کیا مجھے شریکِ حیات بنانا دانشمندی ہوگی؟"

محبوب نے کہا۔ "عشق میں سوچنے کے لیے دماغ نہیں ہوتا۔ اس لیے دانش مندی نہیں ہوتی۔ میں نے اس کوٹھی میں تمہیں قید نہیں کیا ہے۔ لیکن مہربانیوں کی اور احسانات کی نادیدہ زنجیر پہنادی ہے۔

"اور یہ تو خدا جانتا ہے کہ میں نے زنجیریں پہنانے کے لیے احسانات نہیں کیے ہیں لیکن تم اخلاقاً گرفت میں آگئی ہو۔ جب مراد جیل کی چار دیواری میں بے بس اور مجبور تھا' تب میں تمہاری عزت آبرو کا محافظ بن کر رہا۔ آج تک تمہاری آبرو سلامت ہے۔ اس سے بڑی میری نیک نیتی کا ثبوت اور کیا ہوگا؟

"لیکن مجھے نیک نیتی کا صلہ نہیں مل رہا ہے۔ میں اوندھے منہ پڑا ہوں اور مراد مجھ پر سے گزر کر تمہارے پاس پہنچ رہا ہے۔"

وہ بول رہا تھا اور غصے اور جذبات سے ہانپ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "کسی کو اس کی ایمانداری کا اور نیک نیتی کا صلہ نہیں ملے گا تو وہ کیا کرے گا؟ وہ باغی ہو جائے گا۔ جیسے میں ہو رہا ہوں۔ یہ صاف صاف کہہ رہا ہوں کہ اب تم سے اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا سودا ہوگا۔ میں نے جو دیا ہے۔ اس کے عوض تمہیں لوں گا۔ تم میری نیک نیتی کے عوض نہیں ملو گی۔ میری پارسائی کی قدر نہیں کرو گی، جو داغ دار ہے' اس کا کلمہ پڑھتی رہو گی۔ اس لیے میں بھی خود غرض بن رہا ہوں۔

"ویسے اب بھی خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ اگر.... ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے ساتھ یہ ثابت کر دیا جائے گا کہ مراد گناہوں سے توبہ کر چکا ہے تو میں اس کی پارسائی کا انعام دوں گا۔ تمہاری طلب سے باز آجاؤں گا اور اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ میں بھی پارسا نہیں ہوں اور اپنے گناہوں کا داغ چھپائے رکھتا ہوں تو میں تسلیم کر لوں گا۔ داغ دار مراد کی طرح خود کو گناہ گار مان لوں گا اور ایسا کبھی ہو نہیں سکے گا۔ جو سیاہ ہے' وہ سیاہ رہے گا۔ جو سفید ہے۔ وہ ہمیشہ اُجلا ہی دکھائی دیتا رہے گا۔"

پھر وہ معروف اور سمیرا سے بولا۔ "یہاں سے چلیں۔ اب ہم دو تاریخ کو قاضی صاحب کے ساتھ آئیں گے۔"

وہ ماروی سے کوئی جواب سنے بغیر چلا گیا۔ اب کہنا سننا ضروری نہیں رہا تھا۔ دو تاریخ اٹل تھی۔

وہ گیا تو اس کے ساتھ سمیرا اور معروف بھی چلے گئے۔ منی نے کہا۔ "وہ اپنا فیصلہ سنا کر گئے ہیں۔ بیٹی ایمان کی کہتی ہوں، محبوب کی ہر بات درست ہے۔"

چاچا نے مراد سے کہا۔ "بیٹے! تم بڑی تیاریوں کے ساتھ یہاں آئے ہو۔ قانون کی گرفت میں نہیں آؤ گے۔ یہاں ماروی کے ساتھ رہ سکو گے لیکن تم نے اپنی پارسائی ثابت کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی۔"

"چاچا! میں جیسے نیک نیتی سے رہتا ہوں، یہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔ یہاں میں کیسے ثابت کر سکتا ہوں کہ گناہوں سے توبہ کر چکا ہوں۔ کون میری زبان پر بھروسا کرے گا۔ جب میں کچھ عرصے یہاں رہوں گا اور مجھے آزمایا جائے گا، تب ہی حقیقت معلوم ہوگی۔"

ماروی بے چین تھی۔ مراد کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے ابھی ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ اس نے کہا۔ "چاچی! آپ لوگ یہاں سے جائیں، میڈم روزی آج نہیں آئی ہیں۔ تم ملازمہ کو ادھر نہ آنے دینا۔"

وہ سب جانے لگے۔ منی نے کہا۔ "ادھر کسی کو آنے نہیں دوں گی۔ تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔ میں شہزاد کو لے جا رہی ہوں۔"

منی شہزاد کو لے گئی۔ ماروی اور مراد کمرے میں آگئے پھر وہ یکبارگی روتے ہوئے بولی۔ "مجھے پکڑ لو مراد! مجھے چھپا لو۔ میں تمہارے انتظار میں پل پل مرتی جیتی رہی ہوں۔"

وہ بولا۔ "اپنے دل پر اپنے جذبات پر قابو رکھو۔ تمہیں چھونے کا مطلب ہے کہ جذبات بے قابو ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ نہ بھولو کہ گناہ اسی طرح سرزد ہوتے ہیں۔ پلیز فاصلہ رہنے دو۔"

اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھو اور یہ دیکھو کہ جب مراد اپنی ماروی کی تنہائی میں نہیں بہک رہا ہے پھر دنیا کی کوئی اور عورت اسے کیسے بہکائے گی۔ میں نے اپنے خدا سے ثابت قدم رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ میں تمہارا ہوں۔ صرف تمہارا ہی رہوں گا۔"

وہ روتے ہوئے بولی۔ "میرے کیسے رہو گے؟ دو تاریخ کو کیا ہوگا؟ نہ تم اپنی پارسائی ثابت کر سکو گے اور نہ ہی

محبوب کو گناہ گار کہا جاسکتا ہے۔ وہ واقعی فرشتہ ہے۔ اس پر انگلی اٹھائی نہیں جاسکتی۔

''کیا ہوگا مراد؟ صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔''

وہ پریشان ہو کر سوچ رہا تھا۔ پھر مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''میں تمہیں اس کی منکوحہ بننے نہیں دوں گا۔ اس سے پہلے خود کو ظاہر کروں گا۔ مجھے پھر اسلحہ اٹھانا ہوگا۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔''

''کیسی باتیں کررہے ہو۔ خود کو ظاہر کرو گے تو قانون کے شکنجے میں چلے جاؤ گے۔'' وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی اُٹھا کر بولی۔ ''یاد رکھو۔ محبوب ہمارا ایسا فرشتہ صفت محسن ہے جس کے خلاف تمہیں ہتھیار اٹھانے نہیں دوں گی۔ جوش میں آؤ گے تو مجھے حاصل نہیں کرسکو گے پھر ایک بار جیل کی چار دیواری تمہارا مقدر بن جائے گی۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر پاؤں پٹخ کر بولا۔ ''کیا کروں؟ ہم رات کی تاریکی میں کہیں جا کر کتنے دنوں تک چھپ کر رہ سکیں گے؟'' وہ ماروی کو دیکھتے ہوئے سوچتے ہوئے بولا۔ ''میں ماسٹر کو بوبو سے بات کروں گا۔ وہ ہمیں یہاں سے نکال سکے گا۔''

''مراد! مجرمانہ ذہن سے نہ سوچو۔ ہم کہیں پکڑے جائیں گے تو میری عزت بھی دو کوڑی کی ہوجائے گی۔ محبوب نے یہاں کتنی عزت سے رکھا ہے، پھر میرا ضمیر کہتا ہے کہ میرے فیصلے کے مطابق محبوب کا پلڑا بھاری ہے۔ وہ میری طرح پاک دامن ہے۔ مجھے اپنے فیصلے پر عمل کرنا چاہیے۔ اس کے تمام احسانات کا بدلہ چکانا چاہیے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ کیا اس سے نکاح قبول کرلو گی؟''

''نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن میرے فیصلے اور میرے وعدے کے مطابق وہ مجھ سے نکاح پڑھانے کا مستحق ہے۔ اگر اس کا پلڑا تم سے بھاری نہ ہو، کسی طرح ہلکا ہوجائے تو پھر جیت تمہاری ہوگی۔ کوئی تدبیر کرو۔''

اس نے سوچتے ہوئے ماروی کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ دو تاریخ کو شادی کیسے روکی جائے؟ تم مجھے ہتھیار اٹھانے اور جارحانہ انداز اختیار کرنے نہیں دو گی۔ ایسا کرو، کسی طرح شادی کو دو تاریخ سے آگے لے جاؤ۔ مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا وقت ملے گا تو شاید میں اپنی ماروی کو حاصل کرسکوں گا۔''

ماروی نے کوشش کی۔ اس رات محبوب کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ ''میں جانتا تھا، تم مجھے کسی وقت کال کروگی۔''

ماروی نے پوچھا۔ ''آپ کو یہ یقین کیوں تھا؟''

''یہ نہ پوچھو۔ اپنی بات کہو لیکن کچھ بھی کہنے سے پہلے سن لو۔ دو تاریخ کو میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم بھی سب کے سامنے اپنا اٹل فیصلہ سنا چکی ہو کہ مراد بھی تمہارے دل سے نہیں جائے گا۔''

''میرے دل کی بات جانے دیں۔ میں انصافاً آپ سے شادی کے لیے راضی ہوں۔ اب تو آپ کو میری بھی بات ماننی چاہیے۔ میں کوئی بہت بڑی بات نہیں منواؤں گی۔''

''تم مجھ سے دنیا کی ہر چھوٹی بڑی بات منوالو۔ . . . میں اپنی زمین جائداد کاروبار سب تمہارے قدموں میں لا کر ڈال دوں گا۔ لیکن شادی کی دو تاریخ کو آگے نہیں بڑھاؤں گا۔ اب بولو، تم مجھ سے کیا منوانا چاہتی ہو؟''

''یہی کہ مجھ پر بھروسا کرو۔ ضد نہ کرو۔ میں ایک ماہ بعد نکاح قبول کروں گی۔''

''سوری، میں صاف کہتا ہوں کہ مجھے تم پر بھروسا نہیں ہے۔ تم ایک بونے کی خاطر مجھ سے کترا رہی ہو۔ میں حیران ہوں ماروی۔ . . ! میری ایک بات کا جواب دے کر حیرانی دور کرو۔ اگر مجھ سے نکاح قبول نہیں کروگی تو کیا اس بونے کو مجازی خدا بناؤ گی؟''

وہ ذرا چپ رہی پھر بولی۔ ''ابھی میں نے صرف اتنا سوچا ہے کہ تمہاری دلہن بن کر مراد کا دل نہیں توڑنا چاہیے۔ آپ مجھے وقت دیں گے تو میں اسے سمجھاؤں گی کہ اب ہمارا جوڑ نہیں رہا ہے اسے کسی بونی سے دل لگانا چاہیے۔''

''وہ نادان نہیں ہے۔ تمہارا سمجھانا ضروری نہیں ہے۔ اسے اتنی تو عقل ہونی چاہیے کہ وہ تمہارا شوہر نہیں بن سکے گا۔ ازدواجی زندگی ناکام رہے گی اگر وہ مجھ سے ملنا اور بات کرنا چاہے گا تو میں اس سے پوچھوں گا کہ وہ اپنے قد سے اونچی کسی بھی لڑکی سے شادی کرکے شرمندہ کیوں ہونا چاہتا ہے؟''

''میں نہیں چاہتی کہ آپ اس سے ایسی کوئی بات کریں۔''

''ٹھیک ہے نہیں کروں گا۔ کوئی دوسری بات کرو۔ یہ بتاؤ دو تاریخ کے لیے دلہن کا جوڑا خرید لیا ہے؟ میرے ساتھ شاپنگ کے لیے جاؤ گی؟''

ماروی نے فون بند کردیا۔ اس نے دوسرے دن سمیرا کو فون پر کہا۔ ''میرے لیے کچھ کرو۔ میں مراد کا دل نہیں توڑنا چاہتی۔''

سمیرا خود بے چین تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مراد بونا ہو یا جیسا بھی ہو، ماروی اس کی ہو جائے۔ کسی بھی طرح کوئی معجزہ ہو جائے اور وہ محبوب کے لیے پرائی ہو جائے۔

اس نے کہا۔ "خدا جانتا ہے' تمہاری طرح میں بھی پریشان ہوں۔ تمہارے اور مراد کے حق میں مجھ سے زیادہ کوئی دعا نہیں مانگے گا۔ تم جانتی ہو کہ میں محبوب سے آس لگائے بیٹھی ہوں۔ چلتے پھرتے دعائیں مانگتی رہتی ہوں۔"

"تم کسی بھی طرح مراد کی ہو جاؤ گی تو وہ پھر میری طرف مائل ہوں گے لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔"

"تم محبوب کو کسی طرح سمجھاؤ۔ کسی بھی طرح انہیں راضی کرو کہ وہ مجھ سے شادی کی جلدی نہ کریں۔"

"اب تو اور جلدی کریں گے۔ مراد آگیا ہے۔ وہ بونا ہی سہی۔ ایک ہی چھت کے نیچے تمہارے ساتھ رہے گا تو محبوب سے یہ برداشت نہیں ہوگا۔ یہ لکھ لو کہ وہ دو تاریخ کو ہر حال میں تمہیں اس کوٹھی سے نکال کر اپنی کوٹھی میں لے آئیں گے۔"

ماروی کو کہیں سے کوئی سہارا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ دن گزرتے جارہے تھے۔ مراد اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن ماروی اسے مجرمانہ اعمال سے روک رہی تھی۔

وہ خدا کو پکارتا رہتا تھا۔ نمازیں پڑھتا رہتا تھا۔ اب اور اپنی ذات کے اندر ڈوب کر سجدے کر رہا تھا۔ اسی نماز نے اسے کئی بار گناہوں سے بچایا تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ اس بار مایوسی نہیں ہوگی لیکن وسوسے اور اندیشے مایوس کرتے رہتے تھے۔ اور دل میں ایمان بھی تھا کہ نماز ہی اس کی ماروی کو نامحرم ہونے نہیں دے گی۔ وہ بچپن سے اس کی ہے اسی کی رہے گی۔ پہلی اور دوسری تاریخ کی درمیانی شب ایسی تھی جیسے دوسرے دن قیامت آنے والی ہو۔ ماروی اور منتی وہ رات نمازیں پڑھتے ہوئے اور کلام پاک کی تلاوت کرتے ہوئے گزار رہی تھیں۔ چاچا بھی نماز نہیں پڑھتا تھا۔ وہ بھی قبلہ رو ہو کر تسبیح پڑھ رہا تھا۔

قیامت کا وہ دن آہی گیا۔

محبوب صبح دس بجے قاضی صاحب کے ساتھ آگیا۔ سمیرا اور معروف جی بھی آئے تھے۔ ڈرائنگ روم میں فرشی نشست کا انتظام کیا گیا تھا۔ قالین پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ وہ سب وہاں بیٹھ گئے۔ مراد بھی کبڈی کے ساتھ وہاں آکر دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ بہ ظاہر وہاں موجود تھا مگر اپنی ذات میں گم تھا۔

منتی اور میڈم روزی' دلہن کو دونوں طرف سے تھام کر لائیں۔ اس نے دلہن کا جوڑا نہیں پہنا تھا۔ بدن پر ایک معمولی سا لباس تھا۔ اس نے دوپٹے کو گھونگٹ بنا کر اپنے آپ کو چھپا لیا تھا۔ وہ منتی اور روزی کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئی۔ قاضی صاحب نے نکاح نامہ کی خانہ پُری کی۔ پھر کلام پاک کی ایک آیت کی تلاوت کرنے لگے۔ گزرتے ہوئے وقت کا فیصلہ اٹل تھا۔ وہ تلاوت کے بعد نکاح قبول کرانے والے تھے۔ ان لمحات میں محبوب، ماروی پر جبر نہیں کر رہا تھا، وہ اپنا جائز حق حاصل کرنے آیا تھا۔ اور مراد نظریں نیچی کیے چشمِ تصور میں خانہ کعبہ پہنچ گیا تھا۔ وہ دنیا سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اس نے ڈوبتی ہوئی کشتی اللہ کے حوالے کر دی تھی اور وہی پاک پروردگار آنے والے پل کی خبر رکھتا ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے اگر بہتری محبوب کے لیے ہے تو ماروی محبوب کو ملے گی اور اگر مراد کے لیے ہے تو اس کے قریب بیٹھی ہوئی ماروی بھی پرائی نہیں ہوگی۔ اسی کی رہے گی۔

نکاح خوانی شروع ہو چکی تھی ایسے وقت کیا ہو سکتا تھا؟ دنیا کی کوئی طاقت ماروی کو پرائی ہونے سے نہیں روک سکتی تھی۔ قاضی صاحب نے ماروی سے پوچھا۔ "آنسہ ماروی بانو...! تمہارا نکاح محبوب علی چانڈیو سے......"

قاضی صاحب ٹھٹک گئے۔ یکلخت چپ ہو گئے۔

کعبہ کی فضا سے قبولیت کی ہوا چلی تھی۔

ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے پر کال بیل چیخنے لگی اور ایسے چیخنے لگی جیسے قیامت آگئی ہو اور وہ آنے والی قیامت کال بیل کے بٹن سے انگلی نہیں ہٹا رہی تھی۔ کالنگ بیل پورے ڈرائنگ روم میں گونج رہی تھی۔ نکاح خوانی رُک گئی تھی۔ نکاح پڑھاتے پڑھاتے ماروی ایک نعمت کی طرح میسر ہونے ہی والی تھی کہ کال بیل کی آواز نے قاضی صاحب کی آواز کو کچل دیا...

سب ہی سر گھما کر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت کون آسکتا تھا۔ کوئی بن بلایا اور ناپسندیدہ مہمان ہوگا۔ محبوب نے بڑی بے چینی سے ماروی کو دیکھا۔ ابھی وہ "قبول ہے" کہہ کر اس کی ہونے والی تھی۔

محبوب نے قاضی صاحب سے کہا۔ "جو بھی آیا ہے آنے دیں۔ آپ نکاح پڑھائیں۔"

قاضی صاحب پھر شروع ہونے والے تھے۔ منتی چاچی نے کہا۔ "ذرا ایک منٹ۔ دیکھیں تو سہی' کون آیا ہے۔"

میڈم روزی دروازہ کھولنے کے لیے اٹھنے لگی۔

اس سے پہلے ملازمہ نے جا کر دروازے کو کھولا۔ کھلے ہوئے دروازے پر ایک جوان عورت نظر آئی۔ ایک بہت ہی خوب صورت سی بچی اس خاتون کی انگلی پکڑے کھڑی تھی۔ محبوب اس خاتون کو دیکھتے ہی شدید حیرانی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر جیسے بے یقینی سے بولا۔ ''فیروزہ! تم......؟''

فیروزہ اندر آتے ہوئے بولی۔ ''بڑی مشکلوں سے تمہارا پتا معلوم کیا ہے۔ تمہاری ڈیفنس والی کوٹھی میں گئی تو سیکیورٹی گارڈ نے کہا' تم اس کوٹھی میں ہو اور آج اپنی دلہن یہاں سے لے جانے والے ہو۔''

وہ فرشی نشست کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''واقعی ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری شادی خانہ آبادی ہو رہی ہے۔''

محبوب نے کہا۔ ''آؤ یہاں بیٹھو۔''

وہ بولی۔ ''میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔ بہت الجھنوں میں ہوں۔ دس ماہ پہلے تمہارے دوست نفیس احمد کا انتقال ہو گیا تھا۔''

''او گاڈ! تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟''

''تمہارا فون نمبر گم ہو گیا تھا۔ میں دس ماہ سے ایک بیوہ کی زندگی گزار رہی ہوں۔ اب ایک رئیس زادے سے رشتہ طے ہو گیا ہے۔ میں پھر سے اپنا فیوچر بلڈ کرنے والی ہوں لیکن پرابلم یہ ہے کہ وہ اس بچی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔''

سب نے اس معصوم سی گڑیا جیسی بچی کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ''میں اس بچی کی خاطر ایک شاندار مستقبل کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ اس لیے تمہاری امانت تمہیں واپس کرنے آئی ہوں۔''

محبوب کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ایک چونکا دینے والا انکشاف ہونے والا تھا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر فوراً ہی ماروی کی طرف دیکھا۔ فیروزہ نے ایسی بات کہی تھی کہ وہ دلہن بھی دوپٹے کا گھونگٹ اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔

سب ہی سوالیہ نظروں سے اس بچی اور محبوب کو تک رہے تھے۔ پلک جھپکتے ہی وہ کنوارا باپ بن گیا تھا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''جو سچ ہے، وہ کہہ رہی ہوں۔ جب تک تمہارا دوست نفیس احمد زندہ رہا' تب تک اس گڑیا کا باپ کہلاتا رہا لیکن اس معصوم کے باپ تو تم ہی ہو۔''

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا زبردست دھماکا ہو گا۔ فیروزہ کے الفاظ دھماکے سے بھی کچھ زیادہ ہی تھے۔

مراد نے اس کے آگے کچھ نہیں سنا۔ فوراً ہی وہاں سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں آیا پھر ایک جگہ قبلہ رو ہو کر سجدے میں گر پڑا۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ وہ معبود ناممکن کو ممکن بنا کر عبادت کا صلہ ضرور دیتا ہے۔ اب کسی شبہے کے بغیر محبوب بھی پارسا نہیں تھا۔ داغدار تھا' دونوں کا پلڑا برابر ہو گیا تھا۔ اب وہ ماروی سے نکاح پڑھوانے کا مستحق نہیں رہا تھا۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی کرم نوازی تھی کہ وہ سجدے میں بے اختیار رو رہا تھا۔ اپنے معبود کا شکر ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں تھے صرف آنسو رہ گئے تھے۔

ڈرائنگ روم میں ایسا انکشاف ہوا تھا کہ فوراً ہی کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ محبوب بلاشبہ...... ایک فرشتہ تھا۔ وہ سستے جذبات کا حامل نہیں تھا۔ یہ یقین سے کہا جا سکتا تھا کہ کوئی حسینہ تنہائی میں اسے گناہ گار نہیں بنا سکے گی۔ ماروی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کی نظریں محبوب سے چپک کر رہ گئی تھیں۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ''فیروزہ! کیوں مجھے ذلیل کرنے آئی ہو؟ اس کا باپ تمہارا شوہر نفیس احمد تھا۔''

فیروزہ نے کہا۔ ''تم جانتے ہو' وہ باپ بننے کے قابل نہیں تھا۔ اس کی میڈیکل رپورٹ میرے پاس ہے یہ سب ہی مانتے ہیں کہ تم سچے اور دیانت دار ہو۔ پلیز... آج سچائی سے انکار نہ کرو۔ باپ تم ہی ہو۔''

سمیرا نے کہا۔ ''تم ایک انتہائی شریف انسان کو بہت ہی شرمناک الزام دے رہی ہو۔ کیا تم ثابت کر سکتی ہو کہ یہ محبوب صاحب کی بیٹی ہے؟''

وہ بڑے اعتماد سے بولی۔ ''یہ باپ ہو کر اپنی بیٹی کو تسلیم نہیں کریں گے تو کچھ ایسے کاغذات پیش کروں گی جنہیں پڑھ کر میری سچائی کا یقین ہو جائے گا۔''

ماروی نے آگے بڑھ کر محبوب سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ کیا ان کے پاس ایسے کاغذات ہیں؟ کیا آپ ان کاغذات کو جھٹلا سکیں گے؟''

محبوب نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''ماروی! میں بہت بدنصیب ہوں۔ تم سے جتنا قریب ہونا چاہتا ہوں تقدیر مجھے اتنا ہی دور کر دیتی ہے۔ میں تم سب سے ابھی جو سچ کہوں گا اس پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔''

معروف جگی نے پوچھا۔ ''ایسی کیا سچی بات ہے کہ ہم یقین نہیں کریں گے؟''

محبوب نے ماروی کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''یہ... یہ میری بیٹی ہے لیکن میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں ہوس کا پجاری نہیں ہوں۔ میں نے فیروزہ کو بھی ہاتھ نہیں لگایا ہے۔''

نتی چاچی نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''ارے واہ...! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تم نے اسے ہاتھ نہیں لگایا اور بچی پیدا ہوگئی؟''

فیروزہ نے کہا۔ ''محبوب درست کہہ رہے ہیں۔ ہم لندن میں تھے۔ لیکن کبھی تنہائی میں نہیں ملے۔ میں حیا والی ہوں اور یہ انتہائی شریف انسان ہیں۔'' وہ بچی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ گڑیا ٹیوب بے بی ہے۔''

یہ دوسرا دھماکا تھا۔ ''ٹیوب بے بی...؟''

سب کی نظریں گڑیا پر مرکوز ہوگئیں۔ ''ٹیوب بے بی...؟''

وہ ماں کے قریب ایک صوفے پر چڑھ کر اچھل رہی تھی۔ فیروزہ کہہ رہی تھی۔ ''جب میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہوا کہ نفیس احمد بانجھ ہیں۔ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے تو انہوں نے کہا، مجھے ٹیوب کے ذریعے ماں بننا چاہیے۔ وہ ایک بیٹا چاہتے تھے۔''

محبوب نے کہا۔ ''ایسی اولاد کے لیے راز داری ضروری تھی۔ نفیس نے مجھے راز دار بنایا۔ میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ یہ گناہ ہے۔''

''اس نے کہا کہ گناہ اس وقت ہوگا، جب تم میری بیوی کے بدن کو ہاتھ لگاؤ گے۔ تم تو اس کے قریب بھی نہیں جاؤ گے۔ یہ سب کچھ ٹیوب سسٹم کے پروسس کے مطابق ہوگا۔''

''میں کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں زخمی ہوا تھا۔ مجھے خون کی ضرورت تھی۔ نفیس نے مجھے اپنا خون دیا تھا۔ میں اس کے احسان کا بدلا چکانے کے لیے سوچنے لگا۔

''مجھے ایک ایسے میڈیکل پروسس سے گزرنا تھا، جہاں فیروزہ میرے قریب بھی نہ آتی۔ جب کسی کے ساتھ گناہ نہ کرتا تو گناہ گار بھی نہ کہلاتا۔ میں ہر پہلو سے سوچنے کے بعد راضی ہوگیا۔''

فیروزہ نے کہا۔ ''میں نے نو ماہ کے بعد محبوب کی اس بیٹی کو جنم دیا۔ آج تک نفیس احمد اس کے باپ کہلاتے رہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات یوں بدل جائیں گے۔ نفیس احمد وفات پا گئے۔ ان کے بعد لندن میں میرا کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے ہمارے لیے کوئی جائداد نہیں چھوڑی تھی۔ بینک میں صرف اسی ہزار پاؤنڈ زرہ گئے تھے۔ ایسے وقت ایک رئیس اعظم ملک حیات محمد نے مجھے پروپوز کیا ہے۔

وہ اس شرط پر مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں کہ میں بچی کو ساتھ نہ لاؤں۔ اسے کسی رشتے دار کے ہاں چھوڑ دوں۔ وہ صرف اپنی اولاد چاہتے ہیں۔''

وہ محبوب کو دیکھ کر بولی۔ ''میں بہت مجبور ہوکر تمہارے پاس آئی ہوں۔ حقیقتاً ہم عورتیں مجبور ہوتی ہیں۔ پہلے شوہر نے کہا۔ ٹیوب کے ذریعے بچہ پیدا کرو۔ میں نے اس کی بات مان لی۔ دوسرا شوہر کہتا ہے۔ پرائی اولاد کو چھوڑ دو۔ اس لیے میں چھوڑنے آگئی ہوں۔ سوری محبوب! مجھے افسوس ہے۔ میں بہت مجبور ہوکر آئی ہوں۔''

محبوب نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ''یہ میرے ساتھ زیادتی ہوگی۔ تم نے اور نفیس نے وعدہ کیا تھا کہ اس بچی کو کبھی میرا نام نہیں دیا جائے گا۔ بولو وعدہ کیا تھا یا نہیں؟ میں نے تم لوگوں کے ساتھ نیکی کی تھی۔ میری نیکی کا صلہ یوں نہ دو۔ بچی کو میرے پاس نہ چھوڑو۔''

''پھر ایک بار سوری کہتی ہوں! مجھے نئے سرے سے نئی ازدواجی زندگی گزارنی ہے۔

''میں ایک امیر کبیر گھرانے میں جا رہی ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں ملک حیات محمد سے شادی نہ کروں۔ بچی کی پرورش کرتی رہوں تو پھر ایک اور راستہ ہے۔

''پرورش صرف ماں کو نہیں باپ کو بھی کرنی چاہیے۔ ایک سیدھا سا راستہ ہے۔ تم اس کے باپ ہو۔ اس کی ماں کے شوہر بھی بن جاؤ۔ مجھ سے شادی کرلو۔''

سمیرا نے گھور کر اسے دیکھا۔ ماروی زیر لب مسکرانے لگی۔ وہ اندر ہی اندر بہت خوش تھی۔ جو غلطی مراد سے ہوئی تھی، وہی محبوب سے بھی ہو چکی تھی، وہ بھی مراد کی طرح کنوارا باپ بن چکا تھا۔

وہ دل ہی دل میں اپنے رب کے آگے سجدے کر رہی تھی۔ کاتب تقدیر نے جو لکھ دیا تھا، وہی سامنے آرہا تھا۔ محبوب کی ظالم دوتاریخ ہوا ہوگئی تھی۔

محبوب عجیب حالات سے دوچار تھا۔ اس وقت قاضی صاحب ماروی کا نکاح اس سے پڑھانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایسے میں ایک اور دلہن آگئی تھی۔

فیروزہ بھی نکاح پڑھانے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے ماروی کو دیکھا پھر فیروزہ سے بولا۔ ''میں نے تمہارے ساتھ نیکی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب مجھ سے دوسری غلطی کی امید نہ رکھو۔ جاؤ یہاں سے اور اس امیر کبیر سے شادی کرلو۔ میں ظالم نہیں ہوں۔ یہ معصوم میری

بیٹی ہے۔میرے سائے میں پرورش پائے گی۔''
سمیرا نے یہ سنتے ہی گڑیا کے پاس آکر اسے بازوؤں میں اٹھالیا۔پھر اسے چوم کر بولی۔''میں اسے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔میں اس کی پرورش کروں گی۔''
ماروی اور ختی چاچی مسکرانے لگیں۔ماروی نے مراد کے بیٹے کو کلیجے سے لگا رکھا تھا۔سمیرا ابھی موقع سے فائدہ اٹھا رہی تھی۔محبوب کی بیٹی کی کنواری ماں بن رہی تھی۔
محبوب نے سمیرا کی گود میں اپنی بیٹی کو دیکھا پھر ایک نظر ماروی پر ڈالی۔اس کی نظروں میں یہ شکایت تھی کہ اس نے سب کے سامنے مراد کے بیٹے کو گود میں لیا تھا۔اسے سینے سے لگایا تھا۔لیکن اس کی بیٹی کے قریب بھی نہیں گئی تھی۔
یہ رویہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ مراد سے کتنی گہری اپنائیت رکھتی ہے۔آئندہ اسی کے بچے کی ماں بننا چاہے گی۔
فیروزہ نے سمیرا سے کہا۔''گڑیا کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ، یہ مجھے جاتے دیکھے گی تو روئے گی۔''
سمیرا اسے گود میں لے کر ڈرائنگ روم سے باہر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔اس دوران ملازمہ نے ناشتے اور مشروب کی ٹرالی فیروزہ کے سامنے لا کر رکھی تھی۔وہ جلدی میں تھی۔اس نے صرف پانی پیا پھر اٹھ کر بولی۔
''شکریہ محبوب!تم نے میرے سر سے بوجھ اتار دیا ہے،میں جب بھی پاکستان آؤں گی تو بیٹی سے ملنے ضرور یہاں آیا کروں گی۔''
محبوب اسے دروازے کے باہر چھوڑنے آیا۔پریشان ہو کر بولا۔''تم نے میرے لیے مسائل پیدا کر دیے ہیں۔''
وہ بولی''تمہاری معصوم بچی میرے لیے بھی مسائل پیدا کر رہی تھی۔میں بڑی امیدیں لے کر آئی تھی کہ بچی کے ساتھ مجھے بھی قبول کر لو گے۔''
وہ ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔''مگر افسوس!دیر سے آئی۔تم یہاں کسی اور کے ہو رہے ہو.... بہر حال میرے لیے ایک دروازہ کھلا ہے۔''
اس نے ٹیکسی میں بیٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔وہ ٹیکسی وہاں سے چلی گئی۔وہ اندر آیا تو معروف نے دروازے پر ہی دھیمی سرگوشی میں پوچھا۔''محبوب یہ کیا ہو گیا؟کیا یہ شادی ہو سکے گی؟ماروی نکاح قبول کرے گی؟''
اس نے پوچھا۔''قبول کیوں نہیں کرے گی؟''
''خود ہی سمجھو،تم بھی گناہ گار بن چکے ہو۔''
وہ سرگوشی بھول گیا۔تڑپ کر اونچی آواز میں بولا۔

''میں نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔میں آج تک کسی عورت کی تنہائی میں نہیں گیا۔میں نے فیروزہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔''
ختی چاچی نے پوچھا۔''پھر بیٹی کیسے پیدا ہو گئی؟''
''یہ ٹیوب بے بی ہے۔''
عبداللہ کبڈی نے کہا۔''مرد کا تخلیقی جوہر عورت کے رحم میں جاتا ہے، تب ہی ایک بچہ تشکیل پاتا ہے۔تم نے فیروزہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔لیکن تمہارا تخلیقی جوہر ایک پرائی عورت کے اندر پہنچ گیا۔یہ تو چھو لینے سے بھی بڑا گناہ ہے۔''
محبوب نے کہا۔''فضول باتیں نہ کرو۔تمہیں تو اب میرے خلاف بولنے کا موقع مل گیا ہے۔تمہاری تو یہ کوشش ہو گی کہ مجھے عیاش اور گناہ گار ثابت کرو۔''
کبڈی نے کہا۔''جو سچ سامنے ہے'وہی کہہ رہا ہوں۔یہاں تمہارے خلاف ثبوت اور گواہ دونوں ہی موجود ہیں۔''
پھر اس نے قاضی صاحب سے کہا۔''محترم...!آپ دینی معاملات کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔آپ فرمائیں کیا ہمارا دین ٹیوب بے بی کو وجود میں لانے کی اجازت دیتا ہے؟''
قاضی صاحب نے کہا۔''اللہ بہتر جانتا ہے۔میں فتویٰ دینے والا مفتی نہیں ہوں۔آپ حضرات کسی عالم دین سے رجوع کریں۔میری موٹی سی عقل کہتی ہے کہ گناہ چوری چھپے ہوتا ہے۔یہ ٹیوب بے بی نکاح کے بغیر وجود میں آئی ہے۔اس لیے یہ سراسر گناہ ہے۔''
محبوب نے کہا۔''میں نہیں مانتا۔میں کسی بڑے عالم دین سے فتویٰ حاصل کروں گا۔''
قاضی صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا۔''مجھے افسوس ہے محبوب صاحب!میں آپ کا نکاح نہیں پڑھاؤں گا۔''
وہ نکاح کے رجسٹر کو ایک تھیلے میں ڈال کر وہاں سے جانے لگے۔محبوب نے کہا۔''آپ ہی ایک نکاح پڑھانے والے نہیں ہیں۔آپ کے جیسے بہت مل جاتے ہیں۔میں ابھی دوسرے قاضی کو بلا لوں گا۔میں گناہ گار نہیں ہوں۔میں نے فیروزہ کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔میں بے داغ ہوں۔''
مراد ٹی وی لاؤنج سے واپس آ گیا تھا اور بڑی دیر سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔اس نے عبداللہ کبڈی کو اشارہ کیا۔کبڈی نے کہا۔''سائیں!مجھے کہا جا رہا تھا کہ میں اپنی پارسائی ثابت کروں۔اب میں آپ سے کہتا ہوں پہلے اپنی پارسائی ثابت کریں،پھر ماروی کو منکوحہ بنانے کے خواب دیکھیں۔''
وہ بولا۔''مراد!رقیب بن کر نہ بولو۔میں نے

تمہاری طرح دو عورتوں سے منہ کالا نہیں کیا ہے اور اب بھی تم چوری چھپے نہ جانے کیا کرتے رہتے ہو۔ میں تو دھوپ میں کھڑی ہوئی فیروزہ کے سائے میں بھی نہیں گیا۔ خدا جانتا ہے میرا دامن پاک ہے، میں بے داغ ہوں۔''

پھر اس نے ماروی سے کہا۔ ''تم انصاف سے بولو۔ میں آج تک عورتوں سے دور رہا ہوں۔ تم میری نیکی اور شرافت کو دیکھتی آرہی ہو۔ کیا میں گناہ گار کہلا سکتا ہوں؟''

وہ منہ پھیر کر بولی۔ ''قاضی صاحب نے بڑی وضاحت سے کہہ دیا ہے کہ آپ کا لہو دوسری عورت میں منتقل ہو گیا۔ یہ گڑیا آپ کا لہو ہے، آپ کے گناہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔''

وہ ایک دم سے چیخ پڑا۔ ''میں پاگل ہو جاؤں گا۔ اس دو تاریخ کا انتظار کرتے کرتے جیسے میری جوانی گزر گئی ہے۔''

وہ پاؤں پٹختا ہوا اس کے قریب آکر بولا۔ ''تم میرے نکاح میں آنے سے انکار کر رہی ہو... اور میرے اندر دھماکے ہو رہے ہیں۔'' وہ جنون میں مبتلا ہو رہا تھا۔ ''میں چیخ چیخ کر کہتا ہوں کہ تمہیں ہر حال میں حاصل کر کے رہوں گا۔ تم میری شرافت پر تھوک کر کسی اور کی نہیں بن سکو گی۔''

وہ تنبیہہ کے انداز میں انگلی اُٹھا کر بولا۔ ''آج یہ صاف صاف کہتا ہوں کہ میری شریک حیات بن کر تمہیں میرے تمام قرضے ادا کرنے ہوں گے۔ جب تک نکاح کی صورت میں قرض ادا نہیں کرو گی، تمہیں اس کوٹھی سے جانے نہیں دوں گا۔''

وہ پہلی بار ماروی سے اتنی سخت باتیں کہہ رہا تھا۔ اسے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اپنی نیکی اور شرافت کو بھول رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ پھر بولا۔ ''میرے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ میری برداشت جواب دے چکی ہے۔ تم جب تک قرض ادا نہیں کرو گی اس کوٹھی میں قید رہو گی۔ تمہارا یہ بونا عاشق تمہیں یہاں سے نہیں لے جاسکے گا۔''

وہ چیلنج کرتا ہوا، دروازہ کھول کر باہر چلا گیا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ سب ایک دوسرے کو خاموش نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر معروف نے ماروی سے کہا۔ ''محبوب تم سے مسلسل محروم ہوتا آرہا ہے۔ آج وہ پھٹ پڑا ہے۔ میں اسے سمجھاؤں گا۔ وہ غصے میں کہہ گیا ہے کہ تم سے قرض وصول کرے گا۔ اس کا مزاج ایسا نہیں ہے۔ وہ کسی پر جبر نہیں کرتا ہے۔ تمہیں بھی تکلیف نہیں پہنچائے گا۔ اسے آج یا کل تمہیں سوری کہنا چاہیے۔''

ماروی نے کہا۔ ''وہ سوری بولیں یا نہ بولیں، آج ان کی اصل صورت سامنے آگئی ہے۔ میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ آج سے میں ان کا کوئی احسان نہیں لوں گی۔''

اس نے روزی سے کہا۔ ''میڈم! آپ محبوب کے پاس واپس جائیں۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہے۔''

میڈم روزی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ماروی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''پلیز، میں کچھ نہیں سنوں گی۔ مجھ سے بحث نہ کریں۔ آپ جائیں اور اپنا سامان پیک کریں۔''

پھر اس نے منّی سے کہا۔ ''چاچی! ملازمہ کو بولو، وہ بھی چھٹی کرے۔ تم آج سے گھر کے اخراجات کے لیے محبوب سے ایک پیسا بھی نہیں لو گی۔ ہمیں ابھی بہت کچھ سوچنا... سمجھنا ہے کہ محبوب کا قرض کس طرح ادا کرنا ہے۔''

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''میں تو مر جاؤں گی مگر ان سے نکاح قبول نہیں کروں گی۔ میں آج ہی یہ کوٹھی چھوڑ جاؤں گی اور دیکھوں گی کہ وہ مجھے کیسے قیدی بنا کر رکھیں گے۔''

سمیرا نے کہا۔ ''پلیز ماروی! تم اس طرح غصے میں نہ آؤ۔ محبوب صاحب کا غصہ جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

ماروی نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے عبداللہ کبڈی سے کہا۔ ''مراد! تم ابھی جاؤ اور کوئی اچھا سا مکان کرائے پر حاصل کرو۔ ہم آج ہی یہ کوٹھی چھوڑ دیں گے۔''

معروف نے کہا۔ ''ایسا نہ کرو ماروی! تم یہاں سے کہیں جاؤ گی تو محبوب پاگل ہو جائے گا۔ اس نے جنون میں اپنے مزاج کے خلاف بے تکی باتیں کی ہیں۔ تم خود جانتی ہو وہ ایسا نہیں ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم یہاں قیدی بن کر نہیں رہو گی۔ محبوب جلد ہی آکر تمہیں سوری کہے گا۔''

''معروف صاحب... ! کیا ان کے سوری کہہ دینے سے یہ حقیقت بدل جائے گی کہ وہ مجھے حاصل کرنے کی نیت سے احسانات کرتے رہے ہیں؟'' وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں تو نہیں بھولوں گی کہ ان کا قرض ادا کرنا ہے۔ میں ان سے پوچھوں گی کہ وہ قرض کس طرح وصول کریں گے؟ جبکہ مجھے کبھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ میں مراد کی ہوں۔ مراد کی ہی رہوں گی۔''

منّی نے کہا۔ ''یہ اچھی بات ہے کہ محبوب کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے لیکن ماروی اب کس رشتے سے یہاں

رہے گی؟ ان کی جو بے لوث مہربانیاں تھیں وہ ختم ہو چکی تھی۔" چاچی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "ہم یہاں سے جانے کے بعد بھی محبوب کے احسان مند رہیں گے۔ ہم... بے ضمیر اور احسان فراموش نہیں ہیں۔ انہوں نے جو نیکیاں کی ہیں ان کے سامنے سر جھکاتے رہیں گے۔"

ماروی نے کہا۔ "اور آئندہ اس معاملے پر بحث ہوتی رہے گی کہ میں ان کا قرضہ کیسے اتاروں گی...؟ مجھ سے شادی کرنے کا خیال تو انہیں دماغ سے نکالنا ہی ہوگا۔"

معروف نے کہا۔ "بات بگڑ رہی ہے۔ ہمیں دانش مندی سے بگڑی کو بنانا چاہیے۔ میں کوشش کروں گا کہ ہم میں سے کسی کو کسی کی ذات سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

پھر اس نے سمیرا سے کہا۔ "آؤ سمیرا... ہم چلیں۔"

میڈم روزی اپنا مختصر سا سامان لے آئی۔ معروف نے اس سے کہا۔ "آؤ، تم جہاں کہو گی ڈراپ کردوں گا۔"

وہ باہر چلا گیا۔ سمیرا نے گڑیا کو بازوؤں میں اٹھا کر ماروی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "محبوب صاحب اور معروف صاحب کے خیال میں بات بگڑ رہی ہے جبکہ تمہاری بات بن گئی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "مبارک ہو۔ اب تمہاری زندگی میں صرف مراد ہی ہوگا۔ ایک انار کا دوسرا بیمار نہیں رہے گا۔"

پھر وہ گڑیا کو چوم کر بولی۔ "میری بھی بگڑی بن رہی ہے۔ میرے لیے بھی دعا کرتی رہو۔"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ملازمہ کو بھی رخصت کردیا گیا۔

☆☆☆

محبوب غصے سے تلملاتے ہوئے کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ ماروی سے ہر بار محروم ہونے کے بعد سوچتا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ اس کی طرف مائل ہو جائے گی لیکن اب قصہ ہی ختم ہو گیا تھا۔

اس نے ٹیوب بے بی کے حوالے سے جو نیکی یا غلطی کی تھی، وہ غلطی گناہ بن گئی تھی۔ وہ بھی داغ دار ہو گیا تھا۔ مراد کے ساتھ پلڑا برابر ہو گیا تھا۔

مگر کیا اس نے ماروی کے ساتھ کم نیکیاں کی تھیں؟

جب تک مراد گدھا گاڑی والا رہا اور جیل میں رہ کر سزائے موت کی طرف جاتا رہا، تب تک اس کے ساتھ بھی نیکیوں کی انتہا کردی۔ اس کی جگہ سزائے موت پانے کے لیے آہنی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے اب تک کسی ایک نیکی کا بھی صلہ کبھی کیوں نہیں ملا؟ لوگ اپنے مفادات کے سامنے دوسروں کی محبتوں اور قربانیوں کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

دنیا اسے بھول جاتی تو کوئی غم نہ ہوتا۔ ماروی اسے بھلا کر صدمہ پہنچا رہی تھی۔ اس نے سب کے سامنے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا کہ اس کی شریک حیات نہیں بنے گی۔ اس کے بعد ہی پہلی بار صبر کا پیمانہ چھلک گیا تھا۔

کار کی تیز رفتاری بتا رہی تھی کہ ابھی غصہ کم نہیں ہوا ہے۔ اب وہ ماروی کو سو طرح سے گھیرنے اور اسے طرح طرح سے مجبور کرنے والا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے احسانات کا بدلا چکائے بغیر کوٹھی سے نہیں جائے گی۔ وہ ڈرائیو کرتا ہوا ہائی وے پر آگیا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے؟ بس کہیں دور نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے سب کچھ بھولنے کے لیے ہائی وے پر بھاگا جا رہا تھا۔ ماروی سے دور بھاگنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن کیسے نہیں تھا؟ ذریعہ تھا... ایسے وقت سمیرا اس کے خیالوں میں آگئی۔ یہ جنون اور انتقامی جذبوں کی کارستانی تھی۔ ماروی اور سمیرا... سمیرا اور ماروی دونوں کی شکلیں خیالوں میں گڈمڈ ہونے لگی تھیں۔

اب سوچنے کا انداز بدل گیا تھا۔ یہ طے تھا کہ ماروی لائف ٹائم پارٹنر کبھی نہیں بنے گی۔ اسے پارٹ ٹائم قرضے کے طور پر وصول کرنا ہوگا۔

معروف تجلی نے اسے کال کی۔ "محبوب! کہاں ہو؟ غصے میں بنتی ہوئی بات کو نہ بگاڑو۔ مانا کہ اس نے ابھی نکاح سے انکار کیا ہے مگر سوچو، کیا وہ بونے مراد کو گلے سے لگا کر رہ سکے گی۔ پلیز تحمل سے سوچو۔ واپس آؤ۔"

"محبوب... ذرا صبر کرو۔ وہ آخر پچھتا کر تمہاری ہی طرف لوٹے گی۔ فارگاڈ سیک، غصے کو دماغ سے نکالو۔"

وہ بولا۔ "آپ بہت اچھی باتیں کرتے ہیں اور ہمیشہ مجھے نقصانات سے بچاتے ہیں لیکن ماروی نے اس بونے کی خاطر سب کے سامنے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ سوری میں ابھی آپ سے بات نہیں کرسکوں گا۔ کل ضرور آپ سے ملوں گا۔"

اس نے فون بند کردیا۔ زیر لب کہنے لگا۔ "کیا میں ایک بونے سے گیا گزرا ہوں۔ وہ مجھے سمجھتی کیا ہے؟"

اس نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی اونچی حیثیت سے گر کر اسے چاہتا رہا۔ اس نے مجھے اور گرا دیا۔ کوئی بات نہیں، میں بھی گرانا جانتا ہوں۔"

وہ واپسی کے لیے کار کو ایک یوٹرن پر لے آیا۔ بڑی لمبی ڈرائیونگ کرتا رہا تھا۔ غصہ کتنا ہی آئے۔ خواہ کتنی ہی

ٹینشن ہو، بھوک تو لگتی ہے لیکن ابھی کچھ بھی کھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے ایک جگہ رک کر صرف جوس پینے پر اکتفا کیا۔

شام کے بعد اندھیرا اچھل رہا تھا گھر پہنچ کر پینے کے دوران کھانے کا ارادہ تھا۔ وہ ایک چرغہ لے کر کوٹھی میں آگیا۔ وہاں پورچ میں کار سے اترتے ہوئے دل کو پھر صدمہ پہنچا۔

آج وہ اپنی دلہن کے ساتھ کار سے اترنے والا تھا۔ اسے بڑے ارمانوں سے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر خواب کی تعبیر تک، خواب گاہ تک لے جانے والا تھا۔

وہ خالی کار کو اور کوٹھی کے خاموش دروازے کو دیکھ کر بڑبڑانے لگا۔ ''ماروی! یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا بیڈروم میں آیا۔ رقیب کو اس کی قربت حاصل ہو رہی تھی اور وہ اس سے دور خالی ہاتھ آگیا تھا۔ اس کا بیڈ ماروی کے وجود سے محروم تھا۔ وہ خواب گاہ اسے اور صدمہ پہنچا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک خوب صورت سے کیبنٹ کے پاس آیا۔ وہاں اس کے غموں کا علاج تھا۔ اس نے کیبنٹ کے سلائڈنگ پٹ کو ایک طرف ہٹایا تو سامنے شیشے کی دیوار تھی۔ اس دیوار کے پیچھے امپورٹڈ وسکی، وائن، واڈ کا اور بیئر کی بوتلیں اور کین نظر آرہے تھے۔ یہی ہے وہ اُم الخبائث جو سارے غم بھلا دیتی ہے اور بے وفا کو دل سے نوچ کر پھینک دیتی ہے۔

وہ شیشے کا ایک جام اور بلیک لیبل کی ایک بوتل نکال کر بیڈ کے سرہانے والی میز پر آگیا۔ ایک ملازم دروازے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ دوڑ کر کچن میں گیا، وہاں سے پلیٹ چمچ اور فورک لے آیا۔ پیک کیے ہوئے چرغے اور سلاد کو نکال کر پلیٹ میں رکھا۔ پھر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے آیا۔ وہ اپنے صاحب کو پلانے کے معاملے میں مستعد رہتا تھا۔ اس نے بوتل کھول کر ایک پیگ بنایا۔ محبوب نے کہا۔ ''ڈبل پیگ۔''

اس نے بوتل کھولی پھر ایک پیگ کو ڈبل کر دیا۔ محبوب نے جام کو اٹھا کر سنہری شراب کو نشیلی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ پینے سے پہلے نشے کو عادی کر رہا تھا۔ پھر اس نے ایک چسکی لی پھر ایک گھونٹ پیا۔ اسی وقت فون چیخنے لگا۔

اس نے اور ایک گھونٹ پی کر نمبر پڑھے۔ بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا پھر بولا۔ ''ہاں سمیرا...! بولو، کچھ بھی بولو۔ لیکن مجھ سے ہمدردی نہ کرنا اور اس بے وفا کا نام نہ لینا۔''

''میں کسی کا نام نہیں لوں گی۔ صرف آپ کے لیے پریشان ہوں۔ ایسے وقت آپ کو تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ آپ کہاں ہیں؟''

''میں اپنے بیڈروم میں ہوں۔''

''میں آنا چاہتی ہوں۔ پلیز انکار نہ کریں۔''

اس نے شیشے کے جام میں سنہری سمیرا کو دیکھا۔ پھر کہا۔ ''ہاں میں تنہا ہو گیا ہوں آجاؤ لیکن میں پی رہا ہوں۔''

''میں آرہی ہوں۔ آپ وعدہ کریں، چار پیگ سے زیادہ نہیں لیں گے۔''

اس نے جواب نہیں دیا۔ فون بند کر دیا۔ یقین تھا کہ وہ اس کی دیوانی ہے، ضرور آئے گی۔ اس نے ملازم سے کہا۔ ''تم جاؤ اپنے کوارٹر میں رہو۔ ضرورت ہو گی تو کال کر لوں گا۔''

وہ چلا گیا۔ اس نے جام خالی کیا تو سرور چھانے لگا۔ وہ موڈ میں آگیا۔ بہت آہستہ آہستہ سر گھوم رہا تھا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

ایسے وقت سمیرا آگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ذرا سا ڈگمگایا پھر بولا۔ ''بہت اچھے وقت پر آئی ہو۔ میں نے ابھی ابھی اسے بھلا دیا ہے۔ اب یاد آئے گی تو لات مار کر بھگا دوں گا۔''

وہ بولی۔ ''چلیں اچھا ہے۔ اسی طرح اسے بھگاتے رہا کریں۔ اپنا غم غلط کرتے رہیں۔''

وہ ڈگمگاتے ہوئے بولا۔ ''اس کی اوقات یہی ہے۔ اسے ٹھوکروں میں رکھنا چاہیے۔''

سمیرا نے زیرو پاور کا بلب آن کر کے باقی لائٹس بجھا دیں۔ ہلکی نیلی خواب آور روشنی میں ماحول خواب خواب سا ہو گیا۔ وہ ہلکے گلابی لباس میں تھی۔ وہ جام ہاتھ میں لیے کھڑا تھا، اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوابوں میں آنے والی دوشیزہ لگ رہی تھی۔ سمیرا نے قریب آکر اس کے ہاتھ سے جام لے کر میز پر رکھا۔ پھر اس کے دونوں بازوؤں کو تھام کر کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے، آپ نے زیادہ پی لی ہے۔ یہاں آرام سے بیٹھیں۔''

وہ اسے بیڈ کے سرے پر بٹھانا چاہتی تھی۔ ایسے وقت وہ اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ ''اچھا ہوا تم آگئیں، اب وہ نہیں آئے گی۔ میں نے تو اس سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اسے بھول گیا ہوں۔ خبردار! اب یہاں نہ آنا۔ جب میں یاد کروں گا ہی نہیں تو وہ کیسے آئے گی؟''

وہ بیڈ کے سرے پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس کی گرفت میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی شرابی سانسیں اسے آنچ دے رہی تھیں۔ کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک تھی لیکن اس

کنواری کے اندر موسم بدل رہا تھا۔

وہ اس کی گردن اور شانے پر ہونٹوں کو رکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئیں۔ اب وہ نہیں آئے گی۔''

وہ کسمساتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے وہ نہیں آئے گی، آپ مجھے چھوڑیں ہمارے درمیان فاصلہ رہنا چاہیے۔''

وہ بولا۔ ''ہرگز نہیں' فاصلہ رکھو گی تو وہ ہمارے درمیان چھم سے آ جائے گی۔ اسے آنے کی جگہ نہ دو۔''

وہ تڑپ کر ایک جھٹکے سے الگ ہو گئی۔ محبوب نے پہلی بار اسے پکڑا تھا۔ اسے دھڑکنوں سے لگایا تھا۔ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے آئی تھی۔ لیکن ہاتھ آنے سے پہلے ذرا تڑپانا چاہتی تھی۔

محبوب نے اسے پکڑ لیا۔ وہ خود کو چھپانے کے لیے اس کی گردن میں دونوں بانہیں ڈال کر ہار مان گئی۔

وہ شہر تمنا میں بھٹکتے ہوئے بڑی آسودگی سے بولا۔ ''آہ... ماروی! آخر تم آ ہی گئیں۔ تم میرا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔''

وہ جذبات سے لرزتی ہوئی بولی۔ ''میں سمیرا ہوں۔''

وہ جیسے اندھا ہو گیا تھا۔ زیرو پاور کی روشنی میں سمیرا بجھ گئی تھی۔ وہ ماروی لگ رہی تھی۔ سمیرا چپ ہو گئی۔ معاملہ فہم تھی۔ اسے بہلنے اور بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ ماروی کے نام سے ہی سہی' آ تو گیا تھا۔ اس کی پارسائی کا بت ایک بار اوندھے منہ گرتا تو پھر گرتا ہی چلا جاتا۔

کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک بھی تھی اور جذبوں کی حرارت بھی۔ خاموشی بھی تھی اور ہلچل بھی۔ کبھی کبھی اس کے بڑبڑانے کی آواز ابھرتی پھر ڈوب جاتی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد طویل خاموشی چھا گئی۔ وہ نشے اور نیند میں غافل ہو گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ اے سی کے باوجود چھت پر پنکھا گردش میں تھا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ وہ پی رہا تھا اور سمیرا اس کے ساتھ بیڈ پر تھی۔ اس نے چونک کر سر گھما کر دیکھا تو وہ اس کے پاس اُجڑی ہوئی حالت میں نظر آئی۔

اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ پھٹا ہوا لباس ادھر ادھر ہو گیا تھا۔ اسے ایسی حالت میں دیکھ کر ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ کچھ کچھ دھندلا دھندلا سا یاد آنے لگا کہ پچھلی رات کیا کچھ ہوتا رہا تھا؟ وہ فوراً ہی منہ پھیر کر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پہلی بات یہی دماغ میں آئی کہ پارسائی رخصت ہو چکی ہے۔

پھر یہ شاک پہنچا کہ وہ بھی مراد کی طرح ڈبل گناہ گار ہو گیا ہے۔ فیروزہ کے بعد سمیرا کا نام گناہ کی فہرست میں آ گیا تھا۔ سمیرا ایسی حالت میں پڑی ہوئی تھی کہ وہ شرمندگی سے سر گھما کر اسے دیکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ ایک تعلیم یافتہ عزت آبرو اور شرم وحیا والی تھی۔ محبوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اسے دل وجان سے چاہتی ہے۔ اتنی شدت سے چاہتی ہے کہ اپنا قیمتی سرمایہ اس کے حوالے کر چکی تھی۔

اب تو اسے ماروی کی جگہ دے یا نہ دے۔ پیار سے اس کی قدر کرنی ہی تھی۔ وہ اسے پہلے کی طرح نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ وہ محبت اور توجہ کی مستحق ہو گئی تھی۔ محبوب کی زندگی میں وہ پہلی صبح تھی، اس نے جاگتے ہی ماروی کو یاد نہیں کیا تھا۔ سمیرا نے اپنے مسئلے میں اسے جکڑ لیا تھا۔ بلکہ وہ خود ہی شکنجے میں آ گیا تھا۔ پریشان ہو رہا تھا کہ اس کی محبت کا جواب محبت سے کیسے دے گا؟

اس کے سامنے ماروی سے کیسے تقاضا کرے گا کہ وہ احسانات کے عوض اس سے نکاح قبول کرے۔ آئندہ سمیرا بھی تقاضا کرنے والی تھی کہ اس کا قیمتی سرمایہ حاصل کرنے کے بعد وہ اسے اپنی منکوحہ بنائے۔ یہ سوال اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا کہ وہ کیا کرے گا؟ اب تو وہ ماروی کو جبراً حاصل کرنے کے معاملے میں کمزور ہو گیا تھا۔ سمیرا ذہین اور تعلیم یافتہ تھی۔ خاموش احتجاج کرتے ہوئے اس کے لیے عذاب بننے والی تھی۔

پھر اسے اپنے پیچھے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ رو رہی تھی۔ یہ خاموش احتجاج تھا اور آنسو چیخ رہے تھے، دوسروں کے سامنے بھی آنسو نکل پڑتے تو ایک رات کی رنگین وسنگین داستان سب ہی کی سمجھ میں آ جاتی۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''سمیرا... !میں شرمندہ ہوں۔''

اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ آگے کیا بولے؟ کیا کرے؟

ماروی ہوتی تو فوراً اس کے آنسو پونچھتا۔ اسے چومتا اور سینے سے لگا کر تسلیاں دیتا اور کہتا۔ ''میری جان! جو ہو گیا اس پر آنسو نہ بہاؤ، میں ہوں نا۔''

''میں ہوں نا۔'' سمیرا سے کہتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ تمام عمر اسی کا ہو کر رہنے والا ہے لیکن ابھی وہ اتنی بڑی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ ابھی تک ماروی دل میں پھانس کی طرح گڑی ہوئی تھی۔

اس کی سسکیاں تیز ہو گئی تھیں۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ مجبور ہو کر اس کی طرف گھوم گیا۔ اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''چپ ہو جاؤ۔ غلطی دونوں سے ہوئی ہے۔''

وہ سسکتی ہوئی بولی۔ ''مجھ سے نہیں ہوئی ہے۔ آپ کو یاد نہیں ہے۔ میں آپ کو روکتی رہی۔ سمجھاتی رہی لیکن

آپ جنون میں تھے، میرے لباس کو پھاڑ ڈالا تھا۔''
وہ ایک ہاتھ سے اپنا سر تھام کر بولا۔ ''میں اور کیا کہوں؟ جو ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔''
''کیا بھول جانے سے لٹی ہوئی عزت واپس مل جائے گی؟ اب تو آپ ہی اس کے حقدار ہو گئے ہیں۔ آپ لٹیرے نہیں ہیں۔ آپ ہی اس کے امین ہیں۔''
وہ اپنی شرافت کے باعث قائل ہو کر بولا۔ ''مجھے اس سلسلے میں بہت سوچنا اور سمجھنا ہوگا۔''
''آپ پیار سے سوچیں گے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔''
''میں وعدہ کرتا ہوں، ضرور سوچوں گا۔ پلیز ابھی اٹھو۔ اپنی حالت درست کرو۔''
ایسے لمحات میں عورت نہیں مانتی۔ اپنی منواتی ہے۔ اس نے ضد کی۔ ''میں نہیں اٹھوں گی۔ جب تک آپ پیار نہیں کریں گے مجھے تسلیاں نہیں دیں گے۔ میں یہیں پڑی رہوں گی۔ آپ کی قسم کھاتی ہوں۔ آپ کا پیار ہی مجھے یہاں سے اٹھائے گا۔''
وہ کوئی گئی گزری نہیں تھی۔ اس نے اپنا ایک سوشل اسٹیٹس بنا رکھا تھا۔ اس کے اربوں کے کاروبار کو سنبھال رہی تھی۔ اب حالات کہہ رہے تھے کہ محبوب اسے سنبھالے۔
وہ مجبور ہو کر اس پر جھک گیا۔ وہ بے شک حسین اسمارٹ اور بہت ہی پرکشش تھی۔ ماڈلنگ کی دنیا میں دھوم مچا رکھی تھی۔ حالات نے کروٹ لی تھی۔ اب وہ محبوب کی زندگی میں دھوم مچانے والی تھی۔
وہ اسے آغوش میں لے کر تسلیاں دینے لگا۔

☆☆☆

محبوب کی سمجھ میں یہ اچھی طرح آ گیا تھا کہ ماروی بچپن سے مراد کی ہے۔ وہ بونا بن جائے، فنا ہو جائے، تب بھی اسی کے نام سے جیے گی۔ وہ اس پر مزید لاکھوں روپے لٹاتا رہے۔ اس کے لیے خون بہائے اور طرح طرح کی قربانیاں دیتا رہے۔ تب بھی اسے مراد کی جگہ نہیں دے گی۔ اسی بات پر وہ اپنی توہین محسوس کر رہا تھا۔ اس کے خلاف انتقاماً بہت کچھ کر سکتا تھا اور کرنے والا تھا لیکن اس کی فطری شرافت اور اعلیٰ ظرفی اسے روک رہی تھی۔
مراد بونا بن کر آیا تھا تاکہ کوئی اسے عالی جناب کا قاتل مراد علی منگی نہ سمجھے۔ محبوب اس کے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا۔ یہ راز انٹیلی جنس کے حماد صدیقی کو بتا سکتا تھا۔ مراد کو قانونی گرفت میں پہنچا کر اسے ماروی سے دور کر سکتا تھا۔

اگرچہ یہ ثابت نہ ہوتا کہ وہ بونا ہی مراد علی منگی ہے اور عدالت یہ تسلیم نہ کرتی کہ اسے جادو کے ذریعے بونا بنا دیا گیا ہے۔ تاہم جتنے عرصے تک مقدمے کو طول دیا جاتا اتنے عرصے تک ماروی پھر اپنے یار سے دور ہو جاتی لیکن محبوب پر خدا کی رحمت تھی۔ وہ نیکی اور شرافت سے باز نہیں آ سکتا تھا۔
ماروی کی صاف گوئی نے اور نکاح سے انکار نے اسے بہت تکلیف پہنچائی تھی لیکن اب تک اس کے مزاج کے مطابق یہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ماروی کو نقصان پہنچانے والا قدم نہیں اٹھائے گا۔
ہاں۔ اب بھی ایک امید اس کے اندر روشن تھی۔ یہ نظر آ رہا تھا کہ وہ بونے سے لاکھ محبت کرے لیکن اس کے ساتھ میاں بیوی والی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ اُمید کہہ رہی تھی، جب ناکامی ہوگی تو بونا مراد بھی نادم ہوگا۔ یہ بڑی خوش گوار اور حوصلہ افزا اُمید تھی۔ ایسا ہو سکتا تھا۔ بلکہ ایسا ہی ہونے والا تھا۔
وہ اس امید کے سہارے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ماروی اور مراد آئندہ کیسی زندگی گزاریں گے۔ صرف وہی نہیں سمیرا اور معروف بھی یہ تماشا دیکھنے کے منتظر تھے۔
اس نے سمیرا سے کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ معروف صاحب بھی ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ میری بہترین شریک حیات ثابت ہوتی رہو گی۔ میں بھی مانتا ہوں اور اب تو تمہاری عزت آبرو کا امین بن چکا ہوں، لیکن...''
وہ ذرا چپ ہوا۔ سمیرا نے پوچھا۔ ''لیکن......؟''
اس نے کہا۔ ''ابھی مجھ سے شادی کے لیے نہ کہنا۔ میں اس بات کی ضمانت دوں گا کہ تم میری بنو گی لیکن دوسری بیوی۔''
''تعجب ہے۔ کیا اب بھی آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ماروی آپ کی منکوحہ بنے گی؟''
''ہاں، وہ بونے کے ساتھ ازدواجی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ میری طرف لوٹ کر آئے گی۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔ تم میرا انتظار کرو گی۔''
''میں ماروی کے معاملے میں کسی بات پر اختلاف نہیں کروں گی۔ آپ زبان کے دھنی ہیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی لیکن ایک شرط پر...''
''میں تمہاری ہر معقول شرط کو مان لیا کروں گا۔''
''آپ نے چنگاری بھڑکا دی ہے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ ہم چوری چھپے ملتے رہیں گے۔''
اس نے سر جھکا لیا۔ اس کی شرط معقول بھی تھی اور

نامعقول بھی۔ معقول اس لیے کہ ایک کنواری کو چھیڑ دیا گیا تھا اس کے لیے ایک جیون ساتھی ضروری ہوگیا تھا لیکن وہ انتظار کرنے کو کہہ رہا تھا۔ یہ آگ ایسی ہوتی ہے کہ آگ لگانے والا ہی بجھاتا ہے اور وہ سامنے ہو تو انتظار نہیں ہوتا۔

اور ایک غلطی کرنے کے بعد اسے چھپائے رکھنے کے لیے آئندہ چھپ کر ملتے رہنا گویا ایک غلطی کے بعد غلطیاں کرتے ہی رہنا تھا۔ یہ بات تہذیب اور شرم وحیا کے منافی تھی۔

سمیرا نے کہا۔ ''ہم دین اور ایمان کے حوالے سے گناہ گار بنتے رہیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ رازداری سے مجھے منکوحہ بنالیں۔ آپ کی طرف آنے والی ماروی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ آپ مجھ سے شادی کرچکے ہیں۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''آپ اربوں روپے کے کاروبار میں مجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔ پلیز بھروسا کریں اور مجھ سے نکاح پڑھالیں۔ میں اپنے والدین کو بھی اتنی بڑی خوش خبری کی خبر نہیں ہونے دوں گی۔''

''میں تم پر بھروسا کرتا ہوں۔ تم بھی مجھ پر بھروسا کرو۔ صرف ایک ماہ تک صبر کرو۔ پھر جیسے بھی حالات ہوں گے، میں رازداری سے تمہیں دلہن بنالوں گا۔''

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ محبوب نے ننھی سی اسکرین کو دیکھا پھر خوش ہوکر سمیرا سے کہا۔ ''ماروی کال کر رہی ہے۔''

اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر بڑے ترنگ میں کہا۔ ''ہاں ماروی! بولو۔''

دوسری طرف سے بہت ہی سرد آواز سنائی دی۔ ''میں چاچی بول رہی ہوں۔''

وہ بجھ سا گیا۔ اس نے مایوس ہوکر سمیرا کو دیکھا۔ چاچی نے کہا۔ ''ہم نے کرائے کی کوٹھی دیکھ لی ہے، پیشگی رقم بھی ادا کردی ہے۔ کل یہاں سے جانے والے ہیں۔ تمہیں اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے۔''

''آپ ماروی سے بات کرائیں۔''

''تم جس طرح دھمکیاں دے کر گئے تھے۔ اس کے بعد اس سے بات کرنے کا کوئی رشتہ نہیں رہ جاتا۔ وہ تمہارے احسانات کا بدلہ چکا دے گی لیکن تم سے شادی نہیں کرے گی اور ہم زیادہ باتیں بھی نہیں کرنا چاہتے۔''

رابطہ ختم کردیا گیا۔ محبوب نے فون کو دیکھا پھر فوراً ہی اس کے نمبر پنچ کیے۔ فون کو... کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی پھر لائن کاٹ دی گئی۔ محبوب نے پھر

ہیرا اور کنکر

ایک قافلہ اندھیری سرنگ سے گزر رہا تھا کہ ان کے پیروں میں کنکریاں چبھیں۔ کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ پیچھے آنے والوں کو نہ چبھ جائیں، نیکی کی خاطر وہ کنکریاں اٹھا کر اپنے سامان میں رکھ لیں۔ کچھ نے زیادہ اٹھائیں، کچھ نے کم۔ جب وہ اندھیری سرنگ سے باہر آئے تو دیکھا ان کے پاس کنکریاں نہیں بلکہ ہیرے ہیں۔

جنہوں نے کم اٹھائیں، وہ پچھتائے کم کیوں اٹھائیں۔ جنہوں نے بالکل نہیں اٹھائیں، وہ بہت زیادہ پچھتائے۔ دنیا کی اس زندگی کی مثال بھی اسی اندھیری سرنگ کی طرح ہے اور نیکیاں یہاں کے ہیرے موتی ہیں۔ اس زندگی میں جو نیکی کی، وہ آخرت میں ہیرے جیسی قیمتی ہوگی اور انسان ترسے گا کہ اور زیادہ کیوں نہیں کی۔ سو نیکی چاہے کسی پیاسے کی پیاس بجھا دینا ہی کیوں، ہیرے جیسی قیمت رکھتی ہے۔

مرسلہ۔ محمد عثمان انصاری، نیوسینٹرل جیل ملتان

کیوپڈ

محبت کے اس دیوتا کو یونانی اور رومن کیوپڈ کہتے ہیں لیکن اس کا رومن نام زیادہ معروف ہوا۔

یہ ایفروڈائٹ کی آوارگیوں کا نتیجہ تھا اور اس کے مارس سے تعلقات کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اس لیے اسے محبت کا دیوتا تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ دیوتا اندھا تھا۔ اس کی تصویر ایک معصوم بچے کی برہنہ تصویر ہوتی ہے جس کے ساتھ ایک ترکش اور ہاتھ میں کمان بنائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے ترکش میں دو طرح کے تیر ہوتے تھے۔ ایک سنہرا دوسرا آہنی۔ ان تیروں سے کیوپڈ دیوی دیوتاؤں اور انسانوں کے سینوں کا نشانہ بنایا کرتا تھا۔ کیوپڈ کے سنہری تیروں کا نشانہ بننے والے اپنی محبت میں کامیاب ہوجاتے ہیں جبکہ لوہے کا نشانہ بننے والے ناکام رہتے ہیں۔ کیوپڈ سائیکی سے محبت کرتا تھا لیکن اس کے پاس صرف رات کو جایا کرتا تھا کیونکہ دن بھر ماں اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ اسے پندرہ اولمپئز دیوتاؤں کا آخری دیوتا تصور کیا جاتا ہے جبکہ بعض کا خیال ہے کہ اولمپئز کی تعداد بارہ تھی جبکہ باقی ان کے ماتحت دیوتا تھے اور ان کی طاقت وحیثیت اولمپئز کی نسبت بے حد کم تھی۔

مرسلہ۔ پرویز احمد۔ میانوالی

نمبر پنچ کیے۔ پھر لائن کاٹ دی گئی۔ ایسا تین بار ہوا۔ چوتھی بار ماروی کی آواز سنائی دی۔ ''آپ کیوں پریشان کر رہے ہیں؟''

''ایک بار مجھ سے بات تو کرلو۔ پھر چاہو تو کبھی نہ کرنا۔ ماروی...! ہم سب انسان ہیں۔ ہم سب سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ مجھ سے بھی کل بہت بڑی غلطی ہوگئی' میں نے غصے میں الٹی سیدھی باتیں کہہ دیں۔ خدا کا واسطہ دیتا ہوں۔ میرے تمام احسانات کو بھول جاؤ۔ میں ان کا صلہ نہیں چاہتا اور سچ کہتا ہوں' تمہاری مرضی کے بغیر تم سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ مراد تمہیں مبارک ہو۔ ماروی! مجھے کوئی صلہ نہ دو۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے منہ نہ پھیرو۔''

وہ اس سے سمجھوتا کرنے کے لیے' پھر سے اس کا دل جیتنے کے لیے بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس سے کہہ رہا تھا کہ اب اس کی طلب سے باز آرہا ہے۔

یعنی آئندہ اس کا طالب نہیں' صرف ایک اچھا دوست بن کر رہے گا۔ ایسے وقت دماغ میں یہ بات تھی کہ وہ مراد کے ساتھ کامیاب ازدواجی زندگی نہیں گزار سکے گی۔ لوٹ کر اسی کے پاس آئے گی۔ اس لیے پہلے جیسے تعلقات بحال کررہا تھا۔

اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا' تم مراد کے ساتھ کیسی زندگی گزارو گی؟ جیسی بھی گزارو گی میں ہمیشہ کی طرح کسی لالچ یا غرض کے بغیر تمہارے ساتھ رہوں گا۔''

''اب یہ ساتھ نہیں رہے گا۔ میں کوٹھی چھوڑ کر جارہی ہوں۔''

''بے شک جاؤ اور مراد کے ساتھ جہاں بھی رہو خوش رہو۔ کیا میری نیکیوں کا اتنا سا صلہ بھی نہیں دو گی کہ پہلے کی طرح مجھ پر اعتماد کرو اور دوستی رکھو؟''

بے شک وہ اپنے بہترین رویے سے متاثر کرتا تھا۔ وہ متاثر ہوکر بولی۔ ''آپ بہت اچھے ہیں۔ اپنی نیکیوں سے اور باتوں سے دل جیت لیتے ہیں۔'' وہ بڑی سچائی سے بولی۔ ''آپ میرے اپنوں سے زیادہ اپنے ہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں ہمیشہ کی طرح آپ کی عزت کرتی رہوں گی۔ جب آپ ملنا چاہیں گے ملوں گی' جب باتیں کرنا چاہیں گے' باتیں کروں گی۔''

''شکریہ۔ اس سے زیادہ تم سے اور کچھ نہیں چاہوں گا۔''

ماروی نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ ختم کردیا۔ پھر سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے مراد اور کیڈی کو دیکھ کر کہا۔ ''محبوب پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ وہ صحیح معنوں میں فرشتہ ہیں۔''

مراد نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''وہ تمہارے رقیب نہیں بنیں گے۔ ہماری شادی خانہ آبادی کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔ انہوں نے جو احسانات کیے ہیں اس کے عوض چاہتے ہیں کہ ہماری دوستی اور اپنائیت پہلے کی طرح برقرار رہے۔''

منی نے کہا۔ ''یعنی وہ پھر تمہارے قریب آتے جاتے رہنا چاہتے ہیں۔ کیا مصیبت ہے' کیا وہ کبھی پیچھا نہیں چھوڑیں گے؟ کیا ان کی نیت نہیں بدلے گی؟''

ماروی نے کہا۔ ''وہ بدنیت نہیں ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ انہوں نے مراد کی عدم موجودگی سے اور میری مجبوریوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایسے نیک انسان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ہمیں ان سے ناراض نہیں رہنا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں ان کی نیکی اور شرافت کو دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ ہم پہلے کی طرح ان سے اپنائیت رکھیں گے لیکن فی الحال اپنے نکاح .... میں انہیں شریک نہیں کریں گے۔ کیونکہ تمہارا نکاح مجھ سے پڑھایا جائے گا اور انہیں بتانا ہے کہ تم نے بونے مراد سے نکاح قبول کرلیا ہے۔''

منی نے کہا۔ ''ہاں۔ یہ نکاح رازداری سے ہوگا اور بعد نماز مغرب ہوگا۔ تمہارے چاچا قاضی صاحب کو لینے گئے ہیں۔ پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔''

ماروی نے جھکی جھکی نظروں سے مراد کو دیکھا۔ وہ ایک طویل انتظار کے بعد جرائم کی دلدل سے نکل کر آیا تھا۔ اب وہ ایک ہی چھت کے نیچے ایک دوسرے سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ تنہائی میں بہکنے والے تھے۔ اس سے پہلے نکاح پڑھالینا چاہتے تھے اور یہی دانش مندی تھی۔

چاچا قاضی صاحب کو لے آئے۔ پھولوں کے ہار اور مٹھائی بھی لے کر آئے تھے۔ منی نے ایک ہار ماروی کے گلے میں اور ایک مراد کے گلے میں ڈالا۔ قاضی صاحب نے نکاح نامے کی خانہ پری کی۔ پھر انہوں نے دونوں سے نکاح قبول کرالیا۔ نکاح چند منٹوں میں ہوگیا۔ اگر حساب کیا جائے تو وہ کئی صدیوں سے ٹھوکریں کھانے اور مایوس ہوتے رہنے کے بعد منزل مقصود تک پہنچے تھا۔

اس وقت مغرب کی اذان ہورہی تھی مراد' ماروی' منی اور عبداللہ کیڈی نے پہلی بار ایک ساتھ نماز قائم کی۔ اپنے معبود کا شکریہ ادا کیا۔ وہ سب موجودہ حالات سے مطمئن تھے۔ وہ معبود' وہ پاک پروردگار رفتہ رفتہ ان کی مشکلیں

آسان کر رہا تھا۔

ابھی آگے اور مسائل تھے۔ دشمن ختم نہیں ہوئے تھے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی اسے تلاش کر رہے تھے اور وہ تمام مخالفین ان کی ازدواجی زندگی کو منتشر کرنے والے تھے۔ ایک اللہ ہی تھا۔ ایک نماز ہی تھی جو مراد پر سایہ فگن رہنے والی تھی۔

اس نے نماز کے بعد ماسٹر کو بوبو کو خوش خبری سنائی۔ ''ماسٹر! میری مرادیں پوری ہوگئی ہیں۔ آج میں نے اپنی ماروی کو اپنی دلہن بنالیا ہے۔''

وہ بولا۔ ''مبارک ہو۔ تمہاری ہر خوشی میری خوشی ہے۔ میں تم دونوں کی سلامتی چاہتا ہوں۔''

پھر اس نے سمجھایا۔ ''مراد! تم پاکستان میں بونے مراد کا کھیل ہمیشہ نہیں کھیل سکو گے۔ اپنی محبت کو پالینے کی خوشی میں دشمنوں کو نہ بھولو۔ تمہیں وہاں زیادہ دنوں تک نہیں رہنا چاہیے۔''

''میں مانتا ہوں۔ زیادہ دنوں تک بونے مراد کے پیچھے چھپ کر نہیں رہ سکوں گا۔ یہاں آستین کے سانپ ہوسکتے ہیں۔ مگر کیا کروں؟ مجھے اپنے وطن کی مٹی سے پیار ہے۔ میں کسی بھی طرح یہاں رہنا چاہتا ہوں۔''

''وہاں ضرور رہو لیکن حالات سے باخبر رہ کر جگہ بدلتے رہو۔ تم میاں بیوی کو ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جانا چاہیے۔ اپنی ماروی کو ایک محدود ماحول سے نکالو۔ میں تین ٹکٹیں بھیج رہا ہوں۔ پہلے وہاں سے لندن جاؤ۔ عبداللہ کبڈی کو لندن میں چھوڑ کر شریک حیات کے ساتھ سوئٹزرلینڈ جاؤ۔''

وہ ان کے ہنی مون کے لیے پروگرام بنا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''وہاں کے سیون اسٹار ہوٹل میں تمہارے لیے ایک سویٹ بک رہے گا۔ اپنی ماروی کو دنیا دکھاؤ۔ دوسرے ملکوں میں بھی جاؤ' پھر جب چاہو' پاکستان جاتے رہا کرو۔''

''او کے ماسٹر! میں دو چار دنوں میں یہاں سے نکل جانا چاہوں گا۔ لندن کے لیے یہاں سیٹیں کنفرم کرالوں گا۔ آپ وہاں سے سوئٹزرلینڈ کے لیے انتظامات کریں۔''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ منی نے کہا۔ ''یہ اچھا ہے' تم کچھ عرصے کے لیے ماروی کو یہاں سے لے جاؤ۔''

چاچا نے کہا۔ ''ہم نے بہت مہنگی کوٹھی کرائے پر لی ہے۔ یہ دونوں چلے جائیں گے تو کیا ہم اکیلے رہیں گے؟''

منی نے اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہا۔ ''تم وہاں اکیلے میں نہ ڈرنا۔ میں رہوں گی نا۔''

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ماروی نے شہزاد کو پیار کیا پھر اسے مراد کی گود میں دے کر کہا۔ ''یہ میرے لیے لکی ہے، بیٹے کے آتے ہی اس کا باپ بھی میری زندگی میں آگیا۔ میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گی۔''

منی نے کہا۔ ''نہیں بیٹی! ابھی نئی زندگی شروع کر رہی ہو۔ بیٹے کو کچھ دنوں کے لیے بھول جاؤ۔ یہ میرے پاس رہے گا۔''

مراد نے چاچی کی تائید کی۔ منی وہاں سے اٹھ کر بولی۔ ''میں محبوب کو شادی خانہ آبادی کی اطلاع دینے جا رہی ہوں۔''

اس نے کن انکھیوں سے مراد کو دیکھا پھر وہاں سے جانے لگی۔ وہ بھی شہزاد کو چاچی کے حوالے کرکے اس کے پیچھے بیڈ روم میں آگیا۔ وہ فون اٹھا کر نمبر پنچ کرنا چاہتی تھی۔ مراد نے فون کو چھین کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر اسے کھینچ کر بازوؤں میں بھر کر بولا۔ ''پہلے سہاگ رات...''

کتنے طویل اور تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ رات آئی تھی۔ اور کتنی عجیب سی بات تھی کہ یہ طویل سفر زیادہ تر ایک رقیب کے سائے میں کرتی رہی تھی۔

دیکھا جائے تو اس رقیب کی مہربانیوں نے اور دیانت داری نے اسے عزت آبرو کے ساتھ مراد کی آغوش میں پہنچایا تھا۔

وہ ایک انار اور دو بیمار کا قصہ ختم ہوچکا تھا۔ ماروی ازدواجی مسرتوں کی ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اب ایک سہاگن ماروی کی زندگی نئے ہنگاموں سے گزرنے والی تھی۔

☆☆☆

سمیرا صبح اپنے گھر گئی تھی لیکن دل محبوب کی طرف لگا ہوا تھا۔ اس کی خدمت گزاری کے بہانے اس کے قریب رہنا چاہتی تھی۔ محبوب کو کھانے میں مچھلیاں اور جھینگے پسند تھے۔ وہ اپنی ماں سے پکوا کر اس کے لیے رات کا کھانا لے آئی۔

شام کے سات بجے تھے اس نے وقت اور موسم کی مناسبت سے بہت ہی دیدہ زیب لباس زیب تن کیا تھا۔ یوں بھی وہ ماڈلنگ کی دنیا میں ملبوسات کی شہزادی کہلاتی تھی۔

محبوب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہت خوب صورت لگ رہی ہو تمہیں دل میں گھسنے کا ہنر آتا ہے۔''

وہ قریب ہوکر اس کے بازوؤں میں گھس گئی۔ ایک باس اور پرسنل سیکریٹری کا فاصلہ ختم ہوچکا تھا۔ محبوب کی

سنجیدگی اور محتاط رہنے والی عادت ہوا ہو گئی تھی۔

سمیرا واقعی ہوا کا رخ بدلنا جانتی تھی۔

فون سے ابھرنے والی رنگ ٹون نے محبوب کا رخ بدل دیا۔ ننھی سی اسکرین ماروی کا نام لے رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی اسے اٹھا کر کان سے لگانا چاہا تو سمیرا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر مسکرا کر وائڈ اسپیکر کو آن کر دیا۔

اب وہ محبوب کے ایسے معاملات میں مداخلت کی حق دار ... ہو گئی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا تو مایوسی ہوئی۔ چاچی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''محبوب میاں! ایک خوش خبری سنا رہی ہوں۔ امید ہے آپ سن کر خوش ہوں گے۔''

وہ بولا۔ ''خوش خبری سبھی کو خوش کرتی ہے۔ آپ خوش کرنا چاہتی ہیں تو ماروی سے بات کرائیں۔''

''وہ پرائی ہو چکی ہے۔''

''میں نہیں سمجھا۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''لڑکیاں دلہن بن کر پرائی ہو جاتی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے مراد سے اس کا نکاح پڑھا دیا ہے۔''

محبوب کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ اس نے سمیرا کو دیکھا۔ وہ سن رہی تھی اور فون کو تک رہی تھی۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ آخر ہونے والی سوکن اپنے ٹھکانے لگ گئی تھی۔

محبوب نے پوچھا۔ ''کیا واقعی...؟''

''کیا تمہیں یقین نہیں ہو رہا ہے؟''

''ہاں۔ یا۔ یا۔ یقین کیوں نہیں ہوگا...''

وہ اٹک اٹک کر بولا۔ ''لیکن۔ یہ... اچانک اتنی جلدی......؟ میرا مطلب ہے.... مجھے تو نکاح میں شریک کرنا چاہیے تھا۔ چا۔ چی... میں کوئی دشمن تو نہیں ہوں۔''

منی نے کہا۔ ''دشمن نہیں ہو لیکن مراد کے رقیب رہ چکے ہو۔ پچھلی بار تلخیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کی عدم موجودگی میں یہ کام ہو جائے۔''

محبوب نے سختی سے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''وہ بادلی بچپن سے اسی کی تھی۔ میں ابھی اسے دلہا کے پاس سہاگ کی سیج پر پہنچا کر آئی ہوں۔''

وہ یکبارگی انگاروں کی سیج پر پہنچ گیا۔ سمیرا کے پاس چپ چاپ پہلو بدلنے لگا۔ چاچی نے کہا۔ ''فون میرے پاس ہے۔ وہ کل صبح بات کر سکے گی۔''

محبوب نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس نے فون کو اتنی سختی سے مٹھی میں جکڑا تھا جیسے وہ مراد کی گردن ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے غصے سے پھینکتا۔ سمیرا نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر اس سے لگ کر بولی۔ ''آپ آرام سے بیٹھیں، کچھ نہیں ہوا ہے۔''

وہ اس کے شانے پر سر رکھ کر بولی۔ ''ابھی ایک ایسی بات کہوں گی کہ آپ یہ صدمہ بھول جائیں گے۔''

''یہ صدمہ تو کبھی دل سے نہیں جائے گا۔''

''جائے گا... آپ غصے سے نہیں' عقل سے سوچیں' یہ ان کی شادی نہیں ہوئی ہے۔''

وہ اسے شانے سے الگ کرتے ہوئے تعجب سے بولا۔ ''شادی نہیں ہوئی ہے...؟ یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''یہ سمجھنے کی بات ہے۔ آپ سمجھیں۔ مراد سے ماروی کے عشق کا یہ آخری سین ہے۔ وہ صبح سے پہلے ہونے کو سہاگ کی سیج سے نیچے پھینک دے گی۔''

جیسے ڈوبنے والے کو سہارا مل گیا۔ اس نے چونک کر سمیرا کو دیکھا۔ پھر خوشی سے چیخ پڑا۔ اسے آغوش میں بھر کر بولا۔ ''واہ... ! کیا بات کہہ دی ہے تم نے... میں غصے میں بھول گیا تھا کہ وہ بونا ہے۔ بونا...''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''کل صبح ہی اس مضحکہ خیز شادی کا نتیجہ سب کے سامنے ہوگا۔''

وہ دل کھول کر ہنسنے لگا۔ سمیرا کو بھینچ کر پیار کرنے لگا۔

''تم بہت اچھی ہو۔ میرے مزاج کو گہرائیوں تک سمجھتی ہو۔''

وہ اسے ایسے چوم رہا تھا' جیسے آغوش میں ماروی آ گئی ہو۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم میری بہترین شریک حیات ثابت ہو گی۔ ذرا صبر کرو۔ کل دیکھتے ہیں' کیا تماشا ہوگا؟''

''جو کہہ رہی ہوں' وہی ہوگا۔''

وہ اسے جکڑ کر بولا۔ ''ایک بار وہ پلٹ کر میرے پاس آ جائے۔ میری دیوانگی کو سکون حاصل ہو جائے۔ اور۔ اور میرا جنون تھم جائے۔ پھر...''

اس نے پوچھا۔ ''پھر...؟''

''اس کے بعد وہ گھر میں عام بیوی کی طرح پڑی رہے گی۔ تم اونچی سوسائٹی میں میرے شانہ بشانہ رہا کرو گی۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''اور ایک مشورہ دوں؟''

''ہاں، بولو؟''

''ابھی فون پر منی چاچی کو مبارک باد دیں۔ ماروی کی شادی پر خوشی کا اظہار کریں۔ ان سے بولیں کہ کل صبح آپ میاں بیوی کے لیے تحفے لے کر آئیں گے۔''

وہ انکار میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی وہ بولی۔ ''اس طرح آپ کل ماروی کو روبرو دیکھ کر اس کے

چہرے سے اور اس کے لہجے سے معلوم کرسکیں گے کہ بونے مراد کے ساتھ اس کی سہاگ رات کیسی گزری ہے؟"

وہ پھر ایک بار خوشی سے بل گیا۔ کل ماروی کو دیکھ سکے گا۔ وہ اسے چوم کر بولا۔ "واہ کیا بات ہے سمیرا... !تم نے بہت اچھا مشورہ دیا ہے۔ میں تحفہ پیش کرنے کے بہانے جاؤں گا اور اسے قریب سے پرکھ سکوں گا۔"

اس نے چاچی کو فون پر مخاطب کیا پھر کہا۔ "معافی چاہتا ہوں، لائن کٹ گئی تھی۔ پوری بات نہ کہہ سکا۔ میں ماروی کی خوشی میں خوش ہوں۔ کل صبح دونوں میاں بیوی کو مبارکباد دینے اور تحفے پیش کرنے آؤں گا اور انہیں دل سے دعائیں دوں گا۔"

منی نے کہا۔ "آپ آئیں، ہمیں خوشی ہوگی لیکن ماروی اب آپ سے تحفے کے نام پر کوئی چیز نہیں لے گی۔ آپ اس کے لیے صرف ایک پھول لے آئیں... اوہو... یہ شہزاد پریشان کررہا ہے۔ میں فون بند کررہی ہوں۔"

رابطہ ختم ہوگیا۔ منی چاچی کا انداز ایسا ہی تھا جیسے پیچھا چھڑا کر گئی ہو۔ محبوب اتنا خوش تھا کہ اس نے مائنڈ نہیں کیا۔ سمیرا نے کہا۔ "چلیں، سستے چھوٹ رہے ہیں۔ وہ تحفے کے طور پر صرف پھول قبول کرے گی۔ میں چاہتی ہوں' آپ اسے گلاب کی ایک کلی پیش کریں۔"

"وہ اب کلی کہاں رہی ہے کہ اسے کلی پیش کروں گا۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔ "آپ اس کے ہاتھ میں کلی دیں گے۔ وہ کلی زبان بے زبانی سے پوچھے گی کہ اس بونے کی سیج پر پھول بن چکی ہو یا ابھی تک کلی ہو۔"

وہ ہنستے ہوئے سمیرا کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "واہ تم نے اشاروں میں کہنے والی کیا بات کی ہے۔ میں اسے گلاب کی سرخ کلی پیش کروں گا۔"

کال بیل کی آواز سنائی دی۔ سمیرا اس سے الگ ہوکر دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ محبوب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ معروف جنجی آیا تھا۔ وہ اندر آنے سے پہلے ذرا ٹھٹک گیا۔ اس نے ایک نظر محبوب پر ڈالی۔ پھر دور بیٹھی ہوئی سمیرا کو دیکھا۔ محبوب نے پوچھا۔ "آپ رک کیوں گئے؟ اندر آئیں۔"

وہ بولا۔ "میں تو اندر آؤں گا لیکن تم پہلے اپنے کمرے میں جاؤ اور آئینہ دیکھو۔"

اس نے اپنے آپ کو ٹٹولنے والے انداز میں ادھر ادھر سے چھو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے معروف صاحب؟"

"میں نے کہا نا۔ کمرے میں جاؤ۔ معلوم ہوجائے گا۔"

وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ سمیرا خود کو چھوٹے آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کی لالی درست کررہی تھی۔ اس نے سلام کرتے ہوئے کہا۔ "آج سنڈے ہے۔ پھر بھی چلی آئی۔ محبوب صاحب سے چیک پر دستخط لینے تھے۔"

وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تم صفائی کیوں پیش کررہی ہو؟ کیا میں نے یہاں آنے کی وجہ پوچھی ہے؟ ہم تم دن رات کسی وقت بھی محبوب سے ملتے رہتے ہیں۔"

پھر وہ اس کی طرف جھک کر بولا۔ "یہ میرے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ تم نے اسے جیت لیا ہے۔ اب وہ بزنس کی طرف پوری توجہ دے گا۔ تم اسے بہت ایزیلی ہینڈل کرسکو گی۔ چلو صاف صاف بولو۔ کہاں تک پہنچی ہو؟"

وہ اسے بتانے لگی۔ محبوب نے کمرے میں آکر آئینے میں خود کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ معروف کے سامنے بھید کھل گیا ہے۔ سمیرا کے لبوں کی لپ اسٹک اس کے ہونٹوں پر منتقل ہوگئی تھی اور شرٹ کے سینے پر بھی سرخ دھبے تھے۔ سمیرا کے سر کے دو بال شرٹ کے بٹن سے الجھ کر وہیں رہ گئے تھے۔

اس نے آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا مصیبت ہے۔ میں معروف صاحب سے چھپانا چاہتا تھا۔ وہ تو کب سے چاہتے ہیں کہ میں سمیرا کو شریک حیات بنالوں۔ اب وہ میرے پیچھے پڑ جائیں گے اور میں اتنی جلدی اس سے شادی نہیں کروں گا۔ ہر حال میں اس بے وفا کا انتظار کروں گا۔"

اس نے واش روم میں آکر منہ کو اچھی طرح دھویا پھر شرٹ تبدیل کرکے ڈرائنگ روم میں آگیا۔ معروف نے کہا۔ "محبوب! آج تم نے اس بوڑھے کو بہت بڑی خوشی دی ہے۔"

محبوب نے ایک گہری سانس لی۔ بھید کھل چکا تھا۔ معروف کہہ رہا تھا۔ "تم دانائی کی طرف آرہے ہو۔ نادانی کو تھوک دو محبوب! تم نے ایک طویل عرصے تک نیکیاں کرکے دیکھ لیں۔ وہ شروع سے بے وفا تھی۔ بے وفا ہے اور بے وفا رہے گی۔"

وہ ماروی کے خلاف ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا تھا لیکن مجبوراً خاموش تھا۔ معروف نے کہا۔ "ابھی سمیرا نے بتایا ہے۔ کل تم... سے نکاح نہ قبول کرنے والی نے آج اس بونے مراد سے نکاح قبول کیا ہے۔ وہ کھل کر تمہاری انسلٹ کررہی ہے۔ تمہارے تمام احسانات اور نیکیوں کو مٹی دھول کررہی ہے۔"

اس نے سمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے

سامنے بیٹھی ہے، تم دیکھو گے کہ یہ کس طرح بزنس ہینڈل کرے گی اور منافع کے گراف کو اوپر لے جائے گی۔ اب تم نے صحیح معنوں میں اپنی ذہنی سطح پر، تعلیمی سطح پر اور اونچی سماجی سطح پر آ کر سمیرا کا ہاتھ تھاما ہے۔ میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا ہے۔"

وہ بولا۔ "معروف صاحب! میں ہمیشہ سے مانتا آرہا ہوں کہ آپ اور سمیرا دن رات میری بھلائی کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ لیکن میں سمیرا کو جلدی شریک حیات نہیں بنا سکوں گا۔"

"مجھے سمیرا نے بتایا ہے کہ تم کیا چاہتے ہو۔ بے شک اپنے جنون کو سرد کرنے کے لیے ماروی کو ضرور حاصل کرو۔ خدا کرے' بونے سے اس کی شادی ناکام رہے اور وہ تمہاری طرف لوٹ آئے۔ سمیرا کو اس کی سوکن بننے پر اعتراض نہیں ہے۔"

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "میرا دعویٰ ہے' آئندہ تم خود ہی دیکھو گے کہ سمیرا کے مقابلے میں ماروی ایک ناکام شریک حیات ثابت ہوگی۔"

سمیرا نے کہا۔ معروف صاحب! کل ہم بھی ماروی کو مبارک باد دینے جائیں گے۔"

ان تینوں کے دلوں میں کھلبلی سی تھی۔ آنے والا دن بڑی دلچسپیاں لانے والا تھا۔

☆☆☆

وہ بچپن کی آرزو تھی اور برسوں کی تمنا تھی۔ اسے پا کر وہ اپنی قسمت پر فخر کرتا رہا۔ ساری رات سو نہ سکا۔ ماروی اس کے سینے سے لگ کر سو گئی تھی۔ تب یکلخت مرینہ یاد آئی۔ یہ عجیب سی بات تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ماروی کی موجودگی میں وہ کیوں یاد آرہی ہے؟

اس نے سینے سے لگ کر سونے والی کو دیکھا۔ تب یہ فرق سمجھ میں آیا کہ مرینہ تھک ہار کر سونا نہیں جانتی تھی۔ جاگتی تھی اور ہمیشہ ایکشن میں رہنے والی بڑی دلچسپیاں پیدا کرتے ہوئے جگاتی رہتی تھی۔ اس نے جلد ہی اسے ذہن سے نکال دیا۔ خوابیدہ ماروی کو دیکھتے دیکھتے سو گیا۔ دوسری صبح وہ دونوں خوش تھے۔ مراد نے لاشعوری طور پر کوئی کمی محسوس کی تھی لیکن اسے شعوری طور پر سمجھ نہیں پایا تھا۔

صبح میں انہوں نے چاچی اور چاچا کو سلام کیا۔ ان سے دعائیں لیں' عبداللہ کبڈی نے مراد سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب پوزیشن تبدیل کرو، میں ماروی کے ساتھ رہوں گا۔ محبوب وغیرہ کسی وقت بھی آنے والے ہیں۔"

مراد نے کہا۔ "میں باہر جا رہا ہوں۔ کل کسی فلائٹ میں سیٹیں حاصل کروں گا، کچھ ضروری شاپنگ کروں گا۔ مجھے ذرا دیر ہوگی۔ دوپہر تک واپس آؤں گا۔"

ماروی نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میرے اکاؤنٹ میں ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے ہیں، تم انڈیا سے جو بھیجتے رہے' وہی بینک میں پڑے ہیں۔"

وہ بولا۔ "پڑے رہنے دو اور رقم آجائے گی۔ ہم جونہی مون کے لیے جا رہے ہیں' اس کے تمام اخراجات ماسٹر برداشت کرے گا۔ میرا ارادہ ہے' یہاں واپس آ کر کوئی کاروبار شروع کروں گا۔"

کاروبار نہ اس نے کبھی کیا تھا اور نہ کر سکتا تھا۔ محض سماجی زندگی گزارنے کے لیے اپنی ذات پر ایک بزنس مین کا لیبل لگانا چاہتا تھا۔ حقیقتاً اسے کبھی دشمنوں سے نجات مل ہی نہیں سکتی تھی۔

کاروبار میں مشینیں چلتی رہیں تو دولت آتی رہتی ہے وہ گن چلاتا رہتا تو اس کا بینک اکاؤنٹ ہمیشہ کی طرح بڑھتا ہی چلا جاتا۔

مراد نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے ماروی کو پیار سے دیکھا پھر ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ ماروی اور منی ڈرائنگ روم میں آگئیں۔ عبداللہ کبڈی نے کہا۔ "میں لباس چینج کرنے جا رہا ہوں۔ ابھی مجھے دُلہے کی شان سے رہنا چاہیے۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ وہ چلا گیا۔ منی نے ماروی کو بڑی محبت سے دیکھا پھر پوچھا۔ "بیٹی! خوش تو ہونا؟"

وہ چاچی کے گلے لگ کر بولی۔ "میں بیان نہیں کر سکتی کہ کتنی خوش ہوں۔ انتظار کرتے کرتے کتنے زمانے گزر گئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جہنم سے سزائیں پانے کے بعد جنت میں آگئی ہوں۔ اب تو مراد کو کہیں جانے نہیں دوں گی۔"

"خدا نہ کرے وہ تمہیں چھوڑ کر اب کہیں جائے۔ ہم سب ساتھ رہا کریں گے۔"

مراد کی قربت سے دل نہیں بھرا تھا۔ وہ اسے تصور میں دیکھ رہی تھی اور وہ ڈرائیو کرتا ہوا سوچ رہا تھا۔ "میری ماروی مجھے مل ہی گئی۔ اس پہلی رات تک پہنچنے کے لیے میں گن اٹھانے پر مجبور ہو گیا۔ آئے دن آگ اور خون کے دریا سے گزرتا رہا۔ عشق کے مراحل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ آزمائشوں سے گزرتے رہنا پڑتا ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ اچانک ہی ونڈ اسکرین پر مرینہ انگڑائی لینے لگی۔ وہ پتا نہیں کیوں اچانک خیالوں میں آنے لگی تھی۔

اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ پچھلی رات اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ اب سمجھ میں آیا کہ ماروی کی سیج پر مرینہ کیوں یاد آئی تھی؟

ماروی کی سادگی اور مرینہ کی ہنگامہ خیزی کا فرق معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دھوپ تھی اور یہ چھاؤں۔۔۔ ماروی سیدھی سادی دھیمی سی تھی۔ اسی سیج پر مرینہ آندھی بن کر اُڑا لے جاتی تھی۔ وہ ماروی سے مطمئن تھا۔ آسودہ تھا۔ لیکن موسمِ سرما میں انگاروں سے نہیں شعلوں سے حرارت ملتی ہے۔

وہ سوچنے لگا۔ ''میری ماروی ایک سیدھی سی گھر گرہستی والی لڑکی ہے۔ میں اسے رفتہ رفتہ شعلہ بننا سکھاتا رہوں گا۔''

اس نے ذہن سے مرینہ کو جھٹک دیا۔ وہ ونڈ اسکرین سے غائب ہوگئی۔ فی الحال کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

محبوب، سمیرا اور معروف ٹھیک دس بجے آگئے۔ چاچا اور چاچی نے ان کا استقبال کیا۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں سرخ گلاب کی دو دو کلیاں تھیں۔

معروف نے متی اور چاچا جمرو سے شکایت کی۔ ''ہم آپ کے اپنے ہی ہیں۔ ایک ذرا سی رنجش پیدا ہوگئی تھی اور آپ نے اسے دل پر لے لیا۔ ہمیں ماروی کی خوشی میں نہیں بلایا۔''

متی نے محبوب کو دیکھ کر کہا۔ ''یہ بات نامناسب ہوتی کہ ماروی نے جس کے ساتھ نکاح سے انکار کیا' اسے اور اس کے عزیزوں کو اپنے نکاح میں بلایا جائے۔ ہم نے بعد میں اطلاع دی۔ یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ مبارک باد دینے آئے ہیں۔''

عبداللہ کبڈی ڈرائنگ روم کے دروازے پر آیا اور دولہے کی شان سے آیا۔ اس نے ریشمی کڑھائی کی ہوئی قمیص اور چست پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں گلاب کے پھولوں کا ہار تھا۔ کلائیوں میں موتیوں کا گجرا خوشبو دے رہا تھا۔

اسے دیکھنے والے یہ سوچ کر آئے تھے کہ ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح اس کا سر جھکا ہوا ہوگا لیکن وہ ان کی توقع کے خلاف سینہ تان کر فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا آیا اور سلام کرتے ہوئے ان سے مصافحہ کرنے لگا۔ وہ تینوں حیران تھے اور اسے گلاب کی ایک ایک سرخ کلی پیش کرتے ہوئے مبارک باد دے رہے تھے۔ اسے بڑی توجہ سے دیکھتے بھی جا رہے تھے۔

دیکھنا کیا تھا؟ اس کا انداز ایسا تھا کہ ابھی میدان مار کر آ رہا ہو۔ چہک چہک کر بول رہا تھا۔ ''خدا کا شکر ہے، میں نے برسوں تک ترستے رہنے کے بعد اپنی ماروی کو دلہن بنا ہی لیا۔ میرے جیسا خوش نصیب کوئی نہ ہوگا۔''

سمیرا کا دل نہیں مان رہا تھا۔ اس نے بیڈ روم کی سمت جانے والے دروازے کو دیکھتے ہوئے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ ''ماروی کہاں ہے؟''

''میرے بیٹے کو سنبھال رہی ہے۔''

سمیرا نے مسکرا کر محبوب کو دیکھا۔ متی نے اٹھ کر کہا۔ ''میں جا کر شہزاد کو سنبھالتی ہوں۔ ماروی کو ابھی بھیجتی ہوں۔''

اس کے جانے کے بعد محبوب نے طنزیہ انداز میں کبڈی کو دیکھا پھر کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے' ماروی کا بیڈ بہت اونچا ہے۔ تم اس پر چڑھ جاتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں نے جمناسٹک کے کرتب سیکھے ہیں۔ فضا میں قلابازی کھا کر بیڈ پر پہنچ گیا تھا۔''

محبوب نے کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے جمناسٹک کے کرتب بھی سیکھ لیے ہیں۔''

''ابھی یقین دلاتا ہوں۔ سانچ کو آنچ کیا ہے یہ لو۔''

اس نے پنجوں کے بل اچھلتے ہوئے ''ہا۔ ہپ ہپ'' کی آواز نکالی پھر فضا میں اچھل کر محبوب کے سر پر سے گزرتا ہوا دوسری طرف پہنچ کر فرش پر کھڑا ہو گیا۔

تینوں نے حیرانی سے گھوم کر اسے دیکھا۔ ایسی قلابازی' ایسی چھلانگ انہوں نے کبھی فلموں میں دیکھی تھی۔

وہ پنجوں کے بل اچھل رہا تھا۔ اس نے پھر اسی طرح کی آواز نکالی۔ فضا میں اچھل کر وہی تماشا دکھایا۔ محبوب کے سر پر سے گزرتا ہوا اپنی پہلی جگہ واپس آ کر کھڑا ہوگیا۔ داد وصول کرنے کے انداز میں انہیں دیکھنے لگا۔

پھر وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''سائیں! جب میں ضد میں آ کر بندوق اٹھا کر خطرناک مجرموں کے پسینے چھڑا دیتا ہوں تو یہ جمناسٹک کیا چیز ہے؟ آدمی کو جتنا ہنر آئے' اتنا ہی اچھا ہے۔ میں تو جوڈو کراٹے اور تلوار بازی بھی سیکھ رہا ہوں۔''

وہ تینوں اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ کبڈی ہنستے ہوئے اچھل کر ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''کیا بتاؤں' ماروی کتنی حیران ہو رہی تھی۔ سچ کہتا ہوں۔۔۔'' وہ اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ایسی جمناسٹک والی رات اس دنیا کی کسی دلہن نے نہیں منائی ہوگی۔ وہ بہت

خوش تھی۔ ہنستی کھلکھلاتی رہی تھی۔''

محبوب سن رہا تھا کہ ماروی خوش ہے۔ یہ خبر اسے مایوس کررہی تھی۔ اسی وقت کیڈی کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں بولو ایمان علی! کہاں ہو؟ کیا ٹکٹیں ہوگئیں؟''

اس نے دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ ''اچھا ہے پہلے ہم لندن جائیں گے پھر سوئٹزرلینڈ...''

وہ فون پر بول رہا تھا۔ معروف محبوب کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ ''تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ماروی اس کے ساتھ خوش ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ بونا ڈینگیں مار رہا ہے۔''

اسی وقت وہ آگئی۔ اس نے گوری رنگت پر گہرے رنگ کا لباس پہنا تھا۔ چہرے کی شادابی کہہ رہی تھی کہ وہ کلی سے پھول بن گئی ہے۔ اس نے مسکرا کر انہیں سلام کیا۔ پھر آگے بڑھ کر سمیرا کے گلے لگ گئی۔ سمیرا نے اس کے کان میں کہا۔ ''میرے اندر ہلچل سی مچی ہے۔ پلیز اکیلے میں کچھ باتیں کرلو۔''

ماروی نے مسکرا کر کہا۔ ''اُدھر دروازے کی طرف چلو۔''

وہ دونوں وہاں سے ذرا دور ڈرائنگ روم کے دوسرے دروازے کے پاس آگئیں۔ سمیرا نے سرگوشی میں کہا۔ ''مائنڈ نہ کرو تو ایک بات کہوں گی۔''

وہ بولی۔ ''میں بہت خوش ہوں۔ جو بولنا چاہتی ہو، بولو۔''

اس نے کہا۔ ''میں سوچ رہی تھی' ایک بونے کے ساتھ تمہاری سہاگ رات ناکام رہے گی۔''

ماروی گلے لگ کر بولی۔ ''ناکامی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مجھے صرف ایک مراد ہی نہیں ملا ہے۔ گن گن کر من کی مرادیں بھی ملی ہیں۔''

وہ بے یقینی سے پھر کان میں بولی۔ ''ماروی...! وہ آدھے سے بھی آدھا ہوگیا ہے۔ پوری خوشیاں کیسے مل سکتی ہیں؟''

وہ بھی اس کے کان میں بولی۔ ''یقین کرو' سہاگ رات کے کسی ایک پل میں بھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ بونا ہوگیا ہے۔ جیسے پہاڑ تھا، ویسا ہی لگ رہا تھا۔''

وہ حیرانی سے' بے یقینی سے منہ کھول کر اسے دیکھنے لگی۔ ماروی یقین نہ کرنے والی بات کررہی تھی۔

وہ مسکراتی ہوئی' اس سے الگ ہوکر کیڈی کے پاس گئی۔ پھر صوفے پر اس سے لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ بولا۔ ''ابھی ایمان نے فون کیا ہے۔ کل صبح دس بجے لندن کی فلائٹ ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا، ہم ہنی مون سوئٹزرلینڈ میں منائیں گے۔''

''ہاں مگر ایمان علی کے ڈیڈی ہم میاں بیوی کو اپنے گھر انوائٹ کررہے ہیں۔ ہم وہاں ایک دن رہ کر دوسرے دن سوئٹزرلینڈ چلے جائیں گے۔''

وہ تینوں ان کی باتیں سن رہے تھے اور ماروی کا مسرتوں سے کھلا ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اس کی سچی مسرتوں کا یقین اس طرح بھی ہورہا تھا کہ وہ ہنی مون کے لیے جانے والی تھی۔

چاچا کھانے کی ٹرالی ان کے سامنے لے آیا۔ معروف نے کہا۔ ''یہ کوئی کھانے کا وقت نہیں ہے۔''

ماروی اٹھ کر ٹرالی کے پاس آئی۔ مٹھائی کی پلیٹ اٹھا کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''کھانے کا وقت نہ سہی' میری شادی کی خوشی میں منہ تو میٹھا کریں۔''

محبوب نے اسے حیرت اور حسرت سے دیکھا۔ وہ اپنی شادی کی مٹھائی کھلانا چاہتا تھا۔ اس کی ہونے والی دلہن پرائی ہوکر اسے اپنی..... ازدواجی زندگی کی مٹھائی پیش کررہی تھی۔

وہ اخلاقاً انکار نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے بہت مجبور ہوکر مٹھائی کا ایک پیس اٹھاتے ہوئے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ ان لمحات میں اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا..... یہ کیسے ہوگیا...؟

''گیند کی طرح فضا میں اُڑتے اور قلابازی کھانے والے نے چھکا کیسے مارا ہے...؟''

وہ تماشا دیکھنے آیا تھا۔ لیکن آنکھیں جو دیکھنا چاہتی تھیں' وہ تماشا نظر نہیں آرہا تھا۔ خلاف توقع شادی خانہ آبادی ہوئی تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ماروی! خوش رہو میں مبارکباد دینے آیا تھا۔ اب مجھے جانا چاہیے۔ پھر کبھی آؤں گا۔''

وہ جواب سنے بغیر اس سے منہ پھیر کر تیزی سے چلتا ہوا باہر چلا آیا۔ سمیرا اور معروف بھی اس کے پیچھے آگئے۔ معروف اپنی کار میں سمیرا کے ساتھ آیا تھا تاکہ وہ محبوب کے ساتھ کار میں نہ بیٹھے اور نہ ہی کوئی ان کے متعلق باتیں بنائے۔

وہ معروف کی کار کی طرف جانے لگی تو محبوب نے اپنی کار کی اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر کہا۔ ''یہاں آؤ۔''

وہ خوشی سے کھل گئی۔ اس کی کار میں آکر بیٹھ گئی۔ معروف

نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''محبوب! یہ کیا کر رہے ہو؟''
وہ اپنی اسٹیئرنگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کسی کی پروا نہیں ہے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ آپ آفس جائیں میں شام کو سمیرا کے ساتھ آؤں گا۔''
اس نے کار میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ماروی سے دور جانے لگا۔ اس وقت اس کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے اپنے عشق پر اپنی دیوانگی پر لعنت بھیج کر جا رہا ہو۔
سمیرا نے اسے دیکھ کر کچھ کہنا چاہا۔ پھر چپ رہی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ ایسے وقت بولنے والی پر پھٹ پڑے گا۔
وہ تیزی سے ڈرائیو کرتا جا رہا تھا۔ پھر اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''عقل نہیں مان رہی ہے۔ میں کیسے جان لوں کہ ایک بونا اپنے سائز سے دُگنی سائز والی کو سر کر چکا ہے۔''
سمیرا نے کہا۔ ''میں نے اسے الگ لے جا کر پوچھا تھا کہ ایک بونے کے ساتھ سہاگ رات کیسی گزری۔ اس نے جواب دیا کہ رات کے کسی ایک پل میں بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ بونا ہے۔ جیسے پہلے پہاڑ تھا، ویسا ہی لگ رہا تھا۔''
''میں کیسے مان لوں؟'' وہ اس کی طرف منہ کر کے چیخ پڑا۔ ''عقل کیسے مانے گی؟''
اس نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالا پھر دوسرا ہاتھ سمیرا کے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم مانتی ہو کہ وہ سچ کہہ رہی ہے؟ کیا تمہاری عقل تسلیم کر رہی ہے؟''
''وہ جھوٹ کیوں بولے گی؟''
''اس لیے بولے گی کہ بونے سے شادی کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب اپنی غلطی کا اعتراف کر کے ہمارے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی۔''
''نہیں محبوب! کیا تم نے اس کے چہرے کی شادابی، اس کی مسرتیں نہیں دیکھیں۔ اس کے کھنکتے ہوئے اور چہکتے ہوئے لب و لہجے کو نہیں سنا۔''
وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''وہ ایک چلو پانی ہے اور ماروی ایسے مطمئن اور سرشار ہے جیسے سمندر پی لیا ہو۔ یہ پاگل کر دینے والی بات ہے سمیرا...! میں کیسے یقین کر لوں؟ بے یقینی کی پھانس میرے اندر سے نہیں نکلے گی۔''
''ابھی یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ وہ آپ کے دماغ میں پھنسی ہوئی ہے۔ ابھی مضبوط قوت ارادی سے فیصلہ کریں اور اسے دماغ سے نکال کر پھینک دیں تو آپ کو ذہنی سکون مل جائے گا۔''
وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''آپ خود کو سمجھائیں کہ وہ بے وفا ہے۔ اتنی خود غرض ہے کہ اس بونے کی خاطر اس نے آپ کی تمام محبتوں اور نیکیوں کو ٹھکرا دیا۔ وہ ایک گری ہوئی لڑکی ہے۔ آپ کو اس کے سامنے نہیں گرنا چاہیے۔''
وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ سمیرا نے دل میں کہا۔ ''سوری ماروی! تم گری ہوئی نہیں ہو۔ تم بہت عظیم ہو۔ میں نے تمہیں مار ڈالنے کی کوشش کی اور تم نے محبوب کے سامنے میری عزت رکھ لی۔ آج تم نے اس بونے کو قبول کر کے میرے لیے راستہ صاف کر دیا ہے۔''
اس کا ہاتھ محبوب کے شانے پر تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے سوچ رہی تھی۔ ''میں تقریباً انہیں حاصل کر چکی ہوں۔ بس نکاح پڑھوانے کی دیر ہے۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی ماروی! ابھی بہت مجبور ہو کر اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے تمہارے خلاف بول رہی ہوں۔''
حالات ایسے تھے کہ محبوب ڈوب رہا تھا۔ وہ اُبھر رہی تھی۔ مسرتوں سے سرشار ہو کر سوچ رہی تھی۔ ''میں بہت بڑی بازی جیت رہی ہوں ماروی...! تم جیو ہزاروں سال... میں کبھی نہ کبھی تمہارے احسانات کا بدلہ ضرور چکاؤں گی۔''
محبوب نے کوٹھی کے پورچ میں آ کر گاڑی روک کر کہا۔ ''اب معلوم ہو رہا ہے۔ وہ کبھی مجھے دل سے نہیں چاہتی تھی۔ میرے احسانات کی وجہ سے جھوٹے پیار کا ناٹک کرتی رہتی تھی۔''
سمیرا نے کہا۔ ''یہی حقیقت ہے۔''
''میں یقین سے کہتا ہوں اس نے دکھاوے کے لیے بونے سے شادی کی ہے۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اپنی ازدواجی زندگی کو داؤ پر لگایا ہے۔''
وہ بھی کار سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''نہیں محبوب! میں عورت ہوں اور دوسری عورت کو اس کے اندر سے سمجھ رہی ہوں۔ اس نے بھرپور سہاگ رات منائی ہے۔ وہ سب ہی کو اُلجھا رہی ہے۔ پلیز اندر چلیں۔''
وہ کار سے نکل کر کوٹھی کے اندر آئے۔ سمیرا نے ڈرائنگ روم میں آ کر اپنے بیگ میں سے سرخ گلاب کی دو کلیاں نکالیں اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''جب ماروی آئی تو ہم اسے دیکھنے سمجھنے میں ایسے محو ہو گئے کہ یہ تحفہ دینا بھول گئے۔''
محبوب نے دو کلیوں کو ناگواری سے دیکھا۔ پھر اس

سے ایک کلی کو لے کر اسے مٹھی میں بھینچ کر اسے بے دردی سے مسلتے ہوئے کہا۔ ''شادی خانہ بربادی۔ آئی ہیٹ ہر....''

اس نے دوسری کلی کو لے کر ذرا سوچا۔ پھر سمیرا کو پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''گر قبول اُفتد زہے عزوشرف....''

وہ خوشی سے لہرا گئی۔ پھول لے کر گلے لگ گئی۔ وہ اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ وقت کا منہ زور دریا اب اسے سمیرا کی سمت بہانے لگا تھا۔

☆☆☆

موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ نہیں تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ مراد نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بارش ہوسکتی تھی۔ وہ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ اس نے دوسرے دن لندن جانے کے لیے سیٹیں حاصل کرلی تھیں۔ اب ذرا سکون سے تنہا رہنے کے لیے ساحل سمندر کی طرف جانے لگا۔

بہت عرصے تک تڑپتے رہنے کے بعد ماروی حاصل ہوئی تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ اس سے دور بھٹکتا ہوا سمندر کے کنارے آگیا تھا۔ میکڈونلڈ میں بیٹھ کر سینما اسکوپ کھڑکی سے سمندر کی لہروں کو تڑپتے مچلتے دیکھ رہا تھا۔

ماروی سے دور آنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ایک ہی رات میں اس سے اکتا گیا ہے۔ وہ ساری عمر اسے نگاہوں کے سامنے رکھ کر اسے دیکھ دیکھ کر جینے والا تھا۔ ازدواجی رشتے کا کوئی بھی مسئلہ' کوئی بھی رکاوٹ' حالات کی کوئی بھی نئی کروٹ اس کی محبت کو کم نہیں کرسکتی تھی پھر بھی وہ دو چار گھنٹے جو ماروی کے ساتھ گزار سکتا تھا' وہ وقت ساحل پر گزارنے آگیا تھا۔ وہاں بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ''مرینہ میری زندگی میں نہ آتی تو اچھا ہوتا۔ وہ زبردست کھلاڑی ہے۔''

ماروی ایک سیدھا سا پرہیزی کھانا لگ رہی ہے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل کر سوچنے لگا۔ کوئی بات نہیں' میں اسے سمجھاؤں گا۔ سکھاؤں گا۔

بے چاری گوٹھ کے ماحول سے نکل کر کراچی آکر بھی ایک بہت ہی محدود ماحول میں زندگی گزارتی آرہی ہے۔ چاچی نے اسے رازداری سے سمجھایا ہوگا کہ میاں کے سامنے شرم وحیا کو نہ بھولنا۔

وہ اس کی سادگی پر مسکرانے لگا۔ فون کی رنگ ٹون گنگنانے لگی۔ اسکرین نے ماروی کا نام بتایا۔ وہ بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر بولا۔ ''بولو میری جان! کیا میری یاد آرہی ہے؟''

''تمہاری یاد نہیں آئے گی تو اور کس کی آئے گی؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''محبوب کی...''

ماروی نے کہا۔ ''وہ سمیرا اور معروف صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ انہیں پورا یقین تھا کہ میں ایک بونے کی دلہن بن کر بری طرح پچھتاؤں گی۔ وہ سہاگ رات کا ردعمل دیکھنے آئے تھے اور بہت مایوس ہو کر گئے ہیں۔''

وہ اس بات پر ہنسنے لگا۔ ماروی نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ' تم کہاں ہو؟ اور کب آرہے ہو؟''

''میں نے کہا تھا دیر ہوگی۔ باہر سے لنچ کرکے آؤں گا۔''

''جھوٹ مت بولو۔ تم نے باہر لنچ کرنے والی بات نہیں کہی تھی' کس کے ساتھ لنچ کررہے ہو۔ سچ بولو؟''

''میری جان! ماسٹر گوبو بوکا ایک خاص آدمی یہاں ہے اس سے بہت اہم کام کی باتیں ہورہی ہیں۔ ہم جہاں بھی ہنی مون منانے جائیں گے' وہاں ماسٹر ہمیں سیکیورٹی فراہم کرے گا۔ اب سگھڑ بیویوں کی طرح انتظار کرنا اور صبر کرنا سیکھو۔ میں تین یا چار بجے تک آجاؤں گا۔''

اس نے جھوٹ بول کر اسے مطمئن کرکے فون بند کردیا۔ سچ بولتا تو اس کے بغیر تنہا وقت گزارنے پر ناراض ہوجاتی۔ ویسے لندن جانے سے پہلے وہاں کی خبر رکھنا لازمی تھا' اس نے بِلّے سے رابطہ کیا۔ پھر پوچھا۔ ''ایک بہت بڑی خوشخبری سنو گے؟''

''ارے... کیا پوچھ کر خوش خبری سناؤ گے؟''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''ماروی میری دلہن بن چکی ہے۔''

وہ بیچے خوشی سے جھوم کر بولا۔ ''واہ میرے یار! آخر تمہیں منزل مل ہی گئی۔ تم کو اور ماروی کو بہت بہت مبارک باد۔''

پھر اس نے آواز دی۔ ''بلی! کہاں ہو؟ جلدی آؤ... اوئے اپنے یار نے ماروی کو دلہن بنا لیا ہے۔ اس بارود بھری لعنتی زندگی میں پھول کھل رہے ہیں۔''

بلی کی آواز سنائی دی۔ ''بھائی صاحب! السلام علیکم بہت بہت مبارک ہو۔ میں ساؤتھ افریقا میں تھی اب لندن میں ہوں۔ اجنبی لوگ ہیں۔ اجنبی ماحول ہے۔ یا اللہ...! کتنے عرصے بعد ایک پاکستانی خوشی مل رہی ہے۔''

وہ دل سے خوش ہو کر کہہ رہی تھی۔ ''میں گھونگٹ میں ماروی کو دیکھ رہی ہوں۔ وہ مایوں بیٹھی ہوگی۔ شرماتی رہی ہوگی۔ اس کے ہاتھوں پیروں میں مہندی رچائی گئی ہوگی۔ ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت لہراتے رہے ہوں گے۔ ہائے ہمارا پاکستان، ہماری مشرقی تہذیب کتنی خوب صورت ہے۔ دل آپ ہی آپ اپنی دھرتی کی طرف

کھنچا جاتا ہے۔''

بلے کی آواز سنائی دی۔ ''ارے ارے تُو تو رونے لگی ہے۔''

وہ بولی۔ ''بھائی صاحب! یہاں بلے ہزاروں پاؤنڈز یعنی ہر ماہ لاکھوں روپے کماتا ہے۔ ہم رئیسوں کی طرح عیش وعشرت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن قسم سے کہتی ہوں' یہاں دل نہیں لگتا۔ ہمارے سروں پر سے قانون کی تلواریں ہٹ جائیں تو میں تمام عیش وعشرت کو ٹھکرا کر اپنے وطن آؤں گی اور وہاں قدم رکھتے ہی سجدہ کروں گی۔''

مراد نے کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو بشریٰ! تمہارے سینے میں پاکستان دھڑکتا رہتا ہے۔ نمازیں پڑھا کرو۔ دعائیں مانگتی رہا کرو۔ اللہ بڑا کارساز ہے وہ ضرور ہمارے لیے پاکستان میں رہنے کی راہیں ہموار کرے گا۔''

وہ بولی۔ ''آپ وعدہ کریں۔ آپ ماروی کو لندن لائیں گے اور ہمارے گھر آئیں گے۔''

''میں کل ماروی کے ساتھ آرہا ہوں لیکن اپنے گھر بلانے کی ضد نہ کرنا۔ ہم دشمنوں کے شہر میں بھی کھل کر ایک دوسرے سے نہیں مل سکیں گے۔ بلے! اب تم باتیں کرو۔ یہ تو سن لیا ہے کہ میں کل آرہا ہوں۔ تم وہاں کے حالات بتاؤ۔''

''یہاں بڑی مستعدی سے اور بڑی شدت سے تمہیں تلاش کیا جارہا ہے۔ یعنی میں یہاں مراد علی منگی ہوں' اس لیے مجھے ڈھونڈا جارہا ہے۔ جرائم کی دنیا میں ریڈ الرٹ ایک بڑا نام ہے کئی خطرناک تنظیمیں اس کی اور میکی براؤن کی اتحادی ہیں۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''میں نے اس کے بیٹے کو گولی مار کر تہلکہ مچا دیا ہے۔ پولیس، انٹیلی جنس، اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوس اور مجرموں کی فوج پورے لندن میں مراد علی منگی کی بو سونگھتی پھر رہی ہے۔''

''بلے! تم حالات کی سنگینی کو اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ ابھی کچھ عرصے تک کوئی واردات نہ کرنا۔ ورنہ اسکاٹ لینڈ والے بہت شارپ ہیں۔ دوسری واردات سے کڑیاں ملاتے ہوئے تمہاری شہ رگ تک پہنچ جائیں گے۔''

''میں محتاط ہوں۔ ماسٹر نے بھی یہی سمجھایا ہے کہ ابھی مجھے خاموش رہ کر گم ہو جانا چاہیے۔ اطمینان رکھو کسی کو میرے وجود کا سراغ نہیں ملے گا۔''

اس نے مشورہ دیا۔ ''اگر ہو سکے تو مرینہ سے بات کرو۔ اسے لندن میٹ ڈیپارٹمنٹ اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اندر کی بہت سی باتیں معلوم ہوں گی۔ ہمیں اس سے راہنمائی مل سکتی ہے۔''

''میں ابھی بات کروں گا۔''

بلے سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ مرینہ پچھلی رات سے اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھی اور وہ اسے ذہن سے باہر جھٹکتا جارہا تھا۔ اب بلے کا یہ معقول مشورہ تھا کہ مرینہ سے صحیح معلومات حاصل ہوں گی۔

وہ یقیناً سی آئی اے، ایف بی آئی، انٹرپول، میٹ ڈیپارٹمنٹ اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے اندر پہنچ کر معلوم کر رہی ہوگی کہ لندن میں مراد کو پکڑنے کے سلسلے میں کیسی کیسی پلاننگ کی جارہی ہے۔

مراد نے ایک گہری سانس لی پھر فون کو اُٹھا کر اس آفت جاں سے رابطہ کیا۔ اُدھر سے مسرتوں بھری کھنکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''او گاڈ! مراد... !تم نے مجھے کال کی ہے؟ ہائے میں مر جاؤں۔ بولو کیا کروں؟ کہاں آؤں؟''

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے شادی کر لی ہے۔ ماروی میری دلہن بن گئی ہے۔''

اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''کیا واقعی تم نے میدان مار لیا ہے؟ آخر ماروی کو پا ہی لیا۔ وہاٹ اے ہیپی نیوز۔ کونگریچولیشن، ہنی مون منانے کہاں جاؤ گے؟''

''ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''یعنی ابھی پاکستان میں رہو گے؟''

''یہ ابھی کہہ نہیں سکتا کہ کہاں جانا ہے اور کہاں ماروی کے ساتھ ٹھکانا بنانا ہے۔''

''تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ تمہارے پیچھے نہیں آؤں گی۔''

''یہ تمہاری دانشمندی ہوگی۔''

''پہلے میں ثابت کروں گی کہ تمہاری وفادار ہوں۔ تمہارے سر کا سودا کرنے والوں کی جانی دشمن ہوں۔ میں جلد ہی تمہارا اعتماد حاصل کر لوں گی۔''

مراد نے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''نہ اپنے بارے میں بتاؤ، نہ میرے بارے میں پوچھو۔''

''مجھے تم سے ضروری کام ہے۔''

''ہاں بولو، میری جان حاضر ہے۔''

''میکی براؤن کے بیٹے کے مرڈر کے بعد لندن میں تہلکہ مچ گیا ہے۔ جاسوسوں اور مجرموں کی درجنوں ٹیمیں وہاں مجھے تلاش کر رہی ہیں۔ تم سی آئی اے، ایف بی آئی،

انٹرپول، اسکاٹ لینڈ اور اپنے میٹ کے ادارے کے اندر کی باتیں معلوم کرسکتی ہو۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ مجھے گرفتار کرنے کے لیے کیسی کیسی پلاننگ کررہے ہیں؟''

وہ بولی۔ ''اب میں ان کے اندرونی معاملات تک پہنچ نہیں پاؤں گی۔ ان تمام اداروں کو اچھی طرح یقین ہوگیا ہے کہ میں تمہاری گرل فرینڈ ہوں۔''

وہ ہاں کے انداز میں سرہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ سب ہی ہمارے خفیہ گہرے تعلقات کو سمجھ رہے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''میں کبھی تمہیں دشمنوں کے یا قانون کے محافظوں کے ہاتھ لگنے نہیں دوں گی۔ ابھی سب کی نظروں کا مرکز بنی ہوئی ہوں۔ سب ہی خیالی آنکھوں سے میرے پیچھے تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے بلکہ انہیں یقین ہے کہ تم کبھی نہ کبھی میرے ساتھ ہی پکڑے جاؤ گے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں یہ تو میں نے تل ابیب میں دیکھا ہے۔ وہاں ایک گائڈ تمہارے ساتھ تھا۔ دشمنوں نے اسے مراد سمجھ کر تم پر حملے کیے تھے۔ یہ اچھا ہے کہ تم نے مجھ سے دور رہنے کا وعدہ کیا ہے۔ ہمارا صرف فون سے رابطہ رہے گا۔''

''ماسٹر کو بوبو سے کہو۔ ریڈالرٹ کے میکی براؤن نے اس کے خلاف رپورٹ لکھوائی ہے اور بیان دیا ہے کہ ماسٹر کو بوبو برسوں سے دشمنی کرتا آرہا ہے۔ مراد علی منگی، ماسٹر کا سب سے خطرناک شوٹر ہے۔ اس نے ماسٹر کے حکم سے پہلے برنارڈ کو پاکستان میں گولی ماری، پھر ریڈالرٹ کے سابقہ سربراہ جیک البرٹ کو انڈیا میں ہلاک کیا اور اب میکی براؤن کے بیٹے کو لندن میں مار ڈالا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''ماسٹر جانتا ہے۔ وہ اپنے خلاف اس کے بیانات سن چکا ہے۔ اس نے اپنی بیوی، بیٹوں اور بیٹیوں کے اطراف سیکیورٹی سخت کردی ہے۔''

''تمہیں ایک مشورہ دیتی ہوں۔ ماروی کے ساتھ گھر کی چاردیواری سے باہر نہ نکلنا۔ نہ ہی ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک جانا۔ تمام ٹارگٹ کلرز کے پاس ماروی کی تصویر ہے۔''

یہ ایک اہم تشویش ناک بات تھی جس کو ابھی زیادہ اہمیت نہیں دی جارہی تھی۔ مرینہ نے کہا۔ ''وہ اب تک اس لیے محفوظ ہے کہ کراچی کے ایک محدود علاقے میں رہتی ہے۔ کوٹھی سے باہر نہیں نکلتی ہے۔ اس کے اطراف بھی سخت سیکیورٹی ہے۔''

وہ پریشان ہوگیا۔ کبھی کبھی سوچتا تھا کہ ماروی کی تصویر دشمنوں تک پہنچی ہوگی۔ پھر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا تھا۔ لیکن اب خطرے کی بو آرہی تھی۔

اب وہ سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ اس کے تمام دشمن ماروی کو اس کے چہرے سے پہچانتے ہیں اور وہ انجانے میں اسے بڑی آزادی سے لندن اور سوئٹزرلینڈ کی طرف لے جانے والا تھا۔

مرینہ نے پوچھا۔ ''چپ کیوں ہوگئے؟ کیا سوچ رہے ہو؟ کیا میری کوئی بات دل کو لگی ہے؟''

ہاں۔ ''تمہاری بات پر غور کررہا ہوں۔ ماروی کو تفریح کے لیے بھی کوٹھی سے باہر نہیں جانا چاہیے۔''

وہ اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''اور ہنی مون کے لیے بھی نہیں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''آں، ہاں تم درست کہتی ہو۔''

''مراد...! میں باتوں سے اور لہجے سے پکڑ لیتی ہوں۔ میں سمجھ رہی ہوں، اسے کہیں ہنی مون کے لیے لے جانا چاہتے ہو اور مجھ سے یہ بات چھپا رہے ہو۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''مرینہ! مجھے کچھ سوچنے سمجھنے دو۔ میں تھوڑی دیر بعد کال کروں گا۔''

وہ فون بند کرکے فکر میں مبتلا ہوگیا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ دشمن ماروی کو اس کی کمزوری سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اسے چہرے سے بھی پہچانتے ہیں۔

اسے ایک آدھ بار یہ خیال آیا تھا اور اس نے بے پروائی سے یہ سوچ کر ٹال دیا تھا کہ ماروی کی تصویر کسی کے ہاتھ نہیں لگے گی۔ لہٰذا زیادہ اندیشوں میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔

وہ چاہتا تھا اس کی ماروی کے سراپا حسن کو، ملبوسات کو، سولہ سنگار کو اور دل موہ لینے والے ناز و انداز کو ساری دنیا اس کے شانہ بشانہ دیکھے لیکن دنیا سے پہلے دشمن دیکھنے والے تھے پھر موت دیکھتی اور اسے اپنے ساتھ شانہ بشانہ لے جاتی۔

وہ میکڈونلڈ سے نکل کر کار میں آیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کرکے آگے بڑھانے کے بعد فون پر مرینہ کو مخاطب کیا۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''تم کال کرتے ہو مراد...! تمہارا فون پکارتا ہے تو دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میرے اندر مسرتیں بکھر جاتی ہیں۔''

وہ بولا۔ ''میں بہت الجھ گیا ہوں۔ ماروی کے ساتھ آزادی سے زندگی نہیں گزار سکوں گا۔''

مرینہ نے کہا۔ ''اور کب تک اسے چاردیواری میں قید کرکے رکھ سکو گے؟ اپنی ماروی سے پوچھو ایک چھت کے نیچے چھپی رہنا چاہتی ہے یا ہماری طرح تم ٹھوک کر دشمنوں کی

بھیڑ سے گزرنا چاہتی ہے۔"

"وہ دشمنوں کے مقابلے پر کھلی فضاؤں میں سانس نہیں لے سکے گی۔ نہ چالبازی جانتی ہے نہ گن چلانا جانتی ہے۔"

"تم بھی چالباز نہیں تھے۔ کبھی تم نے بھی گن نہیں پکڑی تھی۔ آج دیکھو کیا ہو؟ اگر آج ماروی کی جگہ میں تمہاری شریک حیات ہوتی تو کیا تم فکرمند ہوتے؟ ہرگز نہیں، دشمنوں کو اور زیادہ للکارتے۔ تمہارے سامنے دو چوائس ہیں، ایک تو یہ کہ ماروی کے اندر بھی بارود بھر دو۔ اس کے ہاتھوں میں گن پکڑاؤ اور اسے ٹریننگ دو۔ یا پھر ایک گھر گرہستی والی بیوی کی طرح اسے چار دیواری میں ہی رہنے دو۔ یاد رکھو، تم ہمیشہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکو گے۔

"تمہارے پیروں میں چکر ہے۔ کبھی دشمن تمہیں دوڑائیں گے کبھی تم انہیں رگیدتے رہو گے۔ کبھی کبھی ماروی سے ملنے جاسکو گے۔ ان تمام حالات پر غور کرو اور مجھے سچ سچ بتاؤ، کیا وہاں سے ماروی کے ساتھ نکلنے والے ہو؟"

اس نے پھر اپنی بات پر زور دیتے ہوئے تاکید کی۔ "دیکھو مراد... اپنی اور ماروی کی بہتری کے لیے سچ بولو۔"

اس نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ ذرا چپ رہا۔ وہ بولی۔ "مراد! میں تمہارا اعتماد کھو کر پچھتا رہی ہوں۔ اور تم اعتماد نہیں کرو گے، سچ نہیں بولو گے اور چھپ کر ماروی کے ساتھ کہیں جاؤ گے تو میں فکر میں مبتلا رہوں گی۔"

اس نے التجا کی۔ "تمہیں خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ صرف ایک بار بھروسا کرو۔ بتاؤ کیا کرنے والے ہو۔ تمہارے پیار کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ تم دیکھو گے کہ دور ہی دور سے ماروی کو بھی سیکیورٹی دیتی رہوں گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میں پھر اندھا جوا کھیلوں گا۔ پھر ایک بار تم پر بھروسا کروں گا۔"

"تھینکس اے لاٹ۔ میری ساکھ بحال کر رہے ہو۔ تم دیکھو گے کہ میں کیا کرتی ہوں جہاں ہم دونوں ہوں گے، وہاں دشمنوں کی لاشیں گرتی رہیں گی مراد...!"

مراد نے کہا۔ "کل صبح دس بجے کی فلائٹ سے ماروی کے ساتھ لندن جانا چاہتا ہوں۔ عبداللہ کبڈی ہمارے ساتھ ہے۔ وہ لندن میں رہے گا۔ میں ماروی کے ساتھ سوئٹزرلینڈ جاؤں گا۔"

وہ اپنے موجودہ حالات بتانے لگا۔ "یہاں کے حالات یہ ہیں کہ محبوب وغیرہ کے سامنے کبڈی بونا مراد بن کر رہتا ہے۔ ہماری پلاننگ کے مطابق بونے مراد سے ماروی کا نکاح ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ درپردہ میری منکوحہ ہے۔"

وہ اسے تمام باتیں تفصیل سے بتانے لگا۔ مرینہ نے پوچھا۔ "نکاح کے کاغذات میں اور پاسپورٹ میں ماروی زوجہ مراد علی منگی لکھا ہوگا؟"

"ہاں نکاح تو میرے ساتھ ہوا ہے۔ وہ میری ہی زوجہ کہلائے گی۔ نام تو میرا ہی لکھا گیا ہے۔"

"مراد! تمہاری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔ ائرپورٹ اور کسٹم میں انٹیلی جنس کے لوگ ہوتے ہیں۔ کاغذات پر ماروی زوجہ مراد علی منگی پڑھتے ہی جان کو آجائیں گے۔ تم ماروی کو حاصل کرنے کی دھن میں اس قابلِ گرفت بات کو کیسے بھول گئے؟"

یہ اتنی اہم بات تھی، جس کی طرف مراد نے دھیان نہیں دیا تھا۔ اس نے کار کی رفتار سست کر کے سڑک کے کنارے روک دی۔ پھر کہا۔ "واقعی یہ بات ذہن میں نہیں آئی تھی۔ یہاں ائرپورٹ میں کاغذات کی چیکنگ کے دوران ہی ماروی سے پوچھا جائے گا کہ اس کا شوہر مراد علی منگی کہاں ہے؟"

وہ پریشان ہوکر بولا۔ "وہ لوگ شبہ کریں گے۔ ماروی سے پوچھیں گے، وہ اکیلی لندن جارہی ہے یا عبداللہ کبڈی اور ایمان علی کے ساتھ سفر کررہی ہے۔ اگر ان کے ساتھ سفر کررہی ہے تو ان میں سے کوئی مراد ہے اور کبڈی تو مراد کا ہم شکل ہے ہی۔"

مرینہ نے کہا۔ "پھر انٹیلی جنس والے ماروی کو حراست میں لے کر اس کے شوہر مراد کے متعلق سوالات کی بوچھاڑ کریں گے۔ نکاح نامہ میں شادی کی تاریخ درج ہوگی۔ جس سے ثابت ہوگا کہ مراد کراچی میں موجود ہے اور اس نے ایک روز پہلے ماروی سے نکاح پڑھوایا ہے۔"

مراد کو پسینا آنے لگا۔ وہ بہت بڑی غلطی کرتے ہوئے خود کو اور ماروی کو قانون کے شکنجے میں لانے والا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں ابھی جارہا ہوں۔ جہاز کی سیٹیں کینسل کراؤں گا۔"

"جسٹ اے منٹ۔ جلدی نہ کرو۔ یہ سوچو، ماروی وہاں تمہاری منکوحہ بن کر محفوظ نہیں ہے۔ کسی دن بھی بھید کھل سکتا ہے کہ تم پاکستان میں آکر اس سے نکاح پڑھا چکے ہو۔ قانون کے محافظ اس کے پیچھے پڑجائیں گے۔"

وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "یا میرے خدا...! میں کیا کروں؟"

"میری عقل کہتی ہے، ایک ہی راستہ ہے۔ اسے وہاں سے نکالو۔ وہ فی الحال ماسٹر کو بوبو کی سن سٹی میں

تمہارے ساتھ آزادی سے رہ سکے گی۔ کوئی دشمن اس کے سائے تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

''درست کہتی ہو۔ وہ فی الحال ماسٹر کے سائے میں محفوظ رہے گی۔ اس کی ایک صورت یہ ہے کہ ماروی یہاں چیکنگ کے وقت کسی کو نکاح نامہ نہ دکھائے۔ یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ پاسپورٹ ایک ماہ پہلے بن گیا تھا۔ اس میں شوہر کا نام نہیں ہے۔ یہی ظاہر ہوگا کہ وہ تنہا لندن جا رہی ہے۔ میں اور کبڈی اس سے دور رہیں گے۔''

''ہاں یہ ہوئی نا بات؟ یہی کرو۔ کل ائرپورٹ سے لندن تک اپنی بیوی سے لاتعلق رہو۔ وہ دشمنوں سے چھپنے کے لیے عبایا اور نقاب میں یہاں سے جائے گی۔ ماسٹر سے ابھی بولو کہ وہ لندن سے فوراً ہی تم دونوں کو اپنے پاس بلائے۔''

''میری جان! تم نے آدھی سے زیادہ پریشانی دور کر دی ہے۔ آئی لو یو...''

وہ مسرتوں سے سرشار ہو کر بولی۔ ''آئی لو یو ٹو...''

اس نے کہا۔ ''میں ابھی ماسٹر سے بات کرتا ہوں۔ اس کے بعد تمہیں کال کروں گا۔''

اس نے ماسٹر سے رابطہ کیا اور اسے تمام موجودہ مشکلات سے آگاہ کیا۔ اس نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''یہ کوئی پرابلم نہیں ہے۔ لندن سے سن سٹی جانے والی کسی فلائٹ میں دو سیٹیں ہو جائیں گی۔ یہ میرے لیے انتہائی خوشی کی بات ہے کہ تم میرے پاس آ رہے ہو۔ یہاں تمہاری ماروی آزادی سے رہے گی۔ کل وہاں سے کسی طرح نکل آؤ۔''

اس نے پھر مرینہ سے رابطہ کیا۔ موجودہ حالات کے مطابق اب وہ اہم ہو گئی تھی اور دل کے چور کو کوئی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ وہ پچھلی رات سے ہی اس کے اندر کروٹیں لے رہی تھی۔

اس نے کہا۔ ''ماسٹر کے پاس کام بن رہا ہے۔ ہمیں سن سٹی جانے کے لیے لندن سے شاید کل ہی کسی فلائٹ میں سیٹیں مل جائیں گی۔ اب بتاؤ تم کہاں ہو؟''

''میں لندن میں ہوں، لیکن تم مجھے پہچان نہیں سکو گے میں نے چہرہ بدل لیا ہے۔ میرے ڈپارٹمنٹ والے بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ڈائریکٹر جنرل نے وارننگ دی ہے کہ میں چوبیس گھنٹے کے اندر آ کر ڈیوٹی کی رپورٹ پیش نہیں کروں گی تو مجھے ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔''

وہ بڑے جذبے سے بولی۔ ''اور تم دیکھو گے کہ میں تمہاری خاطر میٹ آفیسر کے عہدے کو ٹھکرا دوں گی۔ جو تمہارے سر کا سودا کرنا چاہتے ہیں' ان کی ملازمت نہیں کروں گی۔''

''کیا واقعی...؟''

''مراد! یہ وہ لوگ ہیں، جو چاہتے تھے کہ میں تمہیں بہیار سے ٹریپ کر کے یہاں لاؤں اور تمہیں ریڈ الرٹ کے میکی براؤن کے حوالے کر دوں۔ میں بہت الو کی پٹھی ہوں۔ کھسک گئی تھی۔ یوں اپنی نادانی کے باعث تمہارا اعتماد کھو دیا تھا۔''

''تھینکس گاڈ! میں پھر سے تمہارا دل جیتنے والی ہوں۔ تم میرے خلوص کو اور نیک نیتی کو سمجھ رہے ہو نا...؟''

''ہاں میری جان... ! تم پھر سے متاثر کر رہی ہو۔''

''یہ بتاؤ' میں وہاں تمہیں کیسے پہچانوں گی؟''

''کوڈ ورڈز کے ذریعے اور وہ ورڈز یہ ہیں۔ یو آر فارمی اینڈ فاریو۔'' وہ ذرا سوچ کر بولا۔ ''نہیں۔ یہ رومانٹک کوڈ ورڈز ہیں۔''

''کیا تمہیں پسند نہیں ہیں؟''

''بہت پسند ہیں۔ پتا نہیں' کیا بات ہے' تم میرے دل میں گھسی آ رہی ہو۔''

اس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ وہ لہراتے ہوئے بولی۔ ''ہائے مراد! میں خوشی سے مر جاؤں گی۔''

''لیکن مرینہ! کوئی ایسی غلطی نہ کرنا کہ ماروی مجھ سے ناراض ہو کر دور چلی جائے۔''

''میں کبھی ایسی حماقت نہیں کروں گی۔''

''تم میرے قریب آتی جاتی رہو گی۔ ماروی کو کبھی شبہ نہ ہو کہ تم مرینہ ہو۔ میں نے اسے بہت مشکلوں سے یقین دلایا ہے کہ تم سے میرا کوئی تعلق ہے اور نہ رہے گا۔''

''اطمینان رکھو۔ میں اسے شبہ نہیں ہونے دوں گا۔''

''تم نئے روپ میں پہلی بار آ کر یہ کوڈ ورڈز ادا کرو گی۔ مائی نیم از... ایم ایٹ یور سروس۔''

مرینہ نے کہا۔ ''میرا موجودہ نام ثلاثہ ہے۔''

''او کے۔ کل ہمارا سامنا ہوگا۔ تم ماسٹر کی طرف سے میری خدمت گار بن کر آؤ گی اور یہی کوڈ ورڈز ادا کرو گی۔ مائی نیم از ثلاثہ۔ ایم ایٹ یور سروس''

''او کے۔ ماروی کو یہی سمجھنا چاہیے کہ میں ماسٹر کی طرف سے بھیجی ہوئی خدمت گار ہوں۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟ مرینہ میری اہم ضرورت بن گئی ہے۔ اگرچہ شوہر بننے کے باوجود اب بھی ماروی کا

دیوانہ عاشق ہوں۔ اس کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ تاہم مرینہ اہمیت اختیار کرتی جارہی ہے۔

ایسے میں ایک بیوی کے اعتماد کو ضرور ٹھیس پہنچے گی۔ آئندہ اس سے ہمیشہ جھوٹ بولنا اور اسے فریب میں مبتلا رکھنا ہوگا۔

وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق ایک ذرا بدل رہا تھا۔ محبت اور وفاداری میں ایک ذرا تبدیلی ہو تو تبدیل ہونے والا ہرجائی، بے وفا اور بے ایمان کہلاتا ہے۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ حالات سے مجبور ہوکر مرینہ سے دوستی کر رہا ہے۔ یہ باتیں وہ ماروی کو سمجھاتا تو وہ بھی سمجھنا نہ چاہتی۔ وہ اسے سوکن ہی سمجھتی رہتی اور وہ غلطی پر نہ ہوتی۔

اس نے دل کو سمجھایا، ماروی آگے چل کر اپنے مراد کی مشکلات دیکھ کر شاید مرینہ سے سمجھوتا کرلے گی۔ ابھی تو اسے جھوٹ بول کر دھوکے میں رکھنا تھا۔ اپنا کام نکالنا تھا۔

اس نے خود کو سمجھایا، اسے دھوکا دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ حاصل ہونے کے بعد کمتر ہوگئی ہے۔ اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کے برابر دنیا کی کوئی عورت نہیں ہوسکتی تھی۔

اسے دھوکا دینے کی صرف ایک وجہ ہے۔ میں خوفزدہ ہوں، اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا۔ اس سے بچھڑنا نہیں چاہتا۔ مرینہ سے میرے تعلق کا علم ہوگا تو وہ مجھ سے بدظن ہوجائے گی۔ وہ بہت ضدی ہے۔ منہ پھیرلے گی تو پھر منانے نہیں مانے گی۔

وہ ایک دکان سے عبایا اور کچھ ضروری چیزیں خرید کر کوٹھی میں آیا۔ ماروی نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

اس نے دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ عبایا ہے، یہ اسکارف ہے، دستانے اور جرابیں ہیں۔ تم ایسے پردے میں رہ کر یہاں سے نکلوگی کہ دشمن تو کیا دوست بھی تمہیں پہچان نہیں سکیں گے۔"

اس نے چاچی، چاچا اور عبداللہ کبڈی کو بلایا پھر انہیں موجودہ بدلتے ہوئے حالات بتائے۔ ماروی نے پریشان ہوکر کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا میں اتنی دور لندن اکیلی جاؤں گی؟"

مراد نے کہا۔ "تم بہ ظاہر اکیلی رہوگی۔ میں اور کبڈی تمہارے آس پاس رہیں گے۔ لیکن تم سے لاتعلق رہیں گے۔ جہاز کے اندر بھی احتیاطاً دور رہیں گے۔ لندن پہنچ کر کبڈی ڈاکٹر ڈیڈی کے ساتھ چلا جائے گا۔ میں تمہارے قریب آجاؤں گا۔"

وہ پریشان ہورہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا وہاں ہمارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا؟"

"مسائل کہاں پیچھا چھوڑتے ہیں۔ وہاں تو دشمنوں کا میلا لگا ہوگا۔ ماسٹر کو بوبو کی ایک قابل اعتماد فائٹر اور شوٹر ہماری راہنمائی کے لیے لندن ائرپورٹ پر موجود رہے گی۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "ایک عورت ہمارے ساتھ کیوں رہے گی؟ کیا راہنمائی کے لیے کوئی مرد ساتھ نہیں رہ سکتا؟"

"ماسٹر بہتر جانتا ہے۔ ثلاثہ بہت خطرناک فائٹر ہے وہ ہماری باڈی گارڈ بن کر رہے گی۔"

اس نے گھور کر پوچھا۔ "یعنی دن رات ساتھ رہے گی یا رات کو بھی پیچھا نہیں چھوڑے گی؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "کب کیا ہوسکتا ہے، ہم نہیں جانتے۔ جب ہمیں ضرورت ہوگی یا حالات اسے ہمارے ساتھ رہنے پر مجبور کریں گے، تب وہ ساتھ رہا کرے گی۔"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تم میری شریک حیات بن کر جرائم کی ایسی دنیا میں آگئی ہو، جہاں اچھی بری عورتوں سے سامنا ہوتا رہے گا۔ پلیز تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا ہوگا کہ میں تمہارا ہوں۔ کوئی عورت مجھے تم سے چھین کر نہیں لے جائے گی۔"

چاچی نے سمجھایا۔ "بیٹی! حالات بدل رہے ہیں۔ خود کو بھی بدلتی رہو۔ اپنے مرد پر پکا بھروسا رکھو، تب ہی ہنستی کھیلتی زندگی گزارتی رہوگی۔"

عبداللہ نے کہا۔ "میں نے انڈیا میں مراد کے ساتھ رہ کر دیکھا ہے۔ وہاں تین حسین لڑکیاں اس کے پاس آئیں اور گئیں لیکن اس نے کسی کو گھاس نہیں ڈالی۔ تم خوش نصیب ہو۔ میرا دوست لاکھوں میں ایک ہے۔ اس پر فخر کرو اور بھروسا کرو۔"

ماروی مراد کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ اسے بچپن کی محبت پر پورا بھروسا تھا مگر جوانی کے عشق پر آدھا اعتماد بھی نہیں تھا۔ اپنے مرد کو لگام دینے کے معاملے میں لڑکیاں پیدائشی تربیت یافتہ ہوتی ہیں۔ وہ اندر سے محتاط تھی۔

کال بیل کی آواز سنائی دی۔ چاچا نے اٹھ کر دروازہ کھولا، وہاں عظمت شاہ کھڑا تھا۔ چاچا نے بڑے ادب سے مصافحہ کیا۔ اسے اندر بلایا۔ ماروی نے کہا۔ "مراد! یہ شہزاد کی نانی مرحومہ کے بھائی عظمت شاہ ہیں۔"

ایک پورے اور ایک آدھے، دونوں ہی مراد نے آگے بڑھ کر شہزاد کے نانا سے مصافحہ کیا۔ منی نے کہا۔

''بھائی صاحب! اچانک آئے ہیں سب خیریت ہے نا؟''
عظمت شاہ نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تو خیریت ہے لیکن انسان کے ساتھ مرنا جینا لگا رہتا ہے۔ میرے گھر میں بھی اور مجھے بھی یہ صدمہ ہوا ہے۔ ایک ماہ پہلے میری زوجہ کا انتقال ہو گیا تھا۔''

چاچی، چاچا، ماروی اور دونوں مراد افسوس ظاہر کرنے لگے۔ عظمت شاہ نے کہا۔ ''افسوس تو ہوتا ہے لیکن مرحومہ اپنے بچوں کی ایک اچھی ماں تھی میری وفادار بیوی نہیں تھی۔ میں زیادہ کیا بتاؤں اس کی بدمزاجی کی وجہ سے میں نے شہزاد کو یہاں آپ کے پاس چھوڑا تھا۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''مرحومہ نے اپنے میکے سے لائی ہوئی تمام زمینیں اور ان کی آمدنی اپنے آوارہ اور عیاش بیٹے کے نام لکھ دی ہے۔ وہ بیٹا پہلے بھی مجھ سے بدظن تھا۔ اب کروڑوں کی جائداد پا کر مجھے ٹھکرا کر چلا گیا ہے۔ بیٹی بھی اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں۔''

وہ اپنی اجرک سے پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ ''اب جو زمینیں رہ گئی ہیں، وہ میری نہیں شہزاد کی زمینیں ہیں۔ صرف آم کے باغات سے سالانہ تیس بتیس لاکھ روپے کی آمدنی ہے گندم کی فصل سے حاصل ہونے والی آمدنی الگ ہے۔''

منی چاچی دیدے پھاڑ کر عظمت شاہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ''آپا مجھ پر اندھا اعتماد کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی وفات سے پہلے میرے نام وصیت لکھی تھی۔ مجھے شہزاد کے بالغ اور باشعور ہونے تک زمینوں کا واحد نگہباں بنایا تھا۔ آپا نے کہا تھا اگر مراد بیٹے کی پرورش کرنا چاہے تو اسے یہاں پہنچا دوں اور میں نے یہی کیا ہے۔''

چاچا نے جوس کا جگ اور گلاس لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ ایک گلاس میں جوس لے کر پینے لگا۔ اسی وقت شہزاد ننھے ننھے پیروں سے ایک گیند کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ وہ بچہ اپنے نانا کو پہچانتا تھا۔ عظمت شاہ نے مسکرا کر پچکارتے ہوئے دونوں بازو پھیلائے تو وہ دوڑتا ہوا اس کی گود میں آ گیا۔

نانا نے اسے چوم کر کہا۔ ''یہ دن رات میرے ساتھ لگا رہتا تھا۔ رات کو میرے ہی ساتھ سوتا تھا۔ میں ایک ماں بن کر اس کی پرورش کرتا رہا ہوں۔''

منی نے کہا۔ ''آپ جب بھی کراچی آئیں تو اس سے ملنے کے لیے آ جایا کریں۔''

''میں اسے لے جانے آیا ہوں۔''
وہ سب چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔

''وہاں میرا کوئی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں، آپ سب وہاں چل کر شہزاد کے ساتھ رہیں۔ اس کی زمین جائداد سنبھالیں۔ اس بچے کے لاکھوں روپے میرے اکاؤنٹ میں ہیں۔ اس کے باپ کو وہاں ان کا حساب رکھنا چاہیے۔ کیا مراد واپس آ گیا ہے؟''

ماروی اور منی نے مراد کو دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''میں مراد ہوں۔ کل یہاں سے لندن جا رہا ہوں۔ پتا نہیں کب واپس آؤں گا۔ اچھا ہوا جانے سے پہلے آپ سے ملاقات ہو گئی۔ میری ساس مرحومہ آپ پر اتنا اعتماد کرتی تھیں کہ اپنے نواسے کو تمام زمین جائداد کے ساتھ آپ کے حوالے کر دیا ہے۔''

''یہ آپا کی محبت تھی، بڑا پن تھا۔''

''بے شک ہم بھی آپ کو مانتے ہیں۔ آپ بہت معزز ہیں۔ ہم بھی آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔ آپ اپنے نواسے کو جب چاہیں لے جا سکتے ہیں اور لا سکتے ہیں۔ یہاں بھی اسے ماں باپ کا نانی نانا کا پیار مل رہا ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''یہ ہمارے ہی پاس رہے گا۔ کبھی آپ لے جانا چاہیں گے تو چاچی اور چاچا اسے لے کر آپ کے ساتھ زمینوں پر رہنے چلے جائیں گے۔''

عظمت شاہ نے کہا۔ ''جب تک مراد لندن سے واپس نہ آئے، آپ سب میرے ساتھ وہاں چلیں۔ شہزاد کی زمینیں اور ان کا حساب کتاب دیکھتے رہیں۔''

ان زمینوں سے لاکھوں کی آمدنی تھی۔ منی اتنی دولت اور جائداد چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ماروی! جب تک تم دونوں واپس نہیں آ جاتے ہم شہزاد کے ساتھ وہاں جا کر رہیں گے۔ ہم اپنے بچے کی زمین جائداد یونہی تو نہیں چھوڑ سکتے۔''

مراد نے کہا۔ ''میرے بیٹے کے نصیب سے یہ اچھا ہو رہا ہے۔ عظمت انکل بہت اچھے وقت پر آئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ شہزاد کی پرورش اس کی زمینوں پر ہو اور یہ ایک زمیندار کی حیثیت سے اپنا کیریئر بنائے۔''

ماروی نے خوش ہو کر کہا۔ ''وہاں اسے ننھیال اور ددھیال کی سرپرستی حاصل رہے گی۔ پھر یہ کہ چاچی چاچا زمینوں کے معاملات بھی سمجھتے رہیں گے۔''

منی نے عظمت شاہ سے کہا۔ ''ماروی اور مراد کل صبح یہاں سے جا رہے ہیں۔ ہم کل شام تک شہزاد کو لے کر آپ کے ساتھ جا سکیں گے۔ آپ یہیں ہماری کوٹھی میں ہمارے پاس رہیں۔''

عظمت شاہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہوٹل میں آرام سے ہوں۔ آج ایک رات گزارنی ہے۔ کل دوپہر کو آپ کے پاس آؤں گا پھر آپ سب کو ساتھ لے جاؤں گا۔''

وہ مراد، کیڈی اور چاچا سے مصافحہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ماروی نے شہزاد کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے تنہا ننھیال بھی نہ جانے دیتی۔ یہ چاچی کی گود میں رہا کرے گا۔ اس لیے ذرا اطمینان ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''یہ اچھا ہی ہوا۔ ہمارے پیچھے چاچی چاچا محبوب وغیرہ کی نظروں میں نہیں رہیں گے، میرا بیٹا بھی میرے رقیب سے دور رہا کرے گا۔''

مُنی نے کہا۔ ''مراد! میں کروڑوں روپے کی زمینیں ہاتھ سے جانے نہیں دوں گی۔ مجھے امید ہے عظمت شاہ ایمانداری سے آمدنی کا حساب دیا کرے گا۔ پھر بھی تم واپس آؤ گے تو سیدھے زمینوں پر آؤ گے اور وہاں کا حساب کتاب سمجھو گے۔''

اس کے حالات ایسے تھے کہ وہ زمین جائداد کی الجھنوں میں نہیں پڑسکتا تھا۔ دشمن اسے اتنا وقت دینے والے نہیں تھے۔ اس نے فی الحال ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ ''ٹھیک کہتی ہو چاچی! ہم ہنی مون سے واپس آتے ہی تمہارے اور شہزاد کے پاس آئیں گے۔ ماروی بھی شہری ہنگاموں سے دور خاموش اور پرسکون علاقے میں رہنا چاہے گی۔''

وہ بولی۔ ''میرا بیٹا جہاں رہے گا، وہاں رہوں گی۔ چاچی! ہم جلد ہی آنے کی کوشش کریں گے۔''

ان سب کی زندگی میں بڑی اہم تبدیلیاں آرہی تھیں۔ تقدیر بدل رہی تھی۔ اس لیے جگہ بدل رہی تھی۔ چاچی چاچا شہر سے دیہات کی طرف جانے والے تھے۔ ماروی اور مراد لہو اچھالنے والے ہنی مون کی سمت پرواز کرنے والے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ واپسی ہو بھی سکے گی یا نہیں؟ وہ اپنے کمروں میں جا کر سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔

☆☆☆

دوسرے دن محبوب صبح ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رات کو اچھی نیند نہیں آئی تھی۔ ماروی جانے والی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا، پھر واپس نہیں آئے گی۔ ائرپورٹ میں اس کا آخری دیدار ہوگا۔

سمیرا اس کی بے چینی کو سمجھ رہی تھی۔ رات کو اس کے پاس دیر تک رہی تھی۔ اسے خوب پلایا تھا تاکہ وہ اسے عارضی طور پر ہی سہی فراموش کر سکے لیکن وہ ڈوبنے والا پھر صبح اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر عشق نہیں کیا تھا۔ بے اختیار ہو گیا تھا۔ عمر بھر کی بے چینی خرید لی تھی۔ یہ پیار کی زبردستی تھی، وہ اس کے اندر آپ ہی آپ آجاتی تھی۔

وہ باتھ روم میں جا کر شاور لے کر سوچتا رہا۔ ''اچھا ہے جارہی ہے۔ مراد اب اسے واپس نہیں لائے گا۔ نہ جانے مجھ سے کتنی دور لے جائے گا؟''

جب سمیرا اس کے پاس ہوتی تھی تو وہ بڑے عزم سے ارادہ کرتا کہ ماروی سے اب عشق نہیں کرے گا۔ بس ایک ہوس ہے کہ اسے ایک بار حاصل کرے گا۔ پھر اس سے منہ پھیر لے گا۔ بس ایک بار وہ نکاح کے سائے میں مل جائے۔ اسے گھر والی بنا کر ایسے رکھے گا جیسے استعمال شدہ چیز کو اسٹور روم میں پھینک کر رکھا جاتا ہے۔

اس کے باوجود صبح سویرے شاور لے کر، بہترین لباس پہن کر اور پرفیوم اسپرے کر کے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ وہ فلائٹ کی روانگی سے دو گھنٹے پہلے ائرپورٹ جانا چاہتا تھا۔

اس نے فون پر انٹیلی جنس کے حماد صدیقی سے کہا۔ ''تم وہاں آٹھ بجے تک آجاؤ۔ وہاں کسٹم اور پولیس والے مراد کو روک سکتے ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ انہیں روکا جائے۔''

حماد اپنے ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت ہی اہم مسئلے میں اس طرح مصروف رہا تھا کہ اب تک بونے مراد کو دیکھنے کا وقت نہ نکال سکا تھا۔ اب اس کی مصروفیت کم ہو گئی تھی اس نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ انہیں نہ روکا جائے آپ نے مجھے کل رات بتایا ہے کہ وہ بونا ہو گیا ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا۔ کبھی کسی انسان کا قد گھٹتا نہیں ہے۔ میں بھی اسے آنکھوں سے دیکھوں گا۔''

پھر اس نے کہا۔ ''سر! ایک بات کہتا ہوں۔ آپ ایک شریف پرامن شہری ہیں۔ آپ مجرمانہ ہتھکنڈے نہیں جانتے۔ پلاسٹک سرجری بہت ایڈوانس اسٹیج پر ہے، گھنٹے دو گھنٹے میں چہرے بدل دیے جاتے ہیں۔''

محبوب نے حیرانی سے فون کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا وہ مراد نہیں ہے؟''

حماد کی بات نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ حقیقتاً بونا ہے اور اسے سرجری کے ذریعے مراد بنایا گیا ہے؟''

''بالکل یہی بات ہے۔ ہم جاسوس ہیں۔ جادو ٹونے والی بات کبھی نہیں مانیں گے۔''

''یعنی اس بونے کا محدب شیشے سے معائنہ کیا جائے تو سرجری ظاہر ہو جائے گی۔''

"نہیں، میں نے کہا نا۔ یہ ٹیکنالوجی بہت آگے جا رہی ہے۔ اب صرف پلاسٹک کا نام رہ گیا ہے ورنہ پلاسٹک کو مخصوص پروسس سے گزار کر انسانی کھال کی طرح بنالیا گیا ہے۔ محدب شیشے سے بھی پتا نہیں چلتا کہ اصلی اور نقلی کھال گردن اور تھوڑی کے نیچے کہاں جا کر مکس ہوگئی ہے۔"

محبوب نے کہا۔ "انسان نے کیسے کیسے علوم اور مہارتیں حاصل کی ہیں۔ اب دو باتیں ہمارے سامنے ہیں۔

" ایک تو یہ کہ وہ بہروپیا ہے۔ مراد ثابت نہیں ہوگا اور جب ماروی کو معلوم ہوگا کہ وہ بہروپیا ہے تو اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اسے دھتکار دے گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ رات گزار چکی ہے۔ اسے مراد کہہ رہی ہے۔ کچھ تو سوچ کر پہچان کر کہہ رہی ہوگی۔"

"سر! میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ وہ کیسے دھوکا کھا رہی ہوگی۔ وہ اتنی نادان نہیں ہے کہ ایک بونے سے شادی کر کے اس کے ساتھ راتیں گزارے گی۔ یہ کوئی لمبا چکر ہے۔"

اس نے پوچھا۔ "لمبا چکر...؟"

"ہاں۔ ایک جاسوس کا ذہن کہتا ہے کہ مراد یہاں نہیں آیا ہے اس نے ایک بونے کو اپنا ہم شکل بنا کر یہاں بھیجا ہے۔ اس سلسلے میں ماروی کو اپنا راز دار بنایا ہے۔ وہ بونا اسے بیوی بنا کر لندن مراد کے پاس لے جا رہا ہے۔"

وہ قائل ہو کر سر ہلا کر بولا "ہاں۔ تم کہہ رہے ہو تو یہ عقل آرہی ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ یہ اس بونے سے اگلوانی چاہیے۔"

وہ اضطراب میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ساڑھے سات ہو رہے ہیں۔ جلدی کرو۔ وہ ائرپورٹ جانے کے لیے نکل گئے ہوں گے۔ حماد... ! تم وہیں بونے کو پکڑو گے اور سختی سے اس کا محاسبہ کرو گے۔ ابھی فوراً نکلو' میں بھی وہاں پہنچ رہا ہوں۔"

"سر! آپ نے بتایا ہے کہ بونا تنہا نہیں آیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دوست بھی ہے۔"

"ہاں اس کا نام ایمان علی ہے۔"

محبوب فون کان سے لگائے تیزی سے باہر آیا پھر اپنی کار میں بیٹھنے لگا۔ حماد نے پوچھا۔ "وہ ایمان علی کون ہے؟ کیسا ہے؟ کیا صحت مند جوان ہے؟"

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "بالکل میری تمہاری طرح صحت مند اور قدآور ہے۔"

"کیا آپ کی طرح؟"

"ہاں"....

"کیا قد میں آپ کے برابر ہے؟"

"ہاں، میرے برابر ہے۔"

وہ چیخ کر بولا۔ "سر! آستین میں سانپ ہے۔"

محبوب نے فوراً ہی بریک لگا کر کار کو ایک طرف روکتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ کیوں چیخ پڑے؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"سر! پورا ڈراما سمجھ میں آگیا ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا سمجھ میں آگیا ہے؟"

"سر... ! میں دعوے سے کہتا ہوں۔ وہ ایمان علی نہیں، مراد علی منگی ہی ہے۔ آپ کا رقیب۔"

محبوب دیدے پھیلائے ونڈ اسکرین کے پار خلا میں تک رہا تھا۔ حماد بول رہا تھا۔ "آپ تھوڑی دیر کے لیے مجرمانہ ذہنیت اور چالبازی سے سوچیں۔ مراد زبردست پلاننگ کے مطابق کامیاب رہا ہے۔ ماروی کا نکاح واقعی مراد سے ہو چکا ہے اور وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے' آپ کی کوٹھی کی چار دیواری میں مراد کے ساتھ دن رات گزار رہی ہے۔"

"او گاڈ... ! تم بہت ہی لرزا دینے والی بات کہہ رہے ہو اور یہ بات دل کو لگ بھی رہی ہے۔"

"ابھی ائرپورٹ میں ثابت ہو جائے گا' اس بونے مراد کو صرف لیبل بنا کر لایا گیا ہے۔"

وہ سن رہا تھا اور دیدے پھیلائے خلا میں ماروی کو ایمان علی کی آغوش میں دیکھ رہا تھا۔ غصے سے دماغ گرم ہو رہا تھا۔

یہ سوچ کر انسلٹ محسوس ہو رہی تھی کہ ماروی بھی مراد کی پلاننگ میں شریک رہ کر اسے دھوکا دے رہی ہے اور کتنی صفائی سے الو بنا کر ہنی مون منانے جا رہی ہے۔

وہ غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "حماد! میں راستے میں ہوں۔ فون بند کر رہا ہوں۔ تم فوراً ائرپورٹ پہنچو۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ پھر اسٹیئرنگ پر زور کا ہاتھ مار کر اسے اسٹارٹ کیا۔ تیز رفتاری سے فرار ہونے والوں کی سمت جانے لگا۔

ماروی مراد اور عبداللہ دو گھنٹے پہلے آگئے تھے۔ وہاں معلوم ہوا کہ جہاز ایک گھنٹے کی تاخیر سے یعنی گیارہ بجے پرواز کرے گا۔ لندن کے مسافروں کو ابھی اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ تینوں باہر کھڑے ہوئے تھے۔

محبوب ٹھنڈا دماغ رکھنے کا عادی تھا۔ اسے کبھی کبھی غصہ آتا تھا لیکن کوشش کرتا تھا کہ غصہ ظاہر نہ ہو۔ وہ کار سے نکل کر تیزی سے چلتا ہوا عمارت کے اندر آیا۔ پھر لوگوں کے

ہجوم میں دور کھڑی ماروی کو دیکھ کر ذرا رک گیا۔
وہ عبایا اور نقاب میں تھی لیکن قریب ہی ایمان علی تھا۔ وہ رُک کر اسے دیکھنے اور سوچنے لگا۔ وہی تو دل و ایمان تھی۔ ماروی کیا تھی؟ فقط پیدائشی حسن تھا اور فطری سادگی تھی۔ اس وقت وہ پریشان ہو کر مراد سے کہہ رہی تھی۔ ''میں تنہا کبھی گوٹھ سے شہر نہیں آئی۔ اتنی دور لندن کیسے جاؤں گی۔''
مراد نے کہا۔ ''خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ صرف یہاں ہم سے دور رہنا ہے۔ جیسے ابھی ہم قریب بھی ہیں اور ایک دوسرے سے انجان بھی۔ میں دوسری طرف منہ کر کے فون کان سے لگائے جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہوں۔ تم بھی یہی کر رہی ہو۔ کسی کو شبہ نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے بول رہے ہیں۔''
اس نے پوچھا۔ ''میں اندر کہاں جاؤں گی؟''
وہ بولا۔ ''سامنے شیشے کے پار دیکھو۔ دوسری فلائٹوں میں جانے والے مسافر سامنے بنے ہوئے کاؤنٹروں کے پاس جا رہے ہیں۔ وہاں سے بورڈنگ کارڈز حاصل کر رہے ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ادھر ائرپورٹ کا عملہ ہے۔ تمہیں ہر معاملے میں گائڈ کرتا رہے گا۔''
ماروی نے چونک کر ایک سمت دیکھا۔ پھر کہا۔ ''مراد... !محبوب آرہے ہیں۔''
محبوب نے نقاب میں پہچان لیا تھا۔ پھر بھی دور کھڑے ہوئے عبداللہ کے پاس آکر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ماروی کہاں ہے؟''
اس نے کہا۔ ''وہ ادھر نقاب میں ہے۔''
''تعجب ہے، یہ پردہ تو نہیں کرتی تھی۔''
''مجبوری ہے سائیں! میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں میری زوجہ بھی جائے۔ میرا چہرہ دیکھتے ہی انٹیلی جنس اور پولیس والے مجھے مراد علی منگی کہیں گے۔ میری وجہ سے یہ مصیبت میں پڑ جائے گی۔ اس لیے ظاہر کر رہی ہے کہ تنہا یہاں سے جا رہی ہے۔''
محبوب نے کہا۔ ''ہوں اسی لیے ایمان علی بھی اس سے منہ پھیر کر کھڑا ہوا ہے۔''
وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ماروی کے پاس آیا پھر قریب آکر بولا۔ ''میں نے چھپنے کے باوجود تمہیں دور سے پہچان لیا تھا۔''
''میں آپ سے چھپ کر نہیں جا رہی ہوں۔''
''جب سے میری زندگی میں آئی ہو تب سے سامنے رہتے ہوئے بھی اپنا اصلی روپ نہیں دکھایا۔ اس روپ کو ہمیشہ خود غرضی کی عبا اور نقاب میں چھپاتی آئی ہو۔''
ایمان علی (مراد) نے گھوم کر دیکھا۔ محبوب سے اس کی نظریں چار ہوئیں۔ وہ سب اسے فریب دے رہے تھے اور وہ دل کو سمجھا رہا تھا۔ ''مجھے طیش میں نہیں آنا چاہیے۔ اب میں دھوکا نہیں کھا رہا ہوں۔ ابھی ان سب کی رگیں سیدھی کر دوں گا۔''
اس نے ماروی سے کہا۔ ''میں تھوڑی دیر تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ذرا ایک طرف چلو۔''
ماروی نے چور نظروں سے مراد کو دیکھا۔ اس نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ''آپ تنہائی میں جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہاں بھی کہہ سکتے ہیں۔''
وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''تنہائی ضروری ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔ ورنہ ابھی حماد اپنے عملے کے ساتھ آئے گا اور تم تینوں کو انکوائری کے لیے لے جائے گا۔''
یہ ایسی دھمکی تھی کہ مراد نے پریشان ہو کر محبوب کو دیکھا۔ وہ مراد سے انجان بنا ہوا تھا۔ اسے اہمیت نہیں دے رہا تھا۔ ماروی نے سہارے کے لیے مراد کو دیکھا تو اس نے نظریں جھکا لیں۔ یعنی اجازت دے دی۔ وہ ایک طرف چل پڑی۔ مسافروں کی بھیڑ سے نکل کر ایک ستون کے پاس آکر رک گئی۔ وہ پیچھے آرہا تھا۔ اس کے سامنے آکر بولا۔ ''بھید کھل گیا ہے۔'' ماروی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑے سخت اور پختہ لہجے میں بولا۔ ''وہ بونا مراد نہیں ہے۔ مراد ایمان علی کے پیچھے روپوش ہے۔''
وہ چونک کر گھبرا کر اسے دیکھنے لگی وہ بولا۔ ''ابھی حماد آئے گا تو ان دونوں کو الگ الگ سیل میں لے جائے گا پھر ان کے اندر چھپے ہوئے بہروپیوں کو باہر لے آئے گا۔''
وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''آپ نے حماد کو کیوں بلایا ہے کیا آپ مجھ سے دشمنی کر رہے ہیں؟''
''کیا تم دوستی کرتی آرہی ہو؟''
اس کی نظریں جھک گئیں۔ اس نے کہا۔ ''کبھی تنہائی میں میرے لیے اتنا سوچا ہے کہ میں نے پیار کی ابتدا سے اب تک کتنی نیکیاں تم سے کی ہیں؟ کس طرح اپنے اربوں روپے کے کاروبار کو خسارے میں ڈالتے ہوئے تمہارے لیے گولی کھائی ہے۔ مراد کی جگہ جیل گیا ہوں۔ کیا کوئی کسی کے لیے پھانسی کے تختے پر چڑھنے جاتا ہے؟ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں نے تمہارے عاشق کی طویل غیر موجودگی میں تمہاری آبرو پر آنچ نہیں آنے دی۔''

ماروی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولی۔ ''خدا جانتا ہے میں آپ کی کتنی عزت کرتی ہوں۔''

''واہ کیا خوب عزت کرتی ہو میری' واہ... گولی میں کھاتا ہوں پیار اس سے کرتی ہو۔ جیل میں جاتا ہوں، بلائیں اس کی لیتی ہو۔

''کیا عزت ایسے ہی کی جاتی ہے؟ جس آبرو کا محافظ میں بن کر رہا۔ اسے بچپن کے یار کو دیتی ہو۔ مراد اور بونے مراد کی دھوکے بازی میں شریک ہو کر میری توہین کر رہی ہو یا عزت بڑھا رہی ہو؟''

اس کا سر جھکا ہوا تھا، وہ بولی۔ ''عشق نے آپ کو دو کوڑی کا کر دیا۔ آپ دولت عزت اور نیک نامی سب ہی کو داؤ پر لگا کر مجھے ہار چکے ہیں۔ مجھے بھی مراد کے عشق نے آپ کی نظروں میں بے وفا اور فریبی بنا دیا ہے۔ میں کیا کروں؟ میں آپ کے لیے ضروری ہوں اور مراد میرے لیے ضروری ہے۔

''میں آپ کا دل توڑ رہی ہوں۔ آپ سمیرا جیسی پیار کرنے والی کا دل توڑتے آرہے ہیں۔ عشق میں صرف اپنا یار اپنی محبوبہ دکھائی دیتی ہے۔ اربوں کا کاروبار بچانے والی کو بھی اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہم سب خود غرض ہیں محبوب صاحب!''

محبوب نے ایک طرف دیکھا۔ حماد صدیقی اپنے دو ماتحتوں کے ساتھ گاڑی سے اتر رہا تھا۔ اس کے آگے والی کار سے معروف جنگی باہر آرہا تھا۔ انہوں نے ایک ستون کے پاس محبوب اور ماروی کو دیکھا۔ ماروی انہیں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ ''کیا آپ جانے نہیں دیں گے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی آتا ہوں۔''

وہ وہاں سے آگے بڑھ کر معروف اور حماد صدیقی کے پاس گیا۔ ان سے کچھ کہنے لگا۔ سفر کرنے والوں کی سمجھ میں آرہا تھا کہ شاید وہ نہیں جاسکیں گے۔

ماروی دور سے مراد اور کیڈی کو دیکھ رہی تھی۔ مراد بھی حماد صدیقی کو دیکھ کر پریشان ہوگیا تھا۔ پھر محبوب ماروی کے پاس آگیا۔ حماد اور معروف، مراد اور عبداللہ کی طرف جانے لگے۔

ماروی پریشان ہو کر مراد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے محبوب کے آتے ہی کہا۔ ''آپ مراد کو کسی حد تک جانتے ہیں۔ میں اسے بچپن سے جانتی ہوں۔ ابھی اسے جانے سے روکا جائے گا تو وہ اصلی روپ میں آجائے گا۔ یہاں قیامت آجائے گی۔ یہ ائرپورٹ میدان جنگ بن جائے گا۔''

''میں جانتا ہوں۔ وہ گرفتاری پیش نہیں کرے گا، مار دھاڑ کا عادی ہوگیا ہے لیکن سراسر نقصان میں رہے گا۔ کیا یہ کم نقصان ہوگا کہ تم اس کے ساتھ نہیں جاسکو گی؟''

ادھر حماد صدیقی نے آکر پہلے حیرانی سے بونے مراد کو دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا۔ ''ویل مسٹر ایمان علی تم نے زبردست ڈراما پلے کیا ہے۔ میں تمہیں ایمان کہوں یا مراد؟''

وہ بولا۔ ''میں یہاں سے لندن تک ایمان علی ہوں، میرے کاغذات مستند ہیں۔ انہیں کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ ابھی ایک فون کال پر میرے ڈیڈی ڈاکٹر ثمین سن تصدیق کریں گے۔ ہمارا پورا خاندان گواہی دے گا کہ میں ان کا بیٹا ہوں۔''

معروف نے کہا۔ ''میں حیران ہوں کہ پلاسٹک سرجری ایسا کرشمہ دکھاتی ہے۔ ایک بونا بالکل مراد علی منگی بن گیا ہے۔''

وہ مراد کو دیکھ کر بولا۔ ''اور تم مراد ہو۔''

''کوئی مائی کا لال مجھے مراد ثابت نہیں کرسکے گا۔''

حماد نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں مانتا ہوں، تمہارے چہرے پر سرجری ثابت نہیں کی جاسکے گی۔ لیکن تمہیں انکوائری کے مرحلوں سے گزارنے کے لیے روکنا پڑے گا۔ پھر جب تک اس بونے کی اصلیت معلوم نہ ہو، اسے بھی انکوائری سیل میں رکھنا ہوگا۔ قانون معلوم کرنا چاہے گا کہ یہ مفرور اور مطلوبہ مجرم مراد علی منگی کا ہم شکل کیسے ہوگیا ہے؟''

محبوب نے ماروی سے کہا۔ ''یہ مطلوبہ مجرم کا ہم شکل کیسے بن گیا۔ اس کی ایک لمبی کہانی عدالت میں سنائی جائے گی جسے شاید مان لیا جائے لیکن جب تک مقدمہ طویل ہوتا جائے گا، مہینوں اور برسوں بھی گزر سکتے ہیں۔ پھر سوچو کہ مراد کتنے عرصے تک ایمان علی بن کر یہاں اس کا مقدمہ لڑتا رہے گا اور کس رشتے سے تمہارے قریب رہے گا؟''

وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ بولا۔ ''تم ایک مجرم کے احمقانہ عشق میں صرف نقصان اٹھاتی رہو گی۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو ابھی نہ جاسکیں تو یہاں رہ کر اس کے ساتھ ازدواجی گھریلو زندگی نہیں گزار سکو گی۔''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''خدا کے لیے دشمنی نہ کریں۔''

وہ بولا۔ ''دشمنی رقیب سے ہے تم سے نہیں ہے۔ پہلی بار تم میمن گوٹھ میں نظر آئی تھیں۔ اس پہلے لمحے سے تمہارا دوست ہوں۔ تم چاہو تو اب بھی دوستی نباہ سکتی ہو۔''

''آ۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''کیا میری دوستی سے اب تک کوئی نقصان پہنچا ہے؟''
ماروی نے انکار میں سر ہلایا، وہ بولا۔ ''آئندہ بھی نہیں پہنچے گا۔ آج ایک اہم وعدہ کرو۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر پورے ایمان سے بولو کہ مراد کے بعد صرف میں ہی تمہارا عاشق، تمہارا مطلوب اور محبوب رہوں گا۔''
ماروی نے اس عجیب و غریب دیوانے کو بڑی عقیدت سے دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ''یہ سچے ایمان سے بولو مراد کے بعد صرف مجھے سوچو گی اور مجھے یاد کرتی رہو گی۔''
پھر اس نے اپنے دل کی آخری بات کہی۔ ''خدانخواستہ وہ نہ رہا تو تم میری دلہن بن جاؤ گی۔''
وہ چونک کر بولی۔ ''یہ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میرا مراد کیوں نہیں رہے گا؟''
''دنیا میں کوئی بھی نہیں رہتا۔ میں بھی نہیں رہوں گا۔ ہوسکتا ہے اس سے پہلے میں مر جاؤں۔ میری دیوانگی کو بھی تو سمجھو۔ ابھی تو نہ جانے کب تک تمہاری آرزو میں جیتا رہوں گا اور انتظار کرتا رہوں گا۔
''یہ انتظار کہ آج نہیں تو کل میرے پاس لوٹ کر آؤ گی۔ مراد بھی یہی سوچتا ہے کہ میں مر جاؤں تو تمہیں ہمیشہ کے لیے مجھ سے نجات مل جائے گی۔ ہم رقیب ہیں۔ ایک دوسرے کی سلامتی کے لیے نہیں سوچیں گے۔ کسی ایک کی موت سے منافع میں تم ملو گی۔'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''تم پرائی ہو چکی ہو۔ پھر بھی رقیب کی موت کا اور تمہاری واپسی کا انتظار کرتا رہوں گا۔''
ماروی نے اسے بڑی عقیدت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ سوچ کر میرے اندر کی عورت خوش ہوتی ہے کہ آپ جنون کی حد سے گزر کر میری آرزو کرتے ہیں۔
''آپ نے میرے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ہم میں سے کسے پہلے مرنا ہے اور کسے لمبی عمر جینا ہے؟
''میں وعدہ کرتی ہوں اگر آپ وفات پاگئے تو آپ کے لیے آنسو بہاتی رہوں گی۔ خدانخواستہ مراد نہ رہا تو صرف اور صرف آپ کے پاس آؤں گی۔ ابھی آپ ہمیں جانے دیں۔''
''پہلے مراد کی قسم کھاؤ۔''
''میں اپنے بچپن کے پیار کی، اپنے دلدار کی اپنے مراد کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مراد کے بعد آپ ہی میرے جسم و جان کے حقدار، میرے وجود کے مالک بن کر رہیں گے۔''
''بوڑھی ہو جاؤ گی، تب بھی آؤ گی؟''
''ہاں تب بھی لاٹھی ٹیکتی ہوئی آؤں گی۔''

"اور کبھی کبھی فون پر اپنی آواز سناؤ گی۔"

"میں دنیا کے آخری سرے سے بھی آپ کو پکاروں گی لیکن میری بھی ایک خواہش پوری کریں۔"

"ہزاروں خواہشیں پوری کروں گا۔"

"صرف ایک خواہش کر رہی ہوں۔ میری زندگی میں ایک جیون ساتھی آگیا ہے۔ اپنی زندگی میں بھی ایک شریک حیات لے آئیں۔ سمیرا بے مثال بیوی ثابت ہوگی۔"

"شادی کروں گا تو تم واپس نہیں آؤ گی۔ سوکن کو برداشت نہیں کرو گی۔"

"میں سوکن کے ساتھ رہنے نہیں آؤں گی' آپ کے ساتھ الگ زندگی گزاروں گی۔"

"پھر تو تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔ اب تمہیں جانا چاہیے۔ فلائٹ کا وقت ہو رہا ہے۔"

وہ ماروی کے ساتھ چلتا ہوا مراد اور حماد کے پاس آیا۔ پھر بولا۔ "حماد! انہیں جانے دو۔ چیکنگ کے دوران کوئی رکاوٹ پیش آئے تو اسے دور کرو... ماروی کو ہر حال میں جانا ہے۔"

پھر اس نے ماروی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "چلیے معروف صاحب! میرا دل اور دماغ ہلکا ہو گیا ہے۔ ماروی کی سچائی کو آخری بار آزما رہا ہوں۔ فی الحال خوش رہا کروں گا۔"

اس نے مراد کی طرف نہیں دیکھا۔ ماروی پر آخری مسکراتی ہوئی نظر ڈالی۔ پھر معروف کے ساتھ بوجھل قدموں سے جاتے ہوئے دل ہی دل میں کہنے لگا۔ "ماروی! میری جان! میں بیان نہیں کر سکتا۔ صرف خدا جانتا ہے کہ کس دل سے کس حوصلے سے تیری دوری برداشت کر رہا ہوں۔ یہ دل تا حیات میرے سینے میں رہے گا۔ مگر تیرے ہی لیے دھڑکے گا۔ میں سوؤں گا تو تیرے خواب دکھائے گا۔ جاگوں گا تو تیرے دھیان میں خوابیدہ رکھے گا۔ تجھے کچھ ہوجائے گا تو یہ سینے کی دیوار سے سر پھوڑے گا۔ ماروی تو جارہی ہے۔ آدھی جان لے جارہی ہے۔ جا اور جب چاہے باقی آدھی بھی لے جانا۔"

وہ اپنی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے زیر لب بولا۔ "کہاں جاؤں؟ میرے آنے جانے کے تمام راستے ماروی لے جارہی ہے۔ میں بے راہ بے سمت ہو گیا ہوں۔ اے جانِ حیات! تیری عمر دراز ہو۔"

کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ فی الحال کوئی راستہ ماروی کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

☆☆☆

لندن کے برن ہاؤس کے قریب ایک بہت بڑے اسٹیڈیم میں رائفل شوٹنگ کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ صحیح نشانہ میں اول دوم اور سوم آنے والوں کے لیے ہزاروں پاؤنڈز کے انعامات رکھے ہوئے تھے۔ یورپ کے کئی ممالک سے مانے ہوئے شوٹرز مقابلہ جیتنے کے لیے وہاں آئے تھے۔

ایسے وقت بلا اپنی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہاں پھر ایک بار میکی براؤن کو نقصان پہنچانے کی پلاننگ پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ بشریٰ عرف بلی نے کہا۔ "میں بھی وہاں جاؤں گی۔ مجھے بھی رائفل شوٹنگ سے دلچسپی ہے۔"

وہ بولا۔ "میں وہاں تماشا دیکھنے نہیں جا رہا ہوں۔ مجھے میکی پر پھر ایک بار زبردست حملہ کرنا ہے۔"

"تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل۔"

"وہاں مجھے اپنی سلامتی کی فکر ہوگی۔ میں تیری حفاظت نہیں کرسکوں گا۔"

"میں کوئی بچی نہیں ہوں۔ تیری انگلی پکڑ کے نہیں جاؤں گی۔ خود ہی کہتا ہے کہ مجھے مرینہ کی طرح زبردست فائٹر بننا چاہیے اور خود ہی ایسی جگہ جانے سے روکتا ہے۔ میں نہیں جاؤں گی تو کس طرح خطرات سے کھیلنا آئے گا؟"

بلے نے اسے بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر آگے بڑھ کر اس پر جھک گیا۔ اسے دونوں بازوؤں میں بھر کر پیار کرنے لگا۔ وہ بڑی اداؤں سے مسکرا کر بولی۔ "کیا میں پھر سے نئی لگ رہی ہوں؟"

"تُو تو ہر روز نئی لگتی ہے۔ دل کہتا ہے' تجھے شیشے کے شوکیس میں سنبھال کر رکھوں۔ باہر کی مٹی دھول لگنے نہ دوں۔ گھر کی چار دیواری سے باہر کسی کی نظر نہ لگنے دوں۔"

وہ اسے محبت سے سمیٹ رہا تھا۔ چوم رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ "میں مجبور ہو گیا ہوں۔ عقل کہتی ہے' تُو ایک گھریلو عورت بن کر نہیں رہ سکے گی۔"

"اسی لیے تو میں نے سن سٹی میں رائفل شوٹنگ' کار ڈرائیونگ' فائٹنگ اور انگلش لینگویج سیکھی ہے۔"

وہ بولی۔ "دل پتھر کر لے۔ مجھے کانچ کی عورت نہ بنا۔ مجھے اپنے ساتھ لے چل۔ میں تیرے لیے پرابلم نہیں بنوں گی۔ اپنی حفاظت آپ کروں گی۔"

تنہائی ہو اور جذبات چیخ رہے ہوں تو عورتیں اپنی باتیں منوا لیتی ہیں۔ پھر حالات کا بھی تقاضا تھا کہ آغوش میں کھیلتے رہنے والی کو فل آف ایکشن بنانا ہے۔ وہ راضی ہو

گیا۔ اس نے کہا۔ ”تجھے تنہا اسٹیڈیم میں جانا ہوگا۔ میری معلومات کے مطابق میکی براؤن وہاں آنے والا ہے۔“

وہ منہ بنا کر بولی۔ ”تو میرے ساتھ کیوں نہیں جائے گا؟“

”میں ایک الگ طرح کی واردات کرنے جا رہا ہوں۔ میرا راستہ الگ ہے۔“

”کیا کوئی بڑی خطرناک واردات کرنے والا ہے؟“

”ہاں زبردست دھماکا ہوگا تو بھی آواز سنے گی۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا' چاہے جیسا بھی ہنگامہ برپا ہو اسٹیڈیم کے باہر پارکنگ ایریا کی طرف ہرگز نہ جانا۔“

”کبھی نہیں جاؤں گی۔“

”تو وہاں میکی براؤن کو دیکھے گی۔ شاید اس کا بیٹا جیکی براؤن بھی باپ کے ساتھ ہوگا۔“

وہ اُچھل کر بولی۔ ”پھر تو میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔“

بلے نے اس کی پیٹھ پر ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”کیا مرنے کے لیے جا رہی ہے؟ کیا وہ لوگ چوڑیاں پہن کر آئیں گے؟ ہزاروں کی بھیڑ میں گولی چلا کر فرار ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ وہ باپ بیٹے سخت سیکیورٹی میں ہوں گے اور وہ درجنوں سیکیورٹی گارڈز عام لباس میں ہوں گے۔ تو سب ہی کو پہچان نہیں سکے گی۔ دھوکا کھا جائے گی۔ وہ تجھے گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔“

وہ مایوس ہو کر بولی۔ ”تو کہتا ہے تو کچھ نہیں کروں گی لیکن یہ تو بتا تو کیا کرنے والا ہے؟“

”میری بات ابھی نہ پوچھ۔ مجھے تیری فکر ہو گئی ہے۔ اگر اُلٹی کھوپڑی سے کوئی کام کیا نا' تو ٹانگیں توڑ کر گھر میں بٹھا دوں گا۔ پھر کبھی باہر نہیں جا سکے گی۔“

”کہہ تو رہی ہوں' کچھ نہیں کروں گی۔“

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولا۔ ”یاد ہے نا' تو اسٹیڈیم کے باہر پارکنگ ایریا کی طرف نہیں جائے گی۔“

”پھر میں اپنی گاڑی کہاں پارک کروں گی؟“

”گاڑی میں لے جاؤں گا۔ تو ٹیکسی میں جائے گی۔ میں واپسی میں تجھے وہاں سے لے آؤں گا۔“

مرینہ بھی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ وہ مقابلے میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ اگر مقابلہ کرتی تو تمام ٹارگٹ شوٹرز کو مات دے دیتی۔ پہلا انعام پچاس ہزار پاؤنڈ ضرور حاصل کرتی لیکن میٹ ڈیپارٹمنٹ کے جاسوس اور افسران تاڑ لیتے کہ وہ نئے چہرے کے پیچھے چھپی ہوئی مرینہ ہے۔

وہ ایک نوجوان ترکش گرل کے روپ میں تھی۔ اس کا موجودہ نام ثلاثہ تھا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے سراغ رسانوں اور افسروں سے چھپ رہی تھی۔ اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو مراد کے سر کی قیمت وصول نہیں کرنے دے گی اور آئندہ کبھی ان کے سامنے نہیں آئے گی۔

اپنے ڈیپارٹمنٹ سے بغاوت کا مطلب یہ تھا کہ ان سے دشمنی مول لی تھی۔ وہ سب جانتے تھے کہ مراد اس کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ وہ لندن میں ہے۔ اس نے ریڈ الرٹ کے میکی براؤن کے بیٹے کو گولی مار کر پورے لندن میں کھلبلی پیدا کر دی تھی۔

براؤن فیملی کو کوئی چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کجا یہ کہ اس نے ائرپورٹ کی عمارت کے باہر سرِعام اس کی فیملی کے ایک اہم فرد کو گولی سے اڑا دیا تھا۔

بلے نے جو کارنامہ انجام دیا تھا، وہ مراد کے نام ہو رہا تھا۔ کئی خطرناک تنظیموں کے شوٹرز اسے ڈھونڈنے اور قتل کرنے لندن پہنچ گئے تھے اور اب مراد تک پہنچنے کے لیے مرینہ کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اسی لیے اس نے ثلاثہ کے نام سے اپنا چہرہ اور اپنی شخصیت تبدیل کر لی تھی۔ ان سب سے چھپ رہی تھی اور ان کے آس پاس رہ کر ان کی مصروفیات کو سمجھنا چاہتی تھی۔

وہ اسی مقصد کے لیے رائفل شوٹنگ کا مقابلہ دیکھنے آئی تھی۔ اس نے عارضی طور پر ایک بوائے فرینڈ کی خدمات حاصل کی تھی۔ لندن میں ایسے بے روزگار جوان کثرت سے پائے جاتے ہیں جو روزانہ اُجرت پر باپ بھائی اور شوہر بن کر صبح سے رات تک ساتھ گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔

اسٹیڈیم کے اندر تماشائی ہزاروں کی تعداد میں تھے خطرناک تنظیموں کے سربراہ اپنے دوست احباب کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے آئے تھے۔ وہ اپنے مجرمانہ مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ پوائنٹس حاصل کرنے والوں کو خریدنا چاہتے تھے۔ ایسے شوٹنگ کے مقابلوں میں انہیں ماہر اور خطرناک شوٹرز مل جایا کرتے تھے۔

میکی براؤن ابھی اپنی بیوی ہیلنا، بیٹے جیکی براؤن اور جوان بیٹی میڈونا کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے اطراف سخت سیکیورٹی تھی۔ دوسری تنظیموں کے گن مین بھی ان کے محافظ بن گئے تھے۔ ان کی قیمتی کار اور دوسری گاڑیاں اسٹیڈیم کے باہر کھڑی ہوئی تھیں۔ ان خالی گاڑیوں کے آس پاس بھی دو چار مسلح گارڈز موجود تھے۔

لندن میں انڈر گراؤنڈ ڈرین سسٹم تہ خانوں کی صورت میں پھیلا ہوا ہے۔ شہر کی تمام غلاظتیں ان تہ خانوں

کے نالوں سے گزرتی ہیں۔ انہیں تیزی سے بہا دینے کے لیے کئی سمتوں سے پانی بہت تیز رفتاری سے بہتا رہتا ہے۔

بلال احمد بلا اس انڈر ڈرین سے گزر رہا تھا، اس کے چہرے پر آکسیجن ماسک تھا تاکہ وہ ناقابلِ برداشت بدبو سے محفوظ رہے۔ اس کی پشت سے آکسیجن سلنڈر بندھا ہوا تھا۔ اس انڈر ڈرین کے اوپر اسٹیڈیم کے پاس جہاں گاڑیاں تھیں، وہاں اس کا ایک ماتحت کھڑا تھا۔ فون کے ذریعے بلے کو اوپر کے حالات بتا رہا تھا۔

بلے کا فون اس کی جیب میں تھا۔ اس کے کانوں سے ہینڈ فری لگا ہوا تھا اور وہ معلوم کر رہا تھا کہ میکی براؤن کی کار کے پاس دو مسلح گارڈز ٹہلتے ہوئے دور جاتے ہیں پھر واپس آتے ہیں۔

بلے نے ایک دن پہلے اس واردات کی ریہرسل کر لی تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اسے انڈر ڈرین کے کتنے کوریڈور سے گزر کر اس گٹر کے ڈھکن تک پہنچنا ہے جہاں اسٹیڈیم کے باہر کئی گاڑیوں کو پارک کیا جاتا تھا۔

بعض اوقات کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے کیچڑ دلدل اور گٹر سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ وہاں بہت ہی گندا پانی بہہ رہا تھا۔ اگر اس کی ناک اور منہ پر گیس سلنڈر نہ ہوتا تو وہ ایک سے دوسری سانس نہ لے پاتا۔ وہیں چکرا کر گر پڑتا۔

وہ دو کوریڈور سے گزرتا ہوا تیسرے کوریڈور میں آیا۔ ایک لوہے کی پتلی سی سیڑھی اوپر چھت تک گئی تھی۔ سیڑھی کے اوپری حصے میں گٹر کا ڈھکن تھا۔ جسے کھول کر وہ باہر اسٹیڈیم کے پارکنگ ایریا میں جا سکتا تھا۔

اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ماتحت سے کہا۔ ”میں گٹر کے ڈھکن کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ گارڈز کدھر ہیں؟“

ماتحت نے کہا۔ ”میکی براؤن کی کار کے پاس ہیں۔ ذرا رک جاؤ۔ جب وہ دور جائیں گے تو میں تمہیں بتاؤں گا پھر تم ڈھکن کھولو گے۔“

”کیا میکی کی کار ڈھکن سے لگی ہے؟“

”نہیں۔ کوئی دوسری گاڑی ہے اس کے ساتھ۔ میکی کی کار ڈھکن سے تین یا چار فٹ کے فاصلے پر ہے۔“

اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”وہ دونوں گارڈز باتیں کرتے ہوئے کار سے دور جا رہے ہیں۔ ڈھکن کھولو۔“

بلا چھت اور ڈھکن سے لگا ہوا تھا۔ ڈھکن پیچ دار تھا۔ وہ ایک روز پہلے دیکھ چکا تھا۔ اسے دائیں طرف گھماتے ہوئے کھولنے لگا۔ ایک منٹ کی محنت سے وہ کھل گیا۔ اس نے ڈھکن کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ باہر کی تازہ ہوا آ رہی تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے دائیں بائیں دور تک کئی گاڑیوں کے پہیے نظر آ رہے تھے۔ بالکل قریب ہی میکی کی سیاہ ہنڈا اکارڈ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گارڈز جو دور گئے تھے کسی وقت بھی واپس آ سکتے تھے۔ بلے نے ٹائم بم نکال کر پندرہ منٹ کا وقت مقرر کیا۔ گٹر سے ہاتھ نکال کر اسے ہنڈا اکارڈ کی طرف زمین پر رکھا۔ پھر اندر ہو کر ڈھکن کو اس کی جگہ واپس رکھ دیا۔ جلدی سے سیڑھیاں اتر کر دوڑتے ہوئے وہاں سے دور جانے لگا۔

اب اسے پھر گندے پانی سے گزرنا تھا اور پندرہ منٹ سے پہلے دور جا کر دوسرے گٹر کے ڈھکن سے باہر نکل جانا تھا۔ وہ گیس ماسک اور سلنڈر کو اتار کر پھینکتا جا رہا تھا۔

اسٹیڈیم کے اندر ٹارگٹ کے مطابق شوٹنگ دلچسپ مرحلے سے گزر رہی تھی۔ بشریٰ اسٹیڈیم کے اس حصے میں آ کر بیٹھ گئی ’جہاں میکی براؤن اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ان کے پیچھے میکی کا پرسنل اسسٹنٹ برونز انو بیٹھا ہوا تھا۔ ہیلنا نے اپنے پرس کو کھول کر دیکھا پھر برونز انو سے کہا۔ ”پلیز باہر جاؤ۔ میں اپنا فون کار میں بھول آئی ہوں اسے لے آؤ۔“

میکی براؤن نے اسے کار کی چابی دی۔ وہ وہاں سے جانے لگا۔ وہ میکی کا قابلِ اعتماد عمر رسیدہ ملازم تھا لیکن ان دنوں اپنے آقا سے ناراض تھا۔ ملازمت چھوڑ کر جا نہیں سکتا تھا۔ میکی براؤن اپنے اصولوں کے مطابق رازدار ملازموں کو سخت پابندیوں میں رکھتا تھا۔ اگر کبھی کوئی اسے چھوڑ کر جانا چاہتا تو اس کے گن مین اسے گولی مار دیتے تھے۔

وہ اپنے حالات سے مجبور تھا۔ اس وقت شکست خوردہ انداز میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسٹیڈیم سے باہر آیا پھر بلیک ہنڈا اکارڈ کی طرف جانے لگا۔ اس کے پیچھے مرینہ تھی۔

وہ اپنی پلاننگ کے مطابق باہر جا کر برونز انو سے دوستی کرنا اور اس سے لمبی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس سے میکی براؤن کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا تھا۔ اگر وہ بوڑھا پی اے اس کی بات نہ مانتا تو اسے گن پوائنٹ پر وہاں سے دور لے جانا چاہتی تھی۔

بلاسٹنگ کا مقررہ وقت پورا ہو رہا تھا، برونز انو ہنڈا اکارڈ سے پانچ گز کی دوری پر تھا۔ ایسے وقت ایک زوردار دھماکا ہوا۔ بلیک ہنڈا اور اس کے قریب کھڑی ہوئی گاڑی فضا میں اڑیں پھر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوتی ہوئی نیچے آئیں۔

بوڑھا برونزا نولو کھڑا کر گرا۔ ایسا دہشت زدہ ہوا کہ بھاگنے کی سکت نہ رہی۔ مرینہ اس کے پیچھے تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کے قریب آکر اسے کھینچتی ہوئی دور لے جانے لگی۔

فضا میں اُڑ کر نیچے آنے والی گاڑیوں کے ٹکڑے دور تک گولیوں کی طرح جا رہے تھے۔ ایک ٹکڑا بوڑھے کو آکر لگا۔ وہ ایک ذرا تڑپ کر بے ہوش ہو گیا۔

وہ ایسی دہشت پھیلانے والا دھماکا تھا کہ اسٹیڈیم کے اندر بھگدڑ ہونے لگی۔ میکی براؤن اور اس کے بیوی بچے کرسیوں کے درمیان دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ درجنوں مسلح گارڈز ان کے چاروں طرف قلعے کی دیوار بن گئے تھے۔

وہیں قریب ہی بشریٰ چند سادہ لباس والوں کو دیکھ رہی تھی۔ بھاگنے والی عورتیں اور مردان گارڈز کو بھی دھکے مارتے ہوئے گزر رہے تھے اور وہ گارڈز لوگوں کے بہتے ہوئے سیلاب کو اپنے قریب سے گزرتے وقت روک نہیں سکتے تھے۔

ایسے وقت بشریٰ نے میکی کے بیٹے جیکی براؤن کو دیکھا۔ اچانک کھوپڑی میں بات آئی' اس سیلابی ریلے میں گولی چلائے گی تو کوئی اسے دیکھ نہیں پائے گا۔ جب دشمنوں کے قریب پہنچی ہوئی ہے تو کچھ کر گزرنا چاہیے۔

اس وقت وہ بھی کرسیوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی۔ اس نے بڑی پھرتی سے اپنی گن میں سائلنسر لگایا۔ ایسے وقت سر اُٹھا اُٹھا کر آتے جاتے' بھاگتے ہوئے لوگوں کو بھی دیکھتی رہی۔ وہ ٹارگٹ کلنگ کی بہت ہی مناسب سچویشن تھی۔

آگے کچھ فاصلے پر دونوں باپ بیٹے کرسیوں کے درمیان سے کبھی کبھی سر اُٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ جب بیٹے نے سر اُٹھایا تو بشریٰ نے گولی چلا دی۔ وہ کچھ کر گزرنا چاہتی تھی لیکن کچھ سے زیادہ ہی کر گزری۔ جیکی کے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ وہ چیخ چاروں طرف کے شور ہنگاموں میں... گڈمڈ ہو گئی۔ اس کا لباس لہو سے تر ہوا تو انہیں پتا چلا کہ کہیں سے گولی آئی تھی۔

وہ فوراً ہی بھاگنے والوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔ عورتوں اور مردوں کے ساتھ گرتی پڑتی اور سنبھلتی جانے لگی۔ کوئی اس پر شبہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہاں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

میکی براؤن پر پھر ایک بار قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ اس کے دوسرے اور آخری بیٹے کو بھی گولی لگی تھی۔ مراد سے دشمنی بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔ اس کے دو گارڈز جیکی کو اُٹھائے دوڑتے جا رہے تھے۔ اسے فوراً ہی اسپتال پہنچانا چاہتے تھے۔

بلّے کی سر پھری بلی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیسی قیامت برپا کر کے وہاں سے جا رہی ہے۔

میکی اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ کرسیوں کے درمیان تھا۔ وہ سب اس اندیشے سے نہیں نکل رہے تھے کہ دوسری تیسری گولیاں ان کی طرف آسکتی ہیں۔

ہیلنا اپنے بیٹے کے لیے رو رہی تھی۔ میکی اسے سمجھا رہا تھا۔ ''صبر کرو۔ حوصلہ کرو۔ بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ زندہ رہے گا۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے لیے دعا کرو۔''

ایسے وقت یہ اطلاع ملی کہ ان کی بلیک ہنڈا اکارڈ اور ساتھ کھڑی ہوئی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ فوراً ہی ان کا دھیان مراد کی طرف گیا۔ ان کے خلاف موت کا ایسا بھیانک کھیل وہی کھیل سکتا تھا۔

میکی براؤن نے فون پر سیکیورٹی افسر سے کہا۔ ''مراد واردات کرنے یہاں آیا ہوگا۔ ہمارے آدمی کیا کر رہے ہیں؟''

''سر! ہم سب اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آپ کا پی اے برونزا نو بری طرح زخمی ہوا ہے۔ شاید مر گیا ہے' اسے ایک جوان عورت اپنی گاڑی میں لے گئی ہے۔''

میکی نے کہا۔ ''بڈھا مر گیا ہوگا۔ ہماری فکر کرو۔ اسٹیڈیم کے پچھلے دروازے پر دوسری گاڑیاں لے آؤ۔''

ڈینجرس رینکٹ کا سربراہ ڈی بلیک اپنے گارڈز کے ساتھ کچھ فاصلے پر کرسیوں کے درمیان گھسا ہوا تھا۔ وہاں سے سر اٹھا کر بولا۔ ''میری گاڑیاں پچھلے گیٹ پر آ رہی ہیں۔ اپنی فیملی کو یہاں سے لے چلو۔''

وہاں تقریباً تیس گن مین تھے۔ ڈی بلیک اور میکی براؤن ان کے حصار میں اپنی فیملی کے ساتھ پچھلے گیٹ کی طرف جانے لگے۔ ڈی بلیک کا انفارمر فون پر کہہ رہا تھا۔ ''باس! واردات کرنے والا انڈر ڈرین کے راستے سے آیا تھا جہاں ٹائم بم بلاسٹ ہوا ہے۔ وہاں گٹر کا ڈھکن پوری طرح بند نہیں کیا گیا تھا۔ وہ وہیں سے نکل کر بم کی ٹائمنگ سیٹ کرنے کے بعد فرار ہوا ہے۔''

ڈی بلیک فون بند کر کے میکی براؤن کو بتانے لگا کہ واردات کیسی زبردست پلاننگ سے کی گئی تھی۔ میکی نے کہا۔ ''مائی گاڈ! ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کتے کا بچہ زمین کی تہ سے نکل کر ہماری کار تک پہنچے گا۔''

وہ سب تیزی سے چلتے ہوئے محتاط نظروں سے

ادھر ادھر دیکھتے جارہے تھے۔ ایسے وقت ہزاروں تماشائی اسٹیڈیم کے باہر کی سمت بھاگ رہے تھے اور ایسے بھی تھے جو اندر آرہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ اب اور دھماکا نہیں ہوگا۔ کوئی اپنا کام کرگیا ہے، پلٹ کر نہیں آئے گا۔

میکی براؤن پچھلے دروازے سے نکل کر فیملی کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہیلنا زیرلب بڑبڑا رہی تھی۔ ''او گاڈ! اگر اس وقت ہم اپنی کار میں ہوتے تو ہمارا انجام کیا ہوتا؟''

اس کی بیٹی میڈونا نے کہا۔ ''ہمارے چیتھڑے اڑ جاتے۔ ابھی اس گاڑی میں بیٹھنے کے لیے زندہ نہ ہوتے۔''

پھر وہ باپ سے بولی۔ ''وہ میرے ایک بھائی کے بعد دوسرے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ گاڈ نے چاہا تو جیکی سلامت رہے گا۔ او گاڈ...! ہم یہاں کتنی سخت سیکیورٹی میں آئے تھے۔ تقدیر سے بچ گئے۔ آپ دیکھیں کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ پہلے ہمارے شوٹرز کی موت بنا ہوا تھا۔ اب ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔''

ہیلنا نے کہا۔ ''اور زمین کی تہ سے آیا تھا جیسے موت کہیں سے بھی آجاتی ہے اور ہم بچ نہیں پاتے۔ آج تقدیر سے بچ گئے۔ ماننا پڑتا ہے' وہ ہماری سوچ سے زیادہ خطرناک ہے۔''

میکی براؤن بڑبڑانے لگا۔ ''میں اسے ایک معمولی پاکستانی شہری سمجھ رہا تھا۔ اسے میرا کوئی بھی شوٹر ایک گولی میں اُڑا سکتا تھا۔ لیکن درجنوں پکے نشانہ باز ماہر مارے گئے ہیں۔ پہلے وہ ایک قطرہ لگتا تھا اب سمندر بن کر ہماری طرف چلا آیا ہے۔ کوئی تدبیر کام نہیں آرہی ہے۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''بس وہ ایک ہے۔ اسے صرف ایک گولی مارنی ہے اور اتنا سا کام نہیں ہورہا ہے۔''

ابھی تو بیٹے کو گولی لگی تھی۔ اسے دیکھنے کے لیے وہ اپنی خیر مناتے ہوئے اسپتال کی سمت جارہے تھے۔

☆☆☆

بلا انڈرڈرین سے نکل آیا تھا۔ اس نے ایک حمام میں جاکر شاور لیا اور غلاظت سے نجات حاصل کی تھی۔ اس کے ماتحت نے بتایا تھا کہ میکی کی کار کے چیتھڑے اُڑ گئے ہیں۔ اسٹیڈیم میں بھگدڑ مچی ہوئی ہے اور ہزاروں کی بھیڑ میں میکی براؤن کی فیملی نظر نہیں آرہی ہے۔

اس نے کہا۔ ''وہیں قریب ہی بشریٰ ہوگی۔ اسے تلاش کرو اور دور ہی دور سے اس کی نگرانی کرتے رہو۔''

اس نے فون بند کرکے اسے ڈیش بورڈ پر رکھا۔ پھر کار کو ایک ہوٹل کے سامنے لاکر روک دیا۔ وہ ایک پاکستانی ہوٹل تھا۔ یورپ کے ہوٹلوں میں مرچ مسالے والی چٹ پٹی چیزیں کھانے کو نہیں ملتیں۔ وہ اس ہوٹل سے بشریٰ کے لیے سُرخ مرچوں والی مسالے دار چکن کڑھائی لے جانا چاہتا تھا۔ ایسے وقت فون نے اسے مخاطب کیا۔

وہ ننھی سی اسکرین کو دیکھ کر مسکرایا پھر بولا۔ ''بول میری جان...! اسٹیڈیم میں کیا ہورہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''ڈبل تماشا ہورہا ہے۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ڈبل تماشا...؟''

''ایک تُو نے کیا تھا۔ دوسرا میں نے کیا ہے۔''

وہ مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''کیا پہیلی بجھوا رہی ہے؟ تُو نے کیا کیا ہے؟''

''پہلے بول تُو غصہ تو نہیں کرے گا؟''

''اری بول نا' کیوں اُلجھا رہی ہے؟''

''میکی براؤن کے ایک بیٹے کو تُو نے اُڑایا' دوسرے بیٹے کو میں نے گولی ماردی ہے۔''

''کیا...؟'' وہ حلق پھاڑ کر چیخا۔

''کیا بکواس کررہی ہے؟ کیا سچ مچ گولی ماردی ہے؟''

''ریوالور سے سچ مچ گولیاں ہی نکلتی ہیں۔''

''دیکھ بشریٰ! تُو مذاق کررہی ہے؟''

''میرے لباس میں سکس ایم ایم۔ بی بی شاٹ گن رہتی ہے اور یہ گن مذاق نہیں کرتی ہے۔''

وہ لرز گیا۔ ہذیانی انداز میں چیخ کر بولا۔ ''میں ابھی آکر تجھے جوتے ماروں گا۔ کہاں ہے تو؟ وہ تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ یا خدا... ابھی تُو کہاں ہے...؟''

وہ فوراً ہی کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ''میری پلی حرام موت مرے گی...''

یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس سرپھری نے جرائم کی دنیا کے ٹائیفون پر گولی چلائی تھی۔ کسی وقت بھی گرفت میں آسکتی تھی۔

وہ آندھی کی رفتار سے اپنی پلی کی طرف جارہا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردش ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

چال

سلیم انور

جس طرح زہر کو زہر مارتا ہے بالکل اسی طرح مجرمانہ ذہن تک رسائی کسی مجرم کی ہی ہوسکتی ہے لہٰذا اس کے پاس بھی ہر زہریلی چال کا توڑ تھا یہ اور بات کہ اس کی بچھائی ہوئی بساط پر چلنا آسان نہ تھا۔

نادیدہ جال سے نکلنے والے ایک شاطر کی کامیاب چال

جوں ہی اس تنومند شخص نے دروازے سے باہر قدم رکھا، فلپ سمرز کے تیزی سے اٹھتے ہوئے قدم سست پڑ گئے اور اس کے چہرے کی رنگت پھیکی ہو گئی۔

''ہیلو فلپ!'' اس ہٹے کٹے شخص نے فلپ سمرز سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''بہت عرصے بعد دکھائی دیے ہو۔''

''کاش، یہ وقفہ اور لمبا ہوتا۔'' فلپ بڑبڑایا۔

''اوہ فلپ۔'' اس شخص نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک پرانے دوست سے بات کرنے کا یہ درست طریقہ نہیں ہے۔''

''تم کبھی بھی میرے دوست نہیں رہے ہو، والٹرز!''



فلپ نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''اور تم یہ بات خود بھی جانتے ہو۔''

والٹرز نے شانے اچکا دیے۔ ''چلو یوں ہی سہی۔ آؤ میرے ساتھ اندر چلو۔ جام کا ایک دور ہو جائے۔''

''نہیں۔'' فلپ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں گھر جا رہا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے فلپ نے آگے بڑھنا چاہا لیکن تنومند والٹرز نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ''میں نے کہا کہ اندر چلو اور میرے ساتھ جام کا ایک دور ہو جائے۔'' والٹرز کا لہجہ کٹیلا تھا۔ ''اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو تمہیں افسوس ہوگا۔'' اس نے فلپ کی جانب معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

فلپ سمرز اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔ فلپ کو معلوم تھا کہ اس کی اس پوشیدہ دھمکی کا کیا مطلب ہے۔ وہ یہ بات والٹرز پر پہلی نگاہ پڑتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اب گڑے مردے اکھاڑنے بیٹھ جائے گا۔ والٹرز ہمیشہ اس کے لیے بری خبریں ہی لایا کرتا تھا۔

''آل رائٹ۔'' فلپ نے اکتائے ہوئے لہجے میں ہامی بھر لی۔

بار میں بیٹھتے ہی والٹرز نے وسکی کا آرڈر دے دیا۔ فلپ نے اپنا آرڈر بیئر کے ایک گلاس تک محدود رکھا۔

جب بار ٹینڈر دور چلا گیا تو فلپ بولا۔ ''آل رائٹ، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

والٹرز نے کھانسنے کے بعد کہا۔ ''اب میں میکنزی جیولری اسٹور کی ملازمت میں نہیں ہوں۔''

''میکنزی بالآخر بات کی تہ تک پہنچ ہی گیا؟'' فلپ نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

والٹرز کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''نہیں، بس میری اس کے ساتھ بن نہیں پائی۔''

فلپ کو والٹرز کی اس بات پر کسی قسم کا شبہ نہیں ہوا۔ جیولری اسٹور کا مالک میکنزی اپنے ملازمین کے چال چلن کے بارے میں خاصا سخت مزاج واقع ہوا تھا۔ اسٹور میں کوئی غلط عملی قدم یا یہ کہ کسی ملازم کی ذاتی زندگی کے متعلق یہ شبہ ہوتا کہ وہ میکنزی کے طے کردہ اصولوں کے مطابق نہیں ہے تو... اسے ملازمت سے فارغ کر دیا جاتا تھا۔

فلپ سمرز نے میکنزی جیولری اسٹور میں پانچ سال تک ملازمت کی تھی لیکن پھر میکنزی کو پتا چل گیا کہ فلپ کبھی کبھار ریس کے گھوڑوں پر شرطیں لگاتا اور جوا کھیلتا ہے..... سو اس نے فلپ کو ملازمت سے برخاست کر دیا تھا۔

''تمہاری ملازمت چلے جانے کا مجھ سے کیا تعلق بنتا ہے؟'' فلپ نے والٹرز سے پوچھا۔

والٹرز کی نظریں اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے گلاس پر جمی رہیں۔ ''میں آج اپنی کچھ پرانی چیزوں کو دیکھ رہا تھا تو جانتے ہو... کیا شے اتفاقاً میرے ہاتھ آ گئی؟ تمہاری وہ پرانی تصویر جو ''دی گلوب'' اخبار کے ہیگرٹی نامی فوٹوگرافر نے اس وقت کھینچی تھی جب پولیس نے فورتھ سکسٹھ اسٹریٹ پر واقع پول روم پر چھاپا مارا تھا...... جانتے ہو تصویر میں تمہیں پولیس کی گاڑی میں لادتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔''

فلپ سمرز کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔ ''مجھے وہ تصویر یاد ہے۔ تم نے وہ تصویر اپنے اس شرابی رپورٹر دوست سے حاصل کی تھی اور اس کے عوض تم نے مجھ سے زبردستی ایک لاکھ ڈالرز بھی وصول کرنے کی کوشش کی تھی اور جب میں تمہیں یہ رقم نہیں دے سکا تو تم نے میکنزی سے میری چغل خوری کر دی۔ ویل، اس بات کی وجہ سے مجھے قماربازی سے نجات مل گئی۔ میں نے گزشتہ چار برسوں سے گھڑدوڑ پر کوئی شرط نہیں لگائی۔ اب میری شادی بھی ہو چکی ہے اور میرے پاس اپنی رقم کو استعمال کرنے کے کئی ایک طریقے ہیں۔''

''بے شک، بے شک۔'' والٹرز نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہاری ملازمت بھی عمدہ ہے۔ بینک میں!''

فلپ نے یہ سن کر ایک جھرجھری سی لی۔ ''تمہیں کیسے پتا؟''

''کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میری تم سے یہاں ملاقات اتفاقیہ ہوئی ہے۔ ایسا ہی ہے نا؟'' والٹرز نے کسی بھیڑیے کے مانند دانت نکالتے ہوئے کہا۔

فلپ نے تیکھی نظروں سے والٹرز کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''یہ چوہے بلی کا کھیل ختم کرو۔ تم کیا چاہتے ہو؟''

والٹرز نے کن انکھیوں سے بارٹینڈر کی طرف دیکھا اور اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے بولا۔ ''بات یہ ہے کہ مجھے ابھی اس بات کی خبر ملی ہے کہ میکنزی کے پاس اپنے اسٹور میں ناتراشیدہ ہیروں کی لاٹ آئی ہے۔ ان کی شناخت نہیں ہو سکتی اور ان کی قیمت پانچ لاکھ ڈالرز ہے۔ مجھے وہ ہیرے چاہئیں۔''

فلپ کے جبڑے کی رگیں تن گئیں۔ ''تم انہیں چوری کرنا چاہتے ہو...... اور تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری مدد کروں؟''

''تم آئیڈیا سمجھ گئے فلپ! لیکن یہ تمام کام تم کرو گے۔ یاد ہے کہ کس طرح میکنزی اپنی تجوری کے تالے کا کمبی نیشن ہر ماہ تبدیل کر دیا کرتا تھا اور پھر ہمیشہ اس کمبی نیشن کو بھول جاتا تھا؟ اور پھر اسی طرح تم ہمیشہ اس تالے کو کھولنے کے عادی ہو چکے تھے۔ تمہیں اس تجوری کو کھولنے میں مہارت حاصل تھی لیکن مجھے اس میں ملکہ حاصل نہیں ہے۔ اس لیے......''

''اس لیے تم چاہتے ہو کہ میں رات میں میکنزی اسٹور میں زبردستی گھس جاؤں۔ تجوری کھولوں اور وہ ناتراشیدہ ہیرے تمہارے لیے نکال کر لے آؤں؟'' فلپ نے بیزار لہجے میں کہا۔

''اتنی بلند آواز سے مت بات کرو، احمق کہیں کے!'' والٹرز نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی تو اصل حقیقت ہے۔ تم وہ ہیرے مجھے لادو اور میں وہ تصویر اور اس کی فلم تمہارے حوالے کردوں گا۔ اگر تم انکار کرو گے تو میں وہ تصویر تمہارے باس کو ڈاک کے ذریعے بھیج دوں گا۔ مدعا سمجھ رہے ہو نا؟''

ایک لمحے کے لیے فلپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اس کا جی چاہا کہ گھونسوں کے وار سے والٹرز کے چہرے کی درگت بنا دے لیکن اس نے اپنی اس خواہش پر فوراً ہی قابو پالیا۔ اس حرکت سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ والٹرز ناراض ہوکر اسے نقصان پہنچانے کی خاطر اس کی تصویر بینک بھیج دے گا...... اور یوں فلپ کی نوکری کا خاتمہ ہوجائے گا۔

فلپ کو اس ادائیگی کا خیال آ گیا جو اس نے اپنے مکان کی مد میں کرنا تھی۔ اسے اپنی بیوی کا بھی خیال آ گیا جو ایک ماہ بعد اس کے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ یقینی طور پر یہ وہ وقت نہیں تھا کہ اس کی بینک کی ملازمت چھوٹ جائے۔ والٹرز بے حد کمینہ تھا۔ اس نے فلپ کو اب بھی ڈھونڈ نکالا تھا اور وہ آئندہ جب بھی چاہتا، اسے تلاش کرسکتا تھا۔ اگر فلپ نے کوئی اور ملازمت اختیار کرلی تو وہ دوبارہ اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ نہیں، اسے ابھی اور ہمیشہ کے لیے والٹرز سے اس معاملے کو ختم کرنا ہوگا۔

''تم واقعی مجھے وہ تصویر اور اس کی فلم دے دو گے؟'' فلپ نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

والٹرز کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''جس لمحے تم وہ

اپنے رب کو اللہ کہہ کر پکارو کیونکہ یہ وہ لفظ ہے جس کی نہ ضد (opposite)
نہ جمع (plural)
نہ مذکر (male)
نہ مؤنث (female)
جبکہ دیگر الفاظ کی ضد، جمع، مذکر، مونث ہوتی ہے مثال کے طور پر
God=Godees
Devta=Devi
Khuda=Khudaon
Lord=Lords
جبکہ اللہ احد...... یعنی ایک ہے۔ پس اپنے رب کو اللہ ہی کہہ کر پکارو۔

مرسلہ۔ علی ساجد۔ لاہور

پانی پینے کا صحیح وقت

جس وقت پانی اللہ تعالیٰ کے حکم سے صحیح اثر کرتا ہے۔

ایک گلاس صبح اٹھتے وقت اندرونی اعضا کو activate کرتا ہے۔

ایک گلاس نہانے کے بعد بلڈ پریشر کا خاتمہ کرتا ہے۔

دو گلاس کھانے سے تیس منٹ پہلے ہاضمے کو درست کرتا ہے۔

آدھا گلاس سونے سے پہلے ہارٹ اٹیک اسٹروک سے بچاتا ہے۔

مرسلہ۔ ناظم علی۔ ملتان

دنیا میں 4 دفعہ وقت رک گیا تھا

1۔ جب ہادی برحق حضرت محمد ﷺ معراج پر گئے تھے۔

2۔ جب عاشق رسول حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان نہیں دی تھی۔

3۔ جب حضرت بی بی فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ عنہ کے سر مبارک سے دوپٹا مبارک سرک گیا تھا اور دو بال مبارک نظر آگئے تھے۔

4۔ جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی نماز قضا ہو رہی تھی۔

مرسلہ۔ عاصم خان۔ کراچی

ہیرے مجھے دو گے، میں اسی وقت دونوں چیزیں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

فلپ نے بے چارگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

والٹرز اپنے اپارٹمنٹ میں فلپ کا انتظار کر رہا تھا۔ جب فلپ وہاں پہنچا، اس وقت رات کے دو بجے تھے۔

''تم ہیرے لے آئے؟'' والٹرز نے بے تابی سے پوچھا۔

فلپ نے اپنے اوورکوٹ کی جیب میں سے مخملی چمڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور بولا۔ ''فلم اور تصویر؟''

والٹرز نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک لفافہ نکالا اور اسے فلپ کے حوالے کر دیا۔ ساتھ ہی تھیلی اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ایک منٹ...... رک جاؤ۔'' فلپ نے کہا۔ پھر لفافے میں موجود تصویر اور فلم باہر نکال کر ان کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آل رائٹ۔ تمہارے ہیرے یہ رہے۔''

والٹرز نے ہیروں کی تھیلی فلپ کے ہاتھ سے جھپٹ لی۔

فلپ نے جیب میں سے اپنا سگریٹ لائٹر نکالا اور ایک کھٹکے سے اس کا شعلہ آن کر دیا۔ اس نے تصویر اور سیلولائڈ فلم کو شعلہ دکھایا تو دونوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی۔ فلپ نے انہیں نیچے فرش پر گرا دیا اور انہیں جلتے ہوئے دیکھتا رہا۔

پھر اس کے کانوں میں والٹرز کی حیرت زدہ آواز سنائی دی۔ ''ارے...... یہ تو عام سے ہیرے ہیں۔''

فلپ نے اپنے جوتوں سے تصویر اور فلم کی راکھ رگڑ دی اور بولا۔ ''ہاں۔ میں نے یہ ایک عام سی دکان سے خریدے ہیں۔''

یہ سن کر والٹرز آگے کی جانب بڑھا۔ اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔ ''تم لعنتی ڈبل کراسر! تم سمجھتے ہو کہ... اس طریقے سے تم بچ نکلو گے؟ کل صبح میں تمہارے باس کے پاس بینک میں جاؤں گا اور اسے سب کچھ بتا دوں گا۔''

یہ سن کر فلپ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے پلان میں جو ایک خامی تھی، وہ یہی تھی کہ والٹرز کے پاس اس تصویر کی مزید کاپیاں موجود نہ ہوں اور وہ ان تصویروں کی بنیاد پر اسے مسلسل بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کرے۔ لیکن والٹرز کی دھمکی اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ اس کے پاس اس تصویر کی اضافی کاپیاں موجود نہیں ہیں۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو گیا۔

''والٹرز! کل صبح تم اس شہر سے میلوں دور ہو گے۔'' فلپ نے کہا۔ ''یا پھر جیل کی سلاخوں کے پیچھے پائے جاؤ گے۔''

''کیا مطلب ہے؟'' والٹرز ٹپٹا گیا۔

''میرا مطلب ہے کہ میں نے جیولری اسٹور میں میکنزی کے چوکیدار کو رسی سے باندھ دیا ہے۔ پھر میں نے چھینی کی مدد سے تجوری پر اس طرح کے نشانات ڈال دیے ہیں جیسے کسی نے اسے کھولنے کی کوشش کی ہو لیکن کھولنے میں کامیاب نہ ہوا۔ میکنزی کو یہ یقین آجائے گا کہ یہ حرکت تمہاری ہے...... اس لیے کہ میں نے بے پروائی سے کام کرتے ہوئے تجوری کے سامنے ایک وزیٹنگ کارڈ گرا دیا تھا جس پر تمہارا نام اور پتا لکھا ہوا ہے۔ یہ کارڈ میں نے گزشتہ شب ایک چھوٹی سی دکان سے چھپوایا تھا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تم میکنزی اور جیوری کو اس بات سے قائل کر سکتے ہو کہ تجوری کو توڑنے کی کوشش کے دوران وہ کارڈ تمہارے پاس سے وہاں نہیں گرا تھا تو پھر تم اس شہر میں موجود رہنے کی ہمت کر لینا لیکن اگر تم ایسا نہیں سمجھتے تو...... تو بہتر ہوگا کہ تم ابھی سے اس شہر سے فرار ہونے کی تیاری کر لو۔ میں نے اسٹور کے چوکیدار کو زیادہ مضبوطی سے نہیں باندھا تھا۔ وہ غالباً اپنی ڈھیلی مشکیں کھولنے اور آزاد ہونے میں کامیاب ہو چکا ہوگا۔''

والٹرز ایک لمحے کے لیے فلپ کو پاگلوں کی طرح گھورتا رہا۔ پھر جنون کی سی کیفیت میں کپڑوں کی الماری کی جانب لپکا اور اپنا کوٹ اور پینٹ نکال کر تیزی سے دروازہ کھول کر سیڑھیوں کی جانب دوڑ پڑا۔

فلپ اطمینان کے ساتھ ٹہلتا ہوا والٹرز کے اپارٹمنٹ سے باہر نکل آیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب وہ کبھی اس شہر واپس آنے کے بارے میں نہیں سوچے گا۔'' فلپ نے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ عرصے بعد وہ یہ سوچ سکتا ہے کہ آیا میں حقیقت میں میکنزی کے اسٹور میں گیا بھی تھا یا نہیں لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ واپس آ کر حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ بالآخر میری یہ ترکیب کامیاب رہی۔''







پناہ گاہ

منظر امام

گیدڑ ہو یا شیر جب شامت آتی ہے پناہ کی تلاش میں ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے کیونکہ... اب شاید کانٹے کا مقابلہ کرنے کا رواج نہیں رہا۔ ویسے سمجھداری کا تقاضا بھی یہی تھا کہ مفاہمت کرلی جائے ورنہ معاملات کی سنگینی اس پر کھل چکی تھی۔

بےکل لمحات اور بے اعتبار موسم کے شکار ایک ناسمجھ کا قصہ

وہ میرے پاس ہی بیٹھا چپو چلا رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”بدبخت انسان، یہ تو نے کشتی پر کتنے بندے بٹھالیے ہیں؟“

”ابھی تو سات آٹھ کی اور گنجائش ہے صاحب۔“

”کیا بکواس کررہا ہے، یہ کشتی ڈوبنے والی ہے۔“

”تو کیا ہوا، مجھے تو تیرنا آتا ہے نا۔“

”ابے تیرنا تجھے آتا ہے۔ دوسروں کو تو نہیں آتا۔“

”اچھا صاحب! دماغ مت خراب کرو، کشتی چلانے دو۔“

اسی لمحے کشتی کو ایک طرف سے لہروں نے اچھا خاصا اوپر کردیا۔ اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ میرے برابر بیٹھا ہوا شخص باقاعدہ کلمہ پڑھنے لگا تھا۔ میرا ہی دماغ خراب تھا جو اس کشتی میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ یہ چھوٹی سی بادبانی کشتی تھی جو کراچی سے منوڑہ جارہی تھی۔ کراچی کے لوگ ایسے مقامات اور ایسی کشتیوں سے اچھی طرح واقف

ہیں۔ اگر انہوں نے منوڑہ تک جانے کی زحمت کی ہو۔ میری چونکہ قسمت خراب تھی، اس لیے اس کشتی میں آکر بیٹھ گیا تھا۔

قسمت تو ویسے بھی خراب ہی تھی۔

زندگی میں نہ تو کوئی چارم تھا اور نہ ہی کوئی اور سبب تھا زندہ رہنے کا۔ بہت مشکلوں سے ایک جگہ سے اچھی نوکری کی آفر آگئی تھی۔ تنخواہ بھی بہت معقول تھی۔

میں نے اپنے ایک دوست سے ذکر کیا تو اس نے مشورہ دیا۔ ''دیکھو بھائی! نوکری پر جانے سے پہلے منوڑہ چلے جاؤ۔''

''کیوں، منوڑہ جانے سے کیا ہوگا؟''

''بزرگوں سے سنتے آئے ہیں کہ پانی کراس کرلو تو نحوستیں چلی جاتی ہیں۔''

''کہاں چلی جاتی ہیں؟''

''وہ پانی میں اتر جاتی ہیں اور بندے کی جان چھوٹ جاتی ہے۔ یہ بھی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ تم ایک مستند منحوس ہو، تمہاری ناکامیاں میرے سامنے ہیں۔''

''اس کے بعد کیا ہوگا؟''

''اس کے بعد کیا ہونا ہے۔ ایک اچھی زندگی تمہارے انتظار میں ہے۔ چالیس ہزار کی سیلری ہوگی۔ اکیلے آدمی ہو، عیش سے رہو گے۔''

اس کا یہ مشورہ مجھے پسند آگیا تھا۔ اس لیے میں نے منوڑہ جانے کا ارادہ کرلیا۔ کیماڑی پہنچا تو وہاں کئی لانچیں اور بادبانی کشتیاں تھیں جو مسافروں کو منوڑہ لے جارہی تھیں۔ پرانی فلموں اور کہانیوں نے مجھ میں بادبانی کشتیوں کی محبت پیدا کررکھی تھی۔ ایک رومان سے بھرا ہوا سفر۔ دور افق میں ڈوبتا ہوا سورج۔ اس کے پیش منظر میں کسی کشتی کے لہراتے ہوئے بادبان اور ملاح کا گیت۔ یا کسی لڑکی کی آواز۔ ''مورے سیاں جی اتریں گے پار ہو، ندیاں دھیرے بہو۔'' یا اسی قسم کا کوئی اور گیت۔

اسی لیے میں نے لانچوں کی طرف دیکھا بھی نہیں اور ایک بادبانی کشتی کی طرف متوجہ ہوگیا جو کنارے کی سیڑھیوں سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔

''آؤ جی آؤ، بسم اللہ۔'' ملاح نے ہانک لگائی۔

''بھئی کتنے پیسے لوگے؟''

''آپ سے صرف سو روپے۔'' اس نے کہا۔

''کیوں، صرف مجھ سے سو روپے کیوں؟ کیا میں تمہارا کوئی رشتے دار لگتا ہوں؟''

''ارے نہیں صاحب۔'' وہ دانت نکال کر ہنس پڑا۔

''یہ تو اپنی عادت ہے۔ میں ہر ایک سے یہی کہتا ہوں۔ ان لوگوں سے پوچھ لو۔'' اس نے کشتی میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان سب سے سو سو لیے ہیں۔''

کشتی میں سات یا آٹھ مسافر تھے۔

میں بھی خدا کا نام لے کر اس کشتی میں بیٹھ گیا۔ وہ ملاح پھر سے دوسرے مسافروں کو پکارنے لگا۔ ''چلو جی...... منوڑہ چلو...... ہوا کی طرح چلنے والی کشتی میں...... ہوا کی طرح۔''

''ارے بھائی! تمہاری کشتی میں جگہ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''بس اب چل دو۔''

''کشتی تو بھر لینے دو صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی سے کیسے چل دوں؟''

''کشتی بھر گئی ہے۔''

''اب بھی دس مسافر آجائیں گے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

اب میں اس ہٹ دھرمی پر کیا کہتا۔ اس کم بخت نے آٹھ مسافر اور بٹھالیے تھے۔ اس کے بعد اس نے چپو اٹھایا اور بادبانی کشتی کا رومانٹک سفر شروع ہوگیا۔

میں چونکہ پہلی بار سمندر کا سفر کررہا تھا، اس لیے سب کچھ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہم دیوہیکل جہازوں کے برابر سے گزر رہے تھے۔

بہت سی لانچیں کراس کرکے آگے بڑھتی جارہی تھیں۔ پرندے شور مچاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ سمندر کی نمکین مرطوب ہوا بہت اجنبی اور بہت خوش گوار لگ رہی تھی۔ کشتی کا یہ حال تھا کہ کبھی دائیں طرف جھک جاتی، کبھی بائیں طرف۔ وہ بری طرح ڈول رہی تھی۔

''ابے یہ کشتی تو ڈوب جائے گی۔'' میں نے ملاح سے کہا۔

''تو کیا ہوا بابو، مجھے تو تیرنا آتا ہے نا۔'' وہ بڑی بے پروائی سے بولا۔

''ابے تجھے تو آتا ہے لیکن مجھے تو نہیں آتا نا۔''

''اب اس میں میرا کیا قصور ہوا؟''

اس نے اتنا کہا تھا کہ کشتی بری طرح اچھل پڑی۔ سب ہی چیخ اٹھے۔ ملاح اور اس کے ساتھی نے کسی طرح کشتی سنبھال لی تھی۔

''بھائی! یہ منوڑہ کب آئے گا؟'' ایک خوف زدہ مسافر نے پوچھا۔

''ابھی تک تو آجانا چاہیے تھا۔'' ملاح نے کہا۔ ''لگتا ہے ہم راستہ بھول کر دوسری طرف نکل آئے ہیں۔''

''کیا؟'' ہم سبھی کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔ ''ابے کیا

بکواس کر رہا ہے؟''

''گھبراؤ نہیں جی، سب کو پہنچا دوں گا۔'' اس نے کہا۔

اور اس کے ساتھ ہی کشتی الٹ گئی۔ کسی طاقت ور لہر نے کشتی کو اچھال کر الٹا کر دیا تھا۔ خدا کی پناہ، کیا منظر تھا...... کیسی قیامت تھی۔

مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ ڈوبتے وقت بھی میں اس کم بخت ملاح کو گالیاں ہی دے رہا تھا۔ پھر خدا جانے کیا ہوا، میں نے کس طرح ہاتھ پاؤں چلائے ہوں گے۔ پانی میں تیرتے رہنے کی کتنی کوشش کی ہوگی۔ کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ جب ہوش آیا تو کنارے پر تھا۔ سمندر کی لہروں نے ساحل پر لا کر پھینک دیا تھا۔ بہت دیر تک آنکھیں بند کیے سوچتا رہا، سوچتا ہی رہا۔ آہستہ آہستہ ذہن کے دریچے کھلنے لگے۔ یاد آنے لگا کہ میں کیماڑی سے منوڑہ کی طرف جا رہا تھا کہ کشتی الٹ گئی تھی۔ تو پھر میں کہاں آ گیا تھا؟ میں کسی نہ کسی طرح کھڑا ہو گیا۔ یہ منوڑہ تو نہیں تھا۔ کیماڑی کا ساحل بھی نہیں تھا۔ وہاں اتنا سناٹا تو ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ تو کوئی غیر آباد مقام تھا۔

میرے خدا! کیا میں کسی ویران جزیرے پر آ گیا ہوں؟ اپنے شہر، اپنے ملک اور اپنے ساحلوں سے بہت دور۔ اس موضوع پر فلمیں یاد آنے لگیں۔ جن میں کوئی شخص اسی طرح لہروں میں بہتا ہوا کسی جزیرے پر جا نکلتا ہے اور وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔ برسوں اسی میں گزار دیتا ہے۔ جیسے وہ فلم ہی تھی۔ ''کاسٹ آوے'' یا اس قسم کی اور فلمیں۔ ان فلموں میں جو جزیرے ہوتے تھے، ان میں ناریل کے اونچے اونچے درخت ہوا کرتے تھے لیکن یہاں تو نیم کے درخت اور کیکر کی جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

مجھے وہ کم بخت کشتی والا پھر یاد آ رہا تھا۔ اگر سامنے ہوتا تو جان سے مار دیتا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود تو بچ ہی گیا ہوگا۔ البتہ دوسرے مسافر ٹھکانے لگ چکے ہوں گے۔

جس طرح میں ٹھکانے لگ رہا تھا۔

میری بہت بری حالت ہو رہی تھی۔ سمندر کے نمکین بوجھل پانی میں نہایا ہوا جسم، بھیگے کپڑے، چہرے پر ریت ہی ریت۔ ایک ایک قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔

دھوپ اتنی تیز تھی کہ کھال میں اتری چلی جا رہی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا ان درختوں کی طرف چل پڑا جن کے سائے میں بیٹھ کر کچھ آرام کرتے ہوئے سوچ سکتا تھا کہ اب کیا کیا جائے۔

اچانک ایک پرندہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔

غصہ

حضور کا ارشاد گرامی ہے، غصہ ایمان کو اس طرح خراب کرتا ہے۔ جیسے ایلوا شہد کو۔ غصہ ایمان سوز کیفیت ہے۔ جب یہ آدمی پر سوار ہوتا ہے تو وہ اللہ کی طے کردہ حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، اس کی زبان سے ایسی ایسی باتیں نکلتی ہیں اور وہ ایسی حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جس سے اس کا ایمان خراب اور دین برباد ہو جاتا ہے، اب وہ اللہ کی نظر سے گر جاتا ہے اور اس کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

پرندے تو خوشی اور زندگی کی نوید ہوا کرتے ہیں لیکن وہ کم بخت تو موت کی علامت تھا۔ یعنی ایک بڑا سا گدھ۔ جو یقیناً مجھے مردہ سمجھ کر کھانے کے لیے آ گیا ہوگا۔

''ابے میں زندہ ہوں۔'' میں بھنا کر بولا۔ ''تجھے خوش ہونے کا موقع نہیں دوں گا...... سمجھا۔''

میں ایک جنون کے عالم میں اس کی طرف لپکا لیکن وہ اڑ کر دوسری طرف چلا گیا۔

میں کسی نہ کسی طرح درختوں کے پاس پہنچ ہی گیا۔ یہاں تیز دھوپ سے نجات ملی تھی۔ میں ایک گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ کر اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ اگر اسی جزیرے میں رہنا پڑ گیا تو کیسے رہوں گا؟ یہ تو بہت خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ ایسا جزیرہ ہو جس کی طرف کسی نے دھیان ہی نہ دیا ہو۔

اگر ایسا ہی تھا تو پھر خدا ہی حافظ تھا۔

بہت دیر کے بعد میں جب اپنے آپ میں آیا تو جزیرے کے اور حصوں کو دیکھنے نکل پڑا۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں کوئی آبادی بھی ہو۔ کچھ لوگ بھی رہتے ہوں۔ اگر کوئی مل جاتا تو پھر یہ جو پریشانی ٹوٹ پڑی تھی، یہ کسی حد تک ختم تو ہو ہی سکتی تھی۔

یہ جھاڑیوں اور درختوں سے بھرا ہوا جزیرہ تھا۔ سورج بھی ڈوبنے والا تھا۔ کسی وقت بھی اس ویران اور ... بے آباد جزیرے میں رات اتر سکتی تھی۔ پھر میرا کیا حشر ہوگا؟ ہو سکتا ہے کہ یہاں جنگلی جانور بھی ہوں اور ایک آدھ سے ملاقات ہو جاتی تو پھر کیا ہوتا؟

میں ایک طرف بڑھتا چلا گیا۔ شام بہت تیزی سے غائب ہوتی جا رہی تھی۔ جزیرے میں اندھیرا اترنے لگا تھا۔ خدایا! میں کس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

وہ کم بخت دوست یاد آ رہا تھا جس نے پانی کراس

کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور کیا مشورہ تھا اس کا۔ زندگی کے لالے پڑ گئے تھے۔

میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ کو بددعائیں دیتا اور برا بھلا کہتا ہوا کہ اچانک کچھ ہوا۔ کسی کی آواز... کسی انسان کی آواز جو شاید مجھ ہی کو مخاطب کر رہا تھا۔

''اوئے رک جاؤ۔''

میں رک گیا۔ درختوں کے درمیان سے ایک آدمی نکل کر میری طرف آ رہا تھا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح مسلط نہیں ہوا تھا اس لیے ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔

وہ ایسا ہی آدمی تھا جیسا کوئی آدمی کسی ویران جزیرے پر مل سکتا ہے۔ الجھے ہوئے بڑے بڑے بال، بے ہنگم ڈاڑھی۔ اس نے ایک بنیان اور پینٹ پہن رکھی تھی جس سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جنگلی نہیں ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔ وہ اس ڈنڈے کو لہرا لہرا کر بولنے لگا۔ ''خبردار، میرے قریب مت آنا۔ میں نہیں جاؤں گا تمہارے ساتھ۔ مجھے کیا پاگل سمجھ رکھا ہے۔''

پتا نہیں، وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

میں نے اسے اطمینان دلانے کے لیے کہا۔ ''بھائی صاحب! میری مدد کریں۔ میں اس منحوس جزیرے میں آ کر پھنس گیا ہوں۔''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم مجھے واپس لے جانے کے لیے آئے ہو۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بھائی، بالکل بھی نہیں۔'' میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ''میں تو تم کو جانتا بھی نہیں ہوں۔''

''تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟'' اسے شاید میری طرف سے کچھ اطمینان ہونے لگا تھا۔

''تم یقین کرو، میں خود نہیں آیا۔ منوڑہ جاتے ہوئے کشتی الٹ گئی تھی۔ کسی طرح بہتا ہوا اس جزیرے کی طرف آ نکلا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اور پناہ کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہا تھا کہ تم مل گئے۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔''

اسے شاید میری بات کا یقین آ گیا تھا۔ اس لیے وہ میرے پاس آ گیا۔ ''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''عامر۔'' میں نے بتایا۔ ''عامر رضوان۔''

''اور میں قدوائی ہوں۔'' اس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ''جلیل قدوائی۔''

نہ جانے کیوں یہ نام مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ جلیل قدوائی...... لیکن اس وقت یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے یہ نام کس سلسلے میں اور کس سے سنا ہو گا۔

''قدوائی صاحب! آپ کا نام کہیں سنا ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اس جزیرے میں کیا کر رہے ہیں؟''

''یہ سب تفصیلی باتیں ہیں۔ ابھی میرے ساتھ چلو، ورنہ رات ہوتے ہی طرح طرح کے سانپ نکل آتے ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔''

وہ مجھے راستہ بتاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ وہاں راستہ ہی کیا تھا۔ بس جھاڑیاں، پودے اور درخت تھے۔ ان ہی کے درمیان سے چلنا تھا۔

کچھ دور جانے کے بعد ایک صاف سی سطح آ گئی تھی۔ زمین کا اچھا خاصا ٹکڑا تھا جہاں نہ جھاڑیاں تھیں، نہ پودے تھے بلکہ لکڑی کا ایک کیبن کھڑا ہوا تھا۔ انکل ٹام کیبن کے کیبن جیسا۔ صحیح معنی میں اب جا کر کسی جزیرے کا ایڈونچر شروع ہوا تھا۔

قدوائی مجھے اس کیبن میں لے آیا۔

کمال ہے اس ویران جزیرے میں اتنے سلیقے کا کیبن۔ ایک طرف ایک چھوٹی سی میز تھی جس کے ساتھ دو کرسیاں تھیں اور لکڑی کا ایک تخت بھی تھا۔ لکڑی کا ایک چولہا بھی تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے قدوائی صاحب بہت دنوں سے یہیں رہتے ہوں۔

''جناب! آپ کب سے یہاں رہ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

''صرف چھ مہینوں سے۔'' قدوائی نے جواب دیا۔ ''یہ کیبن مجھے اسی حالت میں ملا تھا۔ نہ جانے کس نے یہ سب بنایا تھا اور خود کہاں چلا گیا۔ میں نہیں جانتا۔''

اور اسی وقت اچانک کوئی اندر داخل ہو گیا۔

یہ ایک بندر تھا۔ بڑی جسامت کا۔ جو مجھے دیکھ کر خوخیانے لگا تھا۔ ''نہیں افلاطون، یہ دوست ہیں میرے۔'' قدوائی نے اسے ڈانٹ پلائی۔ ''ہاتھ ملاؤ ان سے۔''

بندر نے اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ''گھبراؤ نہیں۔'' قدوائی نے کہا۔ ''یہ کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے اسے ٹرینڈ کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ بندر ہے، انسان نہیں ہے۔ تربیت انسان کا کچھ نہیں بگاڑتی، وہ درندہ ہی رہتا ہے جبکہ درندے انسان بن جاتے ہیں۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں قدوائی صاحب۔''

''اب اس سے ہاتھ ملا لو، ورنہ یہ ناراض ہو جائے گا۔ اس جزیرے پر یہی میرا دوست ہے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے اس بندر سے ہاتھ ملایا۔ وہ خوشی سے اچھلنے لگا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔ میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔" قدوائی نے کہا۔ "اور ہاں، اندھیرا بھی ہوگیا ہے۔ لالٹین جلا دیتا ہوں۔"

"قدوائی صاحب! یہ سب چیزیں اس جزیرے میں آپ کے پاس کہاں سے آگئیں؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

"میرا ایک وفادار دوست مہینے میں ایک بار میرا راشن لے کر آجاتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اسی لیے آج تک کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔"

"میں بہت الجھن محسوس کررہا ہوں۔ آخر آپ اس جنگل میں کیوں رہتے ہیں؟"

"اوہو، کیا سب کچھ ایک ہی بار میں معلوم کرلو گے؟" قدوائی نے کہا۔ "پہلے مجھے رات کے کھانے کی تیاری کر لینے دو۔ اس کے بعد سب کچھ بتادوں گا۔"

میں حیرت اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کیبن میں چاول، دال، مسالے سب کچھ موجود تھا۔ قدوائی نے چولہا روشن کیا پھر کھانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔

"میں تو ایک کپ چائے بھی نہیں بنا سکتا تھا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن اب سب آگیا ہے۔"

"قدوائی صاحب! ایک بات بتائیں، جب آپ کا دوست مہینے میں ایک بار آپ کے لیے راشن لے کر آتا ہے تو وہ یقیناً کسی لانچ سے آتا ہوگا؟"

"ہاں، اس کے پاس اپنی ذاتی لانچ ہے۔"

"پھر آپ اس کے ساتھ واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ یہاں کیوں رہ رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" قدوائی نے کہا۔ "پہلے کچھ کھالیں، اس کے بعد بتاتا ہوں۔"

وہ کھانا بناتا رہا جبکہ میں اس کے بندر کی حرکتیں دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ وہ قدوائی کے اشاروں کو سمجھتا تھا۔

"جاؤ افلاطون، وہ لکڑی اٹھا کرلاؤ۔" قدوائی اشارہ کرتا اور افلاطون وہ لکڑی اٹھا کر لے آتا۔ "افلاطون! وہ بالٹی اٹھاؤ۔" اور افلاطون بالٹی اٹھالیتا۔

"دیکھا تم نے۔ یہ ہے جانور۔" قدوائی نے کہا۔ "جو ذرا سی ٹریننگ سے سب کچھ سمجھ جاتا ہے۔"

"واقعی کمال ہے۔" میں نے تعریف کی۔

کھانا بہت مزے کا تھا۔ چونکہ میں بھوکا بھی تھا اسی لیے خوب پیٹ بھر کر کھا گیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر قدوائی نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

"میں ایک کالج میں پڑھایا کرتا تھا۔"

"ہاں، ہاں...... اب مجھے یاد آگیا۔" میں جلدی سے بولا۔ "اور آپ نے شاید کسی الیکشن میں بھی حصہ لیا تھا۔"

"نہیں، میں نے کسی الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ بلکہ میں نے اس قوم کو صاف ستھری قیادت دینے کا فارمولا پیش کیا تھا لیکن کسی سیاسی جماعت نے میری بات نہیں مانی۔"

"ہاں، کچھ یاد تو آرہا ہے۔" میں نے کہا۔ "بہت زبردست فارمولا تھا آپ کا۔ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں نے اس کی تائید کی تھی۔"

"لیکن بدقسمتی سے ہمارے ملک کی اکثریت کو پڑھے لکھے لوگوں کی قیادت نہیں چاہیے۔ کوئی ایماندار اور

بے داغ انسان کسی محکمے میں آجائے تو یا تو اس کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے یا مار دیا جاتا ہے۔''

''جی ہاں، یہ المیہ تو ہے۔''

''دس دفعہ ایک شخص کو آزما چکے ہوتے ہیں اس کے باوجود اسی کو ووٹ دے کر اپنے سروں پر بٹھا لیتے ہیں۔ ان کا مستقبل اور ملک چاہے جہنم میں جائے، ان کے سردار کا حکم نہیں ٹلنا چاہیے۔ جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔ جس کی طرف اشارہ کر دیا، ووٹ اسی کو دینا ہے۔ چاہے اس کے مقابلے میں کوئی فرشتہ ہی کیوں نہ آکر کھڑا ہو جائے۔''

''آپ کا فارمولا کیا تھا جناب؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت آسان...... میں نے اپنے ملک کے دس اپنی اپنی فیلڈ کے ماہرین کی ایک ٹیم بنائی تھی۔ ان میں معاشیات کے ماہرین تھے۔ سائنس اور تعلیم کے ماہرین تھے۔ ماہرین نفسیات اور ڈاکٹرز تھے۔ غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے کے لوگ تھے۔ یہ ایک انٹرویو پینل تھا۔ اب مثال کے طور پر کسی پارٹی نے کسی امیدوار کو ٹکٹ دیا۔ اس کی قابلیت، اس کا مزاج، اس کا بیک گراؤنڈ، اس کا کردار، پھر پینل کی سفارش پر اس شخص کو پارٹی یا تو بٹھا دیتی یا پھر وہ شخص انتخاب میں حصہ لینے کا اہل قرار پاتا۔ اس طرح پورے ملک سے جو لوگ منتخب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچتے وہ کیسے ہوتے؟''

''ظاہر ہے۔ ہر طرح سے صاف ستھرے اور قابل ہوتے۔''

''یوں سمجھ لو کہ پورے ملک کی کریم اسمبلیوں میں پہنچ جاتی۔'' اس نے کہا۔ ''اسمبلی، اسمبلی سے زیادہ ایک تھنکر فورم بن جاتا۔''

''یہ تو بہت زبردست فارمولا تھا جناب۔''

''لیکن کسی نے قدر نہیں کی کیونکہ یہاں تو لوگ کروڑوں خرچ کر کے اسمبلیوں میں آتے ہیں تاکہ اربوں کما سکیں۔ انہیں یہ فارمولا کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ اسی لیے ہر جگہ میرا مذاق اڑایا گیا کہ یہ شخص یوٹوپیا کا خواب دیکھ رہا ہے۔ بس اس کے بعد سے میں بددل ہو گیا۔''

''اور آپ بددل ہو کر اس جزیرے پر آگئے؟''

''نہیں بھائی، اس جزیرے پر تو ایک حادثہ لے آیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اس وقت میرا وہ دوست بھی میرے ساتھ تھا جس کی لانچ تھی۔ اس میں کچھ خرابی ہو گئی تھی۔ ہم دو دنوں تک اس جزیرے میں بھٹکتے رہے۔ ہم نے یہ کیبن دریافت کیا اور اسی دوران میرا دل یہاں لگ گیا۔ دو دنوں کے بعد جب لانچ کی مرمت ہو گئی اور دوست نے مجھے واپس چلنے کے لیے کہا تو میں نے بتایا کہ ایسا پرسکون ماحول زندگی میں پہلی بار ملا ہے۔ اس لیے میں دو چار دن یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔ تم دو چار دنوں کے بعد آجانا۔ کھانے پینے کا اتنا سامان لانچ پر تھا کہ میں بہ آسانی دو چار دن گزار سکتا تھا۔ بہرحال جب وہ دو دنوں کے بعد مجھے لینے کے لیے آیا تو میں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔''

''وہ کیوں؟''

''وہ اس لیے کہ وہ اپنے ساتھ چار پانچ دنوں کے اخبارات بھی لے آیا تھا۔ خدا کی پناہ۔ اتنی کرپشن، اتنی کلنگ، اتنی ڈکیتیاں، اتنے حادثے، اتنی بیان بازیاں کہ میرا تو سر گھوم کر رہ گیا۔ کمال ہے میں اب تک ایسی دنیا میں زندہ کس طرح تھا؟ بدقسمتی سے شہر تو رہنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ جہاں انسان ایک دوسرے کو تفریحاً مار رہا ہو۔ جہاں لڑکیوں پر ذرا ذرا سی بات پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہو۔ کیا وہ دنیا رہنے کے قابل تھی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ جزیرہ تو لاکھ گنا بہتر جگہ تھی۔ بس بھائی وہ دن ہے اور آج کا دن، میں واپس ہی نہیں گیا۔''

قدوائی صاحب نے اپنی کہانی ختم کر دی۔ اب سمجھ میں آگیا تھا کہ یہ شخص شہر چھوڑ کر اس جزیرے میں کیوں رہنے لگا تھا۔

''عامر میاں۔'' قدوائی نے مجھے مخاطب کیا۔ ''میرا دوست پرسوں اپنی لانچ لے کر آئے گا۔ تم اس کے ساتھ چلے جانا۔''

''پروفیسر صاحب! میرا دماغ خراب نہیں ہے جو میں واپس چلا جاؤں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں بھی تو آپ کی طرح اپنے شہر سے گھبرایا ہوا انسان ہوں۔ اتنی سکون کی جگہ چھوڑ کر کیوں واپس چلا جاؤں؟''

''ویلکم میرے دوست ویلکم۔'' قدوائی کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔ ''ہم دونوں بڑی آسانی اور آرام سے رہ سکتے ہیں۔''

تو میرے پڑھنے والو! وہ دن ہے اور آج کا دن۔ میں بھی پروفیسر قدوائی کے ساتھ اسی جزیرے پر ہوں اور اپنی کہانی لکھ کر پروفیسر کے دوست کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں۔ اس دعوت کے ساتھ کہ اگر وہاں سے بھی کوئی آکر اس پرسکون جزیرے میں زندگی گزارنا چاہے تو بخوشی گزار سکتا ہے۔

میں اور پروفیسر مل کر اس کے لیے دوسرا کیبن بھی بنا دیں گے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف۔





خواجہ احرار

ضیا تسنیم بلگرامی

عیاں اور نہاں کا فلسفہ اگر انسان کی سمجھ میں آجائے تو قدرت کے بہت سے راز اس پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ رب العزت کس بھیس میں کسے زمین پر اتار دے... اور اس کے پیروں تلے کون سے رستے پھیلا دے، اُس کے بھید وہ ہی جانے لیکن یہ حقیقت ہے، جو اس کی منشا کو پا گیا گویا اسی کا سفینہ پار لگا۔ مخلوقِ خدا کو بھی آپ کے سفر کا اندازہ آپ کے رستوں کے تعین سے ہو چلا تھا کہ حق کی راہ پر چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔

مال و متاع کو ٹھکرانے والے اللہ کے ایک

شکر گزار بندے کا احوال

یاغستان میں خواجہ شہاب الدین شاشی کا خاندان علمی سطح پر بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ان کے بیٹے خواجہ محمود کی شادی ایک دوسرے نامور خاندان کے خواجہ داؤد کی بیٹی سے ہوگئی۔

شادی کے بعد خواجہ محمود کی مالی حالت بگڑ گئی یہاں تک کہ جب رمضان 806 ہجری میں ان کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا تو ان کی معیشت تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ خواجہ محمود بچے کی تعلیم و تربیت کی طرف سے بہت فکر مند رہنے لگے۔ بچے کا نام عبید اللہ

رکھا گیا۔

پھر جیسا کہ مشاہیر کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، عبیداللہ کو بھی وہ سارے آلام جھیلنا پڑے جو بڑوں کا مقدر ہیں۔ یہاں تک کہ بارہ سال کی عمر میں وہ بے یارومددگار ہو گئے اور ان کی معیشت اتنی برباد ہو گئی کہ روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ جو لوگ اس نامی گرامی خاندان کی بزرگی سے واقف تھے، انہوں نے اشاروں کنایوں میں امداد و اعانت کی پیشکش کی لیکن غیرت نے اس کو گوارا نہ کیا اور انہوں نے انکار کر دیا۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ ایک کوڑی بھی خرچ نہ کر سکتے تھے اور ہمت کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس جو کچھ بھی ہوتا، سائل یا حاجت مند کے حوالے کر دیتے۔ بارہ سالہ لڑکے عبیداللہ کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اس سے کوئی سوال کرے اور وہ اس کا جواب انکار میں دے۔

ایک دن یہ بارہ سالہ لڑکا عبیداللہ بازار سے گزر رہا تھا، صاف ستھرے کپڑوں سے یہ اندازہ ہی نہ ہوتا تھا کہ اس لڑکے کی مالی حالت نہایت خستہ ہو گی۔ ایک موڑ پر معلوم نہیں کس طرف سے ایک فقیر نمودار ہوا اور لڑکے کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ فقیر نے ننگ دھڑنگ پیٹ پر ہاتھ پھیر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ اس کا پیٹ بالکل پچکا ہوا تھا۔ عبیداللہ نے پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ مجھ سے کوئی کام؟''

بالکل قریب سامنے طباخ اپنی دکان پر کھانے کا سامان بیچ رہا تھا۔ فقیر نے ایک بار پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور دوسرے ہاتھ سے طباخ کی طرف اشارہ کیا۔

عبیداللہ نے پوچھا۔ ''بھوکے ہو؟ کھانا کھاؤ گے؟''

فقیر نے اثبات میں گردن ہلا دی اور التجا آمیز نظروں سے عبیداللہ کی شکل دیکھنے لگا۔

عبیداللہ کی جیب میں ایک کوڑی بھی نہ تھی اور انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مسئلے پر غور کیا اور پھر فوراً ہی طباخ کے پاس پہنچ گئے۔ اپنے سر سے صاف ستھری دستار اتاری اور طباخ کی طرف بڑھا دی۔ ''بھائی! میری یہ دستار تجھ کو کیسی نظر آتی ہے؟''

طباخ نے جواب دیا۔ ''اچھی نظر آتی ہے...... کیوں؟ کیا بات ہے؟''

عبیداللہ نے کہا۔ ''میں اس کو فروخت کرنا چاہتا ہوں اور اس کی قیمت بھی زیادہ نہیں لوں گا۔''

طباخ نے تذبذب سے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے کہ تم اس کی زیادہ قیمت نہیں لو گے لیکن میاں صاحبزادے! تم یہ تو بتاؤ کہ میں اس دستار کو لے کر کروں گا کیا؟''

عبیداللہ نے کہا۔ ''کچھ بھی کرنا، یہ صاف ستھری ہے پاک ہے۔''

طباخ نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ ''صاحبزادے! تم بارہ سالہ لڑکے، میں تمہاری اس دستار کو اپنے کام میں بھی تو نہیں لا سکتا۔''

عبیداللہ نے کہا۔ ''جناب! گھبرانے کی کوئی بات نہیں، میں اس کا مصرف بھی بتا دوں گا۔ دستار کا یہی ایک مصرف تو نہیں ہے کہ اس کو سر پر باندھ لیا جائے، اس کے اور کئی مصرف بھی ہیں۔''

طباخ نے مسکرا کر کہا۔ ''دستار کا ایک ہی مصرف میں جانتا ہوں اور وہ مصرف ہے اس کا سر پر باندھنا۔ دوسرے مصرف کیا ہیں، میں نہیں جانتا۔ غالباً رومال کا کام بھی دستار ہی سے لیا جا سکتا ہے۔ بازار سے سودا سلف لانا ہو تو وہ اس میں باندھا جا سکتا ہے۔ اس سے کمر کسی جا سکتی ہے۔ شاید یہی چند مصارف اور ہیں اس کے؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ مصارف بھی ہیں اس کے، لیکن اس کا ایک ایسا مصرف بھی ہے جس کا تعلق تم سے اور تمہارے پیشے سے ہے۔''

طباخ نے حیرت سے پوچھا۔ ''وہ کون سا مصرف ہے جس کا تعلق مجھ سے اور میرے پیشے سے ہے؟''

عبیداللہ نے خالی دیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنی خالی دیگوں کے دھونے میں میری دستار استعمال کر سکتے ہو اور چونکہ میری دستار صاف ستھری اور پاک ہے اس لیے تم کو اس کے اس مصرف میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔''

طباخ عبیداللہ کے اصرار اور بحث و مباحثے سے پسیج گیا۔ بولا۔ ''اچھا اگر میں یہ کہوں کہ تیری دستار تجھ سے خریدتا ہوں تو، تو اس کی مجھ سے اجرت کیا لے گا؟''

عبیداللہ نے فقیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بس اس کو پیٹ بھر کے کھانا کھلا دو، یہی میری دستار کی اجرت ہے۔''

طباخ نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اور تم؟ کیا تم بھی کھانا کھاؤ گے؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ اس دستار کے عوض بس یہی ایک شخص کھانا کھائے گا۔''

طباخ نے ذرا دیر کے لیے سکوت اختیار کیا۔ پھر فقیر سے کہا۔ ''آجاؤ بابا! میں تمہیں کھانا دیتا ہوں۔''

فقیر تنور کے پاس بیٹھ گیا، طباخ نے اس کے آگے کھانا لگا دیا اور کہا۔ ''بابا! خوب جی بھر کے کھانا کیونکہ اس لڑکے نے جتنے خلوص سے تیرا سوال پورا کیا ہے، اس کی نہ تو کوئی قیمت ہے اور نہ ہی کوئی صلہ۔ سچ کہتا ہوں، میں نے اپنی زندگی میں لڑکا تو لڑکا ایسا کوئی آدمی تک نہیں دیکھا، واللہ اس لڑکے میں بڑائی کے آثار ملتے ہیں۔''

فقیر بڑی بے صبری سے کھانا کھاتا رہا اور شکر گزار نظروں سے عبیداللہ کی طرف دیکھتا رہا۔

عبیداللہ نے اپنی دستار طباخ کے حوالے کرنا چاہی مگر طباخ نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ عبیداللہ نے تلخی سے کہا۔ ''ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس فقیر نے مجھ سے سوال کیا تھا۔ میں یہ دستار واپس نہیں لوں گا۔''

طباخ نے بڑی کوشش کی کہ دستار واپس کر دی جائے لیکن عبیداللہ نے دستار واپس لینے سے صاف انکار کر دیا۔

طباخ نے کہا۔ ''میاں صاحبزادے! کچھ مجھے بھی ثواب کما لینے دو۔''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''ثواب کمانے سے میں نے تمہیں روکا تو نہیں۔ اس کے راستے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں لیکن میں نے جو کچھ کیا ہے، ثواب کمانے کی غرض سے نہیں کیا بلکہ ان حالات میں مجھ کو یہی کرنا چاہیے تھا۔''

فقیر بڑی جلدی جلدی کھانے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا جب وہ پوری طرح شکم سیر ہو گیا تو طباخ نے پوچھا۔ ''بابا! کچھ اور کھاؤ گے یا بس؟''

فقیر نے نفی میں گردن ہلا دی اور ایک زوردار ڈکار لے کر کھڑا ہو گیا۔

عبیداللہ نے فقیر سے پوچھا۔ ''بابا! بس یا اور کچھ؟ اب تو میں جا سکتا ہوں؟''

فقیر نے پہلی بار زبان کھولی۔ ''اے پیر عالم گیر! جا، خدا تجھ کو بہت کچھ دے گا۔ تو نے اپنی دستار کے عوض ایک وقت کا کھانا ہی نہیں خریدا بلکہ معلوم نہیں کیا کچھ خرید لیا۔ تجھ کو اس کا صلہ زندگی بھر ملتا ہی رہے گا۔''

فقیر کی باتوں نے عبیداللہ اور طباخ دونوں ہی کو حیران کر دیا۔ فقیر نے عالم جذب میں آواز لگائی۔ ''تو نے، اے لڑکے تو نے آج بہت بڑا سودا کیا ہے۔ واللہ اتنا بڑا سودا کہ تو ایک دستار کے عوض پیر عالمگیر بن گیا۔''

فقیر تو کہہ کر چلا گیا لیکن عبیداللہ کی حالت ہی کچھ اور ہو گئی۔ عبیداللہ نے سوچنا شروع کر دیا۔ ''اے عبیداللہ! خدا نے انسان کو اس لیے تو نہیں پیدا کیا کہ یہ اپنے آپ سے غافل ہو جائے پھر میں کیوں غافل ہوں۔ مجھ کو کچھ کرنا چاہیے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ کوئی ایسا کام جس سے میں خود بھی طمانیت حاصل کروں اور اپنے رب کو بھی راضی رکھ سکوں۔''

عبیداللہ نے گھر پہنچ کر خدا سے لو لگا لی اور گوشہ نشین ہو گئے۔

اس دوران آپ کی عبادت اور ریاضت کا شہرہ ہونے لگا۔ عبیداللہ کا کوئی مرشد نہیں تھا، جو کچھ تھا، اپنا تھا، خود سے کر رہے تھے لیکن پھر خیال آیا کہ اس سفر میں کسی کی راہبری بہت ضروری ہے چنانچہ انہیں مرشد کامل کی فکر لاحق ہو گئی۔

☆☆☆

چونکہ آپ کے بارے میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ آپ ہر ایک کے کام آتے ہیں اور اتنے زیادہ کام آتے ہیں کہ لوگ انہیں مشکل کشائی کا چلتا پھرتا نمونہ سمجھتے ہیں۔ آپ مراقبے میں تھے کہ آپ کو اطلاع دی گئی کہ ایک ضرورت مند آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔

آپ نے مراقبے کو توڑ دیا اور کہا۔ ''اس شخص کو حاضر کرو، اس کا مجھ سے کیا کام ہے؟''

اس ضرورت مند کو آپ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ آپ نے پوچھا۔ ''مجھ سے کوئی خاص کام ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''جناب! میں بہت پریشان ہوں۔ ایک بیوی اور کئی بچے رکھتا ہوں۔ مالی حالت بالکل تباہ ہے۔ دو دن سے گھر میں کچھ بھی نہیں پکا۔ آپ کی بڑی شہرت ہے۔ کہا جاتا ہے آپ کسی کو مایوس نہیں کرتے۔ کچھ میری بھی مدد

کیجیے، ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔''
آپ نے تسلی دی۔ ''خودکشی حرام ہے اور اس بات کی علامت کہ تو خدا کی رحمتوں سے مایوس ہو چکا ہے۔ میں تیرے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔''
اس شخص نے بے تابی سے کہا۔ ''جناب! کب کیجیے گا؟ بھوک تو اس وقت لگی ہے اور آپ وعدہ مستقبل کا کر رہے ہیں۔ میرے لیے اگر کچھ کرنا ہے تو فوراً کیجیے، ورنہ میں مایوسی میں معلوم نہیں کیا کچھ کر گزروں گا۔''
آپ خاموشی سے کچھ سوچنے لگے۔ ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور ہرات کے حاکم کے نام ایک رقعہ لکھا۔
''حاکم ہرات کے نام اللہ کے کمترین بندے عبیداللہ ابن خواجہ محمود کا مکتوب۔
''حاملِ ہٰذا معاشی بدحالی کا شکار ہے اور یہ بدحالی اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک بیوی اور کئی بچوں کا کفیل ہے۔ اللہ رب العالمین نے انسان کو انسانوں کے رزق کا امین بنایا ہے۔ تو ہرات کا حاکم ہے، اس لیے تیرا یہ فرض ہے کہ یہاں کے بھوکوں کی خبر گیری کرے اور ان کے رزق کا انتظام کرے۔ تو نے اس کی معاش کا کوئی مستقل بندوبست نہ کیا تو یہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرلے گا۔ اس کے بعد اس کی بیوی کیا کرے گی، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے حالات اس کو معصیت پر مجبور کردیں، اس کی اولاد بے تربیت اور آوارہ و ناکارہ ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چور بنے گا، کوئی اچکا اور یہ سارے گناہ تیرے نامۂ اعمال میں بھی شامل ہوں گے کیونکہ تو نے ایک بیوی کے شوہر اور کئی بچوں کے باپ کے معاشی معاملات پر غور وخوض اور دلچسپی سے کام نہیں کیا۔ تو نے ایک شخص کو حرام موت مرجانے کی اجازت دے دی اور مرحوم شوہر کی بیوی کو بدکاری اور حرام کاری پر مجبور کردیا۔ بے سہارا اور بے یارومددگار یتیموں کو دریوزہ گری اور چوری چکاری پر مجبور کردیا۔ اے حاکم! اس دن کی پکڑ سے ڈر، جس دن کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے سکے گا۔ اس دن کوئی رشتہ کام نہیں آئے گا۔ مال و زر، جائداد، دولت، اقتدار، اختیار کوئی شے کام نہ آئے گی۔ ہاں اچھے اعمال، نیکیاں، جود وسخا اور وہ شمہ برابر بھلائی جو کسی کے ساتھ کی گئی ہوگی، کام آجائے گی۔ اے حاکم! آخرت کی کھیتی کے لیے بیج بودے تاکہ موت کے بعد تجھے کھیتی تیار ملے۔
''میں امید کرتا ہوں کہ تجھ پر میری نصیحتوں کا خاطر خواہ اثر ہوگا اور یہ شخص مایوسیوں کے اندھیروں سے نکل کر اللہ کی رحمت کی روشنی میں آجائے گا۔''
آپ نے اس شخص کو یہ خط دیا اور کہا۔ ''جا، حاکم ہرات کو میرا یہ خط پہنچادے اور وہ اس کا جو بھی جواب دے، میرے پاس لے آ۔''
اس شخص نے مایوسی سے سوال کیا۔ ''حضرت! کیا آپ کی حاکم ہرات سے اچھی یاد اللہ ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''اے شخص! نیکی اور بھلائی کے لیے کسی یاد اللہ کی ضرورت نہیں۔''
اس مایوس اور لاچار شخص کے دل کو کوئی خوشی نہیں ہوئی کیونکہ اس کو ایک فیصد بھی کامیابی کا یقین نہیں تھا لیکن تین دن بعد جب وہ واپس آیا تو نہایت بشاش تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ہی کچھ اور تھی۔ آپ نے پوچھا۔ ''حاکم ہرات کو میرا خط پہنچادیا؟''
اس نے جواب دیا۔ ''جناب! پہلے تو دربانوں نے آگے بڑھنے ہی نہیں دیا۔ میں نے انہیں خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ دیا لیکن وہ نہیں پسیجے۔ آخر میں نے یہ طے کیا کہ میں حاکم کے راستے میں بیٹھ جاؤں اور جیسے ہی اس کی سواری سامنے سے گزرے، دوڑ کر آپ کا خط اس کو پیش کردوں۔ چنانچہ میری یہ ترکیب کارگر ہوئی اور میں حاکم ہرات کو آپ کا خط دینے میں کامیاب ہوگیا۔''
آپ نے پوچھا۔ ''میرا خط پڑھ کر حاکم نے کیا کہا؟''
اس نے جواب دیا۔ ''اس نے خط پڑھ کر مجھ کو اپنے ساتھ بٹھالیا۔ سواری محل میں واپس گئی۔ مجھ سے پوچھا ...... کیا تو بھوکا ہے؟ میں نے جواب دیا۔ جناب! میں اپنی بھوک سے نہیں اپنے بیوی بچوں کی بھوک سے پریشان ہوں۔ اس لیے اگر میں آپ کے دسترخوان پر اپنی بھوک مٹا بھی لوں گا تو بیوی بچوں کی بھوک کی خلش مجھے برابر تنگ کرتی رہے گی۔''
حاکم نے اسی وقت اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ اس کو پچاس دینار دے دیے جائیں تاکہ یہ ان سے اپنے گھر کا انتظام کرسکے۔ اس کے بعد مجھ سے کہا۔ ''جاؤ، ایک ہفتے بعد کام پر آجانا۔ تجھے میں نے اپنے خزانچی کے حوالے کیا۔ اس سے کام

سیکھ اور اس کی مدد کر۔ تیرا معقول مشاہرہ مقرر کر دیا جائے گا۔''

اور پھر جب میں پچاس دینار لے کر وہاں سے چلنے لگا تو حاکم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھ کو روکا اور کہا۔'' عبیداللہ سے جا کر کہہ دینا کہ آپ کی نصیحتوں کا بہت بہت شکریہ۔ دنیا کا نظام آپ ہی جیسے لوگوں سے چل رہا ہے۔ آپ آئندہ بھی مجھ کو نصیحتیں فرماتے رہیے گا تاکہ میں ادھر ادھر ہونے سے بچا رہوں۔''

آپ نے فرمایا۔'' جزاک اللہ۔ اللہ اس کو صراط مستقیم پر رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔''

جب اس بات کا شہرہ ہوا تو کسی حاسد نے کہا۔'' حضرت! آپ نے اس شخص کا کام کر دیا، خوب کیا۔ مگر جب لوگوں نے یہ سنا کہ آپ نے مراقبے کو توڑ کر حاکم ہرات کو خط لکھا تھا تو بہت افسوس کیا۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

آپ نے جواب دیا۔'' اے شخص! یہ تو نے کیسی بات کر دی، کیسا اعتراض کر دیا؟ میں کسی مسلمان کے کام کو اپنے مراقبے سے زیادہ ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نفل کے مقابلے میں کسی مسلمان کا کام کر دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔''

معترض نے پوچھا۔'' یہ کس کی تعلیمات پر آپ چل رہے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔'' یہ کسی اور کی تعلیم یا تلقین سے میں نے اخذ نہیں کیا بلکہ خدمات کے ثمرے سے یہ اخذ کیا ہے چنانچہ جب میں کسی کے کام آ جاتا ہوں تو میرے ضمیر اور نفس کو بڑی فرحت اور خوشی محسوس ہونے لگتی ہے اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اللہ ہر شخص کو اپنا قرب ایک مخصوص دروازے سے عطا فرماتا ہے۔ اس نے میرے لیے مخلوق کی خدمت کا دروازہ رکھا ہے۔ چنانچہ مجھ کو مخلوق کی خدمت زیادہ محبوب ہے۔''

معترض اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

ہرات میں شیخ بہاؤالدین عمر بھی بڑی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی محفل میں علماء اور فقراء تک حاضریاں دیا کرتے تھے۔ عبیداللہ بھی وقتاً فوقتاً پہنچ جایا کرتے تھے۔ ایک دن جو یہ شیخ بہاؤالدین عمر کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے سوال کیا۔

'' عبیداللہ! شہر کا کیا حال ہے؟ لوگ کیا کر رہے ہیں؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔'' حضرت! دو اہم خبریں ہیں۔''

انہوں نے پوچھا۔'' کون کون سی؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔'' حضرت شیخ زین الدین اور ان کا حلقہ کہتا ہے ہمہ از اوست، اور سید قاسم اور ان کے پیرو کہتے ہیں، ہمہ از اوست نہیں بلکہ ہمہ اوست۔''

شیخ بہاؤالدین عمر نے پوچھا۔'' اور تم کیا کہتے ہو؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔'' میں ہمہ از اوست کا قائل ہوں۔''

شیخ بہاؤالدین نے فرط خوشی میں کہا۔'' اور درست بھی یہی ہے۔ یہاں جو کچھ ہے اسی سے ہے، حالانکہ درست یہ بھی ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہے وہی ہے، اس کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن اس عقیدے میں عوام کی گمراہی کا اندیشہ موجود ہے۔ اگر یہاں اس کے سوا کچھ بھی نہیں، تو کفار بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اشجار، مظاہر فطرت اور بتوں کی پرستش کہاں کرتے ہیں کیونکہ جب اس کے سوا یہاں کچھ ہے ہی نہیں اور جو کچھ بھی ہے اس میں وہی موجود ہے تو اشجار، مظاہر فطرت اور بتوں میں بھی وہی موجود ہے۔ اس طرح نہ کوئی کافر ہے نہ کوئی مسلمان۔ کفر و اسلام کا فرق ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی ہے، اس سے ہے تو گویا ہم خالق اور مخلوق کے درمیان ایک فصل پیدا کر دیتے ہیں اور غیر اللہ کے سجدے سے بچ جاتے ہیں۔''

ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے فلسفے اور معانی و مطالب نے عبیداللہ کو بہت متاثر کیا اور انہوں نے خود کو ہمہ از اوست پر قائم کر لیا۔

یہ عبیداللہ کی جوانی کا واقعہ ہے۔ ان دنوں مولانا سعدالدین کاشغری بھی ہرات ہی میں مقیم تھے اور ان کے فضل و کمال کا بڑا چرچا تھا۔ مولانا سعدالدین کاشغری عبیداللہ کے پاس ہی رہتے تھے۔ اب عبیداللہ کی معیشت خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ حاکم ہرات نے انہیں زمینیں عطا کر دی تھیں جن پر مزدوروں کی مدد سے کاشت کی جانے لگی۔ وہ مزدوروں کے ساتھ خود بھی لگ جاتے۔ خدا نے انہیں بہت جلد مالا مال کر دیا چنانچہ مولانا کاشغری کی تشریف آوری اور اقامت سے عبیداللہ کو فکرمند نہیں

ہونا پڑا اور وہ بڑی تواضع سے پیش آئے۔ دونوں الگ الگ ریاضت کرتے اور روحانی کمال میں اضافہ کرتے رہتے۔ شام کو دونوں ایک ساتھ ادھر ادھر نکل جاتے اور مختلف طریقوں سے اپنی ہمت اور استعداد کا جائزہ لیتے رہتے۔ شہر کے بیچوں بیچ میں ایک اکھاڑا تھا، جس میں شہر بھر کے پہلوان زور آزمائی کرتے تھے اور ان کشتیوں کو دیکھنے کے لیے شہر کی کثیر آبادی اکھاڑے کے چاروں طرف جمع ہو جاتی تھی۔ عبیداللہ نے مولانا کاشغری سے کہا۔

''حضرت! ہم دونوں کیوں نہ اکھاڑے چلیں اور مقابلوں سے جی بہلائیں۔''

مولانا کاشغری نے جواب دیا۔''عبیداللہ! ہم نے جو راہ پکڑی ہے اس میں جی بہلانے کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ تم نے یہ کیسی بات کر دی؟''

عبیداللہ نے کہا۔''حضرت! میں صرف تماش بین کی حیثیت سے نہیں جا رہا ہوں بلکہ میں وہاں اپنی ہمت اور استعداد کا امتحان کروں گا۔ مولانا! میں وہ کارنامے دکھاؤں گا کہ آپ دنگ رہ جائیں گے اور لوگوں کو سکتہ ہو جائے گا۔''

مولانا کاشغری نے پوچھا۔''کیا ہم دونوں اکھاڑے چلیں گے؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔''ہاں، ہم دونوں اکھاڑے چلیں گے کیونکہ ہمیں وہاں روحانی کمال کے مظاہرے کرنے میں آسانی رہے گی اور اس طرح لوگوں کو بھی وہ سب کچھ دیکھنے کا موقع ملے گا جو ہم دکھانا چاہتے ہیں۔''

چنانچہ یہ دونوں شہر کے اکھاڑے کی طرف چل دیے۔ دور ہی سے اکھاڑے کا ہجوم انہیں دکھائی دینے لگا۔ شہر کے مختلف حصوں سے مقابلے میں حصہ لینے والے پہلوان اکھاڑے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ عبیداللہ نے ایک دبلے پتلے پہلوان کو راستے ہی میں روک لیا اور اس سے پوچھا۔

''کیوں بھائی! کیا تو بھی کشتی لڑے گا؟''

پہلوان نے جواب دیا۔''ہاں جناب! میں بھی کشتی لڑوں گا۔ کیوں بات کیا ہے؟''

عبیداللہ نے مسکرا کر کہا۔''لیکن تیرا جثہ اور صحت تو ایسے نہیں ہیں کہ تو کسی بھی پہلوان کو پچھاڑے۔ پھر تو کس سے کشتی لڑے گا؟ یہاں تو ہر پہلوان تجھ سے بڑا اور طاقتور دکھائی دیتا ہے۔''

پہلوان نے سرد آہ کھینچی اور کہا۔''بس یہی خیال تو میرا دل توڑ دیتا ہے۔ میں کشتی میں نام پیدا کرنا چاہتا ہوں اور میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی یہی ہے کہ میں لوگوں میں پہلوان کی حیثیت سے پہچانا جاؤں۔''

عبیداللہ نے کہا۔''اگر میں تیری یہ خواہش پوری کر دوں تو؟''

پہلوان اچھل گیا اور بے چینی سے پوچھا۔''میری یہ خواہش کس طرح پوری ہو سکتی ہے؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔''یہ کام تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کو صرف تو ہی نہیں پورا شہر دیکھ اور سن لے گا۔''

پہلوان نے عاجزی سے کہا۔''حضرت! اگر آپ خدا کے خاص بندے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں بڑا نامی گرامی پہلوان بن سکتا ہوں تو خدا کے لیے میری یہ تمنا پوری کر دیجیے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

عبیداللہ نے پوچھا۔''تو کس کس پہلوان سے لڑنا چاہتا ہے؟''

پہلوان نے جواب دیا۔''ہر اس پہلوان سے جو اپنے اپنے مقابل کو شکست دے کر آگے آیا ہو۔''

عبیداللہ نے کہا۔''تب پھر میں حکم دیتا ہوں کہ تو جس جس کو زیر کرنا چاہتا ہے، اس کو مقابلے کی دعوت دے دے۔ اللہ نے چاہا تو تو ہی جیتے گا۔ کوئی بھی پہلوان تجھ کو شکست نہیں دے سکتا۔''

پہلوان نے آپ کو کچھ تحفے کے طور پر پیش کیا اور کہا۔''حضرت! فی الحال میں آپ کو کوئی بڑا تحفہ نہیں پیش کر سکتا اس لیے جو کچھ حاضر ہے پیش کر رہا ہوں، قبول فرمائیں۔''

عبیداللہ نے بڑے ناگوار لہجے میں کہا۔''اے شخص! میں نے جو یہ جتانے کی پیشکش کی ہے، اس کے پیچھے حرص و طمع اور لالچ کو کوئی دخل نہیں۔ تجھ کو جتوا کر میں اپنے روحانی تصرفات کا کمال اور ہمت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس طرح دو بڑے کام ہو جائیں گے۔ پہلا یہ کہ میں اپنے روحانی کمال اور ہمت سے واقف ہو جاؤں گا اور دوسرا یہ کہ تو اس شہر کا نامی گرامی بلکہ سب سے بڑا پہلوان بن جائے گا اور اس طرح تیری ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جائے گی۔''

پہلوان جھوم جھوم گیا اور نشے کی کیفیت میں بہکنے لگا۔

مولانا کاشغری نے ٹہوکا دیا اور آہستہ سے کہا۔ ''عبیداللہ! یہ کیا کر رہے ہو؟ کیا کسی اور طرح روحانی تصرفات اور ہمت کا اندازہ نہیں کر سکتے ہو؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''فی الحال یہی کافی ہے، میں زیادہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں اپنے اس طریقے میں کیف سا محسوس کر رہا ہوں۔''

مولانا کاشغری نے پہلوان کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں تو اس پہلوان میں ایک بھی ایسی کوئی بات یا خوبی نہیں محسوس کر رہا ہوں، جس سے اس کی تمام پہلوانوں پر سبقت اور برتری کی امید کر لی جائے۔''

عبیداللہ نے پہلوان سے کہا۔ ''اب تو پہلوانوں میں شامل ہو جا اور جس پہلوان سے بھی مقابلہ کرنا چاہے، مقابلہ کر...... جیت تیری ہی ہوگی۔''

پہلوان بھاگ کر پہلوانوں میں شامل ہو گیا۔ عبیداللہ اور مولانا کاشغری بعد میں پہنچے۔

کمزور پہلوان اچانک اکھاڑے میں کود پڑا اور اعلان کیا۔ ''لوگو! اس وقت میں ہرات کا سب سے بڑا پہلوان ہوں اور اس بڑائی کو ثابت کرنے کے لیے میں اس اکھاڑے میں اترا ہوں۔ جس جس کو اپنی طاقت اور داؤ پیچ پر ناز ہو، وہ میرے مقابلے میں آ جائے۔ اللہ نے چاہا تو میں اپنے دعوے کی صداقت ثابت کر دوں گا۔''

زور آور نامی گرامی پہلوانوں نے کمزور پہلوان کی طرف ہنس کر دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ تماش بینوں میں سے بعض نے مسکرا کر کہا۔ ''غریب کی شامت ہی آ گئی ہے شاید، کوئی بھی بڑا پہلوان اس کی ہڈی پسلی برابر کر دے گا۔ یہ ہے ہی کیا، ایک بھنگا۔''

عبیداللہ اور مولانا کاشغری اکھاڑے کے قریب بیٹھ گئے۔

جوڑ کا اعلان کیا جانے لگا اور آخر تک اس کمزور پہلوان کا نام تک نہ آیا۔ اس نے احتجاج کیا۔ ''میں بھی مقابلہ لڑوں گا، میں بھی کشتی لڑوں گا اور ہر اس شخص سے لڑوں گا جس کو اپنی پہلوانی پر ناز ہوگا۔ آخر میرا نام کیوں نہیں لیا جا رہا؟ میں بھی تو کشتی لڑنے آیا ہوں۔''

اعلان کرنے والے نے ازراہِ مذاق اعلان کیا۔ ''چونکہ اس ٹڈے پہلوان کا یہاں کوئی جوڑ ہی نہیں اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ جو پہلوان اول آئے گا، اس کا مقابلہ اس ٹڈے پہلوان سے کرایا جائے گا۔''

کمزور پہلوان پھولا نہ سمایا اور مارے خوشی کے اکھاڑے میں کئی قلابازیاں کھائیں۔

کشتیاں ہونے لگیں۔ عبیداللہ نے اپنے روحانی کمال اور ہمت کا امتحان لینا شروع کر دیا۔ جو پہلوان زیر ہونے لگتا، آپ اس پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتے۔ توجہ کا یہ اثر تھا کہ زیر ہونے والے کا اوپر لے آتا اور طاقتور پہلوان کمزور پڑ جاتا پھر جب دوسرا زیر ہونے لگتا تو آپ پہلے کو کمزور کر دیتے اور دوسرا حاوی آ جاتا۔ یہاں تک کہ اس آخری مقابلے نے اتنا طول کھینچا کہ گھنٹوں بعد بھی کسی کے حق میں فیصلہ نہ ہو سکا اور دونوں پہلوان شل ہو کر پسینا پسینا ہو گئے، زور زور سے ہانپنے لگے اور یہ مقابلہ ہار جیت کے بغیر ہی ختم ہو گیا۔

دوسرا مقابلہ شروع ہوا اور آپ نے اپنی توجہ اس پہلوان پر مرکوز کر دی جو نسبتاً کمزور محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ کمزور پہلوان نے طاقتور کو شکست دے دی۔ لوگوں نے خوشی سے نعرے بلند کیے اور کمزور پہلوان کو تماشائیوں نے کاندھے پر اٹھا لیا۔

اس کے بعد تیسرا مقابلہ ہوا اور اس مقابلے میں بھی وہی جیتا جس پر عبیداللہ کی توجہ تھی۔ جب سارے مقابلے ہو گئے اور ایک پہلوان ان سب میں اول آیا تو کمزور پہلوان ایک بار پھر اکھاڑے میں اتر پڑا اور اعلان کیا۔ ''حضرات! اب میں اپنے مقابلے کا منتظر ہوں اور حسب وعدہ اول آنے والے پہلوان کا مجھ سے مقابلہ کرایا جائے۔''

اعلان کرنے والے نے ہنس کر جواب دیا۔ ''میں نے وہ اعلان تو یوں ہی مذاق میں کر دیا تھا ورنہ کیا مجھ کو اندازہ نہیں ہے کہ کون کتنی طاقت رکھتا ہے اور کتنے داؤ پیچ جانتا ہے۔ اگر تیری شامت ہی آ گئی ہے تو، تو بے شک مقابلے پر ڈٹا رہ۔ ورنہ میرا مشورہ مان اور اپنا راستہ لے۔ کسی بھی پہلوان کو تجھ پر غصہ آ گیا تو وہ تجھ کو اٹھا کر اکھاڑے کے باہر پھینک دے گا جس

سے تیری پسلیاں ٹوٹ پھوٹ کر برابر ہو جائیں گی۔''
کمزور پہلوان نے شور کیا۔ ''واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں تو لڑے بغیر اکھاڑے سے نہ نکلوں گا۔''
عبیداللہ نے بھی مداخلت کی، کہا۔ ''لوگو! یہ تو واللہ بڑی زیادتی ہے اس پہلوان کے ساتھ۔ جب اعلان کیا ہے کہ آخر میں اول آنے والے پہلوان کو اس تختی پہلوان سے مقابلہ کرنا ہوگا تو اب کیوں گریز اختیار کیا جا رہا ہے؟''
تماش بین بھی مقابلے سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے، شور کیا۔ ''یہ مقابلہ ہوگا، ضرور ہوگا۔''
چنانچہ منتظم اکھاڑا نے کمزور اور اول آنے والے پہلوانوں کو یکجا کیا اور اعلان کیا۔ ''حضرات! بہ ظاہر تو ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں لیکن آپ لوگ اس کشتی پر مصر ہیں تو میں بھی مجبور ہو گیا ہوں۔ اب ان دونوں کا مقابلہ ہوگا اور ان میں جو جیتے گا وہی آج کا فاتح کہلائے گا۔''
دونوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ طاقتور پہلوان نے غصے میں کمزور کو پٹخنی دینا چاہی لیکن عبیداللہ کی پوری توجہ کمزور کے حق میں تھی چنانچہ کمزور پہلوان نے زور لگا کر طاقتور پہلوان کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور سر سے اونچا کر کے اکھاڑے میں دے مارا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی اور غیر متوقع ہوا کہ کسی کو اس نتیجے پر یقین ہی نہ آیا۔ تماشائی پہلوان، منتظمین، ہر کوئی حیرت زدہ اور پریشان دیکھے ہوئے پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔
طاقتور پہلوان نے کہا۔ ''یہ مقابلہ صحیح نہیں تھا اور اس شخص نے مجھ کو دھوکے سے زیر کر لیا ہے اس لیے یہ مقابلہ دوبارہ کرایا جائے۔''
کمزور پہلوان سے پوچھا گیا۔ ''تو کیا کہتا ہے؟ کیا یہ مقابلہ دوبارہ ہونا چاہیے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''نہ صرف دوبارہ بلکہ سہ بارہ کے لیے بھی میں تیار ہوں۔ مجھ کو اپنی طاقت اور داؤ پیچ پر ناز ہے، اس لیے میں دس بار مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔''
کمزور پہلوان کے اس جواب نے ہر ایک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور ہارا ہوا پہلوان خوف زدہ ہو گیا۔
دونوں کا مقابلہ پھر شروع ہوا۔ اس بار عبیداللہ نے روحانی تصرف میں کمی کر دی اور مقابلے کو طول دینا شروع کر دیا۔ کبھی طاقتور اوپر آ جاتا کبھی کمزور طاقتور کو مغلوب کر لیتا۔ کافی دیر تک مقابلہ جاری رہا۔ آخر عبیداللہ نے روحانی تصرف میں اضافہ کر دیا اور کمزور نے طاقتور کو ایک بار پھر سر سے اونچا لے جا کر دے مارا اور اس بار اس کو اتنے زور سے گرایا گیا کہ وہ اٹھ نہ سکا، آنکھیں بند کیے دیر تک پڑا رہا۔ کمزور پہلوان فخریہ اکھاڑے کے چاروں طرف چکر لگاتا رہا اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر لوگوں کی داد و تحسین کا جواب دیتا رہا۔
نتیجے کا اعلان کمزور پہلوان کے حق میں کر دیا گیا۔
کمزور پہلوان نے ایک بار پھر اعلان کیا۔ ''ہے کوئی پہلوان جو میرے مقابلے پر آئے، میں ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہوں۔''
ایک پہلوان کو دیکھ دیکھ کر غصہ آ رہا تھا بولا۔ ''میں تجھ سے لڑنے کو تیار ہوں۔''
کمزور نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ ''آ جا بھائی تو بھی آ جا اور اپنے ارمان نکال لے۔''
دوسرا پہلوان مشتعل ہو کر اکھاڑے میں اتر گیا۔
پہلا پہلوان ابھی تک اکھاڑے میں پڑا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دوسرے پہلوان کو اکھاڑے میں اترتے دیکھا تو چپکے سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچا اور کان میں کہا۔ ''بھائی! اس کے کمزور جسم پر نہ جانا، یہ بہت طاقتور ہے اور میرا دو بار کا یہ تجربہ ہے کہ اگر اس کی گرفت میں پھنس گئے تو یہ اوپر تک لے جا کر بڑی زور سے دے مارے گا۔ بس لڑنے کے دوران یہی خیال رکھنا کہ کہیں تم اس کی پکڑ میں نہ آ جانا۔''
دوسرے نے جواب دیا۔ ''میں احتیاط کروں گا۔ میں نے بھی کچھ یہی اندازہ لگایا ہے کہ اس کی گرفت سخت ہوتی ہے اور خود کو اس کی پکڑ سے محفوظ رکھا جائے۔''
اکھاڑے میں ایک بار پھر اعلان ہوا۔ ''حضرات! ایک دوسرے پہلوان نے آخری جیتے ہوئے پہلوان کو دعوتِ مقابلہ دے دی ہے اس لیے ذرا دیر بعد دوسرا مقابلہ ہوگا۔ مزید گزارش یہ ہے کہ آپ لوگ اس دوسرے

مقابلے کو بہت غور سے دیکھیں کیونکہ بہ ظاہر کمزور مگر اس غیر معمولی پہلوان میں یہ خاص بات دیکھی گئی ہے کہ یہ اپنے حریف کو توقع سے پہلے ہی شکست دے دیتا ہے اور تماشائی سب کچھ دیکھ کر بھی انجام کو سمجھ نہیں پاتے اور اگر سمجھ جاتے ہیں تو اس پر یقین نہیں کرتے۔''

تماشائی دم بخود اکھاڑے کی طرف دیکھنے لگے۔

مقابلہ شروع ہوا اور عبیداللہ نے آہستہ آہستہ تصرف بڑھانا شروع کیا۔ آپ نے اپنا تصرف بڑھا کر ایک دم کم کردیا جس کے نتیجے میں کمزور پہلوان زمین پر آرہا۔ پہلے پہلوان نے خوشی میں نعرہ بلند کیا۔ ''وہ مارا۔''

لیکن دوسرے ہی لمحے آپ نے اپنی پوری توجہ کمزور پر مرتکز کردی۔ اس نے طاقتور پہلوان کو اچانک دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا اور بیچ اکھاڑے میں دے پٹخا۔ اب دوسرے مغلوب پہلوان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ سے اٹھ سکتا۔ وہ کچھ دیر دم سادھے پڑا رہا۔

کمزور پہلوان نے اعلان کیا۔ ''اصولی طور پر دوسرا پہلوان بھی مجھ سے ہار چکا ہے لیکن میں حسب سابق اس سے بھی دوبارہ مقابلہ کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اس کا جی چاہے تو؟''

ہارا ہوا پہلوان فوراً اٹھ کھڑا ہوا، بولا۔ ''میں ایک شرط پر دوبارہ لڑنے کو تیار ہوں۔''

کمزور نے پوچھا۔ ''کس شرط پر؟''

جواب ملا۔ ''یہ جو تو اوپر تک اٹھا کر پٹخ دیتا ہے، کشتی میں یہ نہیں ہونا چاہیے۔ تو اپنے داؤ لگا، میں اپنے داؤ لگاؤں گا غرضیکہ جو بھی جیتے، داؤ سے جیتے۔ میں اس اجڈ کشتی سے بالکل واقف نہیں کہ اپنے حریف کو اونچا اٹھا کر اکھاڑے میں دے مارے۔''

کمزور نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ شرط منظور ہے، چلو میں نہیں پٹخوں گا...... اور کچھ؟''

مقابلہ پھر شروع ہوا اور عبیداللہ نے روحانی تصرفات سے کام لینا شروع کردیا۔ کبھی یہ روحانی تصرف طاقتور کے حق میں ہو جاتا اور کبھی کمزور کے حق میں۔ دونوں کا لڑتے لڑتے برا حال ہو گیا۔ کمزور پہلوان کو پسینا آ گیا۔ اس نے عبیداللہ کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھا۔ آپ مسکرائے اور اپنی پوری توجہ کمزور پر مرکوز کردی۔ اس بار کمزور نے طاقتور کو اپنی پشت پر لے لیا۔ بالکل مشک کی طرح اور کئی زور زور کے جھٹکے دے کر اکھاڑے میں گرا دیا۔ گرنے والے کی ریڑھ کی ہڈیاں جواب دے گئیں اور وہ دم سادھے دیر تک پڑا رہا۔

کمزور نے پھر ہاتھ ہلا ہلا کر اعلان کیا۔ ''اور کوئی ہے جو مقابلے پر آئے۔ آج میں ایک لنگوٹ پر دس پہلوانوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوں۔ اللہ چاہے گا تو میں سبھی کو شکست دے دوں گا۔''

اعلان کرنے والے نے بہ آواز بلند کہا۔ ''ہے کوئی اور پہلوان جو اس عظیم پہلوان سے مقابلہ کرے؟''

سب نے دم سادھ رکھا تھا۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کھڑے ہو کر باقاعدہ مقابلے کا اعلان کردے۔

کمزور پہلوان نے فیصلہ کن لہجے میں پوچھا۔ ''کوئی ہے جو میرے مقابلے پر آئے۔ میں آج ہرات کا عظیم پہلوان ہوں اگر کسی کو میرے اس دعوے پر اعتراض ہو تو میرے مقابلے پر آجائے اور میری کمتری کو ثابت کردے۔''

اس اعلان کے بعد وہ بڑی دیر تک اکھاڑے میں کھڑا رہا اور اپنے حریف کا انتظار کرنے لگا لیکن کوئی بھی سامنے نہ آیا۔

آخر مقابلے کے اختتام کا اعلان کردیا گیا اور کمزور پہلوان کو ہرات کا عظیم پہلوان قرار دے دیا گیا۔

کمزور پہلوان کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے اور وہ آپ کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ ''حضرت! یہ جو کچھ بھی مجھ کو حاصل ہوا ہے، آپ کی توجہ سے، میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں، بس جا، اللہ کو یاد کر اور گھمنڈ سے کام نہ لینا۔''

پورے ہرات میں ان مقابلوں کا بڑا چرچا ہوا لیکن یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی کہ یہ سارا کیا دھرا عبیداللہ کا تھا۔

☆☆☆

مولانا کاشغری ہرات سے سمرقند چلے گئے اور عبیداللہ کو دعوت دے گئے کہ ہرات چھوڑ کر سمرقند کی سکونت اختیار کریں۔ آپ نے وعدہ کرلیا کہ میں ضرور آؤں گا۔

مولانا کاشغری نے کہا۔ ''وہاں میری زمینیں ہیں، ان پر ہم دونوں مل جل کر کاشت کریں گے اور اللہ نے چاہا تو کایا پلٹ کر رکھ دیں گے۔''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''میں سمرقند ضرور پہنچوں گا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلوں گا۔ مجھ کو سمرقند کی طرف سے بوئے یگانگت آتی محسوس ہو رہی ہے۔''

ان دنوں سمرقند میں مولانا نظام الدین خاموش روحانی کمال میں دوسروں سے بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک دن مراقبے میں کچھ دیکھا اور ایک دم چونک کر چیخ ماری اور کپکپی سی طاری ہوگئی۔ وہاں مولانا کاشغری بھی موجود تھے۔ انہوں نے مولانا نظام الدین خاموش سے پوچھا۔ ''حضرت! کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

مولانا نظام الدین نے جواب دیا۔ ''کاشغری! ابھی ابھی مراقبے میں، میں نے ایک جوان کو سمرقند کی طرف آتے ہوئے دیکھا ہے۔ بس اس کو دیکھ کر میں کانپ گیا کیونکہ اس کی شاندار چال اور پرشکوہ چہرہ، دونوں ہی کچھ اعلان کر رہے ہیں۔''

مولانا کاشغری نے پوچھا۔ ''حضرت! میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔''

مولانا نظام الدین نے جواب دیا۔ ''مولانا کاشغری! میں نے اس پورب سے آنے والے کی پیشانی پر اس کا نام پڑھ لیا ہے عبیداللہ احرار، یہ شخص پورے عالم کو اپنے تحت کرلے گا۔''

مولانا کاشغری خاموش ہوگئے کیونکہ انہیں خوب معلوم تھا کہ عبیداللہ ان کی دعوت پر عنقریب آنے والے ہیں۔

کچھ دنوں بعد عبیداللہ سمرقند پہنچ گئے اور مولانا کاشغری اور مولانا نظام الدین خاموش کے مہمان ہوئے۔ مولانا نظام الدین ان کی صورت دیکھتے ہی احتراماً کھڑے ہوگئے اور کہا۔ ''خوش آمدید عبیداللہ۔ میں تو تمہارا انتظار ہی کر رہا تھا۔''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں تو آپ کی خدمت میں درس کی خاطر حاضر ہوا ہوں۔''

مولانا نظام الدین نے کہا۔ ''وہ اپنی جگہ لیکن اس سے تمہارا مرتبہ کم نہیں ہوجاتا۔''

عبیداللہ کئی سال سمرقند میں مقیم رہے، اس کے بعد ہرات واپس گئے۔ ان دنوں ہرات میں مشہورِ زمانہ نقش بندی بزرگ یعقوب چرخی بھی آئے ہوئے تھے۔ ان بزرگ کی شہرت نے سبھی کو متاثر اور مرعوب کر رکھا تھا۔ عبیداللہ کے دل میں بھی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ ابھی تک عبیداللہ نے کسی کی مریدی اختیار نہیں کی تھی۔ اب وہ کسی کے مرید ہوجانا چاہتے تھے چنانچہ یعقوب چرخی کی ذات اسی غرض سے انہیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

عبیداللہ ڈرتے ڈرتے یعقوب چرخی کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ یہ بھی نہ پوچھا کہ تم کون ہو اور میرے پاس کیوں آئے ہو؟

عبیداللہ کو اپنی حاضری پر بڑا افسوس ہوا اور دل میں سوچا کہ میں نے ان کی خدمت میں ناحق حاضری دی۔ مجھ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ اسی تذبذب اور تاسف میں تھے کہ مولانا یعقوب چرخی نے کہا۔ ''اے شخص! میں نے تجھ سے یہ کب کہا تھا کہ تو میرا مرید ہونا چاہتا تھا لیکن اب میں تجھ کو مرید نہیں کروں گا، واپس جا اور کسی اور کا در دیکھ۔''

ابھی ان کی بات ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ عبیداللہ کی نظر یعقوب چرخی کی پیشانی پر گئی۔ وہاں ایک سفید داغ نظر آیا۔ جس سے عبیداللہ کے دل میں کراہیت اور تنفر پیدا ہوگیا۔ ان کے دل میں یعقوب چرخی کی طرف سے بیزاری پیدا ہوگئی۔

مولانا یعقوب چرخی نے کہا۔ ''تو گویا میری پیشانی کا سفید داغ تجھ کو اور دور کر رہا ہے اور تو بیعت میں تامل سے کام لے رہا ہے۔''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''حضرت! دل کا معاملہ براہِ راست خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ میری کیا مجال کہ میں آپ سے نفرت کروں یا بیعت میں تامل سے کام لوں۔''

مولانا یعقوب نے کہا۔ ''عبیداللہ! اپنی آنکھیں بند کر اور دیکھ کہ تجھ کو کیا نظر آرہا ہے؟''

عبیداللہ نے آنکھیں بند کرلیں اور کچھ دیکھنے کی کوشش کی اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ یہاں بھی مولانا یعقوب چرخی موجود تھے لیکن اب ان کی پیشانی پر کوئی سفید داغ نہیں تھا اور چہرے پر بلا کی نورانیت پائی جاتی تھی۔ انہوں نے گھبرا کر

آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے مولانا یعقوب کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہاں بھی خلع لبس (تبدیلی لباس) ہو چکا تھا اور ان کے سامنے وہ پہلے جیسے مولانا یعقوب نہیں تھے جن کی پیشانی پر سفید داغ موجود تھا، اب ان کے سامنے جو ذات تھی، وہ بڑی حسین و جمیل اور پرکشش تھی۔

مولانا یعقوب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''عبیداللہ! کیا تجھ کو معلوم ہے کہ میری بابت حضرت بہاؤالدین نقشبند نے کیا فرمایا تھا؟''

عبیداللہ نے جواب دیا۔ ''جو کچھ فرمانا ہے حضور ہی فرمادیں، میں کیا عرض کروں۔''

مولانا یعقوب نے کہا۔ ''بہاؤالدین نقشبند نے فرمایا تھا کہ میرا ہاتھ یعقوب کا ہاتھ ہے اور جو شخص یعقوب کے ہاتھ پر بیعت کرے گا، گویا میرے ہاتھ پر بیعت کرے گا۔ اس لیے عبیداللہ میرے ہاتھ پر بیعت کر کے حضرت بہاؤالدین نقشبند کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی سعادت حاصل کر۔''

مولانا یعقوب خاموش ہوئے تو عبیداللہ نے بے اختیار ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور ان سے بیعت ہو گئے۔

اب عبیداللہ کی زندگی میں ایسا موڑ آ چکا تھا جہاں سے انہیں دوسروں کی راہنمائی کا فرض ادا کرنا تھا۔ اب وہ عبیداللہ احرار ہو چکے تھے اور ان کا لقب ناصرالدین قرار پا چکا تھا۔

ایک دن مراقبے میں آپ کو القا ہوا کہ اسلام کو تقویت اور شریعت کو عروج بادشاہوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے چنانچہ آپ ہرات سے سمرقند تشریف لے گئے۔ ان دنوں سمرقند میں امیر تیمور کے بیٹے مرزا شاہ رخ کا پوتا مرزا عبداللہ حکومت کر رہا تھا۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر عام ہوئی تو لوگوں کا ہجوم ٹوٹ پڑا۔ ان میں مرزا عبداللہ والیٔ سمرقند کا ایک امیر بھی شامل تھا۔ آپ نے اس امیر سے کہا۔ ''کیا تو جانتا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں؟''

امیر نے جواب دیا۔ ''میں نہیں جانتا اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔''

آپ نے فرمایا۔ ''تو نے بڑی غلط بات کہی۔ تو سلطان کا امیر ہے اس لیے تجھ کو ملک کے معاملات سے باخبر رہنا چاہیے۔''

امیر نے جواب دیا۔ ''ہمیں بہت سی باتوں کی خبر رہتی ہے، براہِ کرم یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ سمرقند کیوں تشریف لائے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''مجھ کو مراقبے میں القا ہوا ہے کہ اسلام کو تقویت اور شریعت کو عروج بادشاہوں کی مدد کے بغیر ممکن نہیں، اس لیے میں سمرقند میں تیرے حکمران مرزا عبداللہ سے ملاقات کرنے آیا ہوں اور تو اس ملاقات کا اہتمام کرے گا۔''

امیر نے بے ادبی اور گستاخی سے جواب دیا۔ ''حضرت! آپ ٹھہرے درویش۔ آپ کہاں بادشاہ سے ملیں گے اور پھر یہ کہ ہمارا مرزا عبداللہ بڑا بے پروا جوان ہے، میں نہیں سمجھتا کہ وہ آپ سے ملاقات کرنے پر رضامند ہو جائے۔''

آپ کو غصہ آ گیا، فرمایا۔ ''اے شخص! میں یہاں خود نہیں آیا لایا گیا ہوں۔ مجھ کو حکم دیا گیا ہے کہ میں سلاطین سے ملاقات کروں اور انہیں بتاؤں کہ اس میں ان کے فرائض کیا ہیں؟ اگر تیرا مرزا بے پروا ہے اور پروا نہیں کرتا تو مجھے بھی اس کی کوئی پروا نہیں، میں اس کا نام فہرست سے نکال دوں گا اور اس کی جگہ کسی اور کو لے آیا جائے گا۔ ایک ایسا سلطان اس کی جگہ بٹھایا جائے گا جو بے پروا نہیں ہوگا۔''

امیر نے منہ بنا کر کہا۔ ''سبحان اللہ! آپ بڑی بڑھ چڑھ کر باتیں کر رہے ہیں اور آپ کی باتوں سے ایسا لگتا ہے گویا سلاطین کا عزل و نصب آپ ہی کے ذمے ہے۔ ایک درویش کو یوں اکڑ کر بات نہیں کرنا چاہیے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''تو کس قسم کی جاہلانہ باتیں کر رہا ہے۔ ہمارے ذمے بھی انتظام و انصرام ہے جس طرح سلاطین کو ذمے داریاں سونپی گئی ہیں، اسی طرح مجھے بھی ذمے دار بنایا گیا ہے۔ میں نے تجھ کو بھی امارت کی فہرست سے خارج کیا۔''

امیر نے جاتے جاتے کہا۔ ''آپ کی یہ بات بھی دیکھ لیں گے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔''

امیر چلا گیا۔

امیر کے جاتے ہی آپ اپنی جگہ سے اٹھے اور کوئلے سے دیوار پر امیر کا نام لکھا اور مٹا دیا۔ اس کے بعد مرزا عبداللہ کا نام لکھا اور اس کو بھی مٹا دیا، فرمایا۔ ”اس بادشاہ اور اس کے امیروں سے ہمارا کام نہیں چل سکتا۔“

اس عمل کے بعد آپ نے سمرقند چھوڑ دیا اور تاشقند کی طرف روانہ ہو گئے۔

آپ کو سمرقند چھوڑے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ امیر بیمار پڑ گیا۔ طبیبوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ امیر کو شبہ گزرا کہ یہ سب عبیداللہ احرار کی خفگی کے نتیجے میں ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا ایک آدمی آپ کی خدمت میں روانہ کیا اور اس سے کہا۔ ”حضرت سے کہہ کہ میں شرمسار ہوں اور گستاخی پر نادم ہوں۔ خدا کے لیے مجھ کو معاف فرما دیں اور اپنی خدمت میں حاضری کی اجازت مرحمت فرما دیں۔“

خادم گیا اور ذرا دیر بعد یہ خبر لے کر واپس آ گیا کہ عبیداللہ احرار سمرقند چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔

امیر کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ رونے لگا، مایوسی سے کہا۔ ”خدا مجھ پر اور سلطان پر رحم کرے۔ اس وقت میں معلوم نہیں کس ترنگ میں تھا جو میں آپ سے باندازِ گستاخی گفتگو کی۔“

چند دنوں بعد امیر کا انتقال ہو گیا۔ مرزا عبداللہ کو امیر کے انتقال سے افسوس ہوا۔ اس کو عبیداللہ احرار اور امیر کی گفتگو کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے نہایت افسوس سے کہا۔ ”یہ امیر بڑا سادہ دل شخص تھا۔ ایک فضول درویش کی باتوں سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اندر ہی اندر گھل کر چل بسا، اس کی جان اس کے وہم نے لے لی۔“

بادشاہ یہ کہہ کر اپنی محفل میں واپس آ گیا۔

ایک ماہ بعد بادشاہ کو یہ خبر ملی کہ اس کا چچا ابوسعید مرزا ترکستان سے سمرقند کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔ مرزا عبداللہ نے اپنے چچا کا مقابلہ کرنے کے لیے لشکر تیار کیا اور یہ طے کیا کہ ابوسعید مرزا کو سمرقند سے دور ہی روک دیا جائے گا۔

ایک دوسرا امیر جو مرحوم امیر اور عبیداللہ کی بات چیت سے واقف تھا، اس نے بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ بولا۔ ”حضورِ والا! یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، میں بہت ڈر رہا ہوں۔“

سلطان نے منہ ٹیڑھا کر کے پوچھا۔ ”آخر تو کیوں خوفزدہ ہے؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا۔“

امیر نے جواب دیا۔ ”حضورِ والا! میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ جس طرح عالمِ ظاہر پر سلاطین حکومت کرتے ہیں، اسی طرح سلاطین اور عالمِ باطن پر درویشوں کی حکومت ہوتی ہے اور سلاطینِ عالم کا عزل ونصب انہی کے سپرد کیا گیا ہے۔ میں نے یہ سن رکھا ہے کہ عبیداللہ احرار نے سمرقند چھوڑنے سے پہلے اپنی دیوار پر چند نام لکھ کر لعابِ دہن سے مٹا دیے تھے۔ مجھ کو نہیں معلوم کہ دیوار پر کس کس کے نام لکھے گئے تھے اور کس کس کے نام مٹا دیے گئے۔“

سلطان کا پارہ چڑھ گیا۔ ”آخر تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

امیر نے جواب دیا۔ ”مجھ کو یہ بات تو معلوم ہو چکی ہے کہ آپ نے دیوار پر مرحوم کا نام لکھ کر مٹا دیا تھا اور سوئے اتفاق کہ ہم سب امیر کے حشر سے باخبر ہیں، بقیہ کے نام نہیں معلوم ہو سکے، ورنہ ان کا حشر بھی لوگوں کے علم میں آ جاتا۔“

سلطان نے امیر کو ڈانٹ دیا۔ ”بکواس بند کر۔ شاید تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس درویش نے دیوار پر میرا نام بھی لکھ کر مٹا دیا تھا اور اس طرح مجھ کو بھی مٹ جانا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ میں جانتا ہوں۔ ایسا اس لیے نہیں ہوگا کہ یہ میں نہیں چاہتا اور یہ میں کہہ رہا ہوں۔“

امیر نے دبی زبان میں عرض کیا۔ ”حضور کلمۂ غرور اپنی زبان سے نہ نکالیں، اللہ سے اپنے غرور کی معافی چاہیں۔ خدا آپ کی معافی قبول کر لے گا اور آپ پریشانیوں سے بچ جائیں گے۔“

سلطان نے امیر کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑنے لگے، بولا۔ ”اگر وہ درویش اس وقت سمرقند میں ہوتا تو میں اس کو ایسی سزا دیتا کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔“

امیر چلا گیا لیکن سلطان کے دل میں وہم ڈال گیا۔

انہی دنوں سلطان کو خبر ملی کہ ترکستان سے اس کا چچا ابوسعید بڑھا چلا آ رہا ہے۔ سلطان مرزا عبداللہ غصے میں اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ وہ اپنے چچا کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا لیکن اب وہ شک وشبہے میں پڑ گیا تھا۔ اس کو رہ رہ کر عبیداللہ کی یہ بات یاد

آرہی تھی کہ اگر سلطان بے پروا ہے اور میری بات نہیں سنتا تو اس کو ہٹا کر کسی دوسرے کا انتظام کیا جائے گا، جو پروا بھی کرے اور میری بات بھی سنے گا۔

مرزا ابو سعید سمرقند پر حملہ آور ہوا اور ایک خوں ریز مقابلے میں مرزا عبداللہ کو شکست دے کر قتل کر دیا۔

جب حکومت بدل گئی اور مرزا ابو سعید نے سمرقند کا اقتدار سنبھالا تو عبیداللہ سمرقند واپس آ گئے۔ سلطان سے ملاقات کی اور اس کو مفید مشورے دیے۔ سلطان آپ کی باتوں سے نہ صرف بہت متاثر ہوا بلکہ ان کے مشوروں پر عمل بھی کیا۔

☆☆☆

آپ کے پاس کھیتی باڑی سے اتنا مال اکٹھا ہو گیا تھا کہ لوگ رشک کرنے لگے تھے۔ آپ اس مال سے دوسروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ ایک عالم کہیں دور دراز سے آپ کی ملاقات کو حاضر ہوا۔ آپ کی امارت دیکھ کر اس نے سوچا کہ یہ کیسا درویش ہے جو مال وزر کا لالچی معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے اس کو قریب بلایا اور پوچھا۔ ''تو مجھ سے اتنی دور کیوں رک گیا؟ میرے قریب آ۔''

عالم کچھ آگے بڑھا اور عرض کیا۔ ''نہ آں مردے کہ دنیا دوست دارد۔''

آپ نے یہ مصرع سنا اور خاموشی اختیار کر لی۔

عالم نے درخواست کی۔ ''حضرت! چونکہ میں دور دراز علاقے سے ملاقات کو حاضر ہوا ہوں اور خیال یہ تھا کہ چند دن آپ کی صحبت میں گزاروں گا لیکن افسوس کہ میں نے یہاں جو کچھ دیکھا وہ درویشی اور فقر کے برعکس ہے اس لیے میں ایک رات یہاں گزار کر واپس چلا جاؤں گا۔ شب بسری کی اجازت مرحمت فرمائیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''یہ تیرا گھر ہے، جب تک جی چاہے رہ۔ کوئی تجھ سے کچھ نہ کہے گا۔''

عالم کو وہیں ایک کمرا رہنے کو دے دیا گیا۔

رات کو عالم بڑی دیر تک جاگتا رہا، آپ اس کی مزاج پرسی کو پہنچے اور پوچھا۔ ''بھائی! کوئی تکلیف تو نہیں؟''

عالم نے جواب دیا۔ ''تکلیف کوئی نہیں، آپ کی نوازش کا بہت بہت شکریہ۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میں تجھ کو پریشان کرنے نہیں آیا۔ صرف یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ تجھ کو کوئی تکلیف تو نہیں۔ سو اب مطمئن ہو گیا اور واپس جا رہا ہوں، تو سو جا۔''

آپ وہاں سے چلے گئے تو عالم نے ایک بار پھر سو جانے کی کوشش کی، نیند آ گئی اور وہ سو گیا۔ اس نے خواب میں لوگوں کو ایک طرف بھاگتے ہوئے دیکھا اور یہ لوگ اس طرح بھاگ رہے تھے کہ اس بھاگ دوڑ میں جو گرا وہیں گرا رہ گیا۔ یہ لوگ ایک وسیع و عریض میدان میں جمع ہو گئے۔ اس ہجوم میں یہ عالم بھی شامل تھا۔ یہ اس ہجوم اور اس کی بھاگ دوڑ سے پریشان تھا۔ اس نے کسی سے پوچھا۔ ''بھائی! یہ سب لوگ یہاں میدان میں کیوں جمع ہو رہے ہیں؟''

جواب ملا۔ ''یہاں لوگ کیوں جمع ہو رہے ہیں؟ ارے او شخص! تو یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون سی جگہ ہے، یہ عرصۂ حشر ہے نادان، یہاں حساب کتاب کیا جائے گا۔''

حساب کتاب، عرصۂ حشر! عالم کا دماغ گھوم گیا۔ اتنے میں ایک گوشے سے ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس نے اس عالم کو بطور قرض ایک بڑی رقم دے رکھی تھی اور عالم میں اس کی ادائیگی کی استطاعت نہیں تھی۔ وہ عالم کو دیکھتے ہی اس کی طرف لپکا اور ڈپٹ کر کہا۔ ''اے شخص! آج میں تجھ کو کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تو میرا قرضہ چکا دے ورنہ میں تیرا دامن پکڑتا ہوں اور تجھ کو لے جاتا ہوں جہنم کی طرف۔''

عالم گڑگڑانے لگا۔ ''بھائی، یہاں میرے پاس رقم کہاں سے آئے گی؟ خدا کے لیے مجھ کو معاف کر دے۔''

قرض خواہ نے سختی سے کہا۔ ''معافی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں تو وہی کروں گا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ چل جہنم کی طرف۔ یہ معاملہ خالص حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ہمارے معاملے میں خدا بھی دخل نہیں دے گا۔''

عالم بے بس و مجبور ہو گیا۔ قرض خواہ نے اس کو کھینچنا شروع کر دیا۔ ابھی وہ عالم کو تھوڑی ہی دور لے گیا تھا کہ سامنے سے عبیداللہ احرار آتے دکھائی دیے۔ عبیداللہ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ اے شخص! تو اس عالم کو کہاں لیے جا رہا ہے؟''

قرض خواہ نے جواب دیا۔ ''اس پر میرا قرض واجب الادا ہے۔ اب میں خدا سے کہوں گا کہ اس کو جہنم میں جھونک

دے کیونکہ میں اپنا قرض معاف نہیں کر سکتا۔''

عبیداللہ احرار نے کہا۔ ''جلدی نہ کر ابھی ذرا صبر سے کام لے۔ میں اس عالم کا قرض ابھی چکا تا ہوں۔'' اس کے بعد آپ نے عالم کے ذمے واجب الادا رقم اسی وقت ادا کر دی اور قرض خواہ نے عالم کا دامن چھوڑ دیا۔

عالم کی آنکھ دہشت سے کھل گئی اور وہ رات بھر پریشان رہا کیونکہ جس قرض خواہ کو اس نے خواب میں دیکھا تھا، عالم اس کا واقعی مقروض تھا۔

صبح رخصت ہونے کے ارادے سے عبیداللہ احرار کے پاس پہنچا اور کہا۔ ''حضرت! بہت بہت شکریہ، رات مزے کی نیند آئی۔''

آپ نے فرمایا۔ ''وہ مصرع ایک بار پھر تو دہرا۔''

عالم نے شرمندگی سے مصرع دہرا دیا۔ ''نہ آں مردے کہ دنیا دوست دارد۔''

خواجہ عبیداللہ نے فرمایا۔ ''اس میں دوسرے مصرعے کا اضافہ کر لے۔ اگر دارد برائے دوست دارد (یعنی خدمت خلق کے لیے دولت نفع بخش اور نعمت ہے)۔''

عالم بے حد شرمندہ تھا۔ آپ نے اس کو اپنے پاس بٹھا لیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''اس شخص کو کتنی رقم ادا کرنا ہے؟''

عالم نے شرمندگی سے جواب دیا۔ ''دس ہزار درہم۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یہ رقم مجھ سے لے اور اس کو ادا کر دے۔''

عالم ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ وہ بدگمانی سے اتنا شرمندہ تھا کہ آپ سے آنکھیں نہیں ملا سکتا تھا۔

آپ نے صوفیائے کرام کی طرح سیاحت بھی کی اور برصغیر بھی تشریف لائے۔ ان دنوں سندھ میں شیخ مبارک (ابوالفضل وفیضی کے باپ) یہاں نہایت عسرت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شیخ مبارک نے خواجہ عبیداللہ احرار سے ملاقات کی اور ان کے مریدوں میں داخل ہو گئے۔ شیخ نے اپنی عسرت کا ذکر کیا اور دعا چاہی۔ آپ نے دعا دی اور فرمایا۔ ''مبارک! مت پریشان ہو خدا تجھ کو دولت زر اور عزت وشہرت سے مالا مال کر دے گا جس سے تو دوسروں کا محسود ہو جائے گا۔''

آپ سمرقند پھر واپس تشریف لے گئے۔ اٹھاسی سال کے دسویں مہینے سے آپ کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کو بخار رہنے لگا تھا۔ اطبا نے علاج شروع کیا۔

جس دن پہلی بار بخار چڑھا، آپ نے اپنے بڑے بیٹے خواجہ محمد عبداللہ سے کہا۔ ''بیٹے اسّی میں نو جوڑو تو کیا بنے گا؟''

صاحبزادے نے جواب دیا۔ ''نواسی، یعنی ایک کم نوے۔''

آپ نے فرمایا۔ ''یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں نواسی دن بعد پورے نواسی سال کا ہو جاؤں گا۔''

بیٹے نے پوچھا۔ ''باواجان! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''رسول اللہ ﷺ کی حدیث ہے (ایک دن کی تپ ایک سال کا کفارہ ہوتی ہے) بیٹے! میں نواسی دن بخار میں مبتلا رہ کر نواسی سالہ زندگی کا کفارہ ادا کر دوں گا۔ شاید خدا نے میرے حق میں یہی فیصلہ کر رکھا ہے۔''

چنانچہ محرم کی پہلی تاریخ (895ھ) سے بیماری کا آغاز ہوا اور یکم ربیع الاول 895ھ کو آپ نے وصال فرمایا۔

کہتے ہیں کہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا، آس پاس بہت سی شمعیں روشن تھیں۔ دفعتاً آپ کے دونوں ابروؤں کے درمیان سے روشنی نمودار ہوئی اور آناً فاناً یہ روشنی تمام شمعوں کی روشنی پر غالب آ گئی اور آپ کا وصال ہو گیا۔ سمرقند میں آپ کا مزار آج بھی مرجع خاص وعام ہے۔



ذکارِ ابرار۔ محمد غوثی شطاری۔ دربارِ اکبری۔ مولانا محمد حسین آزاد۔
انوار الصفا۔ محمد خصلت حسین صابری۔ صوفیائے نقشبند۔ سید امین الدین۔
انوار الاصفیا۔ غلام علی اینڈ سنز۔ سکینۃ الاولیا۔ داراشکوہ۔





پانی میں شکار

جمال دستی

گھات لگانے والے زمین اور خلا کو خاطر میں لاتے ہیں نہ ٹھوس اور مایع کے چکر میں الجھتے ہیں... وہ تو بس اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے دھنی ہوتے ہیں۔ پانی کی سرکش موجوں نے اسے بھی یہ موقع فراہم کردیا تھا کہ اپنا توازن برقرار رکھے اور سیدھے انداز میں ٹیڑھی چال چل جائے۔

سطح سمندر پر ایک شیطانی کھیل کی
خوفناک کھیل

''سام اس قسم کے لوگوں میں سے ہے جو ہر وقت بلاوجہ فکرمند رہتے ہیں، ہیں نا؟'' میں نے کہا۔ ''خاص طور پر تمہاری طرف سے۔''

''اوہ، میں جانتی ہوں۔'' اینجلا نے کہا۔ ''پہلے تو مجھے شدید غصہ آتا تھا لیکن اب چالیس سال گزرنے کے بعد میں اس کی عادی ہو چکی ہوں۔''

اینجلا اور میں اپنے علاقے کی جھیل کے اطراف میں اپنی تقریباً روزمرہ کی چہل قدمی کر رہے تھے۔ مجھے اینجلا کی یہ گفتگو اس لیے یاد رہ گئی کہ وہ پہلا موقع تھا جب اینجلا نے اپنے شوہر کے مزاج کے متعلق یکسر مختلف بات کہی تھی جو ایک طرح سے تنقید بھی تھی۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''لیکن تم جو کوئی کام بھی کرتی ہو وہ اس کے بارے میں فکرمند رہتا ہے اور اس وقت جب ہم ڈزنی ورلڈ گئے تھے تو کیا وہ بے فکر رہا تھا کہ تم

ڈزنی ورلڈ میں محفوظ ہو؟ ایک بار جب وہ آخرکار اس بات پر رضامند ہوگیا تھا کہ تم اسپیس ماؤنٹین پر چیئر لفٹ کی سیر کرسکتی ہو تو اس نے تمہیں اس طرح دبوچ رکھا تھا جیسے خوف زدہ ہو کہ تم نیچے نہ گر پڑو کیا وہ ہمیشہ اسی طرح کرتا ہے؟''

''جب سے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی، وہ ہمیشہ یہی ... کرتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ بھی یہی کرتا تھا اور ہر وقت اسی کے گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود اسے اسٹروک ہوگیا تھا اور اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ وہ روزانہ اپنی ماں کو دیکھنے جانے کا عادی تھا اور اس کے استعمال کی روزمرہ کی دوائیں ایک لیبل لگے ہوئے چھوٹے سے بکس میں گن کر ڈال دیا کرتا تھا کہ کہیں وہ زیادہ خوراک نہ کھالے۔ اپنی ماں کے مرنے کے بعد کچھ عرصے کے لیے میرے ساتھ اس کا رویہ بدترین ہوگیا تھا لیکن پھر اس کے برتاؤ میں اعتدال آگیا۔'' یہ کہہ کر اینجلا نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا۔

''وہ جوزف اور مجھ پر بھی ضرورت سے زیادہ توجہ دیتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اتنی زیادہ نہیں جتنی تم پر دیتا ہے۔''

''بہرحال میں اسے تبدیل نہیں کرسکتی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کتے کی دم کتنے ہی عرصے نلکی میں رہے، ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔''

پھر ہم دیگر چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور میں نے موضوع دوبارہ نہیں چھیڑا۔ گو میں نے جوزف سے کئی بار سام کے اس رویے کی شکایت بھی کی۔ جوزف نے حسبِ معمول میری سنی ان سنی کردی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

اینجلا اور میں اپنا بیشتر وقت اکٹھے ساحل اور مقامی سوئمنگ پول پر تیراکی کرنے اور لمبی سیر پر نکل جانے پر صرف کیا کرتے تھے۔ اس دوران ہم اپنی فیملیز' ان کے کاموں، اپنے ماضی اور اپنے ان منصوبوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے کہ جب ہم بوڑھے اور تنہا ہو جائیں گے تو کیا کریں گے۔

میرا اپنا یقین یہ تھا کہ میں اینجلا کو دیگر عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ اور اچھی طرح سے جانتی ہوں۔

میرا جوزف فٹ بال کا دلدادہ تھا۔ موسم خزاں میں ہم نے اپنے لیے ایک اسپیشل ویک اینڈ منانے کا اہتمام کیا اور ہم بکس کا گیم دیکھنے کے لیے ٹیمپا چلے گئے۔ گیم دیکھنے کے بعد ہم نے دوستوں کے ساتھ ڈنر کیا۔ پھر قیام کے لیے ایک ہوٹل میں چلے گئے۔ اگلے روز صبح میں تنہا شاپنگ کرنے نکل کھڑی ہوئی جبکہ جوزف نے ہوٹل کے کمرے میں ہی رہنے کو ترجیح دی۔

اپنی شاپنگ مکمل کرنے کے بعد میں لنچ کے لیے اس فرانسیسی ریسٹورنٹ پر رک گئی جہاں ایک بار جوزف اور میں نے ہماری شادی کی سالگرہ منائی تھی۔

جب میں نے ریسٹورنٹ میں قدم رکھا تو وہاں کی سفید میزوں پر موجود تازہ پھول اور ہر میز پر بیٹھے ہوئے جوڑوں کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ایک تنہا عورت کے طور پر میں خود کو غیر مطمئن سا محسوس کروں گی۔ سو میں واپسی کے ارادے سے تقریباً پلٹ گئی لیکن پھر میں نے سوچا۔ ''یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

میں نے ویٹر سے اپنے لیے کسی پرسکون گوشے میں میز کے لیے کہا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر چل پڑا۔ اس دوران میں اطراف کی میزوں پر موجود جوڑوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھتی رہی۔

تب ہی میری نگاہ اینجلا پر پڑی۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ مجھے علم نہیں تھا کہ سام اور اینجلا بھی ٹیمپا جارہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ ''چلو یہ اچھا ہوا۔ اب مجھے کمپنی مل جائے گی۔''

لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے اور وہ سام کے ہمراہ بھی نہیں ہے۔

وہ ایک بوتھ میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ جو شخص موجود تھا اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور تب میں نے بروقت خود کو اس کے پاس جاکر ہیلو کہنے سے روک لیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے کہ جب میں نے اینجلا کے چہرے کو غور سے دیکھا تو جس انداز سے وہ اور اس کے سامنے بیٹھا ہوا خوبرو شخص ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے تو میں سمجھ گئی کہ یہ کوئی معمول کا لنچ نہیں ہے۔ وہ ایک پیار کرنے والا جوڑا لگ رہا تھا۔

اس خوبرو شخص کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ تھی۔

میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ اگر میں ان دونوں کی نگاہ میں آئے بغیر وہاں سے نکلنا چاہتی تو نکل سکتی تھی لیکن میں پلٹ کر وہاں سے دوبارہ گزرنا نہیں چاہتی تھی جدھر اینجلا اور اس کا عاشق بیٹھے ہوئے تھے۔

میں کونے میں اپنی میز پر سکڑ کر بیٹھ گئی اور جو کچھ میں نے دیکھا اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہمارے درمیان ایک خلیج پیدا ہوگئی ہے اور جیسے میں نہیں جانتی کہ اینجلا کون تھی۔ اس کی ایک خفیہ زندگی بھی تھی

اور اس خفیہ زندگی کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔
میں پریشان تھی کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد میں اس کا سامنا کس طرح کر سکوں گی۔
ان دونوں نے مجھے نہیں دیکھا اور نہ ہی میں انہیں دیکھ سکی۔ اتنی ساری رقم خرچ کرنے کے باوجود مجھے کھانے میں رتی بھر بھی ذائقہ محسوس نہیں ہوا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں لکڑی کا برادہ کھا رہی ہوں۔ میں نے سوچا کاش میں نے ادھر آنے کے بارے میں کبھی نہ سوچا ہوتا۔
میں جان بوجھ کر جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا اپنے بیٹھنے کو طول دیتی رہی پھر میں نے اپنا بل ادا کیا اور ریسٹورنٹ کے داخلی دروازے کی جانب چل پڑی۔ جب میں اس میز کے سامنے سے گزری جہاں اینجلا اور اس کا عاشق بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے دیکھا کہ وہ دونوں جا چکے تھے۔
میں نے اطمینان کا سانس لیا۔
میں نے جوزف کو نہیں بتایا کہ میں نے اینجلا کو یہاں دیکھا ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں کے چہروں پر ایک دوسرے کی چاہت کے جذبات اتنے عیاں تھے کہ میں جان گئی، مجھ پر اینجلا کی خفیہ زندگی کا پہلو کھل کر سامنے آ گیا ہے اور جیسے وہ میرے سامنے عریاں ہو چکی ہے۔
جوزف اور میں نے اینجلا اور سام کو اپنے ٹیمپا میں ویک اینڈ گزارنے اور پیر کے روز اپنی شاپنگ کی مہم کے بارے میں بتا دیا۔ مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا میں نے اس دوران اپنے چہرے کو سپاٹ رکھا۔ میں ایک اچھی دروغ گو نہیں ہوں لیکن میں نے اپنے طور پر کوئی کسر نہیں چھوڑی۔
موسم خزاں اور جاڑے کے سیزن میں مجھ سے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا میں نے خود کو اینجلا سے پرے رکھا۔ ہم نے اکٹھا سیر کرنا اور تیراکی کرنا تقریباً چھوڑ دی تھی لیکن بعض اوقات وہ مجھے تنہا سوئمنگ پول سے واپس آتی دکھائی دے جاتی تھی۔ اس نے مجھ سے یہ سوال نہیں کیا کہ میں اس سے کھنچی کھنچی کیوں رہنے لگی ہوں۔ بعض اوقات میں سوچتی تھی کہ وہ جانتی ہے کہ میں نے اسے فرانسیسی ریسٹورنٹ میں کسی کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟
یہ اگلے موسم بہار کی بات ہے جب ہم چاروں یعنی جوزف، میں، اینجلا اور سام نے گہرے سمندر میں مچھلی کے شکار کی مہم آزمانے کا فیصلہ کیا۔ سام کو اس مہم کے لیے راضی کرانے میں ہمیں قدرے محنت کرنا پڑی اور اسے قائل کر لیا کہ یہ کوئی خطرناک مہم نہیں ہے۔ ہم جیسے کئی لوگ ہمیشہ گہرے سمندر میں مچھلی کے شکار کے لیے جاتے ہیں اور صحیح سلامت محفوظ واپس آ جاتے ہیں۔ بالآخر وہ راضی ہو گیا۔
تب ہم نے کلیئر واٹر میں پورے دن کی مہم کی بکنگ کرالی۔ جب ہم گہرے سمندر کے لیے روانہ ہوئے تو وہ ایک نہایت خوشگوار دن تھا۔ مارچ میں فلوریڈا میں اتنی گرمی نہیں پڑتی کہ تکلیف دہ ہو۔ بس ہلکی سی تمازت ہوتی تھی۔
کشتی صبح نو بجے کے قریب اپنے سمندری سفر کے لیے روانہ ہوئی۔ ہم نے اپنے لیے ریلنگ کے ساتھ کی نشستوں کا انتخاب کیا۔ ہم نے اپنی مچھلی پکڑنے کی چھڑ اور میکانکی چرخیاں مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ شکار کے لیے ہمارے پاس زندہ چارہ استعمال کرنے یا اسے بہلا پھسلا کر کانٹے تک لانے کی چوائس تھی۔
میں اور اینجلا دونوں نے چارا استعمال کرنے سے گریز کیا، کیونکہ ہم کانٹے میں بندھے زندہ چارے کی پانی میں بل کھاتی لہراتی حرکت کو سنبھال نہیں سکتے تھے۔ جوزف میرا مذاق اڑانے لگا اور اس نے میرے کانٹے میں چارا لگا دیا۔ اس نے کہا کہ مچھلی اسے محسوس نہیں کرے گی لیکن میرا خیال تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔
سام اینجلا کے برابر میں بیٹھ گیا، اس کے کانٹے میں چارا لگایا اور اسے بتایا کہ کانٹا کس طرح پانی میں پھینکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ یقین بھی کرتا رہا کہ وہ کشتی کے پہلو پر بہت زیادہ جھکنے نہ پائے اور لڑھک کر پانی میں نہ گر جائے۔
جوں ہی میں نے اپنی ڈور پانی میں پھینکی مجھے ایک جھٹکا محسوس ہوا۔ جوزف ضرورت پڑنے پر میری مدد کے لیے میرے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ مچھلی خاصی بڑی اور طاقتور لگ رہی تھی اور ڈور کو کشتی سے پرے کھینچے جا رہی تھی اور جب میں نے چرخی لپیٹنا شروع کی تو وہ اور زور لگانے لگی۔ میں اس کے ساتھ ڈھیل دینے اور کھینچنے کا کھیل کھیلتی رہی۔ اس کھیل میں یوں لگا جیسے گھنٹوں گزر رہے ہوں جبکہ حقیقت میں شاید چند ہی منٹ گزرے تھے۔
پھر جب میرے بازو شل ہو گئے اور مجھے محسوس ہوا کہ اب میں ڈور پر اپنی گرفت مزید قائم نہیں رکھ سکتی تو میں نے اپنی چھڑ جوزف کو تھما دی۔ ہم دونوں نے مل کر مچھلی کو کھینچ لیا اور پانی سے نکال کر کشتی میں لے آئے۔
یہ لال رنگ کی ایک خوردنی مچھلی تھی۔ کشتی میں سوار دیگر افراد نے میرے اس شکار پر تالیاں بجا کر مجھے داد دی۔ کشتی کے کپتان نے کہا۔ ''بہت خوب!'' اپنی اس کامیابی پر میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس کے باوجود کہ میری شکار کردہ مچھلی کا وزن صرف بیس پونڈ تھا۔

بعد میں ہر ایک کے پاس چارا بھی کم رہ گیا اور مجھے جمائیاں آنے لگیں۔ میں سوچنے لگی کہ ہم لنچ کے لیے کب رکیں گے۔ تب ہم نے اپنی اپنی ڈور کھینچ لی اور میرے شکار کا جشن منانے کے لیے تھوڑی سی وائن پی لی جو کہ اس روز کا سب سے بڑا شکار تھا۔

پھر جب سہ پہر ہونا شروع ہوئی تو دھوپ اور نمکین ہوا سے مجھے نیند آنے لگی۔ وہ بڑا شکار جو دوپہر سے پہلے بڑا سنسنی خیز لگا تھا اب دھیرے دھیرے بیزار کن ہو رہا تھا۔

میں نے ایک اچٹتی نگاہ انجیلا پر ڈالی۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں اپنی کرسی پر ڈھے چکی تھی۔ اس کی ڈور اور چھڑ جھول رہے تھے۔ اس نے انہیں تھامے رکھنے کا عارضی بندوبست یہ کیا ہوا تھا کہ انہیں اپنی کلائی سے ڈھیلا باندھ لیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں یہ پھسل کر نیچے پانی میں نہ گر جائیں۔

میں نے ایک بڑی سی جمائی لی اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں تقریباً سو چکی تھی۔

تب مجھے انجیلا کی چھڑ کی ڈور ہلنے کی آواز سنائی دی۔ چھڑ ریلنگ سے ٹکرا کر ٹن ٹن کی آواز پیدا کر رہی تھی۔ ڈور بھی پوری طرح تن چکی تھی۔ لگتا تھا کہ کوئی بڑا شکار کانٹے میں لگ گیا ہے۔ کانٹے میں پھنسی مچھلی نے ایک غوطہ لگایا اور اس سے قبل کہ میں دیکھ پاتی، انجیلا اپنی چھڑ سمیت کشتی پر سے پانی میں لڑھک گئی۔ مچھلی انجیلا کو پانی میں نیچے تہ کی جانب کھینچ رہی تھی۔

میں نے بے ساختہ ایک چیخ ماری۔ مجھے نہیں معلوم کہ سام اس وقت کہاں تھا، جب انجیلا کشتی پر سے پانی میں گری تھی لیکن دوسرے لمحے میں نے سام کو کشتی پر سے پانی میں چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھا۔ ساتھ ہی وہ انجیلا کو آوازیں دے رہا تھا۔

میں چیخنے لگی کہ کوئی بھاری سرے والا دستی ڈنڈا پانی میں پھینک دے۔ کشتی کے کپتان نے ایک ڈنڈا پانی میں پھینک دیا جس کے ساتھ ایک ڈور بھی بندھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی کپتان نے میٹ کو ان کے پیچھے جانے کا حکم دیا۔

اتنے میں سام پانی کی سطح پر ابھرا۔ جوزف نے چیخ کر سام سے کہا کہ وہ اپنے جوتے اتار پھینکے۔ مجھے یقین نہیں کہ سام نے اس کی بات سنی ہوگی۔ سام نے دوبارہ غوطہ لگایا۔ وہ انجیلا کو ڈھونڈ رہا تھا۔

اس مرتبہ جب سام اوپر آیا تو انجیلا کو اس نے اپنے بازوؤں میں جکڑا ہوا تھا۔ انجیلا کسی نہ کسی طرح اپنی کلائی پر بندھی چھڑ سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب مچھلی اسے نیچے پانی میں نہیں کھینچ رہی تھی لیکن وہ کھانس رہی تھی اور منہ سے پانی نکال رہی تھی۔

نیچے پانی میں غوطہ لگانے سے بہت سا پانی اس کے منہ میں چلا گیا تھا۔ خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں انجیلا نے سام کو جکڑ لیا تھا اور اسے نیچے دھکیل رہی تھی جبکہ سام اسے ایسی گرفت میں رکھنا چاہ رہا تھا کہ خود بھی تیر کر لائف پریزرور تک پہنچ جائے۔

ان کی جانب دیگر لائف پریزرور بھی اچھالے گئے لیکن انجیلا سطح پر موجود رہنے کے لیے اتنی مضبوطی سے جدوجہد کر رہی تھی اور سام کو نیچے پانی میں دھکیل رہی تھی کہ سام ان لائف پریزرورز تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔

میٹ بھی اس وقت تک پانی میں اتر چکا تھا۔ وہ ان کی جانب لائف پریزرور کو کھینچتا ہوا لے گیا۔ ساتھ ہی وہ ان دونوں کی جدوجہد کو بھی دیکھ رہا تھا۔ سام اسے تھامے رکھنے اور پریزرور کو گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ انجیلا خود کو بچانے کے لیے اسے پانی میں نیچے دھکیل رہی تھی۔

میٹ تیرتا ہوا ان دونوں کی جانب بڑھ رہا تھا۔

تب انجیلا ایک لائف پریزرور تک پہنچنے اور اسے پکڑنے میں کامیاب ہو گئی۔ اسے واپس کشتی پر کھینچ لیا گیا۔ جب وہ اوپر پہنچی تو تنہا تھی۔ سام غائب تھا۔

میٹ نے بار بار غوطہ لگایا لیکن سام کہیں نہیں ملا۔ وہ پانی میں گم ہو چکا تھا۔ بعد میں اس روز غوطہ خوروں کو سام کی تلاش میں بھیجا گیا لیکن پانی بہت زیادہ گہرا تھا۔

اگلے روز سام کی لاش سینٹ پیٹرزبرگ کے قریب ایک ساحل پر پانی پر ابھر آئی۔ انجیلا کو کسی طور قرار نہیں آرہا تھا۔ وہ خود کو سام کی موت کا ذمے دار قرار دے رہی تھی۔ گو میں ہمدردی جتانے اور اس کا خیال رکھنے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ تھی لیکن وہ مسلسل روئے جا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ یہ سب اس کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔

سام کی موت کے چھ ماہ بعد انجیلا نے اپنا مکان بیچ دیا اور شہر سے چلی گئی۔ آخری بار جب شہر چھوڑنے سے ذرا پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تو اس وقت اس نے مجھے بتایا کہ وہ دوبارہ شادی کر رہی ہے اور کیلی فورنیا منتقل ہو رہی ہے۔ تب میں اچنبھے میں پڑ گئی اور مجھے سام کی موت پر حیرت ہونے لگی۔

اس لیے کہ میں جانتی تھی کہ انجیلا ایک بے حد توانا تیراک تھی اور سام کو پانی سے خوف آتا تھا۔



دوسری شکست

بابر نعیم

چاہے جیت ہو یا ہار... انسان مسائل کے انبار سے تو لڑ سکتا ہے لیکن دل کے محاذ پر لاکھ تدبیریں کرلے بنا منشا کے کسی کا ساتھ حاصل نہیں کر پاتا... اُسے بھی جب اپنی شکست کا کامل یقین ہوگیا تو ایک بھیانک فیصلہ کرڈالا۔ اب اسے زندگی کی پروانہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تو بس ایک ہی خواب تھا اور یہی بات اس کے لیے اہم تھی۔ جس کی تکمیل میں ہی اس کی بقا تھی۔

بات سے بات جوڑ کر راز کی تہ میں اترنے والی ایک حسینہ کی ذہانت

سیلی ٹیلر کو اس بیوٹی سیلون میں کام کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن اپنی محنت، لگن اور مہارت سے بہت جلد پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی تھی، گو کہ یہ ملازمت اس کے شایانِ شان نہیں تھی لیکن فی الوقت گزارے کے لیے اسے اسی ملازمت پر انحصار کرنا تھا جب تک اس کا بوائے فرینڈ کمانے کے قابل نہ ہوجاتا۔

اس وقت بھی وہ اپنی نئی گاہک اینی لورڈن کا ہاتھ تھامے اس کے ناخنوں پر پالش کررہی تھی کہ اچانک اس کی

نظر اپنی کی شال پر پڑی۔ عام طور پر وہ اپنے گاہکوں کے لباس اور دیگر اشیا مثلاً جیولری، موبائل اور پرس وغیرہ پر دھیان نہیں دیتی تھی اور اس کے لیے کسی عورت کا معمولی یا قیمتی لباس کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا لیکن اس شال میں جانے ایسی کیا خاص بات تھی کہ وہ کوشش کے باوجود اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ اس شال پر انتہائی خوب صورت کام ہوا تھا اور وہ دیکھنے میں ہی قیمتی لگ رہی تھی۔

رات جب وہ بستر پر سونے کے لیے لیٹی تب بھی وہی شال اس کی نظروں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ مائیک سٹنگ روم میں اسکرین پلے لکھنے میں مصروف تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے انٹرنیٹ پر بیٹھ گئی اور غیر ارادی طور پر اس نے وہ ویب سائٹ کھول لی جس پر ایک خوب صورت ماڈل کی تصویر موجود تھی اور اس نے وہی شال اوڑھ رکھی تھی جو سیلی نے دن میں اپنی کے جسم پر دیکھی تھی۔ سیلی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے جلدی جلدی دیگر تفصیلات دیکھنا شروع کیں۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ ایک قیمتی شال تھی جس کی قیمت ایک ہزار ڈالر درج تھی۔ سیلی کا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔ وہ اتنی قیمتی شال خریدنے کی متحمل نہیں تھی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے سب سوچا پھر جذبات، عقل پر غالب آ گئے اور اس نے آن لائن شاپنگ کی سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے شال کا آرڈر کر دیا۔

اسے اپنی جرأت پر حیرانی اور خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اب تک بہت محتاط اور خوف زدہ زندگی گزاری تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اپنی صلاحیت و قابلیت کے اعتبار سے وہ کم تر ملازمت کر رہی ہے لیکن فی الوقت وہ اس پر انحصار کرنے پر مجبور تھی جب تک مائیک کا لکھا ہوا اسکرین پلے کسی پروڈیوسر کو پسند نہیں آ جاتا اور وہ چار پیسے کمانے کے قابل نہ ہو جاتا۔ یہی غنیمت تھا کہ مائیک اسے جی جان سے چاہتا تھا اور اس کی معیت میں وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی تھی۔ اسی لیے وہ خاموشی سے مائیک کی ہر خواہش بنا کہے پوری کر دیا کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن وہ سب کچھ مع سود وصول کر لے گی۔

جب اسے کوریئر کے ذریعے وہ باکس موصول ہوا تو یوں لگا کہ یہ اس کی سالگرہ کا تحفہ ہے جو وہ چند روز قبل ہی منا چکی تھی۔ اس موقع پر مائیک نے اسے ایک کارڈ گفٹ کیا تھا جس کا بٹن دبانے سے موسیقی کی دھنیں ابھرنے لگتی تھیں۔ مائیک جانتا تھا کہ سیلی کو موسیقی سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ اسی لیے اس نے اپنی حیثیت اور اس کے ذوق کے مطابق تحفہ دیا تھا۔ ویسے بھی سیلی کی نظر میں اس کی قیمت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ مائیک کا دیا ہوا یہ تحفہ اس کے لیے بیش قیمت تھا۔

اس نے باکس کھولا اور شال باہر نکال لی۔ اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے لطیف سا احساس ہونے لگا۔ شال کا کپڑا انتہائی نرم اور دبیز تھا اور اس پر انتہائی نفیس کڑھائی کی گئی تھی۔ اس نے سرشاری کے عالم میں شال کندھے پر ڈالی اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بہت خوب صورت ہے اور شال اوڑھ کر اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ اس کے سرخ بالوں کی ایک لٹ چہرے پر جھول رہی تھی اور سبز آنکھوں کی چمک میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی اپنے آپ کو اس انداز میں نہیں دیکھا تھا لیکن شال اوڑھ کر اس کا انداز تفاخر بڑھ گیا تھا۔

عین اسی وقت مائیک کا کتا پوکسی اچھلتا کودتا کمرے میں آیا اور اس نے شال کا کونا دانتوں سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ بہ مشکل تمام وہ شال کو اس کے منہ سے نکالنے میں کامیاب ہو سکی لیکن کتے کی یہ حرکت اسے بہت مہنگی پڑی جس کے نتیجے میں اس کی قیمتی شال میں دو سوراخ ہو چکے تھے۔ وہ بستر پر منہ لپیٹ کر لیٹ گئی۔ اب وہ اس شال کو واپس بھی نہیں کر سکتی تھی اور اسے ایک سال تک اس کی قسطیں بھرنی تھیں جو اس کے لیے بے کار ہو چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ اس کے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس نے سر جھکانے کے بجائے اوپر دیکھنے کی جسارت کی تھی۔

اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ شال دوبارہ کندھے پر ڈالی اور آئینے میں دیکھنے لگی کہ سوراخ کہاں ہوئے تھے خوش قسمتی سے وہ شال کی اندرونی تہ میں چھپ گئے اور بہ ظاہر نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی، اس نے شال کو مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور فیصلہ کر لیا کہ وہ ان دو سوراخوں کے باوجود اس شال کو اپنے پاس رکھے گی اور کریڈٹ کارڈ کے ذریعے اس کی قسطیں ادا کرتی رہے گی۔

دو دن بعد وہ مائیک کے ہمراہ فلم دیکھنے گئی۔ اس کے بعد انہوں نے میل اوس ایونیو پر واقع اسٹار لائٹ لاؤنج کا رخ کیا۔ باتیں کرتے کرتے اس نے اپنے ماتھے پر سے بال ہٹائے اور بولا۔ ”یہ تم نے کیا پہن رکھا ہے؟“

سیلی کو اس کی بدذوقی پر بہت غصہ آیا اور وہ تنک کر بولی۔ ”دیکھ نہیں رہے یہ شال ہے۔“

وہ اس شال کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ ''لگتا تو نہیں کہ یہ تمہاری ہے۔''

''وہ کیسے؟''

وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تمہیں پہلے کبھی شال میں نہیں دیکھا۔ اسے پہن کر تم اجنبی اجنبی سی لگ رہی ہو۔''

سیلی نے دونوں ہاتھوں سے شال کو مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا لیکن کچھ بولی نہیں۔ مائیک اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک عام لڑکی ہو اور تمہاری جیسی لڑکیوں پر اس طرح کی شال نہیں جچتی۔ یہ خاصی قیمتی معلوم ہوتی ہے اور ایسی شال صرف تمہارے پاس آنے والی عورتیں ہی پہن سکتی ہیں۔''

سیلی اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ کیا اسے کوئی قیمتی چیز نہیں پہننی چاہیے۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ایک بیوٹیشن کوئی ایسا لباس نہیں پہن سکتی جو پارلر میں آنے والی عورتیں پہنتی ہیں؟'' یہ کہہ کر اس نے غصے کے عالم میں مارٹینی کا گلاس خالی کیا اور دوسرے کا آرڈر دے دیا۔

''تم میری بات کا غلط مطلب لے رہی ہو۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ یہ شال تمہارے روزمرہ کے لباس سے مختلف ہے۔ چلو چھوڑو۔ کوئی اور بات کرتے ہیں۔''

سیلی کچھ لمحے تناؤ کی کیفیت میں رہی پھر اس نے اپنا موڈ ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا مسودہ کہاں تک پہنچا؟''

''وہ تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور میری ایک پروڈیوسر سے بات بھی ہو گئی ہے۔ اس نے اس میں خاصی دلچسپی ظاہر کی ہے۔''

''یہ وہی شخص تو نہیں جس کے ساتھ تم گزشتہ چند روز سے ملاقاتیں کر رہے ہو؟''

''ہاں، اس سے میرا مسلسل رابطہ ہے۔ امید ہے کام بن جائے گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔'' سیلی بولی لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ پہلے بھی ایسے مسودے لکھے جاتے رہے، پروڈیوسرز سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب بھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ اسی طرح ملازمت کر کے گھر کا کرایہ اور کچن کی ضروریات پوری کرتی رہے گی اور اب اس میں شال کی قسط کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دوسرا گلاس اٹھایا اور مشروب کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارنے لگی۔

وہ دونوں بار سے باہر آئے تو بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ مائیک نے اپنا ایک بازو سیلی کے گرد حمائل کیا اور اسے سہارا دیتے ہوئے کار تک لے آیا۔

صبح کے چار بجے اچانک ہی اس کی آنکھ مائیک کے خراٹوں کی آواز سے کھل گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کندھے سرد ہو رہے ہیں۔ اس کے جسم پر شال نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر الماری کی طرف گئی جہاں وہ عموماً شال کو پولیتھین کے بیگ میں لپیٹ کر رکھا کرتی تھی مگر الماری کا خالی خانہ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی لیونگ روم میں گئی اور تمام بتیاں روشن کر کے شال تلاش کرنے لگی۔

مائیک راہداری میں کھڑا آنکھیں مل رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے نیند سے بوجھل آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ''تم کیا ڈھونڈ رہی ہو؟''

''میری شال۔ وہ نہیں مل رہی۔ ضرور کہیں گر گئی ہوگی۔ کمال ہے مجھے پتا بھی نہ چلا اور تم نے بھی اس پر توجہ نہیں دی۔''

''ہم نے کافی زیادہ شراب پی لی تھی۔ شاید تم وہ شال اسٹار لائٹ کے بوتھ میں ہی چھوڑ آئی ہو۔ صبح جا کر لے آنا۔ اب سو جاؤ۔''

''تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ شال اب تک وہاں ہوگی۔ لوگ ایسی چیزیں کہاں چھوڑتے ہیں۔''

''کمال کرتی ہو تم بھی۔ بھلا کسی کو اس شال سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟''

''وہ کوئی معمولی شال نہیں۔ اس کی قیمت ایک ہزار ڈالرز ہے۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

مائیک کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ بولا۔ ''تم۔ تم نے وہ شال ایک ہزار ڈالرز میں خریدی تھی؟''

''ہاں۔'' وہ صوفے پر ڈھیر ہو گئی اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر رونے لگی۔

''اوہ میرے خدا! اتنی مہنگی شال خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟'' مائیک بڑبڑاتا ہوا سونے کے لیے چلا گیا۔

دوسرے دن اس نے اسٹار لائٹ لاؤنج سے اس جگہ تک کے راستے کا اچھی طرح معائنہ کیا جہاں مائیک کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے بار میں کام کرنے والے تمام افراد سے پوچھا کہ ان میں سے کسی نے وہ شال تو نہیں دیکھی۔ سب نے نفی میں سر ہلا دیا پھر اس نے قرب و جوار میں واقع دکانوں کے مالکان سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کسی کو بھی اس شال کے بارے میں علم نہ تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنی عزیز ترین شے کو تلاش کرتی رہی پھر مایوس ہو کر گھر

لوٹ آئی۔

چند روز بعد وہ اینی بورڈن کے ناخنوں پر پالش لگاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اینی نے جو شال اوڑھ رکھی ہے وہ ہو بہو اس کی گمشدہ شال جیسی ہے لیکن یہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ یہ اسی کی شال ہے پھر اسے اپنے کتے پوکسی کا خیال آیا۔ جس نے اپنے دانتوں سے اس شال میں دو سوراخ کر دیے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور اینی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''کیا تمہارے گھر میں کوئی کتا ہے؟''

''نہیں۔'' اینی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اس کے بھورے بال شانوں سے اوپر تک کٹے ہوئے تھے۔ یہ اسٹائل عموماً درمیانہ عمر کی وہ خواتین اپناتی ہیں جو مطمئن زندگی گزار رہی ہوں یا حال ہی میں انہیں شوہروں سے نجات ملی ہو۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تیر رہی تھی اور چہرے پر بڑھتی عمر کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اینی نے اپنے برابر میں بیٹھی عورت سے کہا۔ ''یہ گھر تمہارے لیے بہت مناسب رہے گا۔ بہت خوب صورت بنا ہوا ہے اور لیو بسی ہلز پر واقع ہے۔''

''کتنے کمرے ہیں؟'' اس عورت نے پوچھا۔

''چھ اور آٹھ باتھ روم ہیں۔ ان میں میک اپ روم شامل نہیں ہے۔''

''میرے لیے بہت بڑا ہے۔'' وہ عورت بولی۔ ''ویسے بھی آج کل ہر جگہ چھانٹی ہو رہی ہے۔ کیا پتا کل کیسے حالات ہوں اور ہم اس مکان کا کرایہ دے سکیں یا نہیں۔''

سیلی ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی۔ اس نے اینی سے کہا۔ ''تمہاری شال میں دو سوراخ کیسے ہیں؟''

''واقعی!'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں اندر کی جانب دیکھو۔'' سیلی نے کہا۔

اینی نے بڑی احتیاط سے شال کو پلٹ کر دیکھا تو پارلر کی روشنی میں اسے وہ سوراخ نظر آ گئے۔ سیلی کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ وہ اسی کی شال تھی۔ اینی نے بے پروائی سے کہا۔ ''میں نے ان پر غور نہیں کیا۔ دراصل کئی مہینوں بعد آج یہ شال لی ہے۔''

برابر میں بیٹھی ہوئی عورت نے کہا۔ ''مجھے تو یہ لیاما کی لگتی ہے۔''

''میں نے کبھی ڈیزائنر یا برانڈ پر توجہ نہیں دی۔ مجھے جو چیز پسند آ جائے وہ خرید لیتی ہوں۔''

''ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' سیلی نے کہا۔ دونوں عورتیں حیران ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

سیلی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے نظریں گھما کر بیوٹی سیلون کا جائزہ لیا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ سیلون کا مالک فریڈرک ایک نوجوان ابھرتی ہوئی اداکارہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، اگر وہ اسٹار ہوتی تو وہ اس سے اپنے پرائیویٹ روم میں ملتا۔ دوسری عورتیں سامنے لگے ہوئے آئینوں میں بڑے انہماک سے اپنے آپ کو سنورتا دیکھ رہی تھیں۔ ہال میں ہلکی ہلکی موسیقی گونج رہی تھی جس سے ماحول خوش گوار ہو گیا تھا۔ اگر سیلی اس موقع پر اپنی شال کا مسئلہ اٹھاتی تو اس ماحول میں ایک ناگوار تلخی شامل ہو جاتی۔ کوئی اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔ فریڈرک بھی اپنی گاہک کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس گستاخی کے نتیجے میں سیلی کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑ جاتے پھر وہ اس شال کی قسطیں کیسے ادا کرتی۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' اینی نے آخری بار آئینے پر نظر ڈالی اور شال کو اپنے بھاری کندھوں کے گرد لپیٹتے ہوئے بولی۔ ''تم واقعی اپنے کام میں بہت ماہر ہو۔''

سیلی کو یوں لگا جیسے اس تعریف میں بھی کوئی دھمکی پوشیدہ ہو۔ اینی نے برابر میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور بل ادا کرنے کے لیے استقبالیہ کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔ سیلی نے میز پر پڑے ہوئے نوٹوں کو دیکھا جو وہ ٹپ کے طور پر اس کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ صرف تین ڈالرز۔ اس کا منہ بن گیا۔ اسے کم از کم دس ڈالرز کی توقع تھی۔ اس نے اینی کو بل ادا کرتے دیکھا۔ کیا وہ اسے یونہی جانے دے، وہ اس سے کم از کم یہ تو پوچھ سکتی تھی کہ اس نے یہ شال کب اور کہاں سے خریدی تھی اور یہ کہ کیا وہ اسے خریداری کی رسید دکھا سکتی ہے لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ وہ عورت واویلا مچا دیتی اور سیلی کے لیے مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ اس لیے وہ اسے سیلون سے باہر جاتا دیکھتی رہی۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اینی سے اپنی چیز واپس نہیں لے سکی بلکہ اس لیے بھی کہ شال خرید کر اس نے کوئی عقل مندی نہیں کی تھی اور مائیک نے بھی اسے پسند نہیں کیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ اس شال کو اوڑھ کر بالکل مختلف نظر آتی تھی۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن اسے زیادہ جرأت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اس نے وہ تین ڈالرز جیب میں ڈالے اور فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی شال واپس لے کر رہے گی۔

☆☆☆

اس نے سیلون کے استقبالیہ کاؤنٹر سے اینی کا نمبر حاصل کیا اور فرضی نام سے اینی کو فون کر کے کہا کہ وہ اس مکان کے سلسلے میں اس سے ملنا چاہتی ہے جو وہ فروخت کر رہی ہے۔ سیلی کا خیال تھا کہ ایک بار اس کا اینی سے سامنا ہو جائے تو پھر وہ کسی نہ کسی طرح اس سے اپنی شال واپس لے سکے گی۔

اس نے اپنی کرولا عمارت سے ہٹ کر پارک کی۔ اس علاقے میں تمام مکان کم از کم چالیس لاکھ ڈالرز مالیت کے تھے۔ وہ کچھ دیر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اپنے حواس مجتمع کرتی رہی تاکہ پورے اعتماد اور جرأت کے ساتھ اینی کے سامنے جاسکے۔ وہ گاڑی سے باہر آئی اور مکان کی جانب چل دی۔ اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ مکان کے دونوں بیرونی گیٹ کھلے ہوئے تھے اور باغ میں بھی گھاس اور پودے بے ترتیبی سے بڑھ رہے تھے جیسے کسی نے ان پر توجہ نہ دی ہو۔ مکان کی بیرونی دیواروں پر گرد کی گہری تہ جمی ہوئی تھی اور ان کی اچھی طرح دھلائی کی ضرورت تھی۔ سورج کی تیز روشنی میں اس نے دیکھا کہ چھت کے اوپر لگے ہوئے کچھ ٹائلز بھی غائب تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی چوکھٹ کی پالش اڑ چکی تھی۔ پورے مکان سے اداسی اور ویرانی ٹپک رہی تھی۔

مکان کے بیرونی دروازے پر پہنچ کر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔ اس کے گھنٹی بجانے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔ اینی بورڈن نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اس وقت بھی اس نے وہی شال اوڑھ رکھی تھی۔

''اندر آجاؤ سیلی۔'' یہ کہہ کر اس نے سیلی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

سیلی ایک بڑے سے لاؤنج میں حیران کھڑی تھی جہاں سے ایک چکردار زینہ اوپری منزل کی طرف جا رہا تھا۔ اس پر بھی پیتل کی ریلنگ لگی ہوئی تھی لیکن پالش نہ ہونے کی وجہ سے خاصی بدنما نظر آرہی تھی۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ فون میں نے کیا تھا؟'' سیلی الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیونکہ یہ مکان برائے فروخت نہیں ہے اور تمہیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اس لیے میں سمجھ گئی کہ تم اپنی شال واپس لینے کے لیے مجھ سے ملنا چاہ رہی ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم اس بہانے ضرور یہاں آؤ گی۔'' پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''اندر آجاؤ میں تمہارے لیے کچھ پینے کا انتظام کرتی ہوں۔''

''اس کی ضرورت نہیں۔ تم میری شال واپس کر دو۔ مجھے جلدی جانا ہے۔''

''کیا تم یہ جاننا نہیں چاہو گی کہ یہ شال میرے پاس کیسے آئی؟ میں اپنے ناخن بنوانے کیوں تمہارے پاس گئی اور کیوں یہ ظاہر کیا کہ مکان فروخت کرنا چاہ رہی ہوں''

''میں کوئی مسئلہ کھڑا کرنا نہیں چاہتی مسز بورڈن۔''

''خواہش نہ ہو تب بھی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس وقت تمہاری حالت سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔ تم مجھے اینی کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔''

یہ کہہ کر وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ ڈرامائی انداز میں شال کا لٹکا ہوا پلو اپنے کندھے کے گرد لپیٹا اور لیونگ روم سے گزرتی ہوئی ایک چھوٹے کمرے میں چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد سیلی کے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش ابھری کہ وہ فوراً یہاں سے چلی جائے۔ اس نے بڑی مشکل سے اس خواہش کو دبایا اور لیونگ روم سے ہوتی ہوئی چھوٹے کمرے کی جانب چل دی۔

''بیٹھ جاؤ۔'' اینی نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور دو گلاسوں میں مشروب بنانے لگی۔

''میرے لیے کچھ نہ بنانا اینی۔'' اس نے اتنی احتیاط سے اس کا نام لیا جیسے کوئی نئی زبان سیکھ رہی ہو۔ صوفے پر بیٹھتے بیٹھتے اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ قریب ہی میز پر ایک لیمپ روشن تھا اور آتش دان میں ہلکی آگ دہک رہی تھی۔ اسے کمرے کا ماحول پسند آیا اور وہ پرسکون انداز میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم جن، پسند کرتی ہو۔ میں نے تمہیں اسٹار لائٹ لاؤنج میں مارٹینی پیتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''تم اس وقت وہاں موجود تھیں جب میری شال گم ہوئی اور تم نے اسے اٹھالیا۔'' سیلی غصے سے بولی۔

''ہاں، اس وقت وہاں اکیلی تھی۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ اکثر وہاں جاتی ہوں۔'' اس نے سیلی کو مشروب پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں یہ شال دے سکتی تھی لیکن میں نے ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔''

''کیوں؟''

''میں جانتی ہوں کہ بعض اوقات اچھے کام کا نتیجہ بھی غلط نکلتا ہے اور اب میں تقریباً یہی کرنے والی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگایا اور سر ہلانے لگی۔

سیلی نے اپنا پرس کھولا اور بولی۔ ''میں اس کی رسید

بھی لے کر آئی ہوں۔''

''یہ تمہاری ملکیت کا نہیں بلکہ زندگی کا سوال ہے۔''

اینی عجیب سے انداز میں بولی۔

سیلی کے اعصاب تن گئے اور وہ گھبراتے ہوئے بولی۔''کیا تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟''

''میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گی کیونکہ پہلے ہی ایک قتل کر چکی ہوں اور پوری سچائی سے کہہ رہی ہوں کہ دوسرا قتل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''

سیلی نے رسید دوبارہ پرس میں رکھ لی اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔''کیا واقعی تم نے کسی کو قتل کیا تھا؟''

''ہاں، اپنے شوہر کو۔''

سیلی کا خون رگوں میں جمنے لگا اور یہ سوچ کر ہی اسے جھرجھری آنے لگی کہ وہ اس پاگل عورت کے ساتھ اس کے گھر میں اکیلی تھی۔

''میں پاگل نہیں ہوں۔'' اینی نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا۔''آپ کسی کو قتل کرنے کی حماقت نہیں کر سکتے۔ یہ حقیقت ہے کہ شوہر کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر میں نے زندگی میں پہلی بار کوئی عقل کا کام کیا تھا۔ شاید میں کسی نفسیاتی کیفیت کے زیرِ اثر آگئی تھی۔ اب مجھے اپنے جرم کا احساس ہوتا ہے۔''

''تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟'' سیلی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جیسے فرار کا ارادہ کر رہی ہو۔

اینی نے ایک سرد آہ بھری اور مشروب کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔''کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ تم بھی میری طرح ہو جاؤ۔''

''میں بھی کسی کو قتل نہیں کر سکتی۔''

اینی نے اپنا سر اٹھایا اور سیلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''میں بھی ایسا ہی سوچتی تھی۔ مجھے اپنے شوہر سے محبت نہیں تھی گو کہ میں نے بہت کوشش کی لیکن یہی حقیقت ہے۔''

''پھر تم نے اس سے شادی کیوں کی تھی؟''

''ہماری ملاقات ہوئی اور دونوں ساتھ رہنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے عادی ہو چکے تھے۔ جب اس نے شادی کے لیے کہا تو میں انکار نہ کر سکی۔ شاید میں اتنی بہادر نہیں تھی اور نہ ہی مجھے یہ پتا تھا کہ حقیقت میں کیا چاہتی ہوں۔''

''میں شادی نہیں کر رہی۔'' سیلی نے اپنے دفاع میں کہا پھر بولی۔''کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ تم اس سے طلاق لے لیتیں؟''

''بالکل لیکن میرے پاس اسے چھوڑنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ میں تمہیں گمراہ کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے جوش میں آکر اسے قتل نہیں کیا بلکہ میں اس سے بور ہو چکی تھی۔ مثلاً کھانے سے پہلے وہ چاندی کے چمچوں، چھریوں اور کانٹوں کو نیپکن سے صاف کیا کرتا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے وہ اپنا چشمہ صاف کرنے لگ جاتا اور میں انتظار کرتی رہتی کہ کب وہ دوبارہ چشمہ ناک پر جمائے گا..... اپنا ادھورا جملہ پورا کرے گا۔ اس وقت بھی وہ اپنا چشمہ ہی صاف کر رہا تھا جب میں نے اسے سیڑھیوں سے دھکا دیا۔ میں بیڈروم سے باہر آئی تو دیکھا کہ وہ سب سے پہلی سیڑھی پر کھڑا کوئی تصوراتی دھبا صاف کرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اس کے پیچھے آکر زوردار دھکا دیا۔ اس کا سر سیڑھیوں سے ٹکرایا اور وہ لڑھکتا ہوا ماربل کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ اس دوران بھی چشمہ اس کے ہاتھوں میں دبا رہا۔''

اینی نے مشروب کا ایک اور گھونٹ لیا اور بولی۔''پولیس یہی سمجھی کہ وہ چشمہ صاف کرتے ہوئے زینہ اتر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا۔''

سیلی کا رنگ زرد ہو چکا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔''کیا تم اسے یاد کرتی ہو؟''

''نہیں لیکن وہ میری زندگی کا حصہ تھا جسے میں نے مار ڈالا۔''

یہ کہہ کر وہ کھڑی ہو گئی اور سرد لہجے میں بولی۔''اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہیں بھی ایسا ہی دکھ پہنچاؤں۔'' سیلی کا سینہ جکڑنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بھاگی۔

''تمہارا بوائے فرینڈ مائیک کسی دوسری عورت سے تعلق استوار کیے ہوئے ہے۔'' اینی نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنا گلاس دوبارہ بھرنے کے لیے میز کی جانب بڑھ گئی۔

سیلی اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گئی پھر اس نے مڑ کر دیکھا اور بولی۔''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''میں نے اسے اس عورت کے ساتھ اسٹار لائٹ بار میں دیکھا تھا۔ وہ میرے برابر والی میز پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ سنہری بالوں والی لڑکی بڑے انہماک سے اس کی باتیں اور اس کے لطیفوں پر قہقہے لگا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ اس کے اسکرپٹ کی تعریف کر رہی ہے جو وہ لکھ رہا ہے۔ ان دونوں کا جوڑ بہت مناسب لگ رہا تھا لیکن مائیک تم سے ہی شادی کرے گا کیونکہ تم برسرِ روزگار ہو اور اس کا خیال رکھ سکتی ہو اور تم اس سے اس لیے شادی کرو گی کیونکہ اس کی عادی ہو چکی ہو۔''

سیلی نے بہ مشکل اپنے آنسو ضبط کیے اور بھرائی ہوئی

آواز میں بولی۔ ''اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پروڈیوسر سے ملنے جاتا ہے۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ تم سچ بول رہی ہو؟''

''مجھے تو اپنے شوہر کے بارے میں بھی معلوم ہو گیا تھا جب اس نے ایک دوسری عورت سے ملنا شروع کیا تھا۔ ایک اور بات۔ تم اس رات بار میں اپنی شال بھول کر نہیں آئی تھیں۔ اس نے جان بوجھ کر تمہارے کندھے سے وہ شال گھسیٹ لی تھی۔ اس نے ایسا کیوں کیا ہوگا؟''

''وہ کہہ رہا تھا کہ میں اس شال میں اچھی نہیں لگ رہی اور ہمیشہ سے مختلف نظر آرہی ہوں۔''

''ممکن ہے کہ اس نے تمہارے اندر کوئی تبدیلی محسوس کی ہو اور اسے اپنی محتاط زندگی کے لیے کوئی خطرہ محسوس ہوا ہو جیسا کہ مجھے ہوا تھا۔''

''میں اب مزید کچھ سننا نہیں چاہتی۔ مجھے میری شال واپس کردو۔''

اینی نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا اور بولی۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں کرسکتی۔''

''تمہیں اسے اپنے پاس رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھے ایک سال تک اس کی قسطیں ادا کرنا ہوں گی۔''

اسے اپنے آپ پر ضبط نہ رہا اور اس نے اپنا پرس گھما کر اینی پر دے مارا جو اس کے سر سے نیچے لگا، اینی پیچھے کی جانب لہرائی لیکن جلد ہی اس نے توازن قائم کرلیا اور اپنے ہاتھ سے زخمی گال سہلانے لگی۔

سیلی کے آنسو بہنے لگے اور وہ روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے افسوس ہے لیکن تم بھی زیادتی کررہی ہو، یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''تم اسے قتل کیے بغیر اپنی زندگی سے نکال دو۔ پھر تمہیں یہ شال واپس مل سکتی ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''

سیلی نے سوچا کہ وہ اس عورت سے شال چھین لے جو اس کی زندگی تباہ کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ اس نے آہستہ سے اینی کا شکریہ ادا کیا اور تھکے تھکے قدموں سے دروازے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سیلی نے بار میں لگے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور مسکرادی۔ وہ اپنا حلیہ بدلنے میں مکمل طور پر کامیاب ہوچکی تھی۔ اب اس کے سر پر سنہری بالوں والی وگ تھی جو اس نے صبح ہی بیوٹی شاپ سے خریدی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو لائنر کی مدد سے بالکل سیاہ کرلیا تھا اور ہونٹوں پر معمول سے ہٹ کر گہرے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ وہ ایک ایسی عورت نظر آرہی تھی جو دوست یا گاہک کی تلاش میں گھر سے نکلی ہو۔ کئی نظریں اس کی جانب اٹھیں بلکہ ایک لڑکے نے تو اسے اشاروں اشاروں میں دعوت بھی دی تھی جسے اس نے بالکل نظر انداز کردیا تھا۔

اسٹار لائٹ لاؤنج میں رش بڑھتا جارہا تھا لیکن مائیک ابھی تک وہاں نہیں پہنچا تھا جبکہ وہ صبح ہی اسے بتاچکا تھا کہ شام میں اس کی پروڈیوسر کے ساتھ ایک اور ملاقات ہے۔ اینی سے ملنے کے بعد سیلی ان ملاقاتوں کی حقیقت جان چکی تھی اور اسے یقین تھا کہ مائیک اس لڑکی سے ملنے یہاں ضرور آئے گا۔

اس نے وقت گزاری کے لیے ہال کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس کی نظر ایک خوب صورت سنہری بالوں والی لڑکی پر گئی جو سفید وائن کے گھونٹ لیتے ہوئے بار بار کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے ظاہر ہورہا تھا کہ کسی کا انتظار کررہی ہے یقیناً یہ وہی لڑکی تھی جس کا ذکر اینی نے کیا تھا۔

عین اسی لمحے بار کا دروازہ کھلا اور مائیک اندر آتا دکھائی دیا۔ اس کے سیاہ بالوں کی لٹ ہمیشہ کی طرح ماتھے پر جھول رہی تھی۔ اس نے دروازے میں رک کر ہال کا جائزہ لیا اور سیلی کے دل کی دھڑکن اس وقت تیز ہوگئی جب مائیک نے اس لڑکی کی طرف جانے کے بجائے سیلی کی میز کا رخ کیا اور اس کے قریب آکر بولا۔ ''معاف کرنا۔ مجھے غلط

صحت یاب

ایک دوست (دوسرے دوست سے) ''کل تھانے میں مجھے ایک پولیس افسر نے مسکرا کر کہا۔ ''لو بیٹے! آج اپنی زندگی کا آخری کھانا کھالو۔''

دوسرا دوست۔ ''تو پھر تم زندہ کیسے بچ گئے؟''

پہلا دوست۔ ''تم پولیس افسر کا نقطہ نظر نہیں پاسکے۔ اس نے مجھے جو کھانا کھلایا تھا ویسا کھانا زندگی بھر نہیں مل سکتا۔''

دوسرا دوست۔ ''بہت ہی لذیذ کھانا تھا کیا؟''

پہلا دوست۔ ''بالکل نہیں پولیس افسر نے وہ کھانا ایک ایسے حوالاتی سے پکوایا تھا جو دراصل کسی اسپتال کا باورچی تھا۔ پولیس افسر نے کہا تھا کہ یہ ایسا عمدہ کھانا ہے کہ خطرناک حالت کے مریض بھی اس سے بہت جلد ''صحت یاب ہوسکتے ہیں''

مرسلہ۔ عائشہ جنجوعہ، پنڈ دادنخان

فہمی ہوئی۔ تم بالکل اس جیسی ہو جس سے میں ملنے آیا تھا۔''

''مائیک!'' وہ لڑکی اپنی جگہ سے ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ ''میں یہاں ہوں۔''

''اوہ خدا۔ مجھے سب سنہری بالوں والی لڑکیاں ایک جیسی لگتی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ مڑا اور تیزی سے اس لڑکی کی جانب لپکا۔ وہ لڑکی اسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس سے لپٹ گئی۔

سیلی کے لیے یہ منظر ناقابلِ برداشت تھا۔ اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے۔ اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے جہاز کے مانند محسوس کیا جو سمندری طوفان کی زد میں آ کر ڈوب رہا ہو۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ اس نے رومال سے پسینا پونچھا اور بل ادا کر کے باہر آ گئی۔ اب وہاں مزید رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی وہ پوکسی کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھی ۔۔۔۔ وہی دکھ تھا جو وہ اپنی کی آنکھوں میں دیکھ چکی تھی جیسے پوکسی نے اس کے دکھ کو محسوس کرلیا ہو اور آنے والے طوفان سے خوفزدہ ہو۔ سیلی کی نظریں بار بار دیوار گیر کلاک پر جاتیں، بالآخر ایک بجے اس نے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنی تو فوراً ہی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا حلیہ درست کرنے لگی۔ اس نے وگ کو اچھی طرح سر پر جمایا اور چہرے کے میک اپ کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہوگئی۔

مائیک گنگناتا ہوا بیڈروم میں داخل ہوا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم دروازے پر رک گئے اور وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو؟''

''سیلی!'' اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی کہ مائیک ایک بار پھر اسے پہچاننے میں ناکام رہا تھا۔

اس نے ناراض ہوتے ہوئے اپنے بال ماتھے پر سے ہٹائے اور آگے کی طرف جھک کر اس کے چہرے پر نظریں جما دیں جیسے تصدیق کرنا چاہ رہا ہو کہ وہ واقعی سیلی ہی ہے۔ پھر وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ مجھے لگا جیسے کوئی اجنبی عورت میرے کمرے میں آ گئی ہے۔''

''کچھ مرد تو بن بلائی اجنبی عورت کو دیکھ کر خوش بھی ہو سکتے ہیں۔''

مائیک نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''تم تو بالکل پہچانی نہیں جا رہی ہو۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' اسی لمحے سیلی نے اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط محسوس کیا۔ اب وہ مائیک کو اس کی اوقات یاد دلانا چاہ رہی تھی جو اس کے ساتھ دھوکا کر رہا تھا۔

''ان دنوں تم عجیب و غریب حرکتیں کر رہی ہو۔ پہلے تم نے وہ شال خریدی جس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اب تم نے اپنے چہرے کا ستیاناس کرلیا ہے۔ اتنا گہرا میک اپ اور بالوں کو ڈائی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں نے بال ڈائی نہیں کیے بلکہ وگ لگائی ہوئی ہے۔'' سیلی نے وضاحت کی۔ ''اور یہ مت سمجھنا کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں۔''

وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ ''پھر یہ سب کیا ہے؟ تم ایک آوارہ عورت کے مانند نظر آ رہی ہو۔''

سیلی کی رگوں میں خون جمنے لگا۔ اسے مائیک سے ان ریمارکس کی توقع نہ تھی۔ وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔

''کیا تمہاری پروڈیوسر آوارہ عورت جیسی نظر آتی ہے۔ اس کے بھی تو سنہری بال ہیں۔''

''کیا اسی لیے تم نے اس جیسا حلیہ اختیار کیا ہے جبکہ وہ میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔''

''سب مرد رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر ایسا ہی کہتے ہیں۔'' سیلی طنزیہ انداز میں بولی۔

''میرا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ......''

''بلکہ کیا؟'' وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔ اس کے بعد بھی تمہارے پاس کچھ کہنے کی گنجائش ہے؟''

''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔''

''میں جاننا چاہتی ہوں کہ وہ کون ہے اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟''

''کوئی تعلق نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''بس یونہی...... وہ تو......'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

''میں چاہتی ہوں کہ کم از کم ایک بات مجھے سچ سچ بتا دو۔ کیا اس رات تم نے میرے کندھے سے شال ہٹائی تھی؟''

''میں ایسا کیوں کروں گا؟''

''براہ کرم مجھے سچ سچ بتا دو۔ میں حقیقت جاننا چاہتی ہوں۔''

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس شال کی قیمت ایک ہزار ڈالرز ہے۔'' وہ دوسری جانب منہ پھیرتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

اینی بورڈن کے گھر کی طرف جاتے ہوئے سیلی کو

افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کتے کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آئی۔ وہ اس سے پہلے ہی فون پر ملاقات کا وقت طے کر چکی تھی اور اینی نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی شال لے جائے۔ سیلی کو اس کے بدلے ہوئے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ کیا اس طرح وہ اینی کی دوست بن سکتی ہے؟ تب اسے یاد آیا کہ جو عورت اپنے شوہر کو قتل کر دے وہ کسی کی دوست نہیں ہو سکتی۔

کار سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ بیرونی دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ اس نے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کھل گیا اور سیلی مکان کے اندر داخل ہو گئی۔ وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا اور لگتا تھا جیسے گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس نے راہداری میں کھڑے ہو کر آواز لگائی۔ ''اینی!''

جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ آگے بڑھی اور لیونگ روم سے ہوتی ہوئی کچن تک آ گئی۔ کافی کی میز پر جن کی بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا اور برابر میں ہی اس کی شال بڑی صفائی سے تہ کی ہوئی رکھی تھی اور اس کے بالکل اوپر ایک تحریر شدہ کاغذ رکھا ہوا تھا۔ سیلی نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

''میری طرف سے یہ ڈرنک تمہارے لیے ہے۔ تمہاری ہمت دیکھ کر مجھے بھی ہمت ہوئی۔ اپنی شال اٹھاؤ اور اسے پہن لو۔''

سیلی نے شال اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ وہ اس کی نرمی اور گرماہٹ کو محسوس کر سکتی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ کمرے سے تمام فرنیچر ہٹا دیا گیا تھا۔ کیا اینی نے سب کچھ بیچ دیا؟ کیا وہ اپنے آپ کو ہر بوجھ سے آزاد کر رہی تھی؟

راہداری میں آ کر اس نے ایک بار پھر اینی کا نام لے کر آواز دی لیکن یہ آواز گھر کے سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔ وہ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس نے چٹخ کی ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اوپر پہنچ کر وہ ایک کھلے ہوئے دروازے کے سامنے لمحے بھر کے لیے رکی پھر اندر داخل ہو گئی۔

اینی بورڈن کمر کے بل بستر پر چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی جگہ خالی پن نظر آ رہا تھا اس کی کنپٹی پر گہرا سوراخ ہو چکا تھا۔ خون کے دھبے عقبی دیوار فرش اور بستر کی چادر پر پھیلے ہوئے تھے اور تکیے کے نیچے سے ایک تحریر شدہ کاغذ جھانک رہا تھا۔ سیلی نے جلدی سے وہ کاغذ اٹھایا۔ اس پر لکھا تھا۔

''سیلی! اگر تم یہ تحریر پڑھ رہی ہو تو تم میری سوچ سے کہیں زیادہ بہادر ہو۔ مجھے اس ہنگامے پر افسوس ہے لیکن میں نے تمہیں اس غیر محفوظ زندگی سے آزاد کرانے کی

کوشش کی تھی جسے تم اب تک محفوظ سمجھتی آ رہی ہو لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم مائیک کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ اس لیے تمہاری شال واپس کر رہی ہوں۔ اب تو تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ شال مجھ تک کس طرح پہنچی۔ میں اپنے شوہر سے ہاتھ دھو چکی ہوں لیکن دوسری بار شکست مجھے منظور نہیں۔ اس لیے تمہارے راستے سے ہٹ رہی ہوں۔''

سیلی نے اس کی آنکھیں بند کیں اور شال کو اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔ وہ بیڈ روم سے باہر آئی اور سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اتر آئی۔ اب وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ شال اینی تک کس طرح پہنچی۔ مائیک نے جان بوجھ کر اسے اس کے کندھوں سے ہٹا دیا تھا تاکہ بعد میں اینی اسے اٹھا لے۔ اس نے سیلی سے جھوٹ بولا تھا کہ اسے شال کی قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ دراصل وہ نہیں چاہتا تھا کہ سیلی وہ شال پہن کر کوئی معزز عورت نظر آئے۔ اس کے خیال میں سیلی اس قابل نہیں تھی۔ ایک معمولی بیوٹیشن کو اتنی قیمتی شال پہننے کا حق نہیں تھا۔

سیلی اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ وہ شال کا تعاقب کرتے ہوئے اینی کے گھر تک پہنچ گئی جہاں اینی نے اسے مائیک سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی اور شال واپس کرنے کے لیے شرط رکھی کہ وہ مائیک کو اپنی زندگی سے نکال دے۔ سیلی کو یہ سودا منظور نہ تھا۔ وہ شال سے دستبردار ہو سکتی تھی لیکن مائیک سے جدا ہونا اسے منظور نہ تھا۔ اس نے مائیک سے سچ اگلوا لیا کہ اسی نے وہ شال اس کے کندھے سے ہٹائی تھی لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اینی بھی مائیک کے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور اسی لیے اس نے شال کے عوض مائیک کو سیلی سے الگ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں ناکام ہونے کے بعد اس نے خودکشی کر لی۔

اینی کا پورا کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر اینی کے بیڈ روم کی طرف دیکھا اور تھکے تھکے قدموں سے باہر آ گئی۔ اینی بدقسمت تھی کہ پہلے اس کے شوہر نے بے وفائی کی اور بعد میں اس نے جسے چاہا وہ اس کے دام الفت میں نہ آ سکا۔ اس میں دوسرا قتل کرنے کی ہمت تھی اور نہ ہی دوسری بار شکست برداشت کرنے کا حوصلہ۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

سیلی نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر اپنے سیل فون سے نائن ون ون ڈائل کیا پھر اس نے اپنا ماتھا اسٹیئرنگ وہیل پر ٹکایا اور پولیس کا انتظار کرنے لگی۔

سلسلہ مکافات

عظیم احمد

کہاوت مشہور ہے کہ "تن پُتلا ہے خاک کا اسے دیکھ مت بھول... اک دن ایسا ہوگا ملے دھول میں دھول..." اس حقیقت کو انسان کبھی نہ بھولے کہ ہر ایک کو ایک نہ ایک دن اپنے مالکِ حقیقی کی جانب لوٹنا ہے... خاک کا یہ پُتلا روتے ہوئے خاک پر پیدا ہوتا ہے اور طاقت کے گھمنڈ میں دھن دولت اکٹھی کرنے اور رشتوں کو ٹھکرانے کے باوجود خاک تلے ہی سو جاتا ہے لیکن... اس رونے اور سونے کے درمیان چاہے مکافات کا عمل مسلسل جاری رہے تب بھی وہ مکافات کی جزئیات کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور یہی غفلت اسے سرکشی پر مائل کرکے جذبات واحساسات سے کھیلنے پر اکساتی ہے... اور پھر وہ زندگی کی بساط پر ایسے داؤ پیچ چلتا ہے کہ بازی مات ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے بھی یہی گمان تھا۔ فتح کے نشے میں چُور اسے خیال تک نہ آیا کہ اگلی بساط پر یہی چالیں خود اس کی چال کو لڑکھڑا دیں گی... جب اپنا ہی سایہ دغا دے جائے تو چند لمحات کے لیے لازم ہے کہ انسان پلٹ کر پیچھے بھی دیکھ لے لیکن اس کے پاس نہ تو پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی فرصت ہوتی ہے اور نہ ہی قدرت کے پاس اتنی رعایت کہ بغیر کسی حجت کے زیست آسان ہوجائے، لہٰذا مکافات کی چکی جب الٹی چلتی ہے تو ایک ایک لمحے کا حساب بے باق ہوجاتا ہے... دن رات کا شمار کرتے کرتے وہ بھی تھک چکی تھی، اس کے باوجود قدرت کی ستم ظریفی جاری تھی۔

عکس در عکس ایک ہی چہرے کے ہزاروں روپ... اور ہر روپ کی ایک الگ داستان

منصور نے تیسری مرتبہ نگاہیں دوڑا کر گردوپیش کا جائزہ لیا اور کسی قدر اضطراب کے عالم میں صوفے کا ہتھا انگلیوں سے کھٹکھٹانے لگا۔ پچھلے نصف گھنٹے سے وہ اسی طرح بیٹھا وقت ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انتظار کرنا ویسے بھی ایک مشکل کام ہے لیکن نوجوانوں کے لیے، بالخصوص منصور جیسے انسانوں کے لیے کسی حد تکلیف دہ بھی ہوتا ہے جنہیں کسی کام کی لگن بے چین رکھتی ہے۔ پھر یہ انتظار ساغر بھی نہ تھا کہ اختتام پر جسم وجاں کو کیف وانبساط کا جام میسر آئے بلکہ یہ ایک خاتون کا انتظار تھا جن کی عمر، منصور کے محتاط اندازے کے مطابق اس کی اپنی والدہ سے بھی کچھ زیادہ ہی رہی ہوگی۔

منصور نوعمر وکلاء کی اس کھیپ کا تازہ ترین نمونہ تھا جو ہر سال پاکستان کے لاء کالجز سے گریجویشن کر کے نکلتی ہے اور ملک بھر کے قانون دانوں کی فہرست میں کچھ اور اضافہ کردیتی ہے۔ ان میں سے کچھ دل میں سماج سدھار کے عزائم لے کر آتے ہیں۔ کچھ قانون کے نشتر سے معاشرے کے ناسوروں کا آپریشن کرنا چاہتے ہیں اور کچھ شعبے قانون سے وابستہ عزت وتوقیر کے خواہاں ہوتے ہیں۔

پھر ہوتا کچھ یوں ہے کہ صبح آٹھ بجے سے دوپہر دو بجے تک ایوان ہائے عدالت میں دھکے کھانے، نکات و دلائل کی تلاش میں موٹی موٹی کتابیں کھنگالنے، رات دو دو بجے تک پیچیدہ مقدمات کے مطالعے اور تجزیے پر مغز ماری کرنے، قانون کے سخت دل اہلکاروں کو نرم کرنے اور... جوڈیشری کی اینڈ بینڈ سے ٹھوکریں کھا کھا کر ہوجاتا ہے کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔ خواب دیکھنا کسی اڑتے پرندے کو دیکھنے سے زیادہ آسان ہے لیکن اسے حقیقت کا روپ دینا



اس پرندے کے پر گننے سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ تب پتا چلتا ہے کہ جس پیشے میں وہ دولت کے ڈھیر لگانے کے لیے داخل ہوئے تھے، وہاں سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے سوداؤ کھیلنا پڑتے ہیں۔ انصاف کا ترازو اپنے حق میں جھکانے کے لیے پلڑے میں اپنا ضمیر، عزت نفس اور فخر ذات ڈالنا پڑتے ہیں۔ تب پتا چلتا ہے کہ انصاف وعدالت کی جس تلوار سے وہ جرم وگناہ کا سر قلم کرنا چاہتے تھے، اس کی دھار کو زنگ لگ چکا ہے۔ اکیلے چنے کے لیے بھاڑ جھونکنا شاید ممکن ہو لیکن اکیلے شخص کے لیے اس زنگ کو کھرچنا ناممکن ہے۔

لیکن منصور ابھی ان حقائق سے ناآشنا تھا۔ سنگینیوں نے ابھی اس کا در نہیں دیکھا تھا۔ اس کا جوش وولولہ ابھی تازہ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایل ایل بی کیا تھا اور اوسط درجے کی ایک لا فرم میں جونیئر ایسوسی ایٹ کی پوزیشن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق مڈل کلاس کے ایک ایسے گھرانے سے تھا جس میں دو تین کمانے والے موجود تھے۔ اس کا باپ سترھویں گریڈ کا سرکاری ملازم تھا۔ ایک بھائی پرائیویٹ فرم میں سیلز منیجر تھا اور دوسرا ایک تعمیراتی ادارے میں بطور اپرنٹس انجینئر کام کر رہا تھا۔ دونوں غیر شادی شدہ تھے چنانچہ پوری تنخواہ گھر دیتے تھے۔ تین تنخواہیں ملا کر اتنا ہو جاتا تھا کہ آج کل کی گراں بازاری کے دور میں کھا بھی لیتے تھے اور کچھ بچا بھی لیتے تھے۔ یوں منصور سے انہوں نے کچھ زیادہ توقعات وابستہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی اور معاشی تفکرات سے آزاد منصور اب بھی پورے دھڑلے سے خواب دیکھ سکتا تھا۔

یہاں پر بھی وہ ایسی ہی نیت سے آیا تھا۔ کام کی نوعیت بہ ظاہر معمولی تھی لیکن منصور کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ اپنے پیشہ ورانہ کیریئر کے آغاز کے بعد پہلی دفعہ اسے کسی مؤکل کو اپنے طور پر ہینڈل کرنے کا موقع ملا تھا چنانچہ یہاں آتے ہوئے وہ خاصا جوش اور ہیجان محسوس کر رہا تھا لیکن اب یہ جوش اور ہیجان آہستہ آہستہ سرد پڑتا جا رہا تھا۔ انتظار کرتے ہوئے اتنی دیر گزر چکی تھی اور ویٹنگ روم میں تنہا بیٹھے وہ سخت بور ہو رہا تھا۔

یہاں پر اس کی آمد بس اتفاق ہی کا نتیجہ تھی۔ دو روز پہلے سیکریٹری نے (جو اس کے علاوہ تین دیگر ایسوسی ایٹس کے امور کی دیکھ ریکھ بھی کرتی تھی) اسے ایک فون کال کے متعلق بتایا تھا کہ دارالصفا نامی ایک ادارے سے کسی خاتون نے فون کر کے فرم کے کسی وکیل سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اصولی طور پر تو کسی بھی مؤکل کا پہلا رابطہ فرم کے کسی سینئر سے ہونا چاہیے تھا، بعد میں وہ جسے چاہتا اس کی ذمے داری تفویض کرتا لیکن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ اس روز کوئی سینئر موجود نہ تھا۔ فرم کے دونوں پارٹنر کسی سیمینار میں شرکت کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ ایک سینئر ایسوسی ایٹ گزشتہ کچھ روز سے بیماری کی وجہ سے غیر حاضر تھا اور دوسرا سالانہ چھٹیوں پر نتھیا گلی جا پہنچا تھا۔ لے دے کے منصور اور تین جونیئرز بچتے تھے اور چونکہ اطلاع سب سے پہلے منصور کو ملی تھی، اس لیے کال بھی اسی نے اٹینڈ کی۔

فون کرنے والی خاتون نے اپنا نام عقیلہ رحیم بتایا تھا۔ وہ دارالصفا نامی اس ادارے کی انتظامیہ میں شامل تھی۔ اس نے کہا تھا کہ ان کے ادارے میں مقیم ایک خاتون اپنی وصیت کی تیاری کے سلسلے میں ان کے ادارے کے کسی تجربہ کار وکیل سے ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ خاتون کا نام اس نے شاہانہ چغتائی بتایا تھا۔

چونکہ کوئی سینئر سر پر نہ تھا اس لیے منصور نے خود سینئر بننے کا فیصلہ کرتے ہوئے خاتون کو مطلع کر دیا تھا کہ وہ اگلے چند دن میں وقت نکال کر ان کے ادارے کا چکر لگا لے گا۔ وقت نکالنے کی بات اس نے محض اس لیے جڑ دی تھی کہ... بے حد مصروف ہونے کا تاثر دے کر عقیلہ نامی اس خاتون پر رعب ڈال سکے۔ تاثر کو مزید گہرا کرنے کے لیے تو وہ یہ کہنے لگا تھا کہ ادارے کے کسی وکیل کے پاس وقت شاید نہ نکل سکے۔ اس لیے خواہش مند خاتون خود ہی ان کے دفتر کا چکر لگا لے لیکن پھر یہ سوچ کر باز رہا کہ اگر خاتون یہاں آ گئی تو اپنے پہلے مؤکل کو ہینڈل کرنے کا یہ سنہری موقع یقیناً اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اب اس موقع سے مستفید ہونے کے لیے وہ انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے سائڈ ٹیبل پر پڑا ہوا ادارے کا بروشر اٹھا لیا۔ بروشر میں ادارے کے قیام کی غرض وغایت اور یہاں میسر سہولتوں کا بیان تھا۔ مطالعے سے معلوم ہوا کہ یہ ادارہ 1913ء میں شوکت چغتائی نامی ایک صاحب نے ایسے بوڑھے اور ضعیف افراد کے لیے قائم کیا تھا جن کے آگے پیچھے کوئی سنبھالنے والا نہ ہو۔ چغتائی صاحب کیمبرج کے پڑھے ہوئے اعلیٰ تعلیم یافتہ رئیس زادے تھے۔ اس ادارے کو قائم کرنے کا آئیڈیا انہوں نے یورپ میں قائم اس نوعیت کے دوسرے

اداروں سے ہی لیا تھا۔ اپنی جائداد کے ایک حصے کو انہوں نے ٹرسٹ کی شکل دے کر ادارے کے لیے وقف کر دیا۔ اپنے حصے کی جائداد چونکہ والدین کی زندگی میں ہی حاصل کر چکے تھے، اس لیے کوئی جھنجٹ نہ پڑا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام انہوں نے خود بھی یہیں گزارے تھے۔

آہٹ سن کر منصور نے سر اٹھایا۔ ویٹنگ روم کا دروازہ کھل رہا تھا۔ شاید انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی تھیں۔ وہ بروشر واپس رکھتا ہوا آنے والے کے استقبال کو تیار ہو گیا۔ اندر آنے والی ہستی کو دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ وہ یہاں کسی ضعیف العمر خاتون سے ملاقات کی توقع لے کر آیا تھا لیکن جس کے استقبال کو وہ اٹھا تھا، وہ چالیس بیالیس سال کی اوسط سے قدرے کم قامت کی خاتون تھی۔ اس کی آنکھوں پر سیاہ رنگ کے موٹے فریم کا چشمہ تھا اور چاندی کی تاروں سے مزین بال پتلی سے چوٹی کی صورت گندھے ہوئے تھے۔ سفید شلوار قمیص، سر پر دوپٹا، کلائیاں اور گلا سونے تھے البتہ کانوں میں ہلکی بالیاں نظر آ رہی تھیں.... بحیثیت مجموعی اسے دیکھ کر ایک سادہ اور بردبار خاتون کا تاثر ابھرتا تھا۔

منصور کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا۔

''تشریف رکھیے، منصور صاحب۔ فون پر آپ سے غائبانہ تعارف تو ہو ہی چکا ہے۔ میں عقیلہ رحیم ہوں۔''

منصور نے ایک گہرا سانس کھینچا اور بیٹھ گیا۔ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔

عقیلہ رحیم کی بات جاری تھی۔ ''بیگم چغتائی سے ملاقات کے لیے آپ کو مزید پندرہ بیس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔ اس زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن مجبوری ہے۔''

''کیسی مجبوری؟'' منصور نے کہا۔

''دراصل بیگم چغتائی کو غسل دیا جا رہا ہے۔''

منصور کو ایک دفعہ پھر حیرت ہوئی۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ غسل تو مردے کو دیا جاتا ہے لیکن محض بھویں اچکا کر رہ گیا۔ عقیلہ رحیم کے سامنے ایسی غیر سنجیدہ بات کہنے سے اس کا شخصی تاثر بری طرح مجروح ہو سکتا تھا۔

اس کے چہرے کا بدلا ہوا تاثر دیکھ کر عقیلہ رحیم اس کے دل کی بات بھانپ گئی، بولی۔ ''دراصل چند سال پہلے بیگم چغتائی پر فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ ان کے جسم کا دایاں حصہ تقریباً ناکارہ ہو چکا ہے۔ اس لیے انہیں غسل دینے اور ایسے دوسرے کام کروانے کا فریضہ ادارے کی ملازماؤں کو ہی انجام دینا پڑتا ہے۔''

''اوہ اچھا۔'' منصور کی سمجھ میں نہ آیا کہ حیرت کا اظہار کرے یا افسوس کا۔

''ادارے کے ہر رہائشی کی ضروریات کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔'' عقیلہ نے کہا۔ ''ہمارے ادارے کی حیثیت کاروباری نہیں فلاحی ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ اس صورت میں ہماری ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔''

''جی جی، بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔'' منصور نے محض جواب دینے کی غرض سے اس کی تائید کر دی حالانکہ عقیلہ رحیم کا نقطۂ نظر اس کے سر پر سے گزر گیا تھا۔ خیراتی اسپتالوں میں مریضوں کی درگت کے کئی قصے وہ سن چکا تھا اور ہر شریف دنیادار کی طرح یہی سمجھتا تھا کہ جب تک کسی طرح کی منفعت درپیش نہ ہو، لوگ اپنے کام دل سے پورے نہیں کرتے۔

''ہمارا ادارہ پورے لاہور میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے اور ہم لوگ اسے بہ حسن وخوبی چلانا ایک مشن سمجھتے ہیں۔'' عقیلہ رحیم نے مزید اضافہ کیا پھر چونک کر بولی۔ ''اوہ معاف کیجیے گا، باتوں باتوں میں، میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی کہ آپ چائے لیں گے یا ٹھنڈا؟ بیگم چغتائی نے اپنی آمد تک مجھے آپ کا خیال رکھنے کی خصوصی ہدایت کی ہے۔''

''زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے پلوا دیجیے۔'' منصور نے پوری گفتگو میں پہلی بار معقول جواب دیا۔

''زحمت کیسی؟ میں ابھی لائی۔'' عقیلہ رحیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہم اس ادارے میں رہنے والے ہر فرد کے مہمان کو اپنا مہمان تصور کرتے ہیں اور بیگم چغتائی کی تو بات ہی اور ہے۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

منصور سر کھجانے لگا۔ عقیلہ رحیم خاصی باتونی معلوم ہوتی تھی اور اپنے ادارے کے متعلق خاصی جذباتی بھی۔ جو بات وہ محسوس نہ کر سکا، وہ یہ تھی کہ عقیلہ رحیم کو اس سے بات کرنے سے زیادہ اپنی بات سنانے میں دلچسپی تھی۔ اگر منصور کی جگہ اس صوفے پر کوئی مجسمہ بھی براجمان ہوتا تو شاید وہ اس سے بھی اسی روانی سے باتیں کرتی چلی جاتی۔ یہ البتہ اس نے ضرور محسوس کیا تھا کہ عقیلہ رحیم سے گفتگو کے دوران اسے زبان ہلانے کا موقع کم ہی ملا تھا۔ وہ اپنے آپ میں تھوڑا سا شرمندہ ہوا تھا۔ ٹھیک ہے کہ آلاتِ صوت و آہنگ کے بے دریغ استعمال میں مرد، خواتین کی برابری نہیں کر سکتے لیکن ایسا بھی کیا کہ اپنی سی کوشش بھی نہ کی جائے۔ ایک

وکیل ہونے کی حیثیت سے اسے لفظی جادوگری کا ماہر ہونا چاہیے۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اس مرتبہ عقیلہ رحیم کے شروع ہونے سے پہلے ہی خود ہلا بول دے گا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عقیلہ رحیم جیسے پہلے ہوا کی طرح آئی اور گئی تھی، تھوڑی دیر بعد اسی طرح دروازہ کھول کر جھپاک سے اندر آگئی۔ اس مرتبہ وہ اکیلی نہیں تھی۔ ایک ملازمہ بھی چائے کی ٹرے اٹھائے اس کے ساتھ تھی۔ ملازمہ ٹرے رکھ کر خاموشی سے واپس ہوگئی تو عقیلہ رحیم نے کہا۔ ''مجھے زیادہ دیر تو نہیں لگی؟''

''بالکل نہیں۔'' منصور نے کہا۔ ''مجھے تو یوں لگا کہ جیسے آپ ابھی گئی تھیں اور ابھی آگئیں۔''

''کہیں میں آپ کے سر پر تو سوار نہیں ہو رہی؟'' عقیلہ نے ایک غیر متوقع سوال کردیا۔

منصور گڑبڑا گیا۔ اس کے بے ضرر سے جواب کو شاید عقیلہ نے طنز تصور کرلیا تھا۔ ''کیسی بات کررہی ہیں آپ۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کی وجہ سے تو میں بیٹھ گیا ہوں ورنہ کسی نئے کلائنٹ کا اتنی دیر انتظار کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا۔''

عقیلہ کچھ نہ بولی، خاموشی سے چائے بنانے لگی۔

منصور دہری کامیابی پر خوش ہوا۔ ایک طرف تو اس نے عقیلہ کو معقول جواب دیا تھا، دوسری جانب اپنی عدیم الفرصتی کا تذکرہ کرکے اپنا شخصی تاثر بھی اجاگر کیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بھرپور اور اہل وکیل ہونے کا تاثر ان لوگوں پر چھوڑے، بیگم چغتائی کے کام کو خوش اسلوبی سے ہینڈل کرے اور اپنے بڑوں کی نظروں میں سرخرو ہوکر دونوں فریقین سے داد بٹورے۔ معاشی اور ذہنی لحاظ سے وہ زندگی کے اس حصے میں تھا جہاں انسان کے لیے روپے پیسے سے زیادہ ستائشی کلمات اہمیت رکھتے ہیں۔ زندگی کے مادی مسائل کی اہمیت ان پر ذرا بعد میں کھلتی ہے۔

عقیلہ رحیم چائے بنا رہی تھی۔ اس کی توجہ بٹی ہوئی دیکھ کر منصور نے موقع غنیمت جانا اور بات آگے بڑھائی۔ ''کچھ دیر پہلے آپ نے کہا تھا کہ بیگم چغتائی کی بات آپ کی نگاہ میں خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''

''وجہ بالکل سیدھی سی ہے۔'' عقیلہ نے کہا۔ ''چینی کتنی لیں گے آپ؟''

''جی...... ایک چمچ۔''

''ہاں، تو میں کہہ رہی تھی کہ وجہ بالکل سیدھی سی ہے۔'' عقیلہ رحیم نے کپ میں چینی انڈیلتے ہوئے کہا۔ ''یہ ادارہ ایک ٹرسٹ کے تحت چلایا جارہا ہے اور وہ ٹرسٹ بیگم چغتائی کے والد نے قائم کیا تھا۔''

''اوہ!'' منصور کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اسے بروشر کے مندرجات یاد آگئے تھے۔ ''تو شوکت چغتائی، شاہانہ چغتائی کے والد تھے۔'' اس نے سوچا۔ دونوں کا چغتائی ہونا تو اس نے پہلے بھی نوٹ کیا تھا لیکن اس طرف اس کا ذہن نہیں گیا تھا۔

عقیلہ رحیم کی بات جاری تھی۔ ''اپنی موت سے پہلے انہوں نے دو سال خود بھی یہیں گزارے تھے۔ ان کی وفات یہیں پر ہوئی تھی۔''

''لیکن ایسے امیر کبیر آدمی کو اپنا آخری وقت یہاں گزارنے کی کیا ضرورت تھی؟'' یہ سوال منصور کے منہ سے خود بخود نکل گیا۔ اسے واقعی حیرت ہورہی تھی۔

''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' عقیلہ رحیم نے کندھے اچکائے۔ ''یہ بات غالباً چالیس، پینتالیس سال پہلے کی ہے اور مجھے یہاں ملازمت کرتے ہوئے فقط چند سال ہوئے ہیں بلکہ یوں سمجھیے کہ میں نے اور بیگم چغتائی نے یہاں اکٹھے ہی قدم رکھا تھا۔ چھ سال پہلے کی بات ہے مجھے یہاں ملازمت ملی اور ایک ہفتے بعد بیگم چغتائی یہاں آگئیں۔''

''آپ نے کبھی بیگم چغتائی سے پوچھا نہیں اس بارے میں؟'' منصور نے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''کبھی خیال ہی نہیں آیا۔'' عقیلہ رحیم نے کہا۔ ''ہاں ایک دفعہ...... یہ ضرور پوچھا تھا کہ بیٹے اور بہو کے ہوتے ہوئے انہیں یہاں آنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ظاہر ہے یہ ادارہ تو ایسے افراد کے لیے ہے جو بے آسرا ہیں۔''

''پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟'' منصور نے دلچسپی سے پوچھا۔

''انہوں نے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کی زندگی میں بے جا طور پر دخل انداز نہیں ہونا چاہتیں۔'' عقیلہ رحیم نے بتایا۔ ''یہاں آنے سے ایک سال پہلے ان پر فالج کا اٹیک ہوا تھا اور اس کے بعد سے انہیں مستقل توجہ کی ضرورت رہنے لگی تھی۔ بیٹا کاروبار میں پھنسا رہتا تھا اور بہو کی کچھ سوشل مصروفیات تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ ان کے معمول کو اپ سیٹ کرکے اپنا پابند بنانا زیادتی ہوگی، چنانچہ وہ یہاں آگئیں۔ یہاں انہیں ہمہ وقت توجہ بھی میسر ہے اور ہم عمروں کا ساتھ بھی ملتا رہتا ہے۔''

"خاصی باہمت خاتون ہیں۔" منصور نے ستائشی انداز میں کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔" عقیلہ نے تائید کی۔ "شوہر کی اچانک وفات کے بعد جس قسم کے حالات سے وہ گزری ہیں، ان کا مقابلہ کرنا انہی کا جگرا ہے۔"

منصور اس ان دیکھی ہستی سے متاثر ہونے لگا تھا۔ بیگم چغتائی کی شخصیت ابھی تک اس کے لیے بے چہرہ تھی لیکن اس کا تصور اس بے چہرہ شخصیت کے گرد ایک نورانی ہالہ پھیلا رہا تھا۔ جو لوگ خود کچھ کر دکھانے کی شدید خواہش رکھتے ہیں، وہ ایسی شخصیات کو فوراً سے پیشتر اپنا رول ماڈل بنا لیتے ہیں۔ منصور کی کیفیت بھی اس وقت کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔

"چائے لیجیے، منصور صاحب۔" عقیلہ رحیم نے اس کے خیالات کا تسلسل ابتدا میں ہی توڑ دیا۔ منصور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ عقیلہ نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"آپ نے اپنے لیے چائے نہیں بنائی؟" منصور نے پوچھا۔

"نہیں شکریہ!" عقیلہ رحیم نے کہا۔ "میں آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے ہی چائے پی چکی ہوں۔ ویسے بھی بیگم چغتائی آنے والی ہوں گی۔ وہ شاید آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہیں۔"

اور اسی وقت جیسے عقیلہ رحیم کے اندازے کی تصدیق میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی پھر دروازہ کھلا اور تھوڑی دیر پہلے چائے لانے والی خادمہ ایک وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

منصور کو غائبانہ طور پر بیگم چغتائی کی ہستی سے متاثر ہوا تھا لیکن ان کی بے چہرہ شخصیت کو خدوخال سے مزین کرنے کی اسے مہلت نہیں ملی تھی اور شاید یہ اچھا ہی ہوا تھا۔ ایک متاثر کن شخصیت کے حوالے سے وہ ان کا جو بھی خاکہ بناتا، وہ یقیناً حسین رنگوں سے سجا ہوا ہوتا اور بیگم چغتائی کی بے رنگ شخصیت حسن سے یکسر خالی تھی۔ دلکش تصورات کے وہ محل جو منصور نے ابھی کھڑے بھی نہیں کیے تھے، بیگم چغتائی کی صورت دیکھ کر وجود میں آنے سے پہلے ہی عدم کو نکل بھاگے۔

بیگم چغتائی کی عمر ویسے تو ستر سے متجاوز تھی لیکن وقت کی شکست و ریخت نے اس عمارت کو کچھ زیادہ ہی بری طرح ڈھا دیا تھا۔ جھریوں بھرا چہرہ، تنگ اور قدرے ابھرا ہوا ماتھا، جس سے اوپر تھوڑی دیر پہلے کے غسل سے بھیگ کر خشک ہوتے ہوئے ڈھائی بالوں کا پلستر تھا۔ استخوانی جسم پر سفید ریشم کی ساڑھی یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے مردے کے جسم پر کفن۔ فالج کے زیر اثر دایاں بازو پہلو سے چپک گیا تھا۔ دائیں آنکھ خفیف سی جھری کی صورت وا تھی لیکن چمک اور نور سے محروم۔ پتھرایا ہوا جبڑا دائیں طرف سے قدرے ٹیڑھا تھا جس سے بادی النظر چہرہ پچکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اپنی زندگی میں پہلی دفعہ منصور نے ایسی صورت دیکھی تھی جس نے ایک سیکنڈ میں اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ بوکھلاہٹ کے عالم میں اٹھ کھڑے ہونے کی کوشش میں کپ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا تھا۔

خادمہ وہیل چیئر کو چلاتے ہوئے آگے لائی اور منصور کے سامنے کھڑی کر کے انہی قدموں پر واپس ہو گئی۔ عقیلہ رحیم خاموشی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑی ہو گئی تھی۔ بیگم چغتائی کا رخ آہستہ آہستہ اس کی طرف ہوا۔ ان کے ہونٹ دائیں طرف سے چپکے ہوئے تھے اور حرکت سے قاصر چنانچہ منہ کا بایاں گوشہ حرکت میں آیا، کھلا اور غرغراتی ہوئی تقریباً ناقابل فہم آواز برآمد ہوئی۔

عقیلہ رحیم نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ منصور کی سمجھ میں خاک نہیں آیا تھا کہ بیگم چغتائی نے اسے کیا ہدایت کی ہے۔ جب وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تو منصور کو پتا چلا کہ بیگم چغتائی نے اسے باہر جانے کو کہا تھا۔ وہ ابھی تک بیگم چغتائی کی دید کے دھچکے سے سنبھل نہیں سکا تھا۔ ساکت کھڑا عقیلہ رحیم کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اسے احساس ہوا کہ عقیلہ رحیم کے جانے کے بعد بیگم چغتائی کی اکلوتی متحرک آنکھ اس پر مرکوز ہو گئی ہے۔

ان کے نصف زندہ دہانے نے ایک دفعہ پھر حرکت کی۔ ان کے حلق کی گہرائی سے ایک آواز نکلی۔ منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ پانی میں سر ڈبوئے، دور کے ڈھول سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اتھلے پانی میں تیرتی ہوئی مچھلی کو باہر کی آوازیں یقیناً کچھ اسی طرح سنائی دیتی ہوں گی۔ وہ کچھ سمجھ نہ پایا، احمقوں کی طرح کھڑا بیگم چغتائی کی شکل دیکھتا رہا۔

بیگم چغتائی کے منہ کا بایاں گوشہ کھنچ سا گیا تھا۔ دہانے کے گرد کھنچی ہوئی لکیروں کا جال متلاطم ہوا اور ہولے ہولے تھرتھرانے لگا۔ وہ مسکرا رہی تھیں یا اپنے تئیں مسکرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے منہ سے الفاظ تو خیر کیا، ان کا قیمہ ایک دفعہ پھر برآمد ہوا اور رفتہ رفتہ سنبھلتا ہوا، آپے میں آتا ہوا منصور کسی حد تک ان کی بات سمجھنے میں

کامیاب ہو گیا۔ بیگم چغتائی اسے بیٹھنے کو کہہ رہی تھیں۔

خود پر قابو پا کر وہ بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں بیگم چغتائی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ نظارہ کوخوشگوار نہ سہی مگر مسحور کر لینے والا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دیو مالائی کہانیوں کا کوئی کردار زندہ ہو کر اس کے سامنے آ بیٹھا ہو۔ آدھا پتھر، آدھا گوشت پوست، آدھا جیتا جاگتا اور متحرک، آدھا جامد اور بے جان۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عملی زندگی کے پہلے موڑ پر ہی اس کا سابقہ ایسی ہستی سے پڑے گا جسے دیکھ کر ایک لمحے کو بصارت پر سے اعتبار اٹھ جائے گا جو حقیقی ہوتے ہوئے بھی غیر حقیقی معلوم دے گی۔

پھر اچانک اسے یاد آ گیا کہ وہ یہاں بیگم چغتائی کو گھورنے نہیں بلکہ ایک پیشہ ورانہ فریضہ انجام دینے آیا تھا۔ یکایک وہ حقیقت کی دنیا میں آ گیا۔ بیگم چغتائی کی صورت و شخصیت جیسی بھی تھی، وہ اس کی ہونے والی موکلہ تھی۔ وہ ان کی زندگی کے ایک اہم کام کا بیڑا اٹھانے آیا تھا۔ اسے یوں گم صم پا کر وہ اس کے متعلق کیا رائے قائم کریں گی۔ شخصی تاثر......! اور وہ ہوش میں آ گیا۔

لکیروں کا جال اب بھی ہولے ہولے تھرتھرا رہا تھا۔ بیگم چغتائی یقیناً اس کی کیفیت سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ ان کا ردعمل اپنی نوعیت کے اعتبار سے خاصا انوکھا تھا۔ اکثر لوگ اپنی شکل و صورت کے متعلق دوسروں کے منفی تاثر کو دل پر لے لیتے ہیں۔ افسردہ خاطر ہو جاتے ہیں یا زبان چلانے پر اتر آتے ہیں۔ بیگم چغتائی کا ردعمل مختلف اور مثبت تھا۔ اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ تجربات کی بھٹی میں پک کر ان کا شعور اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ایسی سطحی اور کسی حد تک ناگزیر باتوں پر انہیں رنج نہیں ہوتا تھا یا گزشتہ سات سال سے اپنی صورت پر دوسروں کا ردعمل دیکھ کر انہیں اس کی عادت ہو گئی تھی۔ دونوں صورتوں میں نتیجہ بہرحال مثبت ہی نکلا تھا۔

''معافی چاہتا ہوں بیگم صاحبہ! دراصل......'' منصور نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی لیکن بیگم چغتائی نے ہاتھ کے اشارے سے اس کی بات کاٹ دی۔

''خواہ مخواہ پریشان مت ہو، مسٹر منصور۔'' انہوں نے حسب سابق الفاظ کا قیمہ کیا۔ ''میں ایسی باتوں کا برا نہیں مناتی۔''

منصور نے سر ہلایا۔ ''انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔''

''لیکن انسان ایسا ہوتا نہیں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''آپ خود ہی بتائیے کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے، آپ کی صورت کسی ناگہانی حادثے میں بے صورت ہو جاتی تو کیا آپ تقدیر کی یہ زیادتی خوش دلی سے قبول کر لیتے؟'' وہ مسلسل بات نہیں کر سکتی تھیں۔ چہرے کے عضلات کو حرکت میں لانا یقیناً ان کے لیے ایک تکلیف دہ عمل رہا ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بات رک رک کر ادا کرتی تھیں۔ منصور کی سماعت ان کے لہجے سے تیزی سے ہم آہنگی حاصل کر رہی تھی اور اب وہ ان کی بات پہلے سے کہیں بہتر انداز میں سمجھ رہا تھا۔

''قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔'' اس نے محتاط انداز میں کہا۔

''یہی ساری بات ہے۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''جبر اور اختیار کا مسئلہ...... اگر تقدیر کوئی جبر کرتی ہے تو یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ اسے رو کر قبول کریں یا ہنس کر۔ میں ہنس تو نہیں سکتی لیکن اتنا ہے کہ روتی بھی نہیں۔'' منصور کچھ اور متاثر ہوا، بیگم چغتائی کی بات جاری تھی۔

''بیماری اور تندرستی ایسے عوامل ہیں جن پر ہمارا اختیار بہت کم ہوتا ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میرے کڑھنے اور غم زدہ ہونے سے میرے مفلوج بدن میں جان نہیں پڑے گی۔ میں اپنی جسمانی حالت کا ذمے دار کسی کو نہیں ٹھہرا سکتی۔''

منصور یہ جواب سن کر تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا۔ بیگم چغتائی کی جسمانی حالت نے بے شک اسے 440 وولٹ کا جھٹکا دیا تھا لیکن ان کی باتوں نے جھٹکے کا اثر بڑی حد تک زائل کر دیا تھا۔

''ماشاء اللہ بڑی اعلیٰ سوچ رکھتی ہیں آپ۔'' اس نے آخر کار کہا۔

بیگم چغتائی کا سر ایک دفعہ جھکا پھر اوپر کو گیا۔ وہ منصور کے ستائشی کلمے کو قبول کر رہی تھیں پھر انہوں نے کہا۔ ''آپ کی بات اپنی جگہ درست لیکن بہرحال میں ایک انسان ہوں۔ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر رنج اور تکلیف محسوس کرنا اور اس کا بدلہ چکانے کی خواہش رکھنا بہ حیثیت انسان میری فطرت ہے۔ تقدیر سے تو میں نہیں لڑ سکتی لیکن اگر کسی انسان کی طرف سے مجھ پر کوئی ظلم اور زیادتی ہو تو اس کا حساب بے باق کرنے کی کوشش تو کر سکتی ہوں۔ آپ کو یہاں میں نے اسی لیے بلوایا ہے۔''

منصور کے چہرے پر الجھن نمودار ہوئی۔ ''میرے علم کے مطابق آپ شاید اپنی وصیت تیار کروانا چاہتی ہیں۔''

''آپ کو یہاں بلوانے کا بنیادی مقصد تو یہی ہے۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''لیکن ایک بات اور بھی ہے

جس کا تذکرہ فون پر قطعی مناسب نہ رہتا۔ میں چاہتی تھی کہ آپ سے آمنے سامنے تفصیلی گفتگو ہو جائے تاکہ میں معاملے کی اچھی طرح وضاحت کر سکوں۔"

"جی، میں سن رہا ہوں۔"

"بات شاید آپ کے لیے کچھ غیر متوقع ہو۔" بیگم چغتائی نے کہا۔"یوں سمجھ لیجیے کہ میں کسی سے بدلہ لینا چاہتی ہوں۔"

منصور کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ ایک لمحے کو وہ بھول گیا کہ اسے یہاں کیا کہہ کر بلوایا گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی ہنگامہ خیز ناول کا کردار بن گیا ہے۔ وہیل چیئر کی قیدی بڑھیا، بدطینت ولن، سچائی کا علمبردار نوجوان یعنی وہ خود۔

اس کے ہونٹ خود بخود ہلے۔"کس سے بدلہ لینا چاہتی ہیں آپ؟"

"ان لوگوں سے جن کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچی ہوں۔"

"کون لوگ ہیں وہ؟"

"میرا بیٹا اور میری بہو۔" بیگم چغتائی نے کہا۔

منصور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بات واقعی اس کے لیے غیر متوقع تھی۔"آپ کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گی؟"

"تفصیل بہت عام سی ہے۔" بیگم چغتائی نے کہا۔ "آپ نے ایسے واقعات سنے ہوں گے اور شاید دیکھے بھی ہوں۔ میری بہو کو اور اس کی نسبت سے میرے بیٹے کو گھر میں میرا وجود ناگوار گزرتا تھا اس لیے میری بیماری کا بہانہ بنا کر مجھے یہاں پہنچا دیا گیا۔"

"آئی سی۔" منصور نے کہا۔"آپ ان کے خلاف کیس کرنا چاہتی ہیں؟"

"نہیں، میں اس ملک میں قانونی عمل کی رفتار سے واقف ہوں۔ ایسے کسی کیس کی شنوائی ہونے کی نوبت آنے تک عین ممکن ہے میں اگلے جہان پہنچ چکی ہوں۔" بیگم چغتائی نے کہا۔"اور کیس کرنے کی ضرورت بھی، میرے خیال میں پیش نہیں آئے گی۔"

"تو پھر؟"

بیگم چغتائی نے ایک لحظہ توقف کیا پھر بولیں۔"آگے بڑھنے سے پیشتر میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔"

"فرمایئے؟"

بیگم چغتائی کی اکلوتی متحرک آنکھ کمرے کے در و دیوار پر گھوم گئی۔"مجھے اس جگہ آئے چھ سال ہو چکے ہیں۔ پہلا ایک سال میں نے امید و بیم کی کشمکش میں گزارا کہ شاید میرے بیٹے کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے شاید وہ اس...... اس تکلیف کا ازالہ کر دے جو اس کے ہاتھوں مجھے پہنچی ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بیٹے کی مرضی یہی ہے کہ میں ان دیواروں میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں۔ تب میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اس کی خواہشات کا لقمۂ تر نہیں بنوں گی۔ شوہر کی وفات کے بعد ساری پراپرٹی اور کاروبار میرے نام منتقل ہو گیا تھا۔ آج بھی ہر چیز میرے نام ہے۔ میرے بیٹے نے میری مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھ سے ایک جنرل پاور آف اٹارنی پر انگوٹھا لگوا لیا اور ہر چیز کا مختار بن بیٹھا لیکن اس پاور آف اٹارنی کو منسوخ کرنے کا اختیار میرے پاس آج بھی ہے۔ اس مقصد کے لیے مجھے قانونی مدد کی ضرورت تھی اور یہ مدد حاصل کرنے کی کوشش میں، میں نے پچھلے پانچ سال میں آٹھ وکیلوں سے رابطے قائم کیے۔ آپ سے پہلے آٹھ وکیل یہاں سے ہو کر جا چکے ہیں۔ آپ یہاں آنے والے نویں وکیل ہیں۔"

منصور کی بھویں سکڑ گئیں۔"اور وہ آٹھ وکیل کہاں گئے؟"

لکیروں کا جال ایک بار پھر متلاطم ہوا۔ بیگم چغتائی مسکرا رہی تھیں لیکن اس مرتبہ اس ادھوری مسکراہٹ میں تلخی کا مکمل تاثر تھا۔

"ان میں سے کوئی ایک بھی واپس نہیں آیا۔" انہوں نے کہا۔

"جی......" منصور نے شدید حیرت کے عالم میں کہا۔"کوئی ایک بھی واپس نہیں آیا؟"

"جی ہاں، ایک بھی نہیں۔" بیگم چغتائی نے تصدیق کی۔

"لیکن اس کی وجہ؟"

"میں نہیں جانتی۔" بیگم چغتائی نے کہا۔"اور میرے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ میں نے ان سے دوبارہ رابطہ قائم کیا۔ ایک نے مصروفیت کا بہانہ بنایا۔ چار نے اپنی سیکریٹریز کے ذریعے ٹال دیا اور تین ایسے تھے جنہوں نے کوئی وجہ بتائے بغیر سیدھا سیدھا انکار کر دیا۔"

"لیکن کیوں؟ آخر کوئی تو وجہ ہو گی۔" منصور کی حیرت اور بڑھ گئی۔

"میں نے کہا نا، اگر کوئی وجہ تھی بھی تو مجھے اس کا علم

نہیں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔'' اگر میری براہِ راست ان سے بات ہوئی ہوتی تو شاید کچھ پتا چل سکتا لیکن اس حالت میں......''

''آپ نے خود رابطہ نہیں کیا تھا ان سے؟''

لکیریں پھر تھر تھرائیں۔'' جب سامنے بیٹھ کر بھی آپ کو میری بات سمجھنے میں اتنی مشقت کرنا پڑ رہی ہے تو فون پر کسی کے کچھ سمجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا بات کرنا بالکل لاحاصل تھا۔''

''اوہ معافی چاہتا ہوں۔'' منصور نے جلدی سے کہا۔'' پھر آپ کی جگہ رابطہ کون کیا کرتا تھا؟''

''جس نے آپ سے رابطہ کیا تھا۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔'' عقیلہ!''

''مس عقیلہ کی یہاں کیا پوزیشن ہے؟'' منصور نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

''مسز عقیلہ!'' بیگم چغتائی نے تصحیح کی۔'' عقیلہ یہاں ڈے ٹائم سپروائزر ہے۔ ہم دونوں نے آگے پیچھے ہی اس جگہ قدم رکھا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے اسے میرے لیے ہی یہاں بھیجا تھا۔ سپروائزر ہونے کی حیثیت سے حالانکہ اس کے سر پر بہت سی ذمے داریاں ہیں لیکن وہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس کی مستعدی اور تندہی دیکھ کر مجھے وہ دور یاد آجاتا ہے، جب میں گھر اور کاروبار کی ذمے داریاں ایک ساتھ سنبھالے ہوئے تھی۔ پھر وہ ہمیشہ اپنے کام سے کام رکھتی ہے اور میرے معاملات میں کبھی بے جا دخل اندازی نہیں کرتی۔ اس کی کم گوئی مجھے بہت پسند ہے۔''

عقیلہ رحیم اور کم گو...... منصور کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گدی پر کسی نے تھپکی دی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی مسکراہٹ پر قابو پایا تھا۔

بیگم چغتائی کی بات جاری تھی۔'' بے چاری بہت مجبور ہے۔ شوہر دل کا مریض ہے، زیادہ کام نہیں کرسکتا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی گریجویشن کر رہے ہیں اور چھوٹا بیٹا پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ میں ہے۔ اوپر سے آج کے دور کی مہنگائی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ یہ بوجھ کیسے اٹھاتی ہوگی۔ میں اپنے ماہانہ الاؤنس سے کچھ رقم دے دیا کرتی ہوں حالانکہ وہ خاصی جھجک کا مظاہرہ کرتی ہے ہر بار۔''

بیگم چغتائی کے لہجے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ عقیلہ رحیم کو بہت پسند کرتی ہیں لیکن منصور کو بھلا اس سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ بات دوسری طرف نکلتی دیکھ کر اس کی سمجھ میں کچھ اور نہ آیا تو اس نے یونہی بیگم چغتائی کی بات اچک لی۔'' آپ کو ماہانہ الاؤنس ملتا ہے؟''

افراتفری میں چلایا ہوا تیر نشانے پر بیٹھا۔ بیگم چغتائی کا بھٹکتا ہوا ذہن کھٹ سے راہِ راست پر آگیا۔ ایک لمحے کو وہ چپ رہیں جیسے غیر ارادی طور پر منہ سے نکل جانے والی اس حقیقت کا دانستہ اظہار ان کے لیے تکلیف دہ ہو۔ منصور اس تکلیف کو سمجھنے سے قاصر تھا کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ جب دینے کے عادی لوگوں کو کسی سے کچھ لینا پڑے تو انہیں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ بیگم چغتائی گفتگو کی رو میں بہہ کر یہ بات بتا تو بیٹھی تھیں لیکن اس پر مزید لب کشائی کے لیے انہیں اپنی ہمت مجتمع کرنا پڑ رہی تھی۔

''جی ہاں، ماہانہ الاؤنس۔'' بالآخر انہوں نے کہا۔'' میرے فرمانبردار، خدمت گزار بیٹے نے میرے آرام و آسائش کی خاطر دس ہزار روپے ماہانہ الاؤنس یعنی وظیفہ مقرر کر رکھا ہے۔ جب میں چغتائی انٹرپرائز کی ورکنگ مینجنگ ڈائریکٹر تھی تو اپنے جنرل منیجر کے اسسٹنٹ کو اس سے زیادہ تنخواہ دیا کرتی تھی۔''

منصور دولت مندی کے اس اظہار سے متاثر ہوا لیکن یہ نوٹس نہ کرسکا کہ یہ جملے ادا کرتے ہوئے بیگم چغتائی کے لہجے میں کیسی تیز دھار اتر آئی تھی۔

قدرے توقف کے بعد بیگم چغتائی نے کہا۔'' مجھے اپنے بیٹے سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوتی۔ آخر میرے بعد یہ سب اسی کا تو ہے۔ اگر وہ میری زندگی میں ہی اپنا حق طلب کرتا تو شاید میں انکار بھی نہ کرتی۔ مجھے افسوس ہے اور غصہ ہے تو صرف اس بات کا کہ میرے بیٹے نے یہ سب کچھ اپنی مرضی کے تحت نہیں بلکہ اپنی بیوی کے اشاروں پر ناچتے ہوئے کیا۔''

تھوڑی دیر پہلے بیگم چغتائی کو دیکھ کر منصور یہ سمجھا تھا کہ اس سے زیادہ بدصورت چہرہ اس نے کبھی نہیں دیکھا لیکن جب غیظ نے اس جزوی مسخ چہرے کے خدوخال میں اتر کر اسے کلی مسخ کرنا شروع کیا تو اس پر انکشاف ہوا کہ جیسے حسن کی کوئی انتہا نہیں، ویسے بدصورتی بھی لاانتہا ہے۔

بیگم چغتائی کے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے تھے، غصے سے ان کا بدن ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا۔ سانس برقی آری کی طرح چلنے لگی تھی اور ضبط کرنے کی کوشش میں گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔ اپنی بہو کے لیے ان کے دل میں جو نفرت تھی، منصور اس کی زہرناکی کا تھوڑا بہت اندازہ کرسکتا تھا۔ بیگم چغتائی کی متغیر حالت دیکھ کر اسے تشویش

لاحق ہونے لگی۔ اس نے تیزی سے کہا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا، بیگم صاحب؟''

بیگم چغتائی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی اور وہیل چیئر کے ہتھے پر لگا ہوا بٹن دبا دیا۔ پائے کے ساتھ جڑا ہوا بزر چیخا تو پہلی بار منصور کی نگاہ اس پر پڑی اور اسے پتا چلا کہ وہیل چیئر کے پائے کے ساتھ ایک بیٹری پاورڈ بزر لگا ہوا ہے۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور عقیلہ رحیم اندر آ گئی۔ بیگم چغتائی کی حالت دیکھ کر وہ ایک لفظ کہے بغیر الٹے قدموں باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئی تو اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا جس پر ڈھکی پرچ پر زرد رنگ کی ایک گولی نظر آ رہی تھی۔ منصور گولی کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کے والد بھی اپنے بلڈ پریشر کو اعتدال پر لانے کے لیے یہ گولیاں کھایا کرتے تھے۔

عقیلہ رحیم نے گولی بیگم چغتائی کے منہ میں ڈال کر گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پورے جسم سے ان پر جھکی ہوئی تھی اور دھیمے سروں میں کچھ کہہ رہی تھی۔ منصور یہ تو نہ سن پایا کہ عقیلہ رحیم کیا کہہ رہی ہے لیکن بیگم چغتائی کی حالت بہتر ہوتے دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ عقیلہ رحیم کے الفاظ انہیں پرسکون کرنے کا سبب بنے ہیں۔ پتا چلتا تھا کہ عقیلہ رحیم، بیگم چغتائی کے مزاج سے بہت اچھی طرح آشنا ہے اور یہ بھی کہ بیگم چغتائی اسے خود سے بہت قریب تصور کرتی ہیں۔

وہ خاموش بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بیگم چغتائی کے بدن کی لرزشیں تھمیں تو عقیلہ پھر باہر نکل گئی اور بیگم چغتائی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''آئی ایم سوری۔''

''اِٹس آل رائٹ۔'' منصور نے فوراً انگلستانی آداب کا تقاضا پورا کیا۔

''جب بھی اس عورت کا خیال آتا ہے، میرے تن بدن میں آگ کی سی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''میرے بیٹے کو اپنے جال میں پھنسا کر اس حرافہ نے ایسا باندھا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف مل بھی نہیں سکتا۔ میں نے فاران کو منع بھی کیا تھا...... مجھے اسی روز سے اس کے تیور پسند نہیں آئے تھے جب فاران اسے پہلی بار مجھ سے ملانے کے لیے لایا تھا۔ اس کے چہرے سے خرانٹ پن ٹپکتا تھا، وہ عمر میں بھی فاران سے بڑی تھی۔ تھوڑا بہت نہیں پورے پانچ سال کا فرق ہے۔

میں سمجھتی رہی کہ کچی عمر کا نشہ ہے چند دن میں فاران کے سر سے یہ بھوت اتر جائے گا لیکن وہ بھی جانتی تھی کہ میں نے اسے ناپسند کر دیا ہے اور میں اپنے گھر میں اس کا داخلہ کبھی برداشت نہیں کروں گی اسی لیے اس نے ایسا چکر چلایا کہ مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور فاران کورٹ میرج کر کے اسے گھر لے آیا۔ خاندان کی عزت کے خیال سے مجھے خاموش رہنا پڑا۔''

منصور خاموشی سے سنتا رہا۔ بیگم چغتائی گویا خود سے کہہ رہی تھیں۔ ''میں پھر بھی اسے برداشت کر لیتی لیکن پہلے روز سے ہی وہ میری جگہ لینے کے خواب دیکھنے لگی۔ خود کچھ کرنے کے قابل نہ تھی اس لیے فاران کو آگے کرنا چاہا۔ فاران میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ براہ راست مجھ سے ایسی بات کہہ سکتا کہ ماں بہت ہو چکی، اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر علیحدہ ہو جائیں...... لیکن میں بھی سمجھ رہی تھی۔ اس کی باتوں کے پوشیدہ معنی، اس کے ڈھکے چھپے اشارے کہ اب مجھے آرام کرنا چاہیے، اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور ڈھلتی صحت کو پیش نظر رکھ کر خود پر بوجھ کم کر لینا چاہیے۔ میں سب سمجھ رہی تھی...... میرا بیٹا، میرا خون مجھے مشورے دے رہا تھا کہ میں نے جس کاروباری سلطنت کو اپنا خون پلا کر پروان چڑھایا ہے، اسے چھوڑ کر ایک گوشے میں بیٹھ جاؤں تاکہ وہ اور اس کی شیطان بیوی من مانیاں کر سکیں۔ فاران کی عمر صرف دو سال تھی جب اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ انیس برس تک میں نے اپنے گھر اور اپنے شوہر کے بزنس کو سنبھالنے کے لیے راتوں کی نیند حرام کی۔ کوئی اس وقت کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتا جو فاران کے جوان ہونے تک مجھ پر گزرا۔ دفتر جاتی تو دل گھر میں اٹکا رہتا تھا کہ میرا بچہ نوکروں کے رحم و کرم پر گھر میں اکیلا ہے اور گھر آتی تو دفتر کی پریشانی لگی رہتی تھی۔ گھر اور باہر کی دنیا کو ملائے رکھنے کے لیے جس پل صراط پر میں چلتی رہی ہوں، جن کٹھنائیوں سے میں گزرتی رہی ہوں، کوئی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

منصور کا دل گھبرا رہا تھا۔ نیم خام ذہن کے اس نوجوان نے زندگی کا یہ روپ کبھی نہ دیکھا تھا۔ پہلی بار ایسی تلخی سے پالا پڑنے پر اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ ابھی وہ نہیں جانتا تھا کہ دنیا کیسی بے ڈھب جگہ ہے اور یہاں سنبھل کر نہ چلنے والا کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتا ہے۔ ابھی وہ ان حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار تو کیا آمادہ بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بیگم چغتائی کی موضوع سے ہٹی ہوئی گفتگو

اسے بے طرح گھبرائے دے رہی تھی۔
بیگم چغتائی بولتی رہیں۔ ان کی توجہ منصور سے یکسر ہٹی ہوئی، خلا میں کسی نقطے پر مرکوز تھی۔ ''جب تک میرا بس چلا ...... جب تک میں کسی قابل رہی، میں نے اس عورت کو قدم جمانے کا موقع نہیں دیا۔ اس کی ہر حرکت پر کڑی نگرانی رکھی۔ اس کے پچھلوں کو ان کی حد سے باہر نہیں نکلنے دیا لیکن جانے پھر کیوں قسمت نے میری طرف سے منہ موڑ لیا۔ فالج کے اٹیک نے مجھے بے دست و پا کر کے اس وہیل چیئر کا قیدی بنا دیا۔ چھ ماہ تک بستر سے اٹھنا تو کیا ہلنا بھی نصیب نہ ہوا۔ اس حالت میں فاران کے نام پاور آف اٹارنی کی دستاویز پر انگوٹھا لگانا پڑا تاکہ میری عدم موجودگی میں وہ بزنس کی دیکھ بھال کر سکے۔ اس وقت سے لے کر آج تک مجھے دفتر کی شکل دیکھنے کو نہیں ملی۔ ایک سال تک مجھے گھر پر ہی رکھا گیا پھر میری بہو نے فاران کو ایسی پٹی پڑھائی کہ اس نے مجھے گھر سے نکال کر یہاں لا ڈالا۔ میں مرتے دم تک وہ زہر بھری فاتحانہ مسکراہٹ نہیں بھول سکوں گی جو میں نے اپنی بہو کے ہونٹوں پر اس وقت دیکھی تھی جب مجھے یہاں منتقل کرنے کے لیے گاڑی میں لادا جا رہا تھا۔'' بیگم چغتائی کے نیم مفلوج منہ سے بہو کا لفظ کسی غلیظ گالی کی طرح نکلتا تھا۔ ''وہ دن اور آج کا دن، میں نے اس عمارت کے احاطے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ تمام احباب اور ملنے جلنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے یہاں آئی ہوں۔ فاران کبھی کبھی مجھے یہاں آکر مل جاتا ہے۔ میں نے کبھی اس سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں یہاں مطمئن ہوں۔ وہ نہیں جانتا کہ اگر مجھے اس کی رسوائی کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس حالت میں بھی اتنا شور مچاتی کہ پورا زمانہ میری آواز سنتا۔ اس کی عزت کے خیال سے چپ ہوں، گھر کی بات کو باہر نہیں نکلنے دیا۔ ویسے بھی اس مفلوج جسم کے ساتھ میں زندگی کی دوڑ میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہوں۔ میری عمر اب رہ ہی کتنی گئی ہے۔ شاید وہ بھی چپ چاپ کاٹ جاتی لیکن...... جب بھی مجھے اس عورت کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ نظر آتی ہے، فتح کا احساس یاد آتا ہے جو اس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا تو میں تڑپ کر رہ جاتی ہوں۔ فاران کی خاطر میں یہ قید، یہ توہین گوارا کر لیتی لیکن میں اس عورت کو اس گھر میں کبھی برداشت نہیں کروں گی...... کبھی نہیں۔'' بیگم چغتائی کا زندہ ہاتھ اس سختی سے وہیل چیئر کے ہتھے کو گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ ان کی پوروں سے سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ ''اسی لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ایسی وصیت تیار کر کے جاؤں گی کہ میرے مرنے کے بعد وہ بھی اس گھر میں نہ رہ سکے جہاں سے مجھے اس کی وجہ سے نکال دیا گیا۔''

''آپ نے پہلے کوئی وصیت تیار نہیں کی تھی؟'' منصور نے سوال کیا۔

''جب تک صحت مند تھی کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''پھر فالج کا اٹیک ہوا، اس کے بعد میں یہاں آگئی۔ اس کے بعد کیا ہوا، وہ میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں۔ مجھ سے مل کر جانے والا کوئی وکیل لوٹ کر واپس نہیں آیا۔''

''آپ کی بات میرے لیے خاصی حیران کن ہے۔'' منصور نے کہا۔ ''وکیل پروفیشنل لوگ ہوتے ہیں، ان کی طرف سے ایسی کوئی حرکت ناقابلِ فہم ہی قرار دی جا سکتی ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟'' بیگم چغتائی نے بے بسی کا اظہار کیا۔ ''نہ میری دوبارہ ان سے ملاقات ہوئی اور نہ مجھے کچھ پوچھنے کا موقع ملا۔''

منصور نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ''خیر چھوڑیے اس بات کو، آپ مجھے یہ بتائیے کہ اب آپ کی خواہش کیا ہے؟''

''میں اپنی وصیت لکھوانا چاہتی ہوں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔

''وصیت کے مندرجات کیا ہوں گے؟'' منصور نے استفسار کیا۔ ''آپ کے ذہن میں کوئی خاکہ ہے؟''

''ہاں۔'' بیگم چغتائی نے بزر کا بٹن دباتے ہوئے کہا۔ ''میں نے وصیت کا متن عقیلہ کو ڈکٹیٹ کروایا تھا۔ آپ وہ دیکھ لیجیے۔''

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے عقیلہ اندر آگئی تھی۔ بیگم چغتائی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''عقیلہ، ذرا میرے کمرے سے وصیت کے متن والے کاغذات لے آؤ۔''

''جی بہتر۔'' عقیلہ مختصر سا جواب دے کر پھر باہر نکل گئی۔ منصور کو اس کے انداز پر حیرت ہو رہی تھی۔ بیگم چغتائی کی آمد سے پہلے کے مختصر سے وقفے میں یہ خاتون اس کا آدھا مغز چاٹ گئی تھی اور اب یوں آ جا رہی تھی جیسے اس جیسی چپ چاپ، کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی خاتون دنیا میں کوئی اور نہ ہو۔ اس کے رویے کی یہ تبدیلی منصور کے لیے حیران کن تھی لیکن آج کا دن

ہی جانے کس رنگ میں چڑھا تھا کہ قدم قدم پر حیرتوں سے سامنا ہو رہا تھا۔

عقیلہ حسب سابق تھوڑی ہی دیر میں واپس آگئی۔ سرخ رنگ کی ایک آفس فائل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے فائل بیگم چغتائی کی طرف بڑھائی۔

''یہ منصور صاحب کو دے دو۔'' بیگم چغتائی نے اشارہ کیا۔

فائل منصور کے حوالے کر کے عقیلہ رحیم ایک بار پھر باہر نکل گئی۔ منصور فائل کھول کر اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ پہلے صفحے پر ایک ابطال نامے کی تحریر تھی جس کے ذریعے بیگم چغتائی نے اس جنرل پاور آف اٹارنی کو منسوخ کر دیا تھا جس کے بل پر ان کا بیٹا فاران چغتائی ان کے کاروبار اور اثاثہ جات کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کے بعد وصیت نامے کا متن شروع ہوتا تھا جس کی رو سے فاران چغتائی اپنے قانونی حق وراثت کے تحت بیگم چغتائی کی وفات کے بعد ان کے جملہ اثاثہ جات کا مالک ٹھہرتا تھا۔ ساتھ میں تمام چیزوں کی ایک اجمالی تفصیل تھی جو بیگم چغتائی کی موت کے بعد فاران کے حصے میں آنی تھیں۔ جملہ دستاویزات فل اسکیپ سائز کے چار صفحات پر مشتمل تھی۔ منصور اچنبھے کے عالم میں وصیت شروع سے آخر تک پڑھتا چلا گیا۔ کہیں بھی کسی قسم کی کوئی شرط، کوئی ابہام، کوئی خلاف معمول بات نہ تھی۔ منصور چکرا کر رہ گیا۔ آخر بیگم چغتائی کا مقصد کیا تھا؟

وصیت کے بعد آخری صفحے کی باری آئی اور یہ صفحہ منصور کی گڑبڑاہٹ میں مزید اضافہ کرنے کا موجب بنا۔ چند سطروں کی مختصر سی تحریر تھی۔ اس تحریر کی رو سے بیگم شاہانہ چغتائی نے اپنے بیٹے منصور چغتائی کو بوجہ نافرمانی و سرکشی اپنی تمام جائداد سے عاق کر دیا تھا اور اس کے کسی بھی آئندہ قول و فعل سے لاتعلقی کا اعلان کیا تھا۔

بات صاف ہونے کے بجائے مزید الجھ گئی۔ ایک طرف تو بیگم چغتائی اپنا تمام تر منقولہ و غیر منقولہ مال و اسباب اپنے بیٹے کے نام چھوڑے جا رہی تھیں اور دوسری طرف انہوں نے اپنے ہر دنیاوی اثاثے سے اس کا تعلق منقطع کر دیا تھا۔ آخر بیگم چغتائی کا مقصد کیا تھا؟

فائل بند کرتے ہوئے اس نے الجھی ہوئی نگاہوں سے بیگم چغتائی کی طرف دیکھا۔ ان کے نیم بگڑے چہرے پر اطمینان تھا۔ منصور کو اپنی طرف متوجہ پا کر ان کی آنکھیں چمکیں اور لکیروں کا جال ہولے سے تھرتھرایا۔ منصور کی حیرت یقیناً انہیں محظوظ کرنے کا باعث بنی تھی۔

منصور کے کچھ کہنے سے پہلے انہوں نے کہا۔ ''آپ کچھ الجھ گئے شاید؟''

منصور نے کچھ کہنے کے بجائے محض فائل سے اشارہ کرنے پر اکتفا کیا۔

''آپ کا ردعمل میرے لیے نیا نہیں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''ویسے آپ کا خیال کیا ہے؟''

''کس معاملے میں؟'' منصور نے کہا۔

''ان دستاویزات کے معاملے میں جو ابھی ابھی آپ کی نظر سے گزریں؟'' بیگم چغتائی نے فائل کی طرف اشارہ کیا۔

''ابطال نامہ تو ایک ضروری دستاویز ہے، اس کی غرض و غایت سمجھ میں آتی ہے۔'' منصور نے کہا۔ ''لیکن جہاں تک آپ کی وصیت اور اس عاق نامے کا سوال ہے، سچی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے متعلق ایک ہی فرد کی طرف سے، بیک وقت ان کا اجرا میرے سر سے گزر گیا ہے۔ یہ دونوں ایک اعتبار سے ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔ بیک وقت اپنے بیٹے کے نام تمام ترکہ چھوڑ کر جانے اور اسے اپنی تمام جائداد سے عاق کر دینے کی کوئی تک، اگر ہے تو میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''میں آپ کی ذہنی کیفیت بخوبی سمجھ رہی ہوں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''دراصل غلطی میری ہی ہے۔ گفتگو کی رو میں میرے منہ سے نکل گیا کہ میں اپنے بیٹے سے بھی انتقام لینا چاہتی ہوں۔ شاید لاشعوری طور پر میں اپنے مقصد کو زیادہ ڈرامائی بنا کر پیش کرنا چاہتی تھی۔ انصاف کی نظر سے، یا شاید ایک ماں کی نظر سے دیکھا جائے تو قصوروار میرا بیٹا نہیں، میری بہو ہے۔ میں اپنی بہو کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتی ہوں جو اس نے میرے ساتھ کیا۔''

''دوسرے لفظوں میں آپ چاہتی ہیں کہ جس گھر سے اس کی وجہ سے آپ کو نکال دیا گیا، وہ بھی اس گھر میں نہ رہ پائے۔'' منصور نے بیگم چغتائی کی کہی ہوئی بات دہرائی۔

''درست کہا آپ نے۔''

''اس کے باوجود......'' منصور نے ایک دفعہ پھر فائل کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں اس وصیت اور عاق نامے کی ایک جائی سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''میں اس کی وضاحت کرتی ہوں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں اپنے بیٹے کی تمام

ترخامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود آج بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔ میں بھی سوچ بھی نہیں سکتی کہ میری وجہ سے وہ ہر اس چیز سے محروم ہو جائے جو اس کا قانونی اور بنیادی حق ہے۔ اگر میرے بیٹے کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی تو مجھے مرنے کے بعد بھی چین نہیں ملے گا۔ اگر اس کے ہاتھوں میرے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی بھی تو اس میں کچھ قصور میرا بھی ہے۔ اگر میں اس کی پسند پر سمجھوتا کر لیتی تو شاید حالات یہ صورت اختیار نہ کرتے۔ میرے سخت رویے کی وجہ سے میرا بیٹا مجھ سے متنفر ہوتا گیا اور رہی سہی کسر اس عورت کی ریشہ دوانیوں نے پوری کردی۔ میرا حقیقی مجرم میرا بیٹا نہیں، اس کی بیوی ہے۔ جب وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے گی تو مجھے بھی سکون مل جائے گا۔"

"لیکن ان دستاویزات کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟" منصور نے اپنی آواز کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔ بیگم چغتائی کی باتوں نے بے چینی کا جو احساس پیدا کیا تھا وہ اب آہستہ آہستہ جھلاہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

"ان کا تعلق میرے بیٹے سے ہے۔" بیگم چغتائی نے کہا۔ "جب آپ ان دونوں دستاویزات کو تیار کروا کر میرے پاس لائیں گے تو ان پر دستخط کرنے سے پہلے میں اپنے بیٹے کو ان پر ایک نظر ڈالنے کا موقع دوں گی۔ فیصلے کا اختیار اس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اگر وہ میری بات تسلیم کر لیتا ہے تو میں وصیت نامے پر دستخط کر کے عاق نامے کی دستاویزات ضائع کر دوں گی۔ بصورت دیگر اگلے روز کے اخبار میں یہ عاق نامہ شائع ہو جائے گا۔"

"آپ کا مطالبہ کیا ہوگا؟"

"یہی کہ مجھے گھر واپس لے جائے اور میری آنکھوں کے سامنے اس عورت کو طلاق دے کر گھر سے نکال دے۔" بیگم چغتائی کا مسخ شدہ لہجہ بھی اتنا عام سا تھا کہ منصور کے منہ کا ذائقہ بدل گیا۔ بیگم چغتائی نے کتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔

قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ "اور اگر آپ کے بیٹے کا ردعمل آپ کی توقع کے برعکس نکلا؟"

لکیروں کا جال پھر تلاطم آشنا ہونے لگا۔ "میں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں منصور صاحب۔ اگر وہ دل کا اتنا مضبوط ہوتا تو نوبت یہاں تک کبھی نہ پہنچتی۔ وہ اس آرام و آسائش کی زندگی سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کی طرف سے پاور آف اٹارنی کی منسوخی کا نوٹس ملتے ہی وہ میرے پاس دوڑا چلا آئے گا۔ ممکن ہے میری طرف... آنے سے پہلے وہ آپ سے ملاقات کرنا پسند کرے۔ مجھے امید ہے کہ آپ ایسے کسی سرپرائز وزٹ کے لیے ذہنی طور پر تیار رہیں گے۔"

منصور نے ہاتھ جھٹکا جیسے ایسے وزٹس سے نمٹنا اس کے معمول کا حصہ رہا ہو۔ "آپ اس کی پروا مت کیجیے۔" اس نے کہا۔ "ان دستاویزات کی تکمیل کے لیے ہمیں دو گواہوں کی ضرورت ہوگی۔ آپ کے پاس ایسے افراد موجود ہیں۔"

"مل جائیں گے۔" بیگم چغتائی نے کہا۔ "اس ادارے کے اسٹاف سے ہی مل جائیں گے۔"

منصور نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور چونک گیا۔ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ بیگم چغتائی سے باتوں میں کتنا وقت گزر گیا ہے۔ اس نے اپنا چرمی ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے وکالت نامہ نکالا۔ "آپ اس پر دستخط کر دیجیے۔" اس نے بیگم چغتائی سے کہا اور جیب سے قلم نکالنے لگا لیکن بیگم چغتائی نے اسے روک دیا۔

"اسے رہنے دیجیے۔ اگر انک پیڈ ہو تو وہ دیجیے۔ میں دستخط نہیں کر سکتی۔ انگوٹھا لگانا پڑے گا، وہ بھی بایاں۔"

ہر نئے موکل سے ملنے کے لیے جاتے وقت ایسے لوازمات ساتھ لے کر جانا وکلا کا دستور ہوتا ہے۔ منصور نے خاموشی سے انک پیڈ نکال کر کھولا اور وکالت نامے سمیت بیگم چغتائی کے سامنے رکھ دیا۔ بیگم چغتائی قدرے دقت کے بعد انگوٹھا لگانے میں کامیاب ہو گئیں۔ ان کے صحت مند ہاتھ پر بھی ہلکا ہلکا لرزہ طاری تھا۔

انگوٹھا لگوا کر منصور نے دونوں چیزیں وصیت نامے اور عاق نامے کی دستاویزات پر مبنی فائل سمیت بیگ میں ڈالیں اور اسے بند کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی دوبارہ ملاقات ہوگی۔ ایک دو دن میں، میں آپ کے بیٹے کو پاور آف اٹارنی کی منسوخی کا نوٹس بھجوا دوں گا اور وصیت نامے اور عاق نامے کی دستاویزات بھی آپ کے ملاحظے کے لیے لے آؤں گا۔ تب تک کے لیے اجازت۔"

"ایک بات کا خیال رکھیے گا مسٹر منصور۔" بیگم چغتائی نے کہا۔ "اس فائل کے مندرجات میں میرے بیٹے کے گھر اور آفس دونوں کا پتا موجود ہے۔ منسوخی کا نوٹس اس کے آفس کے پتے پر بھجوائیے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ نوٹس میرے بیٹے سے پہلے اس کی بیوی کے ہاتھ میں پہنچ جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ پہلا جھٹکا براہِ راست میرے بیٹے کو پہنچے

اور اس کے اثرات اس کی بیوی تک منتقل ہوں۔''

منصور کی بدمزگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنے تئیں یہاں قانون اور انصاف کی سربلندی کے لیے اپنے پہلے موکل کو ڈیل کرنے کے لیے آیا تھا۔ کسی خاندانی سازش میں فریق بننے نہیں۔ بیگم چغتائی اپنے ذاتی مقصد کے حصول کے لیے اسے مہرے کی طرح استعمال کر رہی تھیں۔ منصور کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ پہلے وہ بیگم چغتائی کی شخصیت اور باتوں سے متاثر ہوا تھا لیکن اب یہ مثبت تاثر آہستہ آہستہ بکھر رہا تھا۔ بہرحال بدمزگی کا گھونٹ بھر کر وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ''بہت بہتر!''

''محتاط رہیے گا مسٹر منصور۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''یاد رکھیے گا کہ آپ سے پہلے آٹھ وکیل یہاں سے ہو کر جا چکے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ دوبارہ واپس کیوں نہیں آئے لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ انہیں روکنے والی وجہ یا شخصیت اب آپ کی راہ میں بھی رکاوٹ بننے کی کوشش کر سکتی ہے...... اس لیے محتاط رہیے گا۔''

☆☆☆

منصور دارالصفا کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ ایک عجیب سا اضمحلال اس کے وجود کو دھیرے دھیرے گھیرے میں لے رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ادارے کے وسیع و عریض بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ سفید بورڈ پر جلی حروف میں ادارے کے نام تلے درج تھا۔ ''ان کے لیے جو خود کو بے آسرا سمجھتے ہیں۔'' منصور نے تاسف آمیز انداز میں سر ہلایا۔ بے آسرا ہونے اور خود کو بے آسرا سمجھنے میں کتنا فرق تھا۔ مشترکہ خاندانی نظام کے علمبردار اس ملک میں کتنے گھرانے ایسے ہوں گے جہاں بوڑھوں کو فاضل بوجھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ کبھی چھوٹی چھوٹی کسیلی باتوں سے انہیں ان کی بے مائیگی کا احساس دلایا جاتا ہے۔ کبھی مختلف حیلے بہانوں سے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ خود ہی کسی اور سمت کو منہ کر جائیں اور کبھی سیدھا سیدھا اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ پناہ تو آخر سب کو مل ہی جاتی ہے، زمین کے اوپر یا نیچے لیکن ایسا کرنے والے جانے کیوں بھول جاتے ہیں کہ کل کو انہیں بھی عمر کے اس دور میں داخل ہونا ہے اور ان کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ مکافات کا فلسفہ اتنا پیچیدہ تو نہیں کہ سمجھ میں نہ آسکے۔

لیکن کیا کیا جائے، انسان کی بصارت پہلے ہی کوتاہ ہے اور جب آنکھوں پر خود غرضانہ مفادات کی پٹی بندھ جائے تو پھر دور تو کیا پاس کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ سماعت پر قفل پڑ جاتے ہیں اور آنے والے وقت کی چاپ دب کر رہ جاتی ہے۔

اسے بیگم چغتائی سے ہمدردی ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ان کی کہانی کے حوالے سے کئی شبہات کا شکار ہو رہا تھا۔ عملی وکالت میں آئے گو اسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لیکن بنیادی امور سے تو واقفیت رکھتا تھا۔ بیگم چغتائی کی باتوں میں بعض پہلو تشنہ طلب تھے اور انہیں سن کر ذہن میں کئی سوالات سر اٹھانے لگتے تھے۔

منصور کو ان سوالات کو زبان دینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گفتگو کا زیادہ تر حصہ بیگم چغتائی کی باتوں کو سننے، سمجھنے اور ان سے معقول مفہوم اخذ کرنے میں گزر گیا تھا۔ دوسرے اس نے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی تھی کہ بیگم چغتائی کا کام مکمل ہونے تک ان سے ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔ ان باتوں کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھا جائے۔ دیر بھی کافی ہو چکی تھی، جب وہ دفتر سے نکلا تھا تو اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اس ایک معاملے کو نمٹانے میں اتنا وقت لگ جائے گا۔ اس نے اپنے سینئرز کو ایسے مسائل چٹکیوں میں اڑاتے دیکھا تھا اور خود بھی یہی سمجھتا تھا کہ سینئرز کی طرح وہ بھی بس جائے گا اور فارغ ہو کر آجائے گا لیکن اس کے سینئرز کا واسطہ بیگم چغتائی جیسی موکلہ سے کب پڑا ہو گا؟

آخری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ بیگم چغتائی سے گفتگو کرتے ہوئے اس کا ذہن ان باتوں کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ وہ ان کی گفتگو کے تانے بانے میں کچھ اس طرح الجھا تھا کہ باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔

سورج کو مغرب کا رخ کیے کچھ دیر گزر چکی تھی۔ شام کی کجلاہٹیں آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ روڈ لائٹس اور دکانوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ شام کے ٹریفک کا تیز دھارا دو رویہ سڑک کے دونوں اطراف رواں دواں تھا۔ منصور جو تھوڑی دیر کو سوچوں کے بھنور میں غوطہ کھانے کو ٹھہر گیا تھا، سر جھٹک کر تیز قدموں سے اس طرف بڑھنے لگا جہاں اس نے اپنی موٹر سائیکل کھڑی کی تھی۔

موٹر سائیکل کے برابر ایک سوزوکی ایف ایکس کھڑی تھی۔ ملگجے سے سفید رنگ کی کار جو شام کے دھندلکوں میں کچھ اور بھی میلی نظر آرہی تھی۔ اس کی پسنجر سائڈ کا شیشہ اترا ہوا تھا۔ منصور موٹر سائیکل کے قریب پہنچا تو کار کی اندرونی لائٹ روشن ہو گئی اور ایک شخص نے آگے ہو کر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''ایکسکیوزمی، ذرا میری بات سنیے گا۔''

منصور رک گیا اور محتاط نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ایسے وقت میں اسے کسی کا یوں روک لینا عجیب سی بات تھی۔ شاید یہ شخص اس سے کوئی پتا پوچھنا چاہتا تھا لیکن پتا پوچھنے کے پس پردہ جو دوسرے کھیل کھیلے جاتے ہیں، منصور ان سے ناواقف نہیں تھا۔ اندرونی لائٹ کی روشنی میں کار بادی النظر خالی نظر آرہی تھی لیکن کیا پتا؟

''جی فرمائیے۔'' اس نے محتاط انداز میں کہا۔

''ایسے تو میں کچھ نہیں فرما سکوں گا۔'' اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ''اگر آپ کچھ وقت دے سکتے ہوں تو گاڑی میں بیٹھ جائیے۔''

منصور بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ آخر یہ شخص کون تھا اور اس سے کیا چاہتا تھا؟ اس کے دل میں سر اٹھانے والے خدشات تقویت پکڑتے جارہے تھے۔

اسے بدکتا دیکھ کر وہ شخص دھیرے سے مسکرایا اور اپنی سائڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آیا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں جناب۔'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کے بھلے کی بات کرنے کو ہی بھاگا بھاگا یہاں پہنچا ہوں۔ ویسے بھی بالشافہ نہ سہی غائبانہ طور پر تو آپ مجھ سے متعارف ہو ہی چکے ہوں گے۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ بیگم چغتائی سے مل کر آرہے ہیں؟''

''آپ کون ہیں؟'' منصور نے کسی قدر الجھ کر کہا۔

''میرا نام فاران چغتائی ہے۔'' اس شخص نے نرم لہجے میں کہا۔ ایک گہری سانس جیسے خود بخود اس کے حلق سے نکل گئی۔ ''بیگم شاہانہ چغتائی میری والدہ ہیں۔''

منصور کو ایک جھٹکا سا لگا۔ دم رخصت بیگم چغتائی کے کہے ہوئے الفاظ اس کے ذہن میں گونجے۔ ''محتاط رہیے گا مسٹر منصور۔'' اسے امید تو تھی کہ آئندہ چند دنوں میں اس کی ملاقات بیگم چغتائی کے بیٹے سے ہوگی لیکن اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ فاران یوں باہر اس کے استقبال کو منتظر کھڑا ہوگا۔

''آ بھی جائیے وکیل صاحب۔'' اسے ساکت کھڑا پا کر فاران نے کہا۔ ''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔''

منصور کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فاران مجھ سے کیا چاہتا ہے اور میرا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟ اگر میرا سینئر یہاں ہوتا تو اس کا جواب کیا ہوتا؟ فاران میری مؤکلہ کا مخالف فریق ہے اور کیا مخالف فریق سے بات کرنا سودمند ہوگا؟ سوالات کا ایک طوفان تھا اور کسی جواب کا دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

اسے گومگو کا شکار دیکھ کر فاران نے کہا۔ ''پریشان مت ہوں وکیل صاحب۔ اگر میری گاڑی میں بیٹھتے ہوئے آپ کو ہچکچاہٹ ہورہی ہے تو آئیے کسی ریستوران میں چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات چیت ہوجائے گی۔ اوور آ کپ آف ٹی۔''

''آخر آپ مجھ سے چاہتے کیا ہیں؟'' منصور نے بالآخر خود کو سنبھال کر کہا۔

''میں آپ کا بھلا چاہتا ہوں۔'' فاران نے کہا۔ ''آپ کو تھوڑی سی شرمندگی اور بہت سی پریشانی سے بچانا چاہتا ہوں۔ یقین کیجیے، آپ کی خیر خواہی کے سوا میرے یہاں آنے کا کوئی مقصد نہیں ہے۔''

''میں آپ کی بات ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔'' منصور نے تنگ آکر کہا۔ اس پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی تھی۔

''ایسے کھڑے کھڑے تو میں آپ کو کچھ سمجھا پاؤں گا نہ آپ سمجھ پائیں گے۔ بات ذرا اطمینان سے کہنے سننے والی ہے۔ اگر آپ میری گاڑی میں بیٹھنے پر خود کو آمادہ نہیں کر پارہے تو اپنی موٹر سائیکل پر مجھے فالو کیجیے۔ یہاں قریب ہی ایک چھوٹا ریسٹورنٹ ہے، جہاں بہت عمدہ چائے ملتی ہے۔ کیا کہتے ہیں آپ؟''

منصور تھوڑی دیر اسے گھورتا رہا بالآخر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ فاران کی بات سن لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، آپ گاڑی میں بیٹھیے، میں آپ کو فالو کرتا ہوں۔''

''عنایت کا شکریہ۔'' فاران نے گاڑی میں بیٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ منصور سوچتا ہی رہ گیا کہ اس کا لہجہ طنزیہ تھا یا تشکرانہ۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ ویٹر چائے کا آرڈر لے کر جاچکا تھا۔ فاران نے منصور کا نام پوچھنے کے علاوہ ابھی تک کوئی اور بات نہیں کی تھی۔ اس کی نگاہ میز پر جمی ہوئی تھی اور وہ خاموش تھا جیسے بات شروع کرنے کے لیے کسی شبھ گھڑی کی آمد کا انتظار کررہا ہو۔ منصور اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ فاران کی عمر پینتیس چھتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ متناسب قدوقامت، نرم و نازک خدوخال۔ بدن پر میانہ سے کپڑے کا تو پیس سوٹ جس کے نیچے نظر آنے والی شرٹ کسی قدر شکن آلود ہورہی تھی۔ غالباً فاران اسے ایک دو روز سے پہنے ہوئے تھا۔

چند میزوں کے علاوہ باقی ریستوران خالی پڑا تھا۔ میزوں کی ترتیب کچھ اس طرح سے لگائی گئی تھی کہ عام لہجے

میں بات کرنے والوں کی آواز ایک سے دوسری میز تک... بہ مشکل ہی پہنچتی تھی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ رش کم ہونے کے سبب ریستوران کی فضا معمول سے کچھ زیادہ خاموش تھی۔ اعصابی کشیدگی کے باعث منصور کو یہ خاموشی کچھ زیادہ گہری اور وزنی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ منتظر تھا کہ فاران خود ہی بات کا آغاز کرے لیکن فاران یوں چپ بیٹھا تھا جیسے کسی گہرے نکتے پر غور و فکر کر رہا ہو اور منصور کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فضا کا تناؤ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتا ہی جا رہا ہو۔ اس کی برداشت کا پیمانہ بہت جلد لبریز ہو گیا اور وہ بول پڑا۔

''آپ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتے تھے؟''

فاران مسکرایا جیسے منصور کے اضطراب نے اسے محظوظ کیا ہو۔ ''میں یہی سوچ رہا تھا کہ بات کا آغاز کیسے کیا جائے۔''

''میں اس سلسلے میں کوئی مشورہ دینے سے قاصر ہوں۔'' منصور نے کہا۔ ''کیونکہ مجھے تو یہی علم نہیں کہ آپ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''چلیے، اصل بات کی طرف آنے سے پہلے میں آپ سے ایک سوال پوچھ لیتا ہوں۔'' فاران نے کہا۔ ''کیا میں جان سکتا ہوں کہ میری والدہ سے آپ کی ملاقات کا مقصد کیا تھا؟''

منصور کے اعصابی تناؤ میں یکدم اضافہ ہو گیا۔ فاران کا سوال غیر متوقع نہ سہی لیکن بے حد اچانک تھا۔ ''آپ کو یہ جاننے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے کشیدہ لہجے میں کہا۔ ''وکیل اور موکل کے معاملات کانفیڈنشل ہوتے ہیں اور ان کی حفاظت کرنا ایک وکیل کا فرض ہے۔''

''آپ کا جواب آپ کے پروفیشنل ازم کی دلیل ہے۔'' فاران نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''بہرحال، اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کے اور میری والدہ کے درمیان کیا کیا باتیں ہوئیں۔ میری والدہ نے کسی کے ذریعے فون کروا کر آپ سے ملاقات کا وقت لیا، آپ ان کے پاس پہنچے، آپ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ آپ کو ابتدائی طور پر یہ بتایا گیا کہ میری والدہ کو اپنی وصیت لکھوانے کے لیے آپ کی مشاورت اور معاونت کی ضرورت ہے لیکن جب آپ یہاں پہنچے تو آپ کو بتایا گیا کہ وصیت کی تحریر وغیرہ تو محض ضمنی معاملات ہیں اصل میں میری والدہ آپ کی مدد سے اپنے بیٹے اور بہو سے انتقام لینا چاہتی ہیں۔

''اب یہاں صورتِ حال دہری شکل اختیار کر جاتی ہے۔ اگر آپ کے ذریعے وہ اپنے بیٹے سے یعنی مجھ سے انتقام لینا چاہتی ہیں تو انہوں نے آپ کو ایک عدد عاق نامہ تیار کرنے کے لیے دیا ہوگا اور اگر صرف بہو سے انتقام لینا ہے تو عاق نامے کے ساتھ ساتھ ایک وصیت نامہ بھی آپ کے حوالے کیا گیا ہوگا اور آپ کو بتایا گیا ہوگا کہ جب آپ دونوں چیزیں تیار کر کے لے آئیں گے تو ان میں سے ایک پر عمل درآمد سے پہلے میری والدہ مجھ سے ایک ملاقات کریں گی اور دونوں چیزیں میرے سامنے رکھ دیں گی۔ فیصلے کا اختیار مجھے دیا جائے گا کہ دونوں میں سے کسی ایک کو چن لوں، وصیت نامے کی رو سے میں اپنی والدہ کے ترکے کا حق دار ٹھہروں گا لیکن میری والدہ اس کی توثیق صرف اسی صورت میں کریں گی جب میں اپنی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا اور غالباً یہ کام ان کی نگاہوں کے سامنے انجام پائے تو انہیں زیادہ خوشی ہوگی۔

''اگر میں ان کا حکم ماننے پر کسی طرح کی ہچکچاہٹ یا تامل کا مظاہرہ کرتا ہوں تو میری والدہ وصیت نامے کے بجائے عاق نامے کی توثیق کر دیں گی اور مجھے اس تمام مال و اسباب اور کاروبار سے محروم کر دیا جائے گا جو اس وقت میرے تصرف میں ہے اور جس پر فوری قبضہ کرنے کے لیے میں نے اس وقت جب وہ فالج کے زیر اثر بستر پر پڑی تھیں، ایک جنرل پاور آف اٹارنی پر ان کا انگوٹھا لگوا لیا، بایاں انگوٹھا۔

''اب کہیے وکیل صاحب! کوئی بات رہ تو نہیں گئی؟ شاید آپ کوئی ایسی بات جانتے ہوں جو میرے علم میں نہیں۔''

منصور ایک دفعہ پھر فیصلہ نہ کر سکا کہ فاران کا لہجہ طنزیہ تھا یا استفہامیہ!

اور اسے فیصلہ کرنے کا ہوش بھی کہاں تھا۔ فاران نے جو کچھ بتایا تھا، وہ کم و بیش وہی تھا جو کچھ دیر پہلے اس نے بیگم چغتائی کے منہ سے سنا تھا۔ یہی باتیں اب مخالف فریق کے منہ سے سن کر اس پر حیرت کا جو بھی پہاڑ ٹوٹ جاتا وہ کم تھا۔ ایک سناٹے کے عالم میں بیٹھا وہ فاران کو گھور رہا تھا۔

اس کی کیفیت دیکھ کر فاران کھل کر مسکرایا اور منصور نوٹس لیے بغیر نہ رہ سکا کہ ماں بیٹے میں کم از کم یہ عادت تو مشترک تھی کہ دوسروں کو چونکا کر محظوظ ہوتے تھے۔

''میں آپ کی کیفیت بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔'' فاران نے کہا۔ ''جب پہلی دفعہ میں نے یہ کہانی سنی تھی تو میری بھی

یہی حالت ہوئی تھی۔"

"کہانی۔" منصور کے منہ سے نکلا۔

"جی ہاں، کہانی۔" فاران نے تائید کی۔

"آپ......!" منصور نے پہلو بدل کر کہا۔ "آپ کھل کر بات کریں۔"

"میں کھل کر بات کرنے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔" فاران نے کہا۔ "آپ ایک بات اچھی طرح سمجھ لیں۔ میں آپ کو کوئی کہانی نہیں سناؤں گا۔ میں جو بات بھی کروں گا، ٹھوس بنیاد اور ثبوت کے ساتھ کروں گا۔ آپ اپنی تسلی کے لیے جو شہادت بھی طلب کریں، میں فراہم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وکیل ہونے کی حیثیت سے آپ ثبوت اور شہادت کی عدالتی اہمیت سے بخوبی واقف ہوں گے۔"

اچانک منصور اس آنکھ مچولی سے تنگ آ گیا۔ اس نے کسی قدر چڑ کر کہا۔ "کیسا ثبوت اور کیسی شہادت؟ میں ابھی تک اس انتظار میں ہوں کہ آپ اس ملاقات کا کوئی مقصد بیان کریں تو میرے پلے بھی کچھ پڑے۔ مان لیا کہ آپ کو میرے اور اپنی والدہ کے درمیان ہونے والی گفتگو کا علم ہے لیکن اس سے معاملات کی نوعیت تو نہیں بدل جاتی۔ اتنا تو میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ آپ مجھے کسی نہ کسی طرح اس قانونی کارروائی سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے جو میں آپ کی والدہ کی ہدایات کے تحت عمل میں لانے والا ہوں لیکن اتنا ذہن میں رکھیے گا کہ......"

"میں آپ کو کسی چیز سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کروں گا۔" فاران نے ہاتھ اٹھا کر اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ کی بات کاٹنے پر معذرت چاہتا ہوں لیکن منصور صاحب! کیا آپ کو حیرت نہیں ہوئی کہ یہ تمام باتیں میرے علم میں کیسے آ گئیں؟"

منصور کو پھر خاموش ہو جانا پڑا۔ حیرت تو اسے واقعی ہوئی تھی لیکن فاران کے علم میں یہ سب باتیں کس طرح آ گئیں، اس کے بارے میں وہ کوئی قیاس آرائی کرنے سے قاصر تھا۔

فاران تھوڑی دیر اس کی شکل دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "میری والدہ کی باتیں سن کر آپ یقیناً مجھے نہایت ناہنجار اور بد خصلت سمجھنے لگے ہوں گے۔ اس وقت آپ ایسا سوچنے میں حق بجانب ہیں لیکن بات کو ذرا دوسرے رخ سے دیکھیے۔ میری والدہ آپ کی مؤکلہ سہی لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ انہوں نے آپ کو سب کچھ درست بتایا ہے؟

کیا آپ کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ جو کچھ آپ میری والدہ کے منہ سے سن کر آئے ہیں، وہ غلط بھی ہوسکتا ہے؟''

''کیا آپ وہ سب غلط ثابت کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں؟'' منصور نے ایک لحظہ توقف کے بعد جارحانہ لہجے میں کہا۔ فاران نے جس انداز میں اس پر چڑھائی کردی تھی، اس کا مقابلہ اسی انداز میں کیا جاسکتا تھا۔

''مجھے کسی بات کو غلط یا صحیح ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔'' فاران نے اس کے انداز کا کوئی اثر لیے بغیر کہا۔ ''میں صرف چند حقائق آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں اور مجھے پوری امید ہے کہ اس کے بعد صحیح اور غلط خود بخود آپ پر کھل جائے گا۔ بات آگے بڑھانے سے پیشتر بہتر ہوگا کہ آپ ان کاغذات پر ایک نگاہ ڈال لیں۔'' اس نے ایک خاکی لفافہ میز پر رکھ کر منصور کی طرف سرکا دیا۔ یہ لفافہ وہ گاڑی سے نکلتے ہوئے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔

''اگر آپ ڈاکٹر دلجیت رحمانی کے نام سے واقف ہیں تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ ملک کے ممتاز اور مہنگے ترین ماہرین نفسیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ رپورٹ انہی کی تصدیق شدہ ہے۔''

منصور نے اسے ایک الجھی ہوئی نگاہ سے نوازا پھر کہا۔ ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ اس رپورٹ کا خلاصہ مجھے اپنے الفاظ میں سنا دیں؟''

''شاید آپ کے لیے میری بات قابلِ یقین نہ ہو۔'' فاران نے کہا۔

''اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔'' منصور نے کہا۔

''چلیے، ٹھیک ہے۔'' فاران نے کہا۔ ''اگر آپ کو میرے بیان کا کوئی حصہ مشکوک محسوس ہو تو آپ بلا جھجک اظہار کرسکتے ہیں۔ میں بالکل برا نہیں مناؤں گا۔''

''آپ کا برا منانا یا نہ منانا میرا مسئلہ نہیں۔'' منصور نے کہا پھر اسے احساس ہوا کہ وقتی ابال کے زیر اثر وہ نامناسب الفاظ استعمال کرگیا ہے۔ وہ تلافی کے لیے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ فاران نے کہا۔

''آپ کی سوچ اپنی جگہ درست ہے۔ آپ کا مسئلہ دراصل یہ ہے کہ میری والدہ سے ایک ملاقات کرنے کے بعد آپ فرض کرچکے ہیں کہ آپ ان کے اور میرے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ آپ ان کے یا میرے متعلق حقیقی معنوں میں کچھ نہیں جانتے۔ سب سے پہلے آپ ان کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کی رائے سن لیں۔ اس کا کہنا ہے کہ بڑھتی عمر اور فالج کے حملے نے میری والدہ کی ذہنی کیفیت کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ان کے اعصاب اس حد تک کمزور ہوچکے ہیں کہ کسی بھی وقت جواب دے سکتے ہیں۔ ان کے دماغ کی کمر ٹوٹنے میں یوں سمجھیے کہ بس ایک تنکے کی کسر باقی ہے۔ حالات نے ان کے اعصاب پر اس قدر دباؤ ڈالا ہے کہ اب وہ ہلکی سی سختی برداشت کرنے کی بھی اہل نہیں ہیں۔''

''کیا یہ کہنا غلط ہوگا کہ اپنی والدہ کو اس حالت تک پہنچانے کے ذمے دار آپ خود ہیں؟'' منصور نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

فاران پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔ ''میں ایک دفعہ پھر کہوں گا کہ آپ کی موجودہ معلومات کے پیش نظر آپ کی سوچ اپنی جگہ درست ہے۔ بہرحال، ڈاکٹر دلجیت رحمانی کی اس رپورٹ کا مختصر سا خلاصہ یہ ہے کہ اپنے خاندانی پس منظر اور پرورش کے حالات کی بدولت اپنی بات منوانا اور خود کو سب سے برتر سمجھنا میری والدہ کی فطرت کا حصہ بن چکا ہے۔ یہ خیال کبھی ان کے ذہن سے گزرا ہی نہیں کہ حالات کے مطابق ایڈجسٹ ہوا جائے بلکہ آج تک وہ حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ایڈجسٹ کرنے کی کوشش ہی کرتی رہیں۔ ایک حد تک تو یہ ممکن ہوا لیکن بعد میں انہیں پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سب سے پہلے ناکامی انہیں میرے والد کے سلسلے میں ہوئی پھر ان کی وفات کے بعد وہ ان کے کاروبار اور اپنے والد کے ورثے کو سنبھالنے میں ناکام رہیں۔ میں نے ان کی مرضی کے خلاف شادی کرکے انہیں ایک اور زک سے دوچار کردیا۔ ان کے ذہن پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔ انہیں وہم ہوگیا کہ ساری دنیا ان کی دشمن ہے اور انہیں نیچا دکھانے پر کمربستہ۔ علم نفسیات کی اصطلاح میں اسے پیرانویا (Paranoia) کہتے ہیں۔''

''اور یہ پیرانویا ان کے ذہن میں کس طرح اثر انداز ہورہا ہے؟''

''اس کی تفصیل ذرا لمبی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک ہی بار میں آپ کو سب کچھ بتا دیا جائے۔ اس سے پہلے اگر آپ کے ذہن میں کوئی اور بات ہے تو آپ پوچھ سکتے ہیں؟''

ویٹر اسی اثنا میں چائے رکھ گیا۔ فاران نے چائے بنانا شروع کردی۔ منصور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ فاران کی باتوں سے جھلکتے اعتماد نے اسے کم از کم اس حد تک تو متاثر کرلیا تھا کہ وہ اب ٹھنڈے ذہن سے اس کی

بات سننے پر تیار ہو گیا تھا۔ وہ دل میں جانے کیا کیا توقعات باندھ کر یہاں آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فاران اسے دھمکائے گا، لالچ دے گا یا کسی قسم کی سودے بازی کرنے کی کوشش کرے گا لیکن بات ایک دفعہ پھر اس کی توقع کے برعکس نکلی تھی۔ فاران نے محض چند منٹوں کی گفتگو میں معاملات کی نوعیت ہی بدل دی تھی۔

لیکن نوعیت بدل جانے کے باوجود بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ منصور مخالف فریق کی باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر سکتا تھا۔ فاران نے اپنی والدہ کی کہانی کو جھوٹ قرار دیا تھا اور منصور جاننا چاہتا تھا کہ یہ دعویٰ وہ کس بنیاد پر کر رہا ہے۔ اس کے ذہن میں چند سوالات بھی ابھر رہے تھے۔

منصور شاید اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا چنانچہ اس کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''جی منصور صاحب! میں آپ کے سوالات کا منتظر ہوں۔''

''پوچھنے کو باتیں تو بہت سی ہیں فاران صاحب۔'' منصور نے اپنی کنپٹی مسلتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ کون سا سوال پہلے پوچھا جائے۔''

''جو آپ کے خیال میں سب سے زیادہ اہم ہو۔'' فاران نے مشورہ دیا۔

''تو پھر میرا سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ آپ کے ہوتے ہوئے آپ کی والدہ دارالصفا میں کیوں رہ رہی ہیں؟ یہ ادارہ بے آسرا اور بے گھر لوگوں کے لیے ہے۔ آخر ادارے کی انتظامیہ نے انہیں کس حیثیت سے وہاں جگہ دے رکھی ہے؟ کیا وہ لوگ آپ سے واقف نہیں؟''

''واقف ہیں، اچھی طرح واقف ہیں۔'' فاران نے کہا۔ ''آپ کو شاید معلوم ہو کہ اس ادارے کو چلانے والا ٹرسٹ میرے نانا نے قائم کیا تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آخری حصہ خود بھی یہیں گزارا تھا۔ انہی کی طرح میری والدہ بھی......''

''بزرگوں کو یہاں بھجوا دینا آپ کے خاندان کی روایت ہے کیا؟'' منصور کے منہ سے نکل گیا۔ فاران کے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ نادانستگی میں وہ کتنی گہری چوٹ کر گیا ہے۔

''اپنے نانا کے متعلق تو میں کچھ نہیں جانتا۔'' فاران نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ ''اپنی والدہ کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ گھر چھوڑ کر یہاں منتقل ہونے کا فیصلہ ان کا اپنا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ ادارہ ان کے والد کا قائم کردہ ہے اور وہ یہاں اس گھر کے مقابلے میں زیادہ سکون اور اطمینان محسوس کریں گی جہاں میری بیوی کی حکومت ہے۔ ٹرسٹ کی انتظامیہ نے ان کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ان کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ ان کی بات مان لی جائے۔''

''آپ کی والدہ کی ادویات اور دیکھ بھال کا خرچہ کون اٹھاتا ہے؟'' منصور نے ایک غیر متعلقہ سوال کر دیا۔

''میں اس مد میں ٹرسٹ کی انتظامیہ کو ہر ماہ کچھ رقم دے دیا کرتا ہوں۔''

''اور اپنی والدہ کو؟''

''انہیں میرے ہاتھ کا چھوا ہوا پانی تک پینا گوارا نہیں۔''

''گویا آپ انہیں کچھ نہیں دیتے؟''

''جب وہ لینے پر آمادہ ہی نہ ہوں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ انتظامیہ کو دی جانے والی رقم کا انہیں علم نہیں ہے ورنہ شاید وہ اس سے بھی انکار کر دیتیں۔''

بیگم چغتائی نے بتایا تھا کہ فاران کی طرف سے انہیں ہر ماہ دس ہزار روپے ملتے ہیں جبکہ فاران اس کی تردید کر رہا تھا۔ بیگم چغتائی اگر چاہتیں تو سچ بول کر فاران کی پوزیشن مزید خراب کر سکتی تھیں اور فاران اگر چاہتا تو ایسی کوئی بات کر کے اپنی پوزیشن صاف کر سکتا تھا۔ بیگم چغتائی کی کہی ہوئی ایک بات غلط نکلی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کی بتائی ہوئی دوسری باتیں بھی غلط ثابت ہو سکتی تھیں۔ شک کی گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔

پھر منصور نے کہا۔ ''اس پاور آف اٹارنی کے متعلق کیا خیال ہے جس کی رو سے......''

''آپ اسی پاور آف اٹارنی کی بات کر رہے ہیں جس کے لیے میری والدہ نے ابطال نامہ تیار کروایا ہے؟'' فاران نے اس کی بات کاٹ دی۔

''جی ہاں۔'' منصور نے کہا۔ ''وہی۔''

''ایسی کسی دستاویز کا کوئی وجود نہیں ہے۔'' فاران نے کہا۔ ''جس جائیداد کا اس میں ذکر ہے، وہ مجھے ملی ہی نہیں اور جس کاروبار کا ذکر ہے، اس کا دوالیا نکلنے کا کلیم میری والدہ نے دارالصفا میں آنے سے پہلے خود داخل کرایا تھا۔ آپ چاہیں تو عدالتی ریکارڈ چیک کر سکتے ہیں۔ اب میرے پاس تھوڑا بہت جو کچھ بھی ہے، خدا کا شکر ہے کہ وہ میرا اپنا ہے۔''

''تصدیق تو خیر میں کر ہی لوں گا لیکن اس سے پہلے ایک اور بات۔'' منصور نے کہا۔ ''جب آپ کو میرے اور

اپنی والدہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو کا علم ہے تو یہ بھی علم ہوگا کہ آپ کی والدہ نے مجھے بتایا ہے کہ مجھ سے پہلے آٹھ وکیل یہاں سے ہو کر جا چکے ہیں، کیا یہ سچ ہے؟''

''جی ہاں۔''

''کیا ان وکیلوں سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی؟''

''جی بالکل۔''

''اور اس کے بعد انہوں نے آپ کی والدہ سے دوسری ملاقات نہیں کی؟''

''انہیں ملاقات کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔''

''آخر کیوں؟''

''اس سوال کے جواب کا تعلق بھی ان کے پیرانویا سے ہے۔''

''چلیے اسے چھوڑ دیجیے۔'' منصور نے کہا۔ ''آپ کا کہنا یہ ہے کہ آپ کی والدہ نے مجھ سے جو کچھ بھی کہا وہ غلط ہے۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ نکلا کہ وہ وکیلوں سے رابطہ بلا مقصد کرتی ہیں، ان کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور آپ بھی ذہنی پریشانی اور شرمندگی سے دوچار ہوتے ہیں۔ آپ انہیں روکنے کے لیے کوئی قدم کیوں نہیں اٹھاتے؟''

''کاش ایسا کرنا میرے بس میں ہوتا۔'' فاران نے ایک گہری سانس کھینچ کر کہا۔ ''سب کچھ جاننے کے باوجود میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

''کیوں؟''

''اس کی وجہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ ان کے اعصاب کوئی دباؤ برداشت کرنے کے اہل نہیں رہے۔ میرے خلاف کارروائی کے لیے وکیلوں سے رابطہ کر کے وہ دراصل اپنا غبار نکالتی ہیں۔ اگر انہیں اس آؤٹ لیٹ (Outlet) سے بھی محروم کر دیا گیا تو خدشہ ہے کہ وہ اپنا ذہنی توازن بالکل ہی کھو بیٹھیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میری والدہ اپنی زندگی کے آخری دن پاگل خانے میں بسر کریں۔''

بیگم چغتائی کی باتوں نے منصور کو متاثر کیا تھا لیکن فاران کی باتیں بھی بے وزن نہیں تھیں۔ اپنی اپنی جگہ دونوں سچے معلوم ہوتے تھے۔ بیگم چغتائی کی کہانی وہ سن چکا تھا اور اس کے متعلق کئی شکوک و شبہات کا شکار بھی ہوا تھا۔ فاران کی باتوں نے اس کے چند شبہات کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ فاران کی کہانی سچ ہے یا بیگم چغتائی کی طرح اس نے بھی جھوٹ سے کام لیا ہے۔

''آپ پوری تفصیل بتائیے فاران صاحب۔''

منصور نے کہا۔ ''شروع سے۔''

فاران نے ایک ہاتھ سے اپنی ٹھوڑی رگڑی، کچھ دیر بھاپ اگلتی چائے کو گھورتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر گویا کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ چند سالوں میں مجھے یہ داستان کئی دفعہ سنانا پڑی ہے لیکن آج تک میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ کسی کو سناتے وقت اس کا آغاز کہاں سے کروں۔ اپنے بچپن سے جو باپ کی شفقت سے محروم اور ماں کے تحکم اور تسلط تلے دبا ہوا گزرا۔ اس وقت سے جب میں نے پہلی دفعہ اپنی ماں کے دباؤ سے آزاد ہو کر اپنی مرضی کے تحت کوئی فیصلہ کیا۔ اس وقت سے جب میرے نانا اور میرے والد کی عمر بھر کی محنت میری والدہ کی ہٹ دھرمیوں کا شکار ہو گئی۔ اس وقت سے جب میری والدہ فالج کا شکار ہوئیں یا اس وقت سے جب میرا باپ میری ماں کا شکار ہو گیا۔''

منصور نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن فاران کے کھوئے کھوئے لہجے میں کچھ ایسی لاچارگی تھی، ایسی شکستگی تھی کہ اس کی آنکھوں کے گوشے خود بخود دھست گئے۔ اس کے منہ سے کوئی بات نکل جاتی لیکن اس نے زبان روک لی۔ اس وقت کچھ کہنا قطعاً مناسب نہیں تھا۔

فاران کی آنکھیں خلا میں گھورنے لگی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں سائے اتر رہے تھے۔ ماضی کے سائے۔ چائے کا کپ منصور کی طرف سرکاتے ہوئے اس نے ایک اور گہری سانس لے کر شاید اپنی ہمت مجتمع کی اور بولنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

میری والدہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ ان کی والدہ یعنی میری نانی انہیں جنم دینے کے کچھ ہی دیر بعد چل بسی تھیں۔ میرے نانا اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کی موت کے بعد وہ دنیا سے بالکل بیگانہ ہو گئے۔ عزیزوں، رشتے داروں سے ملنا، کہیں آنا جانا، اٹھنا بیٹھنا سب ترک کر دیا اور کسی کا تو خیر ذکر ہی کیا، انہوں نے کسی کی روک ٹوک نہ دیکھی۔ نوکروں کو اپنے آقا کی بیٹی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ جو جی میں آئے کرتیں، کوئی پوچھنے والا، جواب طلبی کرنے والا نہ تھا۔ نتیجتاً ان کے مزاج میں سرکشی پیدا ہوتی گئی۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ ساری دنیا ان کی حکومت کے لیے بنی ہے اور ان کے اردگرد موجود سارے لوگ ان کے غلام ہیں۔ ان کا صرف نام ہی نہیں،

مزاج بھی شاہانہ تھا۔ منہ زور بادشاہوں جیسا شاہانہ۔

آپ کو شاید یہ جان کر حیرت ہو کہ میری والدہ نے کبھی اسکول یا کالج کا منہ نہیں دیکھا۔ اس خستہ حالت میں بھی ان کی گفتگو سننے والا کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسے شستہ اور مہذبانہ لہجے میں ایسی نپی تلی گفتگو کرنے والی خاتون روایتی تعلیم سے یکسر محروم ہے۔ ان کا رکھ رکھاؤ، اندازِ گفتگو اور اطوار سب میرے والد کی عطا ہیں۔ میری بات سن کر شاید آپ یہ سمجھیں کہ میرے والد نے انہیں خود پڑھایا لکھایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میری والدہ نے جو کچھ پڑھا اور جو کچھ سیکھا، وہ میرے والد کی ضد میں سیکھا۔ میرے والد نے فنانس میں ماسٹرز کیا تھا۔ میری والدہ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں کہ محض تعلیم یافتہ ہونے کی بنا پر ان کا شوہر ان سے اونچا مقام پالے چنانچہ جانے کن جتنوں سے انہوں نے خود کو ایجوکیٹ کیا، اپنے مطالعے میں وسعت پیدا کی، بولنے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب سیکھے تاکہ سوسائٹی میں اپنے شوہر کے ساتھ سر تان کر کھڑی ہو سکیں۔ اس اعتبار سے میری والدہ کی تعلیم وتہذیب میرے والد کی ہی بدولت تھی۔

میرے والد اور والدہ ویسے تو ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کے خاندان ایک نہ تھے۔ میرے والد بنیادی طور پر لوئر ورکنگ کلاس کے ان سپوتوں میں سے تھے جنہیں محنت اور قسمت کے بل بوتے پر کسی قدر نمایاں ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ انہوں نے اس قدر اعلیٰ تعلیم کن مشکلات سے گزر کر حاصل کی۔ مجھے تو ان کی صورت بھی تصاویر میں ہی دیکھنے کو ملی لیکن ان کے پرانے شناساؤں کا کہنا ہے کہ انہوں نے ساری عمر دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ شاید اس لیے وہ اتنی جلد اتنا تھک گئے کہ قیامت تک کے لیے سو گئے۔

شادی سے پہلے میرے والد ایک اکنامک ایڈوائزر کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کر رہے تھے۔ ایک ریسرچ پروجیکٹ کے سلسلے میں وہ میری والدہ کے شہر میں آئے۔ میرے نانا اس وقت تک اپنے برائے نام وجود سمیت اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ ان کی جائداد کی وارث ہونے کی حیثیت سے میری والدہ اس چھوٹے سے شہر میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں۔ اسی سلسلے میں ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ میں نہیں جانتا کہ پہلی نظر میں انہوں نے ایک دوسرے میں کیا دیکھا بہرحال چند ماہ بعد دونوں نے شادی کر لی۔

میری والدہ نے ان سے شادی یقیناً اس لیے کی تھی کہ انہیں توقع تھی کہ مالی حیثیت اور مرتبے میں کمتر ہونے کی وجہ سے وہ ساری عمر ان سے دب کر رہیں گے اور اسی طرح ان کے اشاروں پر چلتے رہیں گے جیسے وہ آج تک سب کو چلاتی آئی تھیں۔ لیکن شاید زندگی میں پہلی بار میری والدہ کی بچھائی ہوئی بازی ان کے خلاف الٹ گئی۔

میرے والد نے میرے نانا کی جائداد پر بینک سے روپیا حاصل کر کے کاروبار شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی ذہانت اور محنت کے بل بوتے پر اسے عروج کی طرف گامزن کر دیا۔ میری والدہ کی توقعات دھری کی دھری رہ گئیں۔ بجائے اس کے کہ میرے والد اپنی بیوی کے محتاج ہوتے، انہوں نے ایسا کام کیا کہ آہستہ آہستہ بیوی ان کی دست نگر ہونے لگی۔ میری والدہ ہزیمت کا شکار ہوگئیں اور انہوں نے میرے والد سے اس کا انتقام لینا شروع کر دیا۔ ان کے انتقام لینے کا انداز اتنا گھٹیا تھا کہ اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

ایک نمایاں کاروباری فرد ہونے کی حیثیت سے میرے والد کو ہائی سوسائٹی میں ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی۔ انہیں اکثر اپنی بیگم سمیت سماجی تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔ ایسی تقریبات میں سب لوگوں کے سامنے میری والدہ ان سے ایسا برتاؤ کرتیں کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں بھی جھک جاتیں۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ خاندانی لوگ اپنے ملازموں سے تنہائی میں بھی ایسا برتاؤ نہیں کرتے جیسا میری والدہ اپنے شوہر کے ساتھ برسرِعام کیا کرتی تھیں۔ وہ ہر جگہ، ہر وقت انہیں احساس دلاتی رہتی تھیں کہ تمہاری یہ دولت، یہ مرتبہ میرا ہی مرہون منت ہے اور اگر میں تم سے شادی نہ کرتی اور تمہیں کاروبار کے لیے اپنی جائداد پر روپیا حاصل کرنے کی سہولت نہ دیتی تو تم اسی گندی نالی میں رینگتے رہتے، جہاں سے میں تمہیں اٹھا کر لائی ہوں۔

میرے والد یا تو بہت اعلیٰ ظرف تھے یا بہت سرد مہر۔ وہ ان باتوں کو خاموشی سے برداشت کرتے رہے۔ میری والدہ نے یہ حربہ بے اثر ہوتا دیکھا تو مزید اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئیں۔ محض اپنے شوہر کو جلانے اور اذیت دینے کے لیے انہوں نے دوسرے مردوں سے فلرٹ کرنا شروع کر دیا۔ وہ خوب صورت تھیں، جوان تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دولت مند تھیں۔ ان کے گرد پروانے

طواف کرنے لگے جوان کے ایک اشارے پر دنیا ان کے قدموں میں بچھانے کو تیار تھے۔ یہی احساس ان کی نفسیاتی ضرورت تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب میرے والد کی طرف سے ان کی توقع پوری نہ ہوسکی تو انہوں نے اس تشنگی کو مٹانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرلیا۔ تمام عمران کی یہی خواہش رہی ہے کہ ان کی شخصیت کی آب وتاب کے سامنے باقی سب ماند پڑجائیں اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتی ہیں۔

آپ میری والدہ سے مل چکے ہیں۔ ان کی عمر کا تھوڑا بہت اندازہ آپ نے لگا ہی لیا ہوگا۔ وہ بہتر برس کی ہیں اور میری عمر چھتیس برس ہے یعنی جب میں نے جنم لیا تو میری والدہ کی عمر سینتیس برس کے لگ بھگ تھی۔ یہ عمر کا وہ حصہ ہے جب عورت اپنی زرخیزی کے آخری دور سے گزر رہی ہوتی ہے۔ تیس سال کا ہندسہ عبور کرنے کے بعد عورت کے ماں بننے کے امکانات گھٹنا شروع ہوجاتے ہیں اور ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر بیس سے تیس سال کی عمر کو ماں بننے کے لیے بہترین قرار دیتے ہیں۔ میری پیدائش میں اتنی تاخیر اس لیے ہوئی کہ میری والدہ نے ماں بننے سے انکار کردیا تھا۔ ان کے بس میں ہوتا تو وہ آپریشن کروا کر اپنی کوکھ کو خود بنجر کردیتیں لیکن ان کی اور میری، دونوں کی بدقسمتی کہ اس وقت پاکستان میں ایسے آپریشنز کی سہولت دستیاب نہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے وہ تمام تدابیر اختیار کیں جن کے ذریعے وہ اس شخص کی اولاد کو جنم دینے سے بچ سکیں جس نے انہیں زندگی میں پہلی دفعہ شکست کا تلخ ذائقہ چکھنے پر مجبور کیا تھا۔ بہرحال ہونی ہوکر رہی اور میں اس دنیا میں آگیا۔

میری صورت میں میری والدہ کو اپنے شوہر سے نفرت کرنے کی ایک اور وجہ مل گئی۔ ان کے مزاج کی تلخی اور برتاؤ کی زہرناکی میں اور اضافہ ہوگیا۔ میرے والد کی ہمت بھی آہستہ آہستہ جواب دیتی جارہی تھی۔ ایک روز دفتر میں کام کرتے کرتے انہوں نے میز پر ایسا سر رکھا کہ دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف بیالیس سال تھی۔ کام کی زیادتی شاید ان کا کچھ نہ بگاڑ پاتی لیکن گھریلو سکون واطمینان کی عدم موجودگی نے انہیں چکنا چور کردیا۔ میری والدہ نے ان کی جان لے لی۔

لیکن میری والدہ کو چین پھر بھی نصیب نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیسے؟ جس شخص سے وہ انتقام لے رہی تھیں وہ تو اب ان کی دسترس سے دور جاچکا تھا۔ وہ جھنجلاہٹ کے عالم میں سر پٹخنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ شوہر کی موت پر انہیں دکھ تو نہیں البتہ اس بات کا افسوس ضرور ہوا ہوگا کہ وہ اپنے شوہر کو اپنے سامنے جھکا نہ سکیں۔ مرتے دم تک وہ شخص ان کی گرفت میں نہ آیا۔

اور پھر میں ان کی نگاہ میں آگیا۔ آخر کو میں اسی شخص کا خون تھا جو تمام عمران کی نفرتوں کا مرکز رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ باپ تو میری ڈوری سے نہ بندھ سکا، اب وہ کسر اس کے بیٹے پر پوری کی جائے اور یوں انہوں نے میری زندگی کا چارج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

میرے ساتھ میری والدہ کا جو سلوک رہا، دیکھنے والے اسے ماں کا جنون کی حد تک پہنچا ہوا پیار سمجھتے رہے۔ بعض نے ان کے رویے کی یہ وجہ بھی نکالی کہ چونکہ میرے والد کی وفات کے بعد، ان کی زندگی میں میرے علاوہ کچھ نہیں بچا اور ویسے بھی والد مرحوم کی زندگی میں انہوں نے ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا، اس لیے اب مجھ پر نچھاور ہوکر وہ اپنی گزشتہ زیادتیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں لیکن ان کے رویے کے پس پردہ حرکات سے صرف میں واقف ہوں اور مجھے بھی یہ واقفیت ایک دن میں حاصل نہیں ہوئی۔ اسے پانے کے لیے میں نے ساری عمران کے رویوں کو سہا ہے، ان کی گزشتہ زندگی کے متعلق معلومات اکٹھی کرکے کڑیوں سے کڑیاں ملائی ہیں۔ تب جاکر میں انہیں اور ان کی شخصیت کو سمجھنے میں کامیاب ہو پایا ہوں۔

میری والدہ کی ابتدائی زندگی کے متعلق تو آپ جان ہی چکے ہیں اور ان کے منہ سے شاید یہ بھی سن آئے ہوں کہ انہوں نے میرے والد کی وفات کے بعد کاروبار اور گھر کو ایک ساتھ کیسے سنبھالا لیکن ان دونوں چیزوں کو انہوں نے کس طرح سنبھالا، اس کی تفصیل کے متعلق شاید آپ کی معلومات کسی قدر ناقص ہوں۔

مجھے میری والدہ نے ایسے سنبھالا کہ میری زندگی کے ایک ایک حصے پر ان کے تسلط کی مہر لگ گئی۔ مجھے کیا کھانا ہے اور کب کھانا ہے، کپڑے کیسے اور کس رنگ کے پہننے ہیں، کب سونا ہے، کب اٹھنا ہے، میرا دوست کون ہوگا اور کون نہیں، کیا پڑھنا ہے اور کیا نہیں پڑھنا، کون سے کھیل کھیلنے ہیں اور کن مشاغل میں دلچسپی لینی ہے، خوشبو کون سی لگانی ہے اور بال کس انداز میں کٹوانے ہیں حتیٰ کہ دانت صاف کرنے کے برش اور پیسٹ سے لے کر نہانے کے صابن تک ہر چیز میری والدہ کی مرضی کے

مطابق ہوتی تھی۔

کسی بچے کے معاملات کا اس کے والدین کی مرضی کے تابع ہونا کوئی انوکھی بات نہیں لیکن والدین اگر بچے سے کوئی بات منواتے ہیں تو پھر اس کی کوئی بات مانتے بھی ہیں۔ مجھے یہ آسائش بھی نصیب نہ ہوئی۔ مجھے کبھی اپنی والدہ سے کوئی فرمائش کرنے اور کوئی بات منوانے کا حق نہ ملا۔ ان کی بات میرے لیے حرفِ آخر ہوتی تھی۔ میں چاہتا بھی تو تحکم اور جبر کے اس حصار سے باہر نہیں نکل سکتا تھا جو انہوں نے میرے گرد کھینچ رکھا تھا۔

میرے والد کی شبانہ روز محنت سے ترقی پانے والے کاروبار کو انہوں نے کیسے سنبھالا، وہ ایک الگ داستان ہے۔ تفصیل میں جاؤں تو شاید ہم گھنٹوں یہیں بیٹھے رہیں۔ جس انداز میں انہوں نے اس کاروبار کا انتظام کیا، ایک چڑیا بھی اپنے گھونسلے کی دیکھ بھال اس سے بہتر طریق پر کرتی ہوگی۔ میرے والد نے اپنی زندگی میں ہی ایماندار، محنتی اور وفادار کارکنوں کی ایک مختصر ٹیم بنادی تھی جس کی بدولت اتنا تو ہوا کہ کاروبار جوں کا توں چلتا رہا لیکن چونکہ مرضی میری والدہ کی چلتی تھی، اس لیے کاروبار کی وسعت اور حجم میں آہستہ آہستہ کمی آتی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب میں ایم بی اے کرکے کاروبار سنبھالنے کے لیے تیار ہوا تو اس کا صرف نام باقی رہ گیا تھا، باقی سب کچھ میری والدہ کی من مانیوں کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ زیادہ تر جائداد بک چکی تھی اور بچی کھچی گروی پڑی تھی۔ کاروبار قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔ میری والدہ نے اپنے عاقبت نااندیشانہ فیصلوں اور کسی کے مشورے پر کان نہ دھرنے کی عادت کے ہاتھوں میرے والد کی زندگی بھر کی محنت غرق کردی۔ شاید یہ بھی ان کے انتقام کا ایک حصہ ہو جس کی آگ میرے والد کی موت کے بعد بھی سرد نہیں پڑی تھی۔ وہ میرے والد کو نہ جھکا سکیں لیکن ان کے کاروبار کو انہوں نے گھٹنوں بٹھادیا۔

میں نے بالکل لیول سے آغاز کیا اور کاروبار کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے اپنے والد کے مانند دن رات محنت کرنا شروع کردی لیکن مصیبت یہ تھی کہ ایم ڈی کی نام نہاد کرسی پر اب بھی میری والدہ کا قبضہ تھا۔ انہیں اب بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ میرے ہر فیصلے کو بیک جنبشِ قلم رد کرسکیں۔ انہوں نے میری راہ میں ایسے روڑے اٹکائے کہ کوئی اور ہوتا تو سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ جس قسم کے ماحول میں، میں نے تربیت پائی تھی، اس کے پیشِ نظر اگر میں ہتھیار ڈال بھی دیتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی۔ میری والدہ نے میری شخصیت کو ابھرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا لیکن شاید میرے والد کے خون کا اثر تھا کہ میں ڈٹا رہا اور کسی نہ کسی طرح کام چلاتا رہا۔ میری خوش قسمتی کہ اس دوران میری ملاقات تسنیم سے ہوئی۔

تسنیم میری بیوی کا نام ہے۔ جب ہماری ملاقات ہوئی تو وہ ایک فرم میں پی آر او کی حیثیت سے کام کررہی تھی اور مجھے بزنس کی دنیا میں آئے چار ساڑھے چار سال گزر چکے تھے۔ مجھے اس کی شخصیت پسند آئی اور شاید پہلی نظر میں، میں بھی اسے اچھا لگا۔ ہم بہت تیزی سے قریب آگئے۔ میں پہلی دفعہ سنجیدگی سے اپنے متعلق سوچنے لگا۔ اس سے پہلے میری سوچ کے ہر محور میں میری والدہ کی ذات بھی شامل ہوا کرتی تھی۔

میری والدہ نے مجھ سے ماؤں والے لہجے میں کبھی بات نہیں کی تھی۔ ان کا رویہ ہمیشہ کسی سخت مزاج گورنس کا سا ہوا کرتا تھا۔ وہ مجھے ہمیشہ حکم دیا کرتی تھیں، مجھ سے کوئی بات پوچھتی نہیں تھیں۔ میں اب عمر کے اس حصے میں داخل ہوچکا تھا جب مائیں بیٹوں پر شادی کے لیے زور ڈالنا شروع کردیتی ہیں لیکن زور ڈالنا ایک طرف، میری والدہ نے کبھی مجھ سے اس سلسلے میں گفتگو نہ کی تھی اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر میری ملاقات تسنیم سے نہ ہوتی اور میں اپنی والدہ سے اس سلسلے میں بات نہ کرتا تو شاید اب تک کنوارہ بیٹھا ہوتا یا والدہ کی پسند کی کوئی لڑکی میرے پلے باندھی جاچکی ہوتی۔

تسنیم کے متعلق اپنی والدہ سے بات کرنے میں مجھے بے حد دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ تمام عمر بھی ان سے اس طرح بات کرنے کی نوبت ہی نہ آئی تھی۔ میرے ذاتی معاملات کے متعلق پوچھنے کی زحمت کبھی انہوں نے گوارا کی نہ مجھے کبھی اتنا حوصلہ ہوا۔

کئی روز تک میں ہمت مجتمع کرتا رہا۔ اس دوران تسنیم نے کئی دفعہ میری والدہ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا لیکن میں ہر دفعہ ٹال گیا۔ میری والدہ اور تسنیم میری زندگی کے مثبت اور منفی قطبین کی شکل اختیار کرگئی تھیں۔ کبھی ایک مجھے اپنی طرف کھینچ لیتا اور کبھی دوسرا۔ دونوں کے سامنے میری کیفیت مختلف ہوتی تھی۔ تسنیم کے ساتھ ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش باش، خوداعتماد اور مضبوط انسان اور کوئی نہیں ہے اور اپنی والدہ کے سامنے ہوتا تو مجھے اپنے آپ پر ایک تناور

درخت کے سائے میں اگے کمزور سے پودے کا سا احساس ہوتا جس کے حصے کی روشنی اور نمی اس کا طاقت ور ہمسایہ چھین لے جاتا ہے اور جس کی قسمت میں گھٹ کر مرجانا لکھا ہوتا ہے۔

آخر ایک روز ہمت کر کے میں نے والدہ کے سامنے یہ کہہ ہی دیا کہ میں تسنیم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ان کی طرف سے مخالفت کی توقع تو تھی لیکن یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ وہ اس طرح حیران ہوجائیں گی۔ انہوں نے یہ سوچا ہی نہ ہوگا کہ کبھی میں بھی ان کے اشارہ کیے بغیر زبان ہلاسکتا ہوں پھر جانے کیا سوچ کر انہوں نے تسنیم سے ملاقات کرنے کی ہامی بھرلی اور پہلی ہی ملاقات میں اسے مسترد کردیا۔

تسنیم عمر میں مجھ سے بڑی ہے۔ میری عمر اس وقت ستائیس سال تھی اور تسنیم کی بتیس سال۔ میری والدہ کا موقف یہ تھا کہ اتنے عرصے تک غیر شادی شدہ رہنے والی لڑکی پاک دامن ہو ہی نہیں سکتی جبکہ حقیقت حال یہ تھی کہ کم عمری میں والد کے سائے سے محروم ہوجانے کے بعد بڑی بیٹی کی حیثیت سے تسنیم نے گھر کا بوجھ سنبھال لیا تھا اور اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا مستقبل بناتے بناتے اپنی نوجوانی کا دور گزار بیٹھی۔ جب میری اور اس کی ملاقات ہوئی تو اس وقت تک وہ اپنی ذمے داریوں سے تقریباً عہدہ برآں ہوچکی تھی۔

میری والدہ کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ تسنیم کا خاندان حیثیت اور مرتبے میں ہم سے کمتر ہے۔ حیثیت...... مرتبہ...... میری والدہ کو شاید احساس نہ تھا کہ ہماری اپنی حیثیت اور مرتبے کا گراف کتنا نیچے آچکا تھا۔ بہرحال انہوں نے دوٹوک انداز میں بتادیا کہ یہ شادی نہیں ہوسکتی اور حکم دیا کہ میں تسنیم کا خیال اپنے دل سے نکال دوں۔

وہ حکم دے کر اس معاملے کو بھول بھال گئیں اور اپنے طور پر فرض کرلیا کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی میں ماتھے پر شکن لائے بغیر تعمیل کروں گا لیکن تسنیم کو بھولنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس نے میری ذات کے خالی خانے پُر کیے تھے، اپنی قوت سے میری کمزوریوں کو دور کیا تھا، میری ناہمواریوں کو ہموار کیا تھا۔ میری تکمیل کی تھی۔ میں بھلا اسے کیسے دل سے نکال سکتا تھا۔

اسی لیے میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اپنے متعلق فیصلے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا اور تسنیم سے کورٹ میرج کرلی۔ میری والدہ آج تک تسنیم کو اس کا ذمے دار قرار دیتی ہیں حالانکہ یہ فیصلہ سراسر میرا ذاتی تھا۔

جب میں نے تسنیم کو بہو کے روپ میں اپنی والدہ کے سامنے لاکھڑا کیا تو پہلے تو وہ بہت چیخی چلائیں، مجھے گھر سے نکالنے اور خودکشی کرلینے کی دھمکیاں تک دیں لیکن میں بھی دل سنبھال کر ان کے سامنے آیا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی ہر کوشش کے باوجود میں ٹس سے مس نہیں ہوا تو تھک ہار کر انہوں نے کم از کم اس معاملے میں خاموشی اختیار کی لیکن یہ مت سمجھیے کہ انہوں نے اپنے اختیار کو چیلنج کیے جانے کا غصہ دل سے اتار دیا۔ انہوں نے اس غصے کو دوسرے راستے سے نکالنا شروع کردیا۔ جتنا عرصہ وہ ہمارے ساتھ رہیں، ہمارا قافیہ تنگ کیے رکھا۔ شادی کے بعد تسنیم نے میرے ساتھ دفتر میں کام کرنے کی کوشش کی لیکن میری والدہ نے پہلی فرصت میں اس کی کوششوں کا سدباب کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ گھر میں رہے، دفتر آنے کے متعلق سوچے بھی نہیں۔

تسنیم نے ان کی یہ خواہش بے چون وچرا پوری کی۔ اگرچہ اس کی زندگی کاروباری دنیا میں گزری تھی لیکن میری والدہ کو خوش رکھنے کی خاطر وہ گھر میں بیٹھ گئی اور خانہ داری کے فرائض سنبھال لیے لیکن جناب خوش اسے رکھا جاسکتا ہے جو خوش رہنا چاہتا ہو اور میری والدہ کا مقصد اسے تنگ کر کے گھر سے نکالنا تھا۔ بہو بنا کر پاس رکھنا نہیں۔ انہوں نے کم و بیش وہی طریقہ کار اپنایا جو میرے والد کے معاملے میں اختیار کیا تھا۔ تسنیم کے کام پر جا بہ جا تنقید کرنا ان کا معمول تھا اور گھر آئے مہمانوں کے سامنے اس کی بے عزتی کردینا ان کا مشغلہ تھا۔ ان کے ہوتے ہوئے تسنیم کی فیملی کے کسی فرد کو ہمارے گھر میں گھسنے کی اجازت نہ تھی۔ روپے پیسے کا انتظام والدہ کے ہاتھ میں رہتا تھا اور وہ تسنیم کو چھوٹی چھوٹی ضروریات کے حوالے سے بھی تنگ رکھتی تھیں۔ تسنیم کا ہی حوصلہ ہے کہ وہ یہ سب برداشت کرگئی، اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو خودکشی کرلیتی یا میری والدہ کو ماردیتی۔

اگر یہ سلسلہ آج تک جاری ہوتا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کم از کم میری ذہنی حالت کیا ہوتی۔ میری بات شاید آپ کو کچھ سنگدلانہ محسوس ہو لیکن میں یہی کہتا ہوں کہ میری والدہ پر گرنے والا فالج قدرت کی طرف سے میرے صبر کا انعام تھا۔ اگر یہ خدائی مدد نہ ہوتی تو آج میری زندگی جانے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہوچکی ہوتی۔ میری والدہ جیسے ڈکٹیٹر کا تختہ الٹنے کا کام صرف وہی ذات کرسکتی تھی، یہ کسی انسان کے بس میں نہیں تھا۔

میری والدہ کی بیماری کے نتائج ایک طرف اگر مثبت نکلے تو دوسری طرف منفی بھی تھے۔ ان کے علاج کے اخراجات اٹھانے کے لیے مجھے قرض پر قرض لینا پڑا۔ کاروبار کی حالت پہلے ہی پتلی تھی، اس پر فاضل اخراجات کا بوجھ...... نتیجتاً اس کا دوالیا نکل گیا۔ میری ذہنی حالت ایسی ابتر ہوئی کہ میں نروس بریک ڈاؤن کے دہانے تک پہنچ گیا۔ ایسے میں تسنیم نے میری مدد کی۔ اس نے میری والدہ کی خدمت میں نہ صرف دن رات ایک کر دیے بلکہ گھر کے اخراجات چلانے کے لیے دوبارہ نوکری شروع کر دی۔ جب میری ذہنی حالت معمول پر آئی تو اس نے اپنے زیورات، جو اسے اس کے والدین کی طرف سے ملے تھے، بیچ کر اتنی رقم کا بندوبست کیا کہ میں اپنے طور پر کاروبار شروع کرنے کے قابل ہو سکا۔

والدہ کی بدمزاجی کی بدولت ہمارے اپنے خاندان کے افراد تو کب سے ہماری دہلیز کا رخ کرنا چھوڑ چکے تھے۔ ان کی بیماری کا سن کر بھی ان میں سے کوئی نہ آیا۔ تسنیم کی فیملی کے افراد جنہیں میری والدہ کے صحت مند ہوتے ہوئے ہمارے گھر میں گھسنے کی اجازت نہ تھی، انہوں نے کچھ کہے سنے بغیر آگے بڑھ کر خود ہی مختلف ذمے داریاں سنبھال لیں۔ ان لوگوں کی مدد اور تعاون سے ہی میں اس قابل ہوا کہ ہر فکر ذہن سے اتار کر اپنے کاروبار پر توجہ دے سکوں۔

مجھے توقع تھی کہ اس عذاب سے گزر کر میری والدہ کے خیالات میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آجائے گی۔ خیالات تو نہیں البتہ ان کی ذہنی حالت ضرور بدل گئی۔ شروع کے چھ ماہ تو وہ بول بھی نہیں سکیں اور چھ ماہ کے بعد ان کے منہ سے پہلی بات یہ نکلی کہ انہوں نے تسنیم کو اپنے سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔

والدہ کی ذہنی ابتری کی علامات اسی وقت نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی انہیں سمجھ نہ پایا اور سمجھ بھی نہ پاتا اگر وہ کہانی سامنے نہ آتی جو آپ کو یہاں تک لانے کا سبب بنی ہے۔ پہلے وکیل کی طرف سے نوٹس موصول ہونے کے بعد میں تو چکرا سا گیا تھا۔ سمجھ ہی نہ آیا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ اگر نوٹس پر واضح الفاظ میں میرا نام مع ولدیت اور پتے کے نہ لکھا ہوتا تو میں یہی سمجھتا کہ ڈاکیا کسی اور کا نوٹس غلطی سے مجھے تھما گیا ہے۔

میں وکیل سے جا کر ملا اور یوں یہ کہانی میرے علم میں آئی۔ میں نے اس وکیل کو حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی لیکن ظاہر ہے وہ میری بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ بڑی مشکل سے میں نے اسے راضی کیا کہ وہ کم از کم ایک دفعہ میرے ساتھ چل کر میری والدہ سے ایک ملاقات کر لے۔ اسے ساتھ لے کر میں والدہ کے پاس پہنچا اور ان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں ان کا جواب کیا تھا؟ انہوں نے اس وکیل کو پہچاننے سے ہی انکار کر دیا۔ وہ جھنجلا کر وکالت نامہ وغیرہ بطور ثبوت پیش کرنا چاہتا تھا لیکن قصہ کسی حد تک میری سمجھ میں آ گیا تھا چنانچہ میں نے دست بستہ معافی مانگ کر اسے رخصت کر دیا۔

بات یہیں پر ختم نہ ہوئی۔ چھ ماہ بعد مجھے ایسا ہی ایک نوٹس اور موصول ہوا۔ اس مرتبہ وکیل کے پاس جانے سے پہلے میں اپنی والدہ کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کے ریفرنس سے ڈاکٹر دلجیت رحمانی سے ملا اور انہیں ساری صورتِ حال بتا کر مشورہ طلب کیا۔ میری والدہ کا مکمل ذہنی و نفسیاتی تجزیہ کرنے کے بعد انہوں نے جو رائے دی، وہ اس رپورٹ کی صورت آپ کے سامنے پڑی ہے۔ آپ چاہیں تو ڈاکٹر رحمانی سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔

ان کی ذہنی خرابی کے عمل کا آغاز بہت پہلے سے ہو چکا تھا۔ میرے والد سے شادی کے بعد اپنی فطری خواہشات کے برعکس انہوں نے ناکامیاں ہی ناکامیاں دیکھی تھیں اس لیے یہ خیال ان کے ذہن میں بیٹھ گیا تھا کہ ان کے خلاف کائناتی پیمانے پر سازش کی گئی ہے اور پوری دنیا اس سازش میں شریک اور ان کی دشمن ہے۔

تسنیم کو انہوں نے اپنا دشمن نمبر ایک ٹھہراتے ہوئے اس پر حملے شروع کر دیے لیکن اس سے پہلے کہ ان حملوں کا کوئی منطقی نتیجہ برآمد ہو پاتا، ان پر فالج کا حملہ ہو گیا۔ ان کا پیرانویا مزید شدید ہو گیا۔ اب دنیا ہی نہیں، قدرت بھی انہیں اپنی دشمن نظر آنے لگی۔ رہی سہی کسر اس احساس...... بےبسی نے پوری کر دی جس سے انہیں بیماری کی حالت میں دوچار ہونا پڑا۔ تمام عمر انہوں نے خود کو دوسروں پر حکمران سمجھا تھا اور آج ایک شیرخوار بچے کی طرح لاچار تھیں۔ خود اپنا کوئی کام کرنا تو درکنار، وہ مافی الضمیر بیان کرنے سے بھی قاصر ہو گئی تھیں۔

آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ تسنیم ان کی دشمن نمبر ایک تھی اور مجھے بھی وہ کسی نہ کسی حد تک قصوروار سمجھتی تھیں۔ ہم سے بدلہ چکانے یا یوں سمجھیے کہ ہمیں پریشان کرنے کے لیے انہوں نے یہ کھیل کھیلنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹر دلجیت رحمانی کی آخری رائے کے مطابق ان

کا اس کیفیت سے نکلنا ممکن نہیں کیونکہ وہ کبھی اپنے معالج سے تعاون کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گی اور ایسے نفسیاتی مسائل سے نجات کے لیے مریض کا تعاون ہر چیز سے زیادہ ضروری ہوتا ہے۔

گزشتہ چھ سال سے میں اس عذاب سے گزر رہا ہوں۔ ہر سال چھ ماہ بعد مجھے کسی نہ کسی کے سامنے اپنے دکھوں کی گٹھری کھولنا پڑتی ہے، اپنے گھر کی باتیں بتانا پڑتی ہیں اور شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا کہ میں یہ ذلت کب تک سہتا رہوں گا۔

☆☆☆

چائے بھاپ اگل اگل کر سرد پڑ چکی تھی اور منصور کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اندر بھی کچھ سرد پڑ گیا ہو۔ ہیجان، اضطراب اور تجسس کی وہ آگ جس کی آنچ وہ یہاں آنے سے پہلے محسوس کر رہا تھا، ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انسان کی توقع یوں بھی غلط ثابت ہوتی ہے۔

ایک طویل توقف کے بعد فاران نے کہا۔ ''میری کہانی آپ نے سن لی منصور صاحب۔ اب آپ جیسے اور جہاں سے چاہیں اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ چاہیں تو میرے ساتھ چل کر میرے گھر اور دفتر کی حالت دیکھ کر خود فیصلہ کرلیں کہ اپنی والدہ کے بقول میں کروڑ پتی ہوں یا درمیانے درجے کا ایک معمولی سا کاروباری۔ آپ سے قبل میری والدہ سے ملنے والے تمام وکیلوں کے نام اور پتے میرے پاس موجود ہیں، آپ چاہیں تو ان سے بات کرکے اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔ مزید کسی ثبوت کی ضرورت ہو یا آپ کے ذہن میں کوئی سوال ابھرتا ہو تو میں آپ کے سامنے ہوں، جو جی چاہے پوچھ لیں۔''

منصور کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ ایک بار اس کے جی میں آئی کہ ابھی فاران کو ٹال دے اور بعد میں اپنے سینئرز سے بات کرکے کوئی فیصلہ کرے لیکن پھر اس نے خود ہی اس سوچ کو رد کر دیا۔ فاران نے اتنی بڑی پیشکش اسے بلاوجہ نہیں کی تھی۔ یقیناً وہ اپنی کہانی کو سچ ثابت کر سکتا تھا۔ بعد میں یہی ہوتا کہ اس کے ہم عصر اس کا مذاق اڑاتے اور سینئرز کی نگاہ میں اس کی پوزیشن خراب ہوتی۔ وہ یہ خطرہ کسی صورت مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے فوری فیصلہ کیا کہ ہر طرف سے شرمندگی اٹھانے سے بہتر ہے کہ فاران کے سامنے غلط فہمی کا اعتراف کرکے چھوٹی سی شرمندگی اٹھالی جائے۔

ابو کی طرح

لڑکا حجام سے۔ ''انکل میرے بال بالکل میرے ابو کی طرح کاٹیں۔''

حجام۔ ''وہ کیسے؟''

لڑکا۔ ''بھئی درمیان سے بالکل صاف اور کناروں سے جھالریں۔''

مرسلہ۔ عاصم خان، کراچی

کم سن

باپ بیٹے سے۔ ''سنا ہے تم بہت نالائق ہوتے جا رہے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ، کم سن کسے کہتے ہیں؟''

بیٹا۔ ''ابو! یہ بھی کوئی مشکل سوال ہے۔ کم سن اسے کہتے ہیں جو کم سنتا ہو۔''

انتخاب۔ عاصمہ علی، سکھر

''آپ کی بات پر یقین نہ کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں ہے فاران صاحب۔'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''آپ اتنا بڑا دعویٰ ایسے ہی تو نہیں کر رہے ہوں گے۔ مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ اپنی بات کو ثابت کر سکتے ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے کہ آپ کو میری بات کا یقین آ گیا۔'' فاران نے کہا۔ ''میں ڈر رہا تھا کہ کہیں آپ نے مجھے جھوٹا سمجھ لیا تو معاملہ مزید طول کھینچ جائے گا اور آپ کا اور میرا وقت خراب ہوگا۔ اب کیا خیال ہے، چائے گرم کروالی جائے؟'' اس نے بھی ابھی تک اپنے کپ کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

''نہیں، وقت بہت ہو گیا۔'' منصور نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جس کی سوئیاں آٹھ سے اوپر کا وقت بتا رہی تھیں۔ ''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔''

''آپ کا جو وقت ضائع ہوا، اس کے لیے میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں۔'' فاران نے کہا۔ ''اگر آپ اپنے قیمتی وقت کا کوئی معاوضہ وصول کرنا چاہیں تو میں حاضر ہوں۔''

''مجھے شرمندہ مت کیجیے فاران صاحب۔'' منصور نے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''چلیے۔''

دونوں اٹھ کر ریستوران سے باہر نکل آئے۔ فاران نے ایک دفعہ پھر اس سے معذرت کی اور اپنی گاڑی میں

بیٹھ کر رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹر رحمانی کی رپورٹ والے کاغذات وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ منصور اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس طرف بڑھا جہاں اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔

موٹر سائیکل پر سوار ہونے سے پہلے اس نے بیگ کھول کر بیگم چغتائی کے ابطال نامے اور عاق نامے کی تحریر کے کاغذوں والا لفافہ نکالا اور کھول کر دیکھے بغیر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

☆☆☆

نئے ماڈل کی لینڈ کروزر ہلکا سا دھچکا لیے بغیر کوٹھی کے پورچ میں رک گئی۔ باوردی شوفر نے جلدی سے اتر کر عقبی نشست کا دروازہ کھولا اور فاران نیچے اتر آیا۔

اس کے بدن پر وہی کپڑے تھے جو وہ منصور سے ملاقات کے وقت پہنے ہوئے تھا۔ گاڑی سے اتر کر وہ اندرونی حصے کے صدر دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ مرکزی ڈرائنگ ہال خالی پڑا تھا البتہ ایک ملازمہ بالائی زینے طے کرتی ہوئی نیچے آرہی تھی۔

''بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟'' فاران نے پوچھا۔

''اوپر بیڈروم میں ہیں جی۔'' ملازمہ نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' فاران تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی اور کسی اندرونی احساس کے زیر اثر چہرہ جگمگا رہا تھا۔

کامل سچ عموماً بہت زیادہ تلخ ہوتا ہے اور کامل جھوٹ بہت زیادہ شیریں۔ اسی لیے اکثر لوگ انہیں ہضم نہیں کر پاتے۔ فاران اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس نے اپنی کہانی میں دونوں اجزا کا توازن بڑا مناسب رکھا تھا اور منصور نے یہ پکوان بڑی آسانی سے ہضم کر لیا تھا۔

اس نے منصور کے سامنے بہت سے سچ بولے تھے مثلاً اس کی والدہ کا تحکمانہ اور تسلط پسند مزاج، اپنے شوہر سے رنجش، والد کی اچانک موت اور اس کے بعد والدہ کے زیر سایہ ایک گھٹی گھٹی، ناآسودہ پرورش۔ وہ اپنی ماں پر گرنے والے فالج کو خدائی رحمت ہی سمجھتا تھا۔ اسی کی بدولت اسے کھل کر سانس لینے کا موقع نصیب ہوا تھا لیکن اس نے منصور کے سامنے چند جھوٹ بھی بولے تھے۔

بیڈروم کے دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ ایک لمحے کو رکا، ہلکی سی دستک دی پھر اسے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرا وال لائٹ کی زرد روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ کنگ سائز بیڈ کے پشتے کے سہارے نیم دراز اس کی بیوی، تسنیم چغتائی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ فاران کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کتاب بند کر کے سائڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

''کیا رہا؟'' اس نے بلاتمہید پوچھا۔

''کامیابی۔'' فاران نے ویسا ہی مختصر جواب دیا اور آگے بڑھ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔

''زیادہ محنت تو نہیں کرنا پڑی؟''

''اتنی تیاری اور مشق کے بعد زیادہ محنت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' فاران نے کہا۔ ''اور یہ وکیل تو ویسے بھی جیسے موم کا بنا ہوا تھا، بڑی آسانی سے پگھل گیا۔''

''بعض وکیل بہت زیادہ نوزی ہوتے ہیں۔''

''ہوں بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ چند ہرے نوٹوں کی خوشبو ہر کھلی ناک کو بند کر سکتی ہے۔ بہرحال اس معاملے میں یہ نوبت نہیں آئی۔''

''عقیلہ نے تمہیں اطلاع کب دی تھی؟''

''وکیل سے ملاقات کا وقت لینے کے بعد اس نے مجھے بتا دیا تھا۔'' فاران نے جواب دیا۔ ''اور آج جب وہ وہاں پہنچا تو اس نے فوراً مجھے فون کر دیا۔''

''اس مرتبہ کس کی گاڑی مانگی تھی؟'' تسنیم نے مسکرا کر پوچھا۔

''چیف اکاؤنٹنٹ کی۔'' فاران نے بتایا۔ ''ابھی واپس کر کے سیدھا ادھر ہی آرہا ہوں۔ بے چارہ حیران ہو رہا تھا کہ چھ گاڑیاں رکھ کر بھی مجھے اس کی گھٹیا سی گاڑی کی کیا ضرورت آن پڑی۔''

''گھٹیا چیزیں بعض اوقات بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔'' تسنیم نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''جیسے یہ کپڑے......اور جیسے عقیلہ۔''

''میں اس عورت کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں۔'' فاران نے کہا۔ ''کتنی عمدگی سے ڈبل رول کھیل رہی ہے۔ امی جیسی زیرک اور باریک بین خاتون کو بھی اس پر شک نہیں ہوا۔ ان سے الگ پیسے بٹورتی ہے اور ہم سے الگ رقم وصول کرتی ہے۔''

''کیا کرے بیچاری، اتنی ضرورت مند جو ہوئی۔'' تسنیم نے ایسے انداز میں کہا تو فاران قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس ایک قہقہے میں گزرنے والے پورے دن کا اعصابی تناؤ اور اضطراب چھپا ہوا تھا۔ تسنیم بھی مسکرانے لگی۔

پھر فاران کا چہرہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔ دھیرے سے اس نے سر تسنیم کی گود میں رکھ دیا۔ تسنیم ہولے ہولے

اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ فاران کی ساری عمر ماں کی زیرِ نگرانی گزری تھی۔ وہ اس نگرانی کا عادی بلکہ نشئی ہو گیا تھا۔ اس میں اتنا اعتماد کبھی پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ ماں کی انگلی چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں اپنا راستہ خود تلاش کر سکے۔ شاید اسے تسنیم بھی اسی لیے پسند تھی کہ وہ اس کا خیال تو شفقت کے ساتھ رکھتی تھی مگر سخت نہ تھی۔

تسنیم کی انگلیاں اس کے سر کو سہلا رہی تھیں، اس کے بالوں میں رینگ رہی تھیں۔ اس کے اعصاب سے کشیدگی کے اثرات ڈھلتے جا رہے تھے۔ وہ پرسکون ہو رہا تھا لیکن ایک ہلکی سی خلش ہمیشہ باقی رہتی تھی۔ اس خلش نے اسے کبھی پوری طرح چین نہیں لینے دیا تھا۔

اس نے ہولے سے کہا۔ ''آخر ایسے کب تک چلتا رہے گا؟ میں تنگ آتا جا رہا ہوں۔''

''اس کا ایک حل ہے۔'' تسنیم نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''فاری...... تمہاری امی کے کھانے پینے اور دوائیوں وغیرہ کا سارا انتظام عقیلہ کے ہاتھ میں رہتا ہے۔''

''ہاں۔''

''اور وہ ضرورت مند بھی ہے؟''

''ہاں تو؟''

''تو پھر کبھی اسے اشارہ دو کہ اگر وہ اپنے فرائض سے تھوڑی سی غفلت برت لے تو اس کی ضرورت مندی ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہے۔''

فاران نے سر اٹھا کر تسنیم کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں، فاران کو اپنے جسم میں برقی لہر اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ ''کیا یہ ضروری ہے؟''

''تمہاری مرضی ہے۔'' تسنیم نے کہا۔ ''لیکن اتنا ذہن میں رکھنا کہ تمہاری امی اپنی زندگی جی چکی ہیں۔ چند دن کم زیادہ ہونے سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا البتہ تمہیں بہت فرق پڑے گا۔''

فاران خاموش رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ ''اور عقیلہ گھبرا گئی تو؟''

تسنیم مسکرائی۔ ''اسے بتا دینا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم اسے پورا تحفظ دیں گے۔ ظاہر ہے ہماری اپنی سلامتی اس کی سلامتی سے مشروط ہوگی اور جب تک ہم منہ نہیں کھولیں گے، اس کی طرف کون انگلی اٹھائے گا۔''

''میں سوچوں گا۔'' فاران نے آنکھیں موندتے ہوئے دوبارہ سر اس کی گود میں رکھ دیا۔ ''ابھی میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔''

تسنیم کی انگلیاں پھر چلنے لگیں۔ فاران کے تنے ہوئے اعصاب پرسکون ہوتے گئے۔ وقت لگی بندھی رفتار سے اپنا سفر طے کرتا رہا۔

☆☆☆

وقت کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ کائنات کے اس کونے سے اس کونے تک۔ ازل سے جاری، ابد تک مسلسل۔ آئن اسٹائن نے کہا تھا کہ وقت اور مقام بدل جانے سے اشیا کی نوعیت بدل جاتی ہے لیکن اندر کا موسم بدل جائے تو وقت کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے لیے وقت پر لگا کر اڑتا ہے اور بعض لوگوں کے لیے سسک سسک کر رینگتا ہے۔

بیگم چغتائی بھی ایسے ہی لوگوں میں شامل تھیں۔

اس وہیل چیئر پر بیٹھے یا اس بستر پر دراز، ان کے لیے وقت کا ایک ایک لمحہ مرض الموت میں گرفتار کی سانس کی طرح اٹک اٹک کر گزرتا تھا۔ بیداری کی طویل گھڑیوں میں وہ جانے کتنی دفعہ جوئے شیر کھود کھود کر پاٹتی تھیں۔

جسم مفلوج ہو تو ذہن اور زیادہ متحرک ہو جاتا ہے۔ جسم کی سرگرمی میں جو چھوٹی چھوٹی باتیں نگاہ میں آنے سے رہ جاتی ہیں، سکوت کی حالت میں چشمِ تصور انہیں بڑا کر کے دکھاتی ہے۔ گزشتہ زندگی کی ساعتیں اور آئندہ زندگی کا تصور سب ایسی صراحت سے نکھر کر سامنے آتے ہیں کہ دیکھنے والا دم بخود رہ جاتا ہے۔

بیگم چغتائی کو زندگی سے بہت کچھ ملا تھا لیکن انہوں نے اپنے ہاتھوں سب کچھ گنوا دیا تھا۔ انہیں اس کا اعتراف تھا اور اب احساس ہوتا تھا کہ ان کا ماضی ناکامیوں اور تلخیوں سے عبارت ہے اور ان کا مستقبل ایک اتھاہ، بے کنار، مہیب خلا۔ ماضی کی طرف لوٹیں تو پچھتاووں کے بچھو ڈنک ماریں، مستقبل کی طرف جائیں تو بے یقینی کا اژدہا منہ پھاڑے، نگل جانے کو لپکے۔ زندگی گیہوں اور گھن کی طرح چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پستی رہے۔

وہ اس وقت اپنے کمرے میں تھیں۔ ادارے کی ملازمائیں تھوڑی دیر پہلے انہیں کھانا اور دوا کھلا کر اور بستر پر لٹا کر گئی تھیں۔ وہ سوچوں کے سمندر میں غرق تھیں کہ دروازہ کھلا اور عقیلہ اندر آئی۔

''تم ابھی تک یہیں ہو عقیلہ؟'' بیگم چغتائی نے اسے

دیکھ کر کہا۔

''ادارے کے حسابات کی چیکنگ ہو رہی تھی۔ اسی لیے آج زیادہ دیر رکنا پڑا۔'' عقیلہ نے کہا۔ ''میں نے سوچا جانے سے پہلے پوچھ لوں کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔''

''شکریہ عقیلہ۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''اس وقت تو کسی چیز کی ضرورت نہیں لیکن صبح کچن والوں سے میری طرف سے کہہ دینا کہ کبھی کبھی ناشتے کا مینیو تبدیل بھی کرلیا کریں۔ اس کے علاوہ لانڈری والوں سے کہہ دینا کہ اگر میری کسی نئی ساڑی کو سرف لگایا تو کھڑے کھڑے سارا نقصان بھروالوں گی۔''

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ۔'' عقیلہ نے کہا۔ ''اور کچھ؟''

''نہیں۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔

''تو پھر میں چلتی ہوں۔'' عقیلہ جانے کے لیے مڑی اسی لمحے بیگم چغتائی نے کہا۔

''یہ وکیل بھی واپس نہیں آئے گا۔''

''جی۔'' عقیلہ حیرت کے عالم میں مڑی۔

''میں جانتی ہوں۔'' بیگم چغتائی نے پھر کہا۔ ''اس کے باہر نکلتے ہی مجھے احساس ہوگیا تھا، یہ بھی واپس نہیں آئے گا۔''

عقیلہ نے کچھ کہنے کے بجائے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا۔ وہ جانتی تھی بیگم چغتائی اس وقت اپنی کہنے کے موڈ میں ہیں۔

''میرے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے۔ میں نے جب بھی کسی سے کوئی توقع باندھی ہے، وہ پوری نہیں ہوئی۔ میرے باپ نے، میرے شوہر نے، میرے بیٹے نے، سب نے مجھے مایوس کیا ہے پھر جب میری طرف سے کوئی ردعمل ہوتا ہے تو دنیا بھی مجھے ہی برا کہتی ہے۔ سب میرے دشمن ہیں۔''

عقیلہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ سوچ کر پھر خاموش رہی۔

''قدرت بھی میرے ساتھ ناانصافی کرتی ہے۔ میرا یہاں اب تک ہونا ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے عقیلہ؟ کیا میں نے کسی کے ساتھ ناانصافی کی ہے؟ میں نے تو صرف حساب برابر کرنے کی کوشش کی ہے آج تک۔ اگر میں نے اپنے باپ کو زندگی کا آخری حصہ یہاں گزارنے پر مجبور کیا تو صرف اس لیے کہ وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا اور میرے گھر میں اس کا وجود خوامخواہ کی پریشانیوں کو جنم دے رہا تھا۔ اگر میری اپنے شوہر سے نہیں بن سکی تو اس لیے کہ اس نے بھی مجھے بیوی سمجھا ہی نہیں۔ اس نے مجھے صرف اپنی ترقی کے لیے سہارے کے طور پر استعمال کیا۔ میرا بیٹا کہتا ہے کہ میں اس پر زیادتیاں کرتی رہی ہوں لیکن اس کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ میں نے جو کچھ کیا، اس کے بھلے، اس کی حفاظت کے لیے کیا۔ کیا میرا رویہ غیر منصفانہ تھا؟''

''آپ اس بارے میں بہتر طور پر جانتی ہیں بیگم صاحبہ۔'' عقیلہ نے بالآخر کہا۔

''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا۔'' بیگم چغتائی نے کہا۔ ''جب میں نے اپنے باپ کو یہاں بھجوایا تھا تو صرف دو سال کے بعد اسے چھٹکارا مل گیا تھا۔ میں چھ سال سے انتظار کی گھڑیاں گن رہی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ قدرت مجھے سزا دے رہی ہے لیکن اگر میں نے جرم کیا تھا تو اس کی سزا بھگت چکی ہوں۔ اب مجھے رہائی مل جانی چاہیے۔ جانے میری نجات کا لمحہ کب آئے گا؟''

عقیلہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ ضبط کی کوشش میں اس کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے اور وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

''میری دعا ہے بیگم صاحبہ کہ...... کہ...... خدا آپ کی مشکل آسان کردے۔''

وہ تیزی سے مڑ کر باہر نکل گئی۔ دروازہ چرچراتا ہوا چوکھٹ سے ٹکرایا اور خودکار قفل کھٹاک سے بند ہوگیا۔ بیگم چغتائی نے ایک آہ بھر کر اپنی اکلوتی آنکھ موند لی۔ وہ پھر تنہا رہ گئی تھیں۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا لیکن ماضی سے ابھرنے والی سرگوشیوں کی بازگشت ان کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان کے والد نے اپنے والدین سے لڑ کر اپنا حصہ وصول کیا تھا اور انہیں تنہا چھوڑ کر اپنی دنیا الگ بسانے کی سوچی تھی۔ انہیں خود ساری عمر اپنے باپ کی توجہ نہ ملی اور آخر میں جب بگڑے ذہنی توازن نے باپ کو ان پر بوجھ بنانا شروع کیا تو انہوں نے اسے یہاں بھجوا کر نجات حاصل کرلی۔ آج وہ خود یہاں بیٹھی اپنی رہائی کا، موت کا انتظار کررہی تھیں۔ مکافات کی جو زنجیر انہوں نے خود اپنے گلے میں ڈالی تھی، ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کا حلقہ تنگ ہوتا جارہا تھا۔

''جانے میرے عذاب کی گھڑیاں کب تمام ہوں گی۔'' بیگم چغتائی نے بڑے کرب سے سوچا اور ان کی اکلوتی آنکھ سے نکلنے والا اکلوتا آنسو ان کے رخسار سے ہوتا ہوا سینے پر ٹپکنے لگا۔